دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
جاسوسی ڈائجسٹ
مارچ 2010
نگران اعلیٰ
معراج رسول
www.pkdigest.com
للکار
جس اور ایکشن سے بھرپور داستان
طاہر جاوید مغل کے قلم سے

11 چٹنی نکتہ چینی — مدیر اعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں کج ادائیاں
نامہ و پیام، محبتیں، شکایتیں اور باتیں

18 بدخصلت — سلیم فاروقی
بے غرض بے لوث... بے وطنوں
کو پیش آنے والے سنگین حالات و واقعات

57 آزادی — محمد عرفان
دہشت پسند گروہوں کی ظالمانہ...
سفاکانہ کارروائیوں کا پُردرد احوال

67 تنگ آمد — کاشف زبیر
لہو، محبت، شائقین کے لیے جرم اور محبت
کے سنسنی خیز امتزاج کی حامل حیرت انگیز تحریر

83 انتقام — تنویر ریاض
ایک انوکھے طریقۂ واردات سے
تعلق رکھنے والی مرا انتقام کہانی

92 گرداب — اسما قادری
تقدیر کا کھیل... قسمت کی... مقدر
کا کھیل... بکھر جانے والوں کی کہانی

131 وعدہ — یعقوب جمیل
تصورات، غم اور درد و اذیت کے پہلوؤں کو
اجاگر کرتی ایک ماورائی اور تحیر آمیز داستان

137 چوبے وان — مریم کے خان
مغرب سے درآمد ایک انوکھی
دلچسپ اور یاد رہ جانے والی تحریر

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

150 للکار — [illegible] مغل
اس عاشق خاص کا احوال جو
للکار سننے اور للکارنے کا دھنی تھا

195 احمق — ثمر عباس
تحقیق و جستجو میں احمقانہ کوئی جہت روشناس
کرانے کا عزم رکھنے والے نوجوان کی داستان

207 ماں جی — آصف ملک
بے بسی اور ناانصافی کی آگ جس نے
ہر شخص کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا

219 تقاضائے انصاف — رضوانہ مظفر
اپنے موضوع اور جدت کے لحاظ
سے منفرد انداز کی تحریر خاص

231 تماشاگر — منظر امام
... قارئین کے تناظر میں
لکھا گیا ایک دلچسپ سرورق

256 مکان اور مکین — احمد اقبال
بے مکین مکینوں کی حکایت غم جو بہا سے
سراب کے پیچھے بھاگ رہے تھے

www.pkdigest.com

مدیر اعلیٰ

چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من... السلام علیکم!

مارچ کا شمارہ پیشِ خدمت ہے... مارچ ہمیں قراردادِ پاکستان کی یاد دلاتا ہے جس کی بنیاد پر برصغیر میں دو علیحدہ مملکتوں کا قیام عمل میں آیا تھا لیکن بھارت کی جانب سے کوئی تقسیم کو بادلِ ناخواستہ قبول کرلیا گیا لیکن اس نے جو مسائل پیدا کیے تھے، تقسیم کے تریسٹھ برس میں بھی... بدستور حل طلب ہیں اور کشمیر ان میں سرفہرست ہے۔ بھارت کے ساتھ "تعلقات" کی بات اب صرف کشمیر کے تنازعے تک محدود نہیں۔ پاکستان میں زندگی اور موت کا مسئلہ پیدا کرنے کے لیے بھارت کی جانب سے سندھ طاس معاہدے کی خلاف ورزیاں بھی بڑی دیدہ دلیری سے جاری ہیں۔ اب تو وہ ایسے حالات پیدا کر رہا ہے کہ پاکستان کے پانی کو اپنے بڑے بڑے ڈیم تعمیر کر کے جمع کر لے، ہمارے دریاؤں کو خشک کر دے، ہماری فصلیں موت کی دہلیز تک پہنچ جائیں اور پاکستانی باشندے بوند بوند پانی اور مٹھی بھر اناج کو ترسنے لگیں... اس وقت دنیا بھر میں پانی کی قلت ہے اور اس بات پر غور کیا جا رہا ہے کہ کسی طرح دستیاب آبی وسائل کو با کفایت انداز میں استعمال کر کے اس قیمتی قدرتی وسیلے کی بچت کی جا سکے۔ پاکستان دنیا کے خشک اور نیم خشک جغرافیائی خطے میں واقع ہے۔ ایسے میں اگر بھارتی آبی راہزنوں سے ہو کر پاکستان پہنچنے والے پانی کو بھارت نے اپنی ہٹ دھرمی سے روکنے کی کوششیں جاری رکھیں تو یہ بات ہماری زندگیوں سے کھیلنے کے مترادف ہوگی... بھارت سے خوشگوار تعلقات کے قیام کی خواہش رکھنے والوں کو سوچنا چاہیے کہ پاکستان کے گلے کو دبا کر اس سے دوستی کا ہاتھ نہیں ملایا جا سکتا... تادمِ تحریر، دہلی میں پاکستان اور بھارت کے درمیان سیکریٹری خارجہ کی سطح پر مذاکرات جاری ہیں۔ اُمید کرتے ہیں کہ بھارت اپنی گزشتہ ہٹ دھرمی کی روش بدل ڈالے، ورنہ پاکستان کا پانی یوں ہی روکا جاتا رہا تو پھر ذہن نشین کرلیں کہ کربلا بہت دور نہیں ہے۔ ویسے بھی یہ بات تو اکیسویں صدی کے آغاز سے ہی عالمی سطح پر کہی جارہی ہے کہ تیسری عالمی جنگ معیشت اور جغرافیہ پر نہیں، پانی کے مسئلے پر ہوگی۔ بھارت عقل کے ناخن لے اور بقول ساحر لدھیانوی!

جنگ ٹلتی رہے تو بہتر ہے

بنی دلاں اس گمبھیر صورتِ حال سے نکلتے ہیں... اور دیکھتے ہیں کہ آپ اپنے مکتوبات میں کس بات پر زور دے رہے ہیں۔

واہ کینٹ تحصیل ٹیکسلا سے نہال سنگھ کی آمد "فروری کا سرورق بہتر تھا۔ ڈاکٹر انکل اب مصنف کرخت کو بھی نسبتاً بہتر انداز میں پیش کر رہے ہیں مگر ڈائجسٹ میں ایک چیز کی کمی تھی جو کہ جاسوسی کا خاصہ ہے اور وہ ہے گن۔ جنوری اور فروری دونوں شماروں میں گن سرورق سے غائب ہے اور اس کا کسی نے نوٹس بھی نہیں لیا۔ شاید آپ بھی گن کو بھول چکے ہیں۔ محفل میں چوہدری محمد سرفراز کا تبصرہ ٹاپ لسٹ پر تھا، ان کو مبارک باد۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر یٰسین بلوچ، رضوان تنولی اور عبدالسلام صدیقی کے خطوط اور تبصرے اچھے لگے۔ اس کے علاوہ بلیک لسٹ میں بڑا نام فرلی ایس کے اسماعیل کا تھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ آخر کار مصنف نے ماہ بانو کو زندہ کر ہی دیا۔ مگر ڈی آئی جی سجاد راٹھ کی بیٹی کی خواجہ سراؤں کے ہاتھوں دردناک موت نے کہانی پڑھتے ہوئے اداسی طاری کر دی۔ کہانی کا سب سے دلچسپ پہلو آفتاب اور کشور کی رنگین ملاقاتیں ہیں جو کہ جانے اب کیا رنگ لاتی ہیں۔ نئی کہانی انگار جو کہ پسندیدہ مصنف مغل انکل کا نیا سلسلہ ہے۔ ایک نئے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ تاہم ابھی ہمارے ہیرو صاحب یعنی تابش کمزور واقع ہوئے ہیں۔ مغل انکل کی کہانیوں کا خاصہ ہے جوش، ولولہ اور دہکتا ہوا لاوا اور وہ بھی لازمی اس میں ہوگا۔ شادی بربادی میں استاد زمانے عالم کی فارسی کم اور اردو سے بہت لطف اندوز ہوئے۔ دراڑ پہلا رنگ شمارے کی سب سے بہترین کہانی تھی۔ دراڑ میں خون کے رشتوں کی بے رخی کا احساس ہوا۔ جس بھائی نے اپنی جوانی ان کے لیے وقف کر دی، انہوں نے اسے کیا صلہ دیا۔ دوسرا رنگ ذرا سا پھیکا تھا۔ وانتدیر بھی اچھی کہانی تھی۔ کاشف زبیر کی چور کے پاؤں پڑھ کر ہمیں تو یہی لگا کہ پنجابی میں اس کا تیجہ کچھ یوں نکلتا ہے کہ (کسیں دی یاری تھوہیں وانگ) اب اجازت چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ میرا خط بلیک لسٹ میں تو شامل کر ہی دیں گے۔"

جعفر حسین کی پسند ناپسند بھوانہ سے "اس دفعہ ماہ فروری کا شمارہ تو ہر سے بک اسٹال کے متواتر چکر لگانے کے بعد 4 تاریخ کو مل ہی گیا۔ شیمپو کے کسی برانڈ کے لیے ماڈلنگ کے انداز میں پوز دیتی حسینہ استعجابیہ انداز میں چاہنے کے گھائل کرنے کی سعی لاحاصل کر رہی تھی۔ پیچھے چادر میں لپٹا کر مصنف کرخت کے ذریعے پُراسراریت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ سرورق اور لسٹ سے طاہر جاوید مغل کی انگار ہٹتے اور دیکھتے ہوئے دلِ ناتواں پر جبر کر کے محفل میں جا پہنچے۔ چوہدری محمد سرفراز کو اول آنے پر ڈھیروں مبارک باد۔ اس دفعہ حق دار کو حق ملا۔ سائرہ مسعود اور چوہدری مسعزز سے غائب ڈاکٹر یٰسین بلوچ کی تنہائی برداشت نہ ہوئی اس لیے دل جوئی کے لیے دوڑی چلی آئیں۔ عصمت علی، آپ کس چیز کے کش لگا رہے ہیں؟ ارسلان رضا خوشی کے غیر متوقع صدمے سے بے حال ہو کر خوشامد پر تبصرہ کرتے ہوئے کہانیوں پر تبصرے کو بھول گئے۔ قاری عبدالصمد اشرفی، خدا آپ کے چچا کو جوارِ رحمت میں جگہ دے، آمین۔ ایس زیڈ بخاری کی خوش قسمتی پر رشک آیا۔ ہمایوں سعید رومیہ، سائرہ مسعود، محمد کبیر عباسی اور عتیق الرحمٰن کے تبصرے اچھے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انگار پڑھی۔ جوں جوں پڑھتے گئے اس قلم کے سحر میں کھوتے چلے گئے جس کے ہر لفظ میں واقعی جذبات کے رنگ اور محسوسات کے سُر تال بجتے ہیں۔ خوب صورت اور انمول جذبوں سے گندھی بے مثال تحریر تھی۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی تحریروں میں زندگی کے تمام احساسات بہت نمایاں ہوتے ہیں۔ حقیقت سے قریب ترین منظر نگاری اور ماورائی چیزوں سے مبرّا ان کی تحریروں کے کردار جیتے جاگتے حتیٰ کہ سانس لیتے تک محسوس ہوتے ہیں۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ اسما قادری کی گرداب ہر لمحہ رنگ بدلتی ایک تیز رفتار تحریر تھی۔ ماہ بانو تیسری جنس کے گرداب سے نکل کر نئی منزل کی جانب رواں دواں ہے اور کشور اور آفتاب لگتا ہے کسی انہونی میں گرفتار ہونے والے ہیں۔ ریت کے دریا میں پھنس کر نکلے تو غیر متوقع انجام نے چونکا دیا۔ گن ڈیپ مرتی اور دولت کی خاطر سارا کھیل کھیلنے والے قیوم اور یاسمن کے وارث ہاتھ ملتے رہ گئے۔ بہرحال ماہر ناصر کاظمی صاحب کی پُراثر کاوش تھی۔ پہلے رنگ میں نجم احمد کو خون کے

رشتوں نے دھوکا دیا۔ حقیقت سے دور افراتفری اور پرانے پلاٹ پر لکھی گئی سلیم فاروقی صاحب کی بے اثر تحریر تھی۔ تعبیر آشنا میں حسام بٹ صاحب قریباً قریباً آتش فشاں کے ری میک میں نظر آئے، وہی طرزِ انداز، وہی مخصوص طرزِ تحریر، وہی فلاسفی، فرق صرف اتنا تھا کہ آتش فشاں کی طرح مار دھاڑ نہیں تھی۔ مختصر کہانیوں میں شادی بربادی نے خوب ہنسایا۔ چور کے پاؤں واقعی نہیں ہوتے۔ گورڈن ایش نے فہم و فراست سے کام لے کر اپنی پوتی کو بوکان سے بچالیا۔ سست و چست میں بیری شیپرڈ نے ذہانت سے اندھے قتل کا سراغ لگایا۔ انسانی ذہن کی پیچیدگیوں کی عکاسی بلاشبہ اس ماہ کی مختصر کہانیوں میں نمایاں تحریر تھی۔ ولیم اور امیلا موت کے خطرات سے کھیلتے کھیلتے بالآخر دوبارہ یکجا ہو گئے۔ دیچھا نے کچھ خاص تاثر نہ چھوڑا۔ باتدبیر نے بھی زیادہ متاثر نہ کیا۔ بینک لوٹنے والے ڈاکو کا اتنا انتظار نہیں کرتے جتنا ان کو امتیاز علی نے کروایا۔"

فاطمہ گل کی لاہور سے اپنی آمد کی اطلاع "طویل عرصے کی غیر حاضری کے بعد پھر سے حاضر ہوں۔ کافی عرصے میری نانو بیمار رہیں۔ اللہ تمام بیماروں کو تندرستی عطا فرمائے، آمین۔ اتنے عرصے میرا جاسوسی کا ساتھ چھوٹ گیا تھا۔ جاسوسی کی آمد ایسی لگی جیسے برسوں سے بچھڑا ہوا کوئی دوست مل گیا ہو۔ فروری کا ٹائٹل سو فیصد زبردست تھا۔ وشادمانیتا ہے بے خبر دوشیزہ کی لیلیت سائیڈ پر ایک شخص فون پر مصروف تھا۔ اوپر کی طرف ایک شخص نے بڑی سی چادر میں اپنا بھوتا چھپانے کی ناکام سی کوشش کی تھی۔ محفل اور حرم محا میں سب کے تبصرے اچھے تھے۔ ٹریل ایس کے ڈیئر برادرز اسٹوری کی سمری ہی لکھ کے بھیج دیا کرو۔ سب کے لکھنے کا اپنا انداز ہوتا ہے۔ ایسے ہی لوگ چلتے ہیں لیکن میں ان میں سے نہیں ہوں گی۔ شکریہ ان تمام فرینڈز کا جنھوں نے مجھ ناچیز کو مس کیا اور ان کو بھی جنھوں نے مس نہیں کیا۔ میری دوبارہ آمد کو سہنا پڑے گا ہاہاہا۔ فہرست میں پرواز کو تلاش کیا لیکن پرواز تو کب کا اپنی پرواز اڑ چکا تھا۔ افسوس کہ پرواز کی لاسٹ دو قسطیں نہ پڑھ سکی۔ معذرت کے ساتھ کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔"

ایم عزیز کا مختصر نامہ چکوال سے "دوستوں کے تبصرے پسند آئے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے طاہر جاوید مغل صاحب کی کہانی پڑھی۔ مختلف آزمائشیں اور مشکلیں جس طرح ایک اناڑی کو للکار رہی ہیں، اس کے پیشِ نظر دیکھتے ہیں کہ کس طرح اناڑی کھلاڑی بن کر جواب دیتا ہے۔ زن اور زر کے گرد گھومتی سفاکانہ انداز لیے خوب صورت تحریر وزارا پسند آئی۔ چور کے پاؤں میں گورڈن ایش کی دونوں دوستیں محفوظ رہیں۔ باتدبیر میں امتیاز علی کی تدبیر خوب رہی۔ منظر امام صاحب ایک انوکھے چھاپ سے لفاظی جھڑ دار ہے تھے۔ گرداب میں ماہ بانو حالات کے شکنجے میں پھنسی ہوئی کافی ... دیکھتے ہیں کب تک محفوظ رہتی ہیں۔"

آسیہ خان کی پشاور سے شرکت "آج پہلی دفعہ اس خوب صورت محفل میں شریک ہو رہی ہوں (خوش آمدید)۔ امید ہے حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ اس شرکت کی تین وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ مجھے طاہر جاوید مغل کی کہانیوں سے عشق ہے۔ اس دفعہ جب للکار پڑھی تو رہ نہیں گئی۔ طاہر جاوید ایک روشن ستارہ ہیں۔ ان کا اندازِ بیاں مجھے بے حد پسند ہے۔ دوسری وجہ محی الدین نواب ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ پلیز جلد سے جلد نواب صاحب کی کوئی تحریر عنایت فرمائیں۔ تیسری وجہ جو کہ سب سے اہم ہے وہ ہے آمنہ پٹھانی اور رومیو۔ مجھے ان دونوں کے تبصرے حد سے زیادہ پسند آتے ہیں۔ ہمایوں سعید رومیو کا تو کوئی ثانی نہیں۔ ویلڈن رومیو۔ سب سے پہلے للکار پڑھی اور مجھے بتانے کی ضرورت نہیں کہ بے حد پسند آئی۔ گرداب اور ... دونوں بہترین کہانیاں ہیں۔ پلیز! اب گرداب کو وائنڈ اپ کر کے کوئی فنی مسکراتی تحریر عنایت کریں۔ رنگوں میں وزارا پسند آئی۔ تبصروں پر کیا تبصرہ کروں۔ آمنہ کو غائب پاکر رومیو پر ہی توجہ مرکوز کی۔ رومیو! آپ سے مجھے یہ پوچھنا تھا کہ اگر آپ کا تعلق ملتان سے ہے تو آپ کی اردو اتنی اچھی کیسے ہو سکتی ہے؟ پلیز! ضرور بتائیے گا۔"

محمد سلیم شبلی ملتان سے لکھتے ہیں "ماہ فروری کا شمارہ بک اسٹال کے دس چکر لگانے کے بعد 7 تاریخ کو ملا۔ نجی مصروفیات کی وجہ سے پچھلے دو ماہ محفل سے غیر حاضر رہا، معذرت۔ سب سے پہلے ٹائٹل پر نگاہ دوڑائی۔ چادر کی بغل مارے بیٹھا آدمی اتنا خوب صورت اور وجیہ تو نہیں لگ رہا تھا کہ اس کو کہانی میں بیان کیا گیا۔ البتہ اس کی آنکھیں بہت عجیب تھیں جبکہ مس جاسوسی اس آدمی کو نظرانداز کیے بڑی ادا سے ہمیں دیکھ رہی تھیں۔ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر آگے بڑھ گئے۔ چٹکی نکتہ چینی میں بڑی خوب صورتی سے ہماری قومی غیرت جگانے کی کوشش کی گئی۔ محفل ہاؤس میں داخل ہوئے جہاں پر کوئی خاص رونق نہیں تھی۔ چودھری محمد سرفراز آپ کو صدرِ محفل بننے پر مبارک باد، آپ کا تبصرہ بھی پسند آیا۔ عصمت علی، یار محفل کا کچھ ادب تو کرو، باہر جاکر لمبے لمبے کش لگاؤ، اندر اتنا دھواں تو نہ بھرو۔ دلنشین بلوچ، آپ سسپنس میں بھی پائی جاتی ہیں، حیرت ہے آپ اتنے سارے رسالے کیسے پڑھ لیتی ہیں۔ ہم سے تو ایک جاسوسی ہی بڑی مشکل سے پڑھا جاتا ہے۔ لومی اے، جب بھی آپ کا نام دیکھتا ہوں بہت اداس ہو جاتا ہوں۔ عبدالسلام صدیقی آپ کی مثبت تنقید بہت پسند آئی۔ بہرحال، یہاں پر اپنی پریکٹس کامیابی سے جاری رکھیں، الیکشن قریب ہیں۔ ایس ایس ناز صاحبہ، آپ کہاں غائب ہو گئی ہیں۔ آپ کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ اب کچھ کہانیوں پر۔ سب سے پہلے للکار پڑھی۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی اسٹوری میں عموماً ہیرو صاحب بہت مضبوط، طاقتور اور لڑائی بھڑائی کا ماہر ہوتا ہے لیکن یہاں پر تو معاملہ الٹ ہے۔ گرداب میں اب ماہ بانو اور شہریار میں محبت کا کھیل شروع ہو چکا ہے۔ ماسٹر آفتاب کا عشق ہمیں بھی اچھا نہیں لگا۔ بقول عبدالسلام صدیقی عشق صلاحیتوں کو کھا جاتا ہے۔ پہلے رنگ میں سلیم فاروقی نے اچھے انداز سے خونی رشتوں کی قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ نسیم نے اپنی زندگی بھائیوں کے لیے وقف کی لیکن بھائیوں نے نسیم کو یہ صلہ دیا۔ سچ کہتے ہیں، غیروں سے زیادہ اپنے نقصان پہنچاتے ہیں۔ دوسرا رنگ میں سسپنس بہت پھیلایا گیا تھا۔ شاہ جی کا جدید سائنسی طریقہ علاج اچھا لگا۔ ریت کا دریا میں گگن دیپ کی موت نے متاثر کر دیا۔ کہانی کوئی خاص پسند نہیں آئی۔ باتدبیر بھی اچھی کہانی تھی۔"

ساہیوال سے اعجاز احمد کا خوش خط محبت نامہ "جاسوسی کا عرصہ دراز سے ایک خاموش قاری ہوں لیکن شرکت پہلی دفعہ کر رہا ہوں۔ محترم، بہت عرصے سے جی چاہ رہا تھا محفلِ یاراں میں سب کا حال پوچھنے آؤں، سو اس دفعہ جرأت کر لی۔ جاسوسی 7 فروری کی ایک اداس سی شام کو ملا۔ دلِ ناداں سب کچھ بھول گیا۔ سرورق پر ایک حسینہ بے نیاز ہاتھوں میں چوڑیاں، کانوں میں جھمکے جو گجرے والی سی گردن پر سج رہے تھے، آنکھوں میں امیدوں کے دیپ جلائے نیم وا ہونٹوں کے بیچ موتیوں جیسے دانتوں کی نمائش کر رہی تھی۔ ساتھ ہی ایک پُراسرار ... لبادہ اوڑھے موجود تھی اور ایک بھائی بہت پریشانی میں شاید حسینہ کو خبردار کرنے کے لیے فون کر رہا تھا۔ اشتہارات کو سرسری نظر سے دیکھتے ہوئے اپنی محفل میں پہنچے جہاں چودھری سرفراز صاحب سب صنفِ نازک کو فخر سے

دیکھ رہے تھے۔ بھئی مبارکاں۔ تبصروں میں شفیق الرحمن، محمد کبیر عباسی، لوئی فرام بہاولپور، قاری عبدالماجد کے تبصرے پسند آئے۔ قاری صاحب دعا ہے اللہ آپ کے چچا جان کو جنت میں جگہ عطا فرمائے۔ ایس زیڈ بخاری آگ کے آگے بیٹھ کر گرمی کیسے تاپتے ہیں ضرور بتائیے گا۔ ارسلان رضا فرام چکوال عورتوں کی طرح عمر بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ دلنشین بلوچ صاحبہ آپ محفل میں کن پریوں کو بلا رہی ہیں، باقی سب ساتھیوں کے تبصرے اچھے تھے۔ سب سے پہلے مغل صاحب کی للکار پڑھی۔ کہانی کی اٹھان اچھی ہے۔ ہیرو صاحب نے سیٹھ سراج کو تھپڑ مارا اور شروعات کر لیں۔ ہیرو صاحب ابھی تو کم ہمت ہیں لیکن کل کو یہی نابش صاحب رستم اور شاہ خاور کی طرح ہو جائیں گے۔ مغل صاحب نیا سلسلہ شروع کرنے پر مبارکاں۔ اس کے بعد ریت کا دریا پڑھی۔ کاشی صاحب کی اچھی کاوش ہے۔ گگن دیپ کی موت پر افسوس ہوا۔ اس کے بعد گرداب پڑھی۔ اسما قادری نے ماہ بانو سے دوبارہ ملاقات کرائی۔ ماہ بانو نے اپنا دفاع کرنا شروع کر دیا ہے۔ آفتاب نے بھی کہانی میں نیا رنگ ڈالا ہے۔ اب اس پر ایک کڑا وقت آنے والا ہے۔ آخر محبت میں یہ سب تو ہوتا ہے۔ سرورق کے دونوں رنگ پسند آئے۔ پہلا رنگ دل پر اثر چھوڑ گیا۔ آج کے دور میں واقعی رشتوں کے بارے میں اعتبار خوش گمانی ہے۔ نسیم کا اعتماد بھی ریزہ ریزہ ہو گیا۔ سلیم فاروقی صاحب مبارکاں۔ دوسرا رنگ حسام بٹ صاحب نے تحریر کیا۔ تعبیر آشنا میں شاہ جی نے زرلش کے وہم کا کامیاب علاج کیا۔ مختصر کہانیوں میں شادی بربادی میں استاد وترائے عالم کی قاری سے لطف اندوز ہوئے۔ چور کے پاؤں واقعی انسانی فطرت کبھی نہیں بدلتی۔ گورڈن نے اپنی پوتی کا بہتر دفاع کیا۔ سست و چست میں بیری شیپرڈ نے آخر قاتل کو تلاش کر لیا۔ جال میں ایک ذہین بیوی نے اپنے ہرجائی شوہر سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ ... صاحب کی کہانی شکاری دل کو بھا گئی۔ خطرناک حالات میں بھی ہمت سے کام لینا چاہیے۔ جہاں فرگوسن وغیرہ اپنے انجام سے دوچار ہوئے، وہاں امیلا اور ولیم کو بھی ایک دوسرے کی محبت کا اندازہ ہو گیا۔ مریم کے خان کی کہانی دیچھا میں ایک آدم خور سے پُراثر سبق ملا کہ ماں کا حکم ہر حال میں ماننا چاہیے۔"

ڈی جی خان سے روشنا نے صنم بلوچ کی تعریف و تنقید "آج بہت عرصے بعد اپنی ہمت اور جوش سے خط لکھنے بیٹھی ہوں۔ ٹائٹل گویا ایک جیسے شائع ہو رہے ہیں۔ ماڈل ایک ہی شکل، ایک ہی اسٹائل میں ہوتی ہے اور بیک گراؤنڈ میں حسبِ معمول دو بدصورت آدمیوں کو کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ اہلِ ٹائٹل پرو گلکس...! ہماری محفل میں اس بار سرفراز جی نے کچھ زیادہ ہی انکل پر خوشامد کی بارش کی جس کی وجہ سے ٹاپ پر رہے۔ مبارک باد۔ عصمت علی، بس آپ کے نام کی وجہ سے آپ کو لالا کی سمجھ کر آپ کا خط پڑھتی رہی، سوسویٹ... شفیق الرحمان اور کبیر عباسی صاحب آپ شاید سردی کی ٹھنڈ سے بچنے کے لیے ہماری گرما گرم محفل میں آ جاتے ہیں، اوکے نیور مائنڈ...! بابی صنف کی کمان سنبھالے ڈٹ رہی۔ اے ڈی سیال بھائی جس طرح آسٹریلوی ٹیم سے پنگا لینا اچھا نہیں اس طرح لڑکیوں سے بات کرتے وقت احتیاط کا دامن ہاتھ سے مت چھوڑیں، انڈراسٹینڈ۔ باقی میری دوستیں مس روز، روانیل وجاہت علی، آ گئے آفندی، توشی چودھری، یار! تم سب لوگ کدھر غائب ہو گئی ہو؟ کہیں تم لوگ پرواز لیس تو نہیں سدھار گئیں؟ واپس آ جاؤ نا پلیز، مزہ نہیں آ رہا تم لوگوں کے بنا۔ کم بیک پلیز...! انکل جی اس بار خط لکھنے کی دو سب سے بڑی وجہ ہیں جس کی وجہ سے میرے ہاتھ نہیں رک پائے، مجھ سے صبر نہیں ہو سکا۔ میری خوشی ریت کے دریا میں سفر کرتی رہی۔ جب تک میں نے اپنے جوش و جذبے کو للکارا نہیں۔ جی ہاں! ان دونوں کہانیوں کی تعریف کے لیے ہیرے سے بھی اور پھولوں سے بھی زیادہ خوب صورت لفظوں کی ضرورت ہے۔ ریت کے دریا میں میری سب سے بڑی خواہش تھی کہ ندیم اور گگن دیپ کا ملاپ ہو جائے۔ وہ بچھڑیں نہیں کیونکہ ... ہوتا ہے کہ سب خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں۔ کوئی کسی سے نہیں ملتا۔ ندیم کا ایجنڈا میں دیوبند گڑھ کا سفر میرے لیے کسی نئی زندگی سے کم نہیں اور اقبال کاشی جیسے نایاب آدمی کا یہ تحفہ ہمارے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے اگرچہ آج وہ ہم میں نہیں ہیں، اللہ انہیں غریقِ رحمت عطا فرمائے (آمین)۔ للکار کے آغاز سے ہی پتا چل گیا ہے کہ سفر اچھا کٹے گا۔ طاہر جاوید مغل صاحب آپ کے لیے صرف ایک ہی بات۔ Forever تسی گریٹ ہو۔ جال کا اختتام بہت اچھا تھا۔ مسز کیٹر نے اپنے شوہر سے بہت اچھا انتقام لیا اور صبر کا پھل حاصل کیا۔ شکاری میں قلمی ... تھی۔ آخر تک سسپنس رہا، واؤ گریٹ۔ کاشف زبیر بے شک بڑا نام بڑا کام۔ چور کے پاؤں کے ساتھ حاضر ہوئے۔ ویل ڈن فنٹاسٹک آپ تو بازی لے گئے۔ دیچھا میں سنیک نے بڑا آدمی ہونے کے ساتھ ساتھ اچھائی کا ثبوت دے کر دل جیت لیا۔"

لیہ سے آمنہ پٹھانی کی مصروفیت "جاذبِ نظر فروری کا خوب صورت شمارہ بروقت ملنے سے انتہائی مسرت ہوئی۔ چودھری محمد سرفراز، آخر آپ نے طویل انتظار کے بعد میدان مار ہی لیا۔ ویسے آپ کا تبصرہ تھا بھی بہت جامع اور پسند آیا۔ مبارک باد۔ شفیق الرحمن اگر اتفاق سے ایم اے صدیقی کا تعلق ہمارے شہر سے نکل ہی آیا تو آپ کیوں جیلس ہو رہے ہیں...؟ ویسے شفیق بھائی، واقعی آپ کے ننھیال ... رہے ہیں۔ کبیر عباسی...! شہزادے شکوے شکایات نہیں کیا کرتے، بس حکم چلایا کرتے ہیں۔ انعام علی محمد لوئی اے بہاولپور! آپ نے ہمیں یاد کیا اور ہم آ گئے۔ قاری عبدالماجد آپ کے عم محترم کے انتقال پُرملال پر دلی افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوارِ رحمت میں رکھے، آمین۔ سائرہ مسعود جی! آپ نے فرمانِ قائد کی غلط تشریح کی ہے۔ فرمانِ قائد میں اظہارِ قومیت سے منع نہیں کیا گیا تھا، فخرِ قومیت سے روکا گیا ہے اور یہی اسلام کی بھی تعلیم ہے۔ محمد عزیز اسد چکوال اور ایس زیڈ بخاری...! دل کی اتھاہ گہرائیوں سے خوش آمدید۔ دیگر تبصروں میں عبدالسلام صدیقی، ہمایوں سعید رومیو اور میر اے ڈی سیال کے تبصرے بہت پسند آئے۔ اور دوستو! تعلیمی شیڈول انتہائی ٹف ہو چکا ہے لہٰذا کہانیوں پر تبصرہ نہیں کر سکوں گی۔"

محی الدین اشفاق کی تجاویز لیہ سے "انکل، میں تقریباً 9 سال سے جاسوسی اور سسپنس کا قاری ہوں۔ اس سے پہلے میرے بڑے بھائی 14 سالوں سے اور والد صاحب 35-30 سال سے پڑھ رہے ہیں، اسی لیے ادارہ جاسوسی کے ساتھ ہماری وابستگی بہت گہری ہے۔ لیکن اب میں نے خط لکھنے کا ارادہ کیا ہے اور اس خط میں صرف للکار کے بارے میں بات کروں گا۔ کہانی کا آغاز تو طاہر انکل کے مخصوص اسٹائل سے ہٹ کر ہے اس لیے اچھی لگی ہے۔ میری آپ سے چند فرمائشیں اور چند مشورے ہیں: آپ مجید سودی، محمود احمد مودی، ایچ اقبال اور غلام قادر ان سب کی واپسی لازمی بنائیں۔ مودی انکل سے کوئی قسط وار کہانی لکھوا لیں۔ میرے خیال میں احمد اقبال کی اناڑی اور کاشف زبیر کی سراب کو جاسوسی میں ہونا چاہیے، اس وقت کاشف زبیر صاحب سب سے اچھا لکھ رہے ہیں۔ تین رنگوں کا سلسلہ پھر سے شروع کریں۔ اقبال کاشی (مرحوم) کی کہانی بہت اچھی لگی۔ ان کی مزید کہانیاں ہوں تو شائع کر دیں۔ جاسوسی، سسپنس، سرگزشت سب ملک کے بہترین ڈائجسٹ ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ تمام ڈائجسٹ ایسے ہی چلتے رہیں گے، ان شاء اللہ۔"

غلام حسین نوناری اور اللہ دتہ نوناری کی توصیف چوک سرور شہید سے "ہم جاسوسی ڈائجسٹ میں پہلی بار خط لکھ رہے ہیں۔ حسبِ توقع جاسوسی کی

آمد 5 فروری کو ہوئی۔ ٹائٹل جاسوسیت سے عاری تھا۔ اشتہارات نظرانداز کرتے ہوئے نکتہ چینی میں جا گھسے۔ وشک پوائنٹ کو مضبوطی سے تھامے، ہاتھ میں ڈنڈا اٹھائے مصنف نازک کو للکارتے ہوئے چودھری محمد سرفراز خاصے پُرجوش نظر آرہے تھے۔ تبصرہ اچھا تھا، پسند آیا۔ عصمت علی نے کش لگاتے ہوئے اپنے مختصر تبصرے کو دھواں دار بنانے کی ناکام کوشش کی مگر ناکام رہے۔ عتیق الرحمٰن، محمد کبیر عباسی، ارسلان رضا اور عمیر اے ڈی سیال نے دلچسپ و بہترین خیالات کا اظہار کیا۔ طاہر جاوید مغل اس بار للکار کے ہمراہ جاسوسی کے صفحات کو چمکاتے ہوئے تھے۔ ہمیں تو عمران کا کردار بے حد پسند آیا۔ گرداب خوب رہی۔ ریت کا دریا کا اختتام اداس کر گیا۔ رنگوں میں پہلا رنگ، سلیم فاروقی کو نمبر لے گیا۔ حمامہ بٹ کی تحریر تعبیر آشنا کچھ خاص تاثر نہ چھوڑ سکی۔ مغرب سے درآمد شدہ تحریروں میں شکاری سب پر نمبر لے گئی۔ چیچا بھی ایک عمدہ تحریر تھی۔ منظر امام اس بار استادوں والے عالم کو لائے جنہوں نے فارسی بول بول کر ہمارا دماغ خراب کر دیا۔ ہاتھ دیر ایک مزاحیہ تحریر تھی جس نے ہمارے ہونٹوں پر تبسم بکھیر دیا۔ باقی شمارہ بھی دلچسپ رہا۔"

ہمایوں سعید رومیو کاہنوں سے تبصرہ "خلافِ معمول پہلے ہی چکر میں جاسوسی کے درشن ہو گئے۔ سرورق پر پہلی نظر پڑتے ہی روح تک سرشار ہو گئی اور کیوں نہ ہو بھلا۔ ہمارے ویری ویری ویری موسٹ فیورٹ رائٹر طاہر جاوید مغل کی آمد کی نوید جو مل گئی۔ اس سرشاری کے عالم میں ملکۂ جاسوسی سے نگاہیں ملائیں جو قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی بے حد تفاخر اور مغرور انداز میں اپنا سائیڈ پوز دیکھ رہی تھی۔ ساتھ کھڑا ہیرو تھا ویٹر یا ویٹر نما ہیرو کسی دوست کو مغل صاحب کی نئی کہانی چھپنے کی خوش خبری دے رہا ہے۔ ہماری چادر اوڑھے صاحب کی پُراسرار آنکھوں سے شعلے نکلتے ہوئے محسوس ہوئے جن سے بچنے کے لیے ہم نے فہرست کی جانب دوڑ لگائی۔ فہرست میں تیزی سے نظریں دوڑائیں اور خود کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے جاسوسی کے اسپیکر ہال میں گھس گئے۔ چند لمبی سانسیں لینے کے بعد جب حواس بحال ہوئے تو چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ سب سے اونچی کرسی پر براجمان جناب چودھری صاحب سپاٹ نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ شاید انہیں میرا اس طرح اچانک داخل ہونا گوارا نہ تھا۔ سرفراز بھائی آمیں، تو تو تبصرہ شبیر کے ایک ایک جملے میں چٹکی نظر آئی اور آپ کو... شہزادہ کو مبارک ہو آپ جیسے کھانگ کھلاڑی کی شاگردی میں رہوں گا تو یہ بھولا پن جاتا رہے گا۔ خلافِ معمول مغل صاحب کی للکار سے آغاز کیا۔ مغل صاحب کے لیے کیا کہوں۔ ان کا ایک ایک جملہ دل کو لگتا ہے۔ اس بار مغل جی کا ہیرو، تم اور خاور کے برعکس کمزور اعصاب کا مالک ہے جو فی الحال دلی جذبات کو عملی جامہ پہنانے سے قاصر نظر آرہا ہے۔ للکار کو ختم کرکے ہم گرداب کی طرف بڑھ رہے تھے کہ شادی بربادی نے ہمارا راستہ روکا مگر پرانا موضوع ہونے کی وجہ سے کچھ خاص پسند نہ آئی۔ اس کے بعد سیدھے گرداب میں پہنچے جہاں ماہ بانو کے ملنے کی موہوم سی امید تھی۔ حسبِ توقع ماہ بانو کے آنے سے کہانی میں بے حد تیزی آئی۔ الجھی ڈوریں سلجھنے لگیں۔ اسما جی بہت خوبصورتی سے کہانی اور کرداروں کو واضح کرتی جا رہی ہیں۔ رنگوں میں پہلے درواز پڑھی۔ بے حد خوبصورت تحریر۔ فاروقی صاحب کے مخصوص اسٹائل سے ہٹ کر اور واقعی پُرتاثر تحریر تھی۔ تعبیر آشنا کچھ عجیب سی لگی۔ کوئی خاص تاثر قائم کرنے میں ناکام رہی۔ بے حد سسپنس لیے شکاری بھی اچھی لگی۔ حیرت ہوئی کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو محض اپنی اذیت پسند طبیعت کی آسودگی کے لیے کسی کی جان لے سکتے ہیں۔ ہاتھ دیر اور چور کے پاؤں بھی منفرد اور اچھوتے موضوعات ہونے کی وجہ سے پسند آئی۔ گوران نے جس خوبصورتی سے لی روز کی آنکھوں سے یوکان کی محبت کی پٹی اتاری وہ واقعی لائقِ تحسین ہے۔ ہاتھ دیر پڑھنے کے دو گھنٹے بعد کہانی کا مقصد اور مقاز کی چالاکی سمجھ آئی اور اب تک ہنستے رہتے ہیں۔"

محمد سرفراز کا انداز بیاں جتوئی سے "اس ماہ بک اسٹال کی غلطی کی وجہ سے دو چکر لگانے پڑے۔ ایک مرتبہ ڈائجسٹ لینے اور دوسری مرتبہ تبدیل کرانے۔ سرورق پر موجود نازنین ہمیں کسی شاعر کی ایسی غزل لگی جس کی اگر تشریح کی جائے تو تشریح کرنے والا مشمول شاعر حدود آرڈیننس کے تحت اندر ہو جائے۔ اتنا خطرناک کام کرنے سے بہتر ہے کہ اپنی مصنف کے خوفناک پنجوں سے دل کو بہلایا بلکہ چلایا جائے۔ آوا بھی تو دیکر انکل کو اپنی مصنف پر بھی رحم آنے لگا۔ نکتہ چینی میں اول اول اپنا نام دیکھ کر جسم کے رونگٹے رونگٹے سے خوشی پھوٹ پڑی اور موڈ ایک دم ٹپ ٹاپ ہو گیا۔ عمیر اے ڈی سیال، چٹکلوں کے نہ تو سرخ ہونٹ ہوتے ہیں نہ گال گلابی اور نہ ہی گھنیری زلفیں۔ سیال صاحب ابھی بھی عمر گزر رہی ہے اس دشت کی سیاحی میں مگر ایسی تشبیہات اور استعارے نظر سے نہیں گزرے۔ ہمایوں سعید خواتین کی عزت کرنا اچھی بات ہے مگر ایسے نہیں جیسے تم کر رہے ہو۔ دلنشین بلوچ صاحبہ ریٹائرمنٹ کا تعلق عمر کے ساتھ عقل سے بھی ہے۔ اب عمر کا تو پتا نہیں، البتہ عقل کا اندازہ آپ کے تبصرہ جات سے بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ ڈی ایس کے اسماعیل کے حوالے سے رضوان تنولی اور ایم احمد ہاشمی کے خیالات سے میں تو کیا تمام اہلیانِ محفل متفق ہیں مگر اپنے اسماعیل صاحب ہیں کہ کچھ سمجھتے نہیں یا سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔ عصمت علی نے کش لگا لگا کر تبصرہ تحریر کیا۔ اچھی بات ہے، کش لگانے سے آدمی بوڑھا نہیں ہوتا۔ جوانی میں ہی گزر جاتا ہے۔ مغل صاحب کی نئی سلسلے وار کہانی للکار کی پہلی قسط میں نا پک وہی محبت تھا مگر موصوف ہیرو تابش میں نہ تو دیوی کے رستم سیال جیسا دم خم اور نہ ہی پرواز کے خاور جیسی گرج چمک اور جنون تھا۔ خیر ابھی تو ابتدائے عشق ہے۔ جیسے ہی عشق کی بھٹی میں جل کر سونے سے کندن بننے کا عمل شروع ہوگا، یہ خصوصیات بھی آ جائیں گی۔ اقبال کاظمی صاحب کی ریت کا دریا بھی اپنے منطقی انجام کو جا پہنچی۔ دولت کے حوالے سے ہنٹن دیپ کا رویہ غیر فطری سا تھا۔ اختتام پر اس کی موت اور وصیت نے افسردہ کر دیا۔ گرداب بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ ماہ بانو اور شہریار کا ہلکا پھلکا رومانس چلس ماسٹر آفتاب اور کشور کا طلسمات اور اہم ہوتا راز، کہانی کو ایک خاص رخ کی جانب لے جا رہا ہے۔ دیکھتے ہیں فتح کس کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ سرورق کا پہلا رنگ درواز میں سلیم فاروقی صاحب نے جس انداز میں خونی رشتوں کی ناپائیداری کو بیان کرنے کی کوشش کی، اس سے میں متفق نہیں ہوں۔ رائٹر نے ایک طرف کے پوائنٹ آف ویو کو بیان کیا ہے جو کسی بھی لحاظ سے درست نہیں۔ دوسرا رنگ تعبیر آشنا میں رائٹر نے نفسیاتی الجھن سلجھاتے ہوئے خود ہمیں بھی الجھا کر رکھ دیا۔ شادی بربادی میں استادوں والے عالم کی گاڑھی فارسی سمجھنے میں خاصا ٹائم لگا۔ کاشف زبیر صاحب کی چور کے پاؤں میں یوکان کے طرزِ عمل سے سمجھ میں آیا کہ چور کے پاؤں کیوں نہیں ہوتے۔ سست و چست میں سراغ رساں بیری سست ہونے کے باوجود چست پیچ پر سبقت لے گیا اور ڈاکٹر ریان کے حصے میں ناکامی آئی۔ تنویر ریاض نے جال کو بڑے ہی سلجھے ہوئے انداز میں تحریر کیا۔ ثمر عباس کی شکاری جاسوسی اور تھرل سے بھرپور عمدہ تحریر تھی۔ ہاتھ دیر نے بھی خاصا محظوظ کیا۔ مریم کے خان کی چیچا میں سسپنس کچھ زیادہ ہی تھا۔"

محمد آئی بھکر سے عامر خان کی امید و امکان "کوئی دو سال پہلے ہم نے دو مرتبہ اپنی تمام تر قلمانہ صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے اپنی محفل نکتہ

نکتہ چینی میں شرکت کی کوشش کی تھی لیکن دونوں بار ہی اپنا خط شاملِ اشاعت نہ پا کر پورے دو سال تک ہمت نہ ہو سکی۔ آج پھر ایک نئی امید دل میں جگائے محفل نکتہ چینی میں شامل ہونے کی جسارت کر رہا ہوں۔ اس دفعہ سرورق پر کافی محنت کی گئی ہے اور واقعی جاسوسانہ لگ رہا ہے۔ سرورق کی حسینہ تو اتنی حسین ہے کہ اب تک میں اس کی آنکھوں میں غوطے کھا رہا ہوں اور اپنے خط کی اشاعت تک نہ نکلنے کے موڈ میں ہوں۔ اس ماہ کے جاسوسی کی خاص ترین بات محبوب مصنف طاہر جاوید کی للکار کی شمولیت ہے جو انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں لکھ کے ہمارا دل موہ لیا ہے۔ اس خط میں تفصیلی تبصرہ تحریر نہیں کر رہا کیونکہ کیا پتا آپ میری محنت کے ساتھ کیا سلوک کریں۔ تفصیلی تبصرے کے ساتھ پھر حاضر ہوں گا بشرطِ اشاعت یہ تبصرہ..."

گاؤں یار محمد ہوت سے محمد رمضان ہوت کا اختصاریہ "اس دفعہ فروری کا شمارہ دو فروری کو ملا۔ جاسوسی کے اس شمارے کی سب سے خاص بات طاہر جاوید کی للکار کی شمولیت تھی، کہانی زبردست تھی۔ اب اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ سرورق کے رنگوں میں پہلا رنگ بڑا زبردست لگا۔ انکل سلیم فاروقی کے قلم میں پتا نہیں کیا جادو ہے جو پڑھتے وقت کہانی پوری کیے بغیر چھوڑنے کو دل نہیں کرتا۔"

اوکاڑہ سے تصویر انجم کا باتصویر تبصرہ "جاسوسی میں نے تقریباً سات آٹھ سال پہلے پڑھنا شروع کیا۔ اسما قادری کی گرداب اس وقت کی سب سے اچھی کہانی ہے، پورا مہینا انگلیوں پر گن گن کر گزر رہے۔ جب مداری، موت کے سوداگر، سرکش اور شکاری جیسی کہانیاں شائع ہوتی تھیں تو جاسوسی کی تو بات ہی نرالی تھی۔ اب بھی جاسوسی زبردست ہے مگر پھر بھی کہیں ایک کمی سی محسوس ہو رہی ہے، نہ جانے کیوں۔ ٹائٹل بہت پیارا تھا۔ دوشیزہ چوڑیوں سے بھرا ہاتھ اپنے بالوں میں پھیرتے ہوئے ایک ادا سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک شخص ٹیلی فون کان سے لگائے نہ جانے دنیا جہاں کی کون کون سی گپیں لگا رہا تھا۔ دوسرا شخص شال اوڑھے اپنی ڈراؤنی آنکھوں سے یقیناً ٹائٹل کا حسن خراب کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی ڈراؤنی آنکھوں کو دیکھتے ہی ہم نے صفحات پلٹے اور سیدھے نکتہ چینی کی محفل میں آ گئے۔ چودھری محمد سرفراز آپ نے بہت جامع اور تفصیلی تبصرہ کیا، پڑھ کر اچھا لگا۔ عصمت علی، آپ کش بہت لگاتے رہے، یہ بھی بتا دیجیے کہ یہ کش کس چیز کے تھے، سگریٹ کے یا سگریٹ کے؟ عتیق الرحمان اپنے تبصرے میں تمام افراد کی ٹانگ کھینچتے نظر آئے۔ محمد کبیر عباسی قافیہ سے قافیہ ملانے کی بہت عادت لگی ہے آپ کی اور عابد جان کے بارے میں آپ کا جملہ تبصرے کی جان تھا، اب شاید عابد جان بھی اپنے نام کے ساتھ خان لگانا شروع کر دیں۔ رضوان کریڑوی رونی جیسی بیوی پانے کی دعا کرنے کے بجائے خدا سے ہدایت ہی مانگ لی ہوتی۔ اُف خدایا! آپ کا نام لیتے ہی زبان ہی تو ڈسموڑ گئی۔ عبدالسلام صدیقی بن عبداللہ آپ اتنی بار کہہ چکی ہے نہ مطالعہ کیا کریں اور تنقید کرتے وقت ہاتھ ذرا ہولا ہی رکھا کریں۔ اتنا تو شاید رائٹر بھی اپنی کہانیوں پر غور نہیں کرتے ہوں گے۔ قاری عبدالماجد آپ کے چچا کی ڈیتھ کا سن کر افسوس ہوا، خدا آپ کو اور آپ کے تمام خاندان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو جنت الفردوس میں بلند درجات عطا فرمائے۔ انیس زبیدہ بخاری نکتہ چینی میں آپ کی آمد اچھی لگی۔ آئندہ بھی اپنے تبصرے لے کر محفل میں ضرور شرکت کیجیے گا۔ انکل طاہر کی للکار کی پہلی قسط بہت اچھی تھی لیکن انکل آپ اپنی ہیروئن کی دو دفعہ شادی کیوں کرواتے ہیں۔ اب اس میں بھی۔ اسما قادری کی گرداب پر تبصرہ تو سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ ان کی کیا تعریف کروں۔ شادی بربادی میں تو منظر امام نے استاد کی فارسی سنا سنا کر اکتا ہی دیا بلکہ بیک میں ہی پڑھ گئے۔ دوسرا رنگ حمامہ بٹ کی بہت اچھی تحریر تھی جس میں انہوں نے زر لِش کے نفسیاتی مسئلے کا اچھا حل نکالا۔ سلیم فاروقی کا پہلا رنگ درواز اپنوں کے ہاتھوں ستائے گئے ایک دکھی انسان کی کہانی تھی۔ جب اپنا خون ہی سفید ہو جائے تو انسان دوسروں سے کیا شکوہ و شکایت کرے۔"

قیصر عباس ٹانوری کی تحریریں جھنگ سے "اس مرتبہ بھی جاسوسی مل ہی گیا۔ سرورق کی حسینہ تو دوپٹے سے بے نیاز دکھائی دی جبکہ پیچھے موجود شرابی ٹائپ غنڈے نے پورا آستین پیٹ رکھا تھا۔ کیا کہا جائے... خیر! اپنی محفل یعنی نکتہ چینی میں پہنچے، انکل جی تو نئی تعمیر ست و حیثیت کا مظاہرہ کرتے نظر آئے۔ مان آف دی لسٹ قرار پانے پر چودھری محمد سرفراز، مبارک ہو بھئی۔ ویسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ آپ محض ذہن کو دیوانش کرنے کے لیے بلیک لسٹ میں جانے کے لیے تیار ہیں۔ محمد کبیر عباسی عرف شہزادہ صاحب! کیا واقعی آپ کو صرف ٹانگیں کھینچنے میں مزہ آتا ہے؟ رضوان تنولی! آخر آپ نے مان ہی لیا کہ آپ کو مرغ کڑاہی پسند ہیں۔ تنولی! اے تبصرہ مکمل کیا کرو۔ ہمایوں سعید رومیو، عتیق الرحمٰن، عبدالسلام صدیقی اور ایم احمد ہاشمی کے نامے پسند آئے۔ چودھری مسٹر زاور محمد عزیز اسد جیسے نئے آنے والے دوستوں کو خوش آمدید۔ طاہر جاوید مغل کی للکار ایک ولولہ انگیز اور دلچسپ تحریر ہے جس میں تابش اور عمران کے کردار دلچسپ ہیں۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ ریت کا دریا بھی اختتام پذیر ہوئی۔ دنیا کی امیر ترین عورت نے گمنامی کی زندگی گزاری اور اپنی دولت غریبوں کے لیے وقف کر دی۔ گرداب کا ہر موڑ سسپنس لیے ہوتا ہے۔ کشور اور آفتاب کی محبت بھی گل کھلا رہی ہے۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ سرورق کے رنگوں میں پہلا رنگ درواز ایک بدنصیب شخص کی زندگی کا احوال تھا۔ بے چارے نعیم نے اپنے بہن بھائیوں کے مستقبل کے لیے اپنی محبت بھی قربان کر دی مگر اسے اس کا اجر بدتمیزی کے سوا کچھ نہ ملا۔ دوسرا رنگ تعبیر آشنا عجیب سا رنگ تھا جس میں بے جا سسپنس پیدا کیا گیا۔ شکاری میں دو جوڑے سیاحت کے لیے جاتے ہیں، راستے میں کچھ شیطان فطرت لوگوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ جیکب اور کارل مارے جاتے ہیں جبکہ ولیم اور امیلیا بقا کی جنگ لڑتے ہیں اور شیطانوں کو انجام تک پہنچاتے ہیں۔ ثمر عباس کی زبردست اور تیز رفتار تحریر تھی۔ منظر امام کی شادی بربادی بھی دلچسپ تحریر تھی۔ کاشف زبیر کی چور کے پاؤں میں گورڈن اسمتھ نے اپنی لوالٹی روز کو یوکان ڈفس جیسے بدمعاش سے بڑی معاملہ فہمی اور فراست سے بچایا۔ ہاتھ دیر میں بینک منیجر امتیاز علی نے عقل کے استعمال سے ڈاکوؤں کو انجام تک پہنچایا۔ مریم کے خان کی چیچا میں آدم خور انسانوں کے انجام پر سنسنی خیز اور پُراسرار تحریر لکھی گئی۔ الغرض، فروری کا جاسوسی ہر لحاظ سے دلچسپ اور بہترین تھا۔"

عبدالغفور خان خٹک کی عنایت ضلع اٹک سے "میں جاسوسی ڈائجسٹ میں پہلی بار شرکت کر رہا ہوں۔ سرورق کی تصویر اچھی ہے۔ کہانیوں میں طاہر جاوید مغل کی کہانی للکار پڑھی، کہانی اچھی ہے لیکن ابھی آغاز کیا ہے۔ شادی بربادی ایک طنز و مزاح سے بھرپور کہانی تھی۔ مریم کے خان کی تحریر چیچا ایک ایسے آدم خور گروہ کے بارے میں ہے کہ جو اپنے ہی لوگوں کو ایک خاص وقت کے بعد کھا لیتے ہیں اور جس میں ایک مظلوم ماں بھی ہے جس کی بچی کو بھی کھا لیتے ہیں لیکن وہ اپنے بیٹے کو ان تمام کو ختم کرنے کی ترغیب دیتی ہے اور وہ اس مشن کی تکمیل کرتا ہے۔ سلیم فاروقی کی کہانی اچھی ہے، اس میں ایک بھائی نے اپنے والد کی وفات کے بعد اپنی خوشیاں اپنے بہن بھائیوں پر نچھاور کر دی تھی کہ اپنی محبت بھی لیکن اس کو اس کا صلہ بڑا عجیب ملا اور ایک خاص بات درواز میں صفحہ نمبر 237 میں ایک فقرہ میں نے ابھی تک کپڑے نہیں بدلے تھے وہ ہے کہ میں نے ابھی تک کپڑے نہیں بدلے۔ ہمارا مقصد کہانی پڑھنا بھی ہے کہ کوئی غلطی

ہوتو اُس کی نشاندہی کریں۔ (آپ نے نشاندہی کردی ہے جس کا بے حد شکریہ) حسام بٹ کی تحریر تعبیر آشنا کی کہانی درتش، فیصل اور جن کے گرد گھومتی ہے جس میں زیادہ کردار جن اور درتش کے درمیان باتیں کرنے کا ہے۔ واقعہ ایک اچھی چٹکلی طرح سے بھرپور کہانی تھی، کچھ مزہ آیا۔ اقبال کاظمی کی تحریر ریت کا دریا ایک اچھی اور خوبصورت کہانی تھی۔ سب کہانیوں میں ریت کا دریا نمبر ایک، درواز نمبر دو، گرداب نمبر تین، انکار نمبر چار رہی ہیں۔ چٹکی بحکتہ چینی میں نظر ڈالی تو دھماچوکڑی تھی۔ اس ماہ نکتہ چینی میں، اکیس دوستوں کو شامل کیا گیا تھا، آٹھ کو بلیک لسٹ میں شامل کیا گیا تھا۔“

انجینئر انجلی کا وارڈ سے ہوا تبصرہ فورٹ عباس سے ”سب سے پہلے محفل کے تمام دوستوں کو پیار بھرا اسلام ہو۔ میں آپ لوگوں سے بھی امید کرتی ہوں کہ آپ بھی مجھے ضرور اپنے دوستوں میں شامل کریں گے اور کھلے دل سے خوش آمدید کہیں گے۔ جاسوسی کو حاصل کرنے کے لیے بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ مل تو جاتا ہے لیکن گھر میں غائب ہوجاتا ہے۔ جب مل جاتا ہے تو بہت خوشی ہوتی ہوں۔ جاسوسی ہاتھ میں ہوتو سب سے پہلے کہانیوں کی لسٹ کے گرد چکر لگا کے چٹکی بحکتہ چینی پر منہ میٹھا کرنے کی غرض سے جاتے ہیں لیکن اوپر سے میٹھا اندر سے کڑوا ہوتا ہے لیکن حیرت ہے اس بار تو کمال ہو گیا، واقعی آخری بات غور طلب تھی ان کی غلطیں دیکھیں فیشن اپنا ہے۔۔ محفلوں میں ارسلان رضا کا خط قابل تعریف تھا۔ سرورق کے رنگ ہمیشہ بہت اچھے ہوتے ہیں، درواز کافی سنسنی خیز تھی۔ دوسرا رنگ حسام بٹ کا اچھا تھا۔ لگتا ہے آپ نے کوئی جن دیکھا تھا خواب میں۔ اسما جی نے گرداب میں پھر سے جان ڈال دی، اچھی لگی۔ ارسلان رضا کو مبارک باد دینا بھول گئی۔ بہت بہت مبارک ہو، انیسویں سالگرہ۔ نوٹی اے کو مشورہ ہے کہ رات کو سونے سے پہلے آیت الکرسی پڑھ کر سویا کریں۔ راؤ ظفر اقبال کی مختصر مگر اچھی بات تھی۔ آخر میں سارہ مسعودی اچھی تحریر اور صنف سخت کو کڑوا جواب، کافی بہادر ہیں آپ۔ ثمر عباس کی شکاری بہت ہی متاثر کن تحریر تھی۔ جاسوسی کے مزاج سے ہم آہنگ دلچسپ اور سنسنی خیز تھی۔“

صادق آباد سے عطاء اللہ اعوان کی شکایت ”سب سے پہلے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ معراج رسول صاحب کو شفائے کاملہ عطا فرمائے آمین اور شکریہ کہ جاسوسی ڈائجسٹ آہستہ آہستہ لیٹ ہونا شروع ہو گیا ہے۔ اب فروری کا پرچہ سات تاریخ کو ملا۔ (یہ ادارے کا نہیں، ریلوے اور محکمہ ڈاک کا قصور ہے۔ الحمدللہ ادارے کے چاروں پرچے ہر ماہ وقت پر شائع ہوتے ہیں)۔ طاہر جاوید مغل صاحب کافی تھک گئے ہیں اگرچہ انہوں نے دیوی کو رن وائنڈ کیا تھا اور ٹیمپو بھی تیز رکھا تھا، اب دیکھیں انکار سے کہاں کہاں دہشت پھیلتی ہے۔ کہانی کے درمیان میں تو کچھ ایسا بھی محسوس ہوا کہ روداس، دلیپ کمار والا، شاہ رخ والا تھیں، آ گیا ہے۔ اچھی امید کی جا سکتی ہے۔ اسما قادری بھی ٹھیک جا رہی ہیں۔ باقی پرچہ بھی مجموعی طور پر اچھا ہے۔ بس کبھی کبھار بے سروپا جن ٹائپ کہانیاں، حسام بٹ صاحب، امجد بیگ کے نام سے منسلک رہیں تو بہتر ہے۔ لگتا ہے کچھ رطب اللسان قسم کے لوگ مستقل خط لکھتے رہتے ہیں اور جگہ بھی پاتے ہیں۔“ (ان لوگوں میں آپ بھی شامل ہو سکتے ہیں)۔

محفل مہربان عابد جان چارسدہ سے رقم طراز ہیں ”ہلکی ہلکی بارش برس رہی ہو، گرما گرم چائے کی پیالی ہو اور ہاتھ میں جاسوسی ڈائجسٹ ہو تو بندہ اور کیا چاہے۔ مس سرورق پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ نما تھیں۔ بجلیاں تو ویسے بھی گرا رہی تھیں، چلو اک اور سہی۔ سوا پنے گھائل دل کے ساتھ وارد ہوئے، اپنی محفل زعفران زار میں۔ جتوئی صاحب ویلڈن، تبصرہ بہت ہی شاندار تھا۔ عتیق الرحمٰن عرف شیرو کے بارے میں آپ کے خیالات ہیں؟ یہاں کتاب ”پان“ لگاتے کے بارے میں آپ لوگوں کا اپنے نام کے ساتھ ”بیان“ لگانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ انجینئر بلوچ کی غیر موجودگی میں محفل بلیک اینڈ وائٹ نہیں بلکہ وہائٹ ہی وہائٹ لگ رہی تھی۔ ویسے لگتا ہے کہ محفل سے صنف نازک قسم کا بوریا بستر گول ہونے والا ہے۔ عبدالسلام صدیقی! تنقید کے بارے میں آپ کے زریں خیالات جان کر کافی خوشی ہوئی۔ ایڈ و ٹیکم ثوالیس زلیخا بخاری! آ گئے ہیں ریت کے دریا کی طرف۔ کاظمی صاحب نے حالات کو اس طرح کنٹرول کر لیا کہ دل اش اش کر اٹھا ورنہ یہاں تو ہاتھ الجھے ہوئے ریشم میں پھنسا بیٹھے ہیں، والی صورت حال تھی۔ ندیم نے ہیرو کا کردار ادا کیا جبکہ سلطان زیدی مغلیہ دور کے بادشاہ کے روپ میں نظر آئے۔ سلطنت کو بھی بچالیا اور رعایا کو بھی۔ اگر مگن دیپ واپس آ جاتی تو مزہ آ تا۔ رنگوں کی دنیا اس بار کافی شوخ تھی۔ خوبی نے بھائیوں کے لیے اپنی جوانی کے قیمتی دن قربان کر دیے لیکن بدلے میں دونوں نے پیٹھ میں چھرا گھونپا۔ تعبیر آشنا کا پلاٹ بھی بہت زبردست تھا۔ چھوٹی کہانیوں میں سب سے بہترین کہانی شکاری تھی۔ وسیم اور اسما طویل خون ریزی کے بعد تجدید کی ڈوری میں بندھ گئے۔ البتہ جیب اور کارئی بے چارے مفت میں مارے گئے۔ چور کے پاؤں میں یوکان نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ورنہ دولت کے ساتھ ساتھ اسے نئی دو رو بھی ملنے والی تھی۔ پچھتاوے میں وہی خون آشام والی کہانی دہرائی گئی تھی لیکن ذرا مختلف انداز میں۔ باقی کہانیاں بھی دلچسپ تھیں۔“

اے اے انیس کیانی کی خصوصیت فتح جنگ اٹک سے ”اگرچہ ہم پہلی مرتبہ چٹکی کم تنگ زیادہ کی محفل میں اپنے نام کا بتا لگانے کی کوشش کر رہے ہیں مگر امید واثق ہے کہ ہمیشہ کے رواج کو برقرار رکھتے ہوئے جاسوسی ایک نئے مہمان کو خوش آمدید کہے گا۔ (یقیناً خوش آمدید)۔ جاسوسی ہمیشہ روٹھی ہوئی حسینہ کی طرح بہت تنگ کرنے کے بعد رخ روشن کا دیدار کراتا ہے مگر اس ماہ خلاف توقع بک اسٹال کے دوسرے چکر پر ہی تین فروری کو ہم نے اس جان سے پیارے مگر تھوڑے سے کرارے کے رخ روشن کا دیدار کیا چونکہ پہلا تبصرہ ہے اس لیے ہم سرورق پر تبصرہ کرنے کو گراں سمجھتے ہیں اور چٹکی دان میں ہم نے حاضری نہیں ہوئی کیونکہ کزن کی شادی کی وجہ سے ہم نے مورخہ 4 فروری کی رات کو جاسوسی کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور روپے چٹکی ملتی ہی نہیں اور اگر ملے بھی تو سو روپے بکواس۔ لے چٹکی دان میں کیا ہوگا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف اور سچ پوچھیں تو ہم بھی انکل مغل کی نئی اسٹوری انکار کی وجہ سے خط لکھنے پر مجبور ہوئے اور ہمیں دو چیزوں پر گلہ ہے۔ ایک تو انکل غریب سا ہیرو ڈھونڈ کر اسے ڈاکو بنا دیتے ہیں اور دوسرا یہ کہ ہمیں اس اسٹوری میں ہیروئن کا نام بالکل پسند نہیں آیا۔ کوئی ماڈرن سا نام ہونا چاہیے تھا۔ اس کے بعد منظر امام کی شادی بربادی میں سوائے عربی مکس اردو کے کچھ خاص نہ تھا۔ کاشف زبیر کی چور کے پاؤں اچھی کاوش تھی۔ سست و چست میں بیری نے بہت سستے سے بہت چست کیس حل کر دیا۔ واقعی اچھی کہانی تھی۔ ریت کا دریا شروع سے آخر تک بور رہی۔ چلو اینڈ تو ہوا۔ جان بھی کچھ زیادہ اچھی نہ لگی۔ ہاں شکاری اچھی لگی۔ گرداب پر مصنفہ کی گرفت مضبوط ہے اور وہ اسٹوری کو بہت تسلسل سے لے کر چل رہی ہیں۔“

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے مکتوبات شامل محفل نہ ہو سکے۔

یاسمین بلوچ، ٹیکسلا۔ ایم اے صدیقی، راولپنڈی۔ عتیق الرحمٰن، مری۔ ملک عطاء الرحمٰن، صوابی۔ شان احمد گنگلوری، محمد پور دیوان۔ عبدالسلام صدیقی بن عبداللہ، ملتان۔

گھر بیٹھے چھ ماہ کے شارٹ ٹرم کورسز

بذریعہ خط و کتابت (عمر اور تعلیم کی کوئی قید نہیں)

انگلش لینگویج	بیوٹی پارلر اینڈ ہیلتھ	ڈرافٹس مین سول	فوٹو گرافی	فرسٹ ایڈ میڈیکل	جرنلزم	الیکٹریشن	لائبریرین
ریڈیو ٹی وی ٹیکنیشن	نیوز رپورٹنگ	پبلک ریلیشن آفیسر	ڈرافٹس مین مکینیکل	سکول ٹیچنگ معلم	لیڈی ٹیلرنگ	یوگا	
موبائل ریپیرنگ	ڈرائیونگ سٹر	انٹیریئر ڈیزائننگ اقائن آرٹس	بوتیک اینڈ فیشن ڈیزائننگ	امپورٹ ایکسپورٹ	طب نبوی		
ریفریجریشن اینڈ ایئر کنڈیشننگ	کمپیوٹر ہارڈ ویئر	فزیو تھراپی	آٹو کیڈ	کوکنگ اینڈ بیکنگ	موٹر سائیکل ٹیکنیشن		
انٹرنیٹ / ویب سائٹ اپریشن	کمپیوٹر کورس	پلمبر	کارپینٹر	ہومیو ڈاکٹر	ہوم اکنامکس	مارکیٹنگ	پولٹری فارمنگ	چائلڈ ران کیئر
میجک کرنا سیکھیے	عربی بول چال سیکھیے	سائنس اور زراعت	پو ائنٹر انجینئرنگ	فنز	باغبانی (پھل اور سبزیاں)	ہائی جین پبلک ہیلتھ	

ایک مکمل کورس کی فیس 1750 روپے ہے۔ نام پتہ اور کورس کا نام SMS کرنے کیلئے موبائل نمبر 0345-7917181 یا خط لکھیں۔ کورس ڈاک کے ذریعے گھر ڈیلیور کرے گا اور فیس وصول کرے گا۔ جس کو مکمل کرکے آپ کالج بھجوا دیں گے۔ طلباء کو سرٹیفکیٹ / ڈپلومہ جاری کیا جائے گا جو گورنمنٹ سے منظور شدہ ہوگا۔ نوٹ: صرف وہی طلباء SMS کریں جو فیس ادا کر کے کورس منگوانا چاہتے ہیں۔

DAE

گھر بیٹھے داخلے

میڈیکل ڈپلومہ / انجینئرنگ ڈپلومہ

میٹرک سائنس و آرٹس کے بعد بذریعہ خط و کتابت ڈپلومہ ان ہومیو پیتھک۔ حکمت۔ نرسنگ۔ ڈسپنسر۔ ایکسرے ٹیکنیشن۔ الٹرا ساؤنڈ ٹیکنیشن۔ ڈینٹل ٹیکنیشن۔ لیبارٹری ٹیکنیشن۔ فزیو تھراپی۔ ویٹرنری اسسٹنٹ (جانوروں کا علاج)۔ کمپیوٹر اسسٹنٹ۔ الیکٹریکل۔ الیکٹرونکس۔ سول۔ مکینیکل ٹیکنالوجی۔ آرکیٹیکچر۔ ٹیکسٹائل اینڈ فیشن ڈیزائننگ۔ کمپیوٹر۔

ایڈمیشن فیس: 2000 روپے ماہانہ فیس: 500 روپے کل مدت: ایک سال (چھ چھ ماہ کے دو سمسٹر) نام پتہ اور کورس کا نام SMS کرنے کیلئے موبائل نمبر 0305-6482061

نوٹ صرف وہی طلباء و طالبات SMS کریں جو فیس ادا کر کے کورس منگوانا چاہتے ہیں پراسپکٹس اور داخلہ فارم ڈاک کے ذریعے آپ کے گھر موصول ہو جائے گا ڈپلومہ گورنمنٹ سے منظور شدہ ہوگا رزلٹ کا انتظار کرنے والے طلباء بھی داخلہ کے اہل ہیں

گھر بیٹھے داخلے ایگزیکٹو ایم بی اے

(ایگزیکٹو مینیجر ان بزنس ایڈمنسٹریشن)

سپیشلائیزیشن ان: مارکیٹنگ۔ فنانس۔ HRM۔ ہوٹل مینجمنٹ۔ ہاسپٹل مینجمنٹ۔ میڈیکل مینجمنٹ۔ لاء ایڈمنسٹریشن۔ کنسٹرکشن مینجمنٹ۔ ٹیکسٹائل مینجمنٹ۔ لائیو سٹاک مینجمنٹ۔ ایگری مینجمنٹ۔ الیکٹریکل۔ سول۔ مکینیکل۔ پیٹرولیم۔ کیمیکل۔ گیس اینڈ آئل مینجمنٹ۔ کمپیوٹر مینجمنٹ (صرف کا کورس لکھا بھیجا جائے گا)

ایسے طلباء و طالبات جن کی تعلیمی قابلیت بی اے، بی ایس سی، بی کام، بی سی ایس، ایم بی بی ایس، ڈی اے ای اور بی ایس سی انجینئرنگ ہے اور وہ گھر بیٹھے مندرجہ بالا کورس بذریعہ خط و کتابت کرنا چاہتے ہیں وہ اپنا نام، کورس کا نام ولدیت کا نام اور مکمل ایڈریس لکھ کر موبائل نمبر 0306-4829917 پر SMS کریں یا فون کریں پراسپکٹس اور داخلہ فارم آپ کے گھر موصول ہو جائے گا کورس گورنمنٹ سے منظور شدہ ہوگا رزلٹ کا انتظار کرنے والے طلباء بھی داخلہ کے اہل ہیں کورس گھر بیٹھے اسائنمنٹ کے ذریعے ہوگا اور امتحان بھی گھر بیٹھے ہی ہوں گے داخلہ فیس -/2000 روپے ماہانہ فیس -/1000 روپے

چیئرمین چوہدری خالد سعید گل نیشنل انسٹیٹیوٹ آف مینجمنٹ سائنسز NIMS ستیانہ روڈ بالمقابل آئیڈیل ہومز اینڈ بلڈرز نزد APTECH بلاک کالونی فیصل آباد

باخصلت

سلیم فاروقی

نفرت، ناانصافی اور خود غرضیوں کے گرداب میں پھنس کر انسان شرفِ انسانیت کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے ...... وہ انسانیت جو دردِ دل بن کر خاک کے پُتلوں کو فرشتوں سے افضل بنا دیتی ہے ...... آج کے ترقی یافتہ دور میں انسان کے پاس سب کچھ ہے لیکن جوہرِ انسانیت ...... دوستی ...... اور محبت ارض و سما کی وسعتوں میں کھو چکے ہیں ...... انسانوں کے ساتھ مختلف ممالک کے درمیان بھی کشیدگی بڑھنے کی نمایاں وجہ دوستی سے دوری اور نفرت سے قربت ہے ...... ایک ایسے ہی نوجوان کے شوقِ آوارگی کا اعجاز کہ قدم قدم پہ ایک داستاں منتظر تھی۔

بے غرض و بے لوث...... بے ٹھکانا و بے وطنوں کو پیش آنے والے سنگین حالات و واقعات

میں اس وقت سر کے بل کھڑا تھا اچانک میرے سیل فون کی بیل ہونے لگی۔

"یہ صبح صبح کسے پرابلم ہے؟" میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور بیل بجتی رہی۔

سیل فون کی بیل بج بج کر خاموش ہو گئی تو میں نے سکون کی سانس لی لیکن دو منٹ بعد بیل پھر بجنے لگی۔

میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور فرحانہ بپھری ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ "بھیا! آپ کو گھنٹی سنائی نہیں دے رہی ہے؟"

"میں بہرا نہیں ہوں۔" میں نے اسی پوزیشن میں کہا۔ "کوئی رانگ نمبر ہوگا۔ اب اس کے لیے میں اپنی ایکسر سائز تو نہیں چھوڑ سکتا۔"

فرحانہ نے فون اٹھا کر دیکھا اور بولی۔ "اسکرین پر کسی کا نام تو نہیں ہے، صرف نمبر ہے۔" اس نے کال ریسیو کرلی اور بولی۔ "ہیلو... یس! بھیا اس وقت ٹانگیں اوپر اور سر نیچے کیے کھڑے ہیں۔ میں ان کی بہن ہوں فرحانہ... آپ کون؟" فرحانہ نے یہ تمام گفتگو انگلش میں کی تھی۔ مجھے غصہ آرہا تھا کہ دوسری طرف جو کوئی بھی تھا اُسے اپنا شجرہ بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ ٹیلی فون پر کسی لڑکی کی آواز سن کر لوگ خوامخواہ گفتگو طول دے رہی ہے۔

"مجھے، آپ خود ہی بات کرلیں۔" اس نے فون میرے کان سے لگا دیا۔

"ہیلو!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"ہیلو کے بچے... میں ایک گھنٹے سے تمہارا نمبر ملانے کی کوشش کررہی ہوں۔ پاکستان جاکر بھی تمہاری عادتیں بدلی نہیں؟ ادھر وہ تیمور بھی فون ریسیو نہیں کررہا ہے۔" دوسری طرف جینی تھی۔ اس کی آواز سن کر میں اچھل کر سیدھا ہو گیا اور سیل فون فرحانہ کے ہاتھ سے لے لیا۔

"سوری جینی! تم تو جانتی ہو کہ..."

"میں سب جانتی ہوں۔" وہ بھنا کر بولی۔

"تم اتنی صبح صبح کہاں سے کال کررہی ہو اور یہ نمبر کون سا ہے؟"

"سر کے بل کھڑے ہونے سے تو بقول تمہارے حافظہ تیز ہوتا ہے۔ آج تاریخ کیا ہے؟" جینی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"آج چوبیس ستمبر... ارے... آج تو تمہیں..."

"ہاں، میں کراچی پہنچ چکی ہوں اور اس وقت ائرپورٹ سے کال کررہی ہوں لیکن اب میں سوچ رہی ہوں

کر یہیں سے واپس چلی جاؤں۔"

"ارے یار! اب غصہ تھوک دو، میں ابھی دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔"

"ایسی کوئی ایمرجنسی نہیں ہے۔ میں انتظار کرلوں گی۔ تم شریفانہ انداز میں ڈرائیونگ کرنا۔" جینی نے کہا۔ وہ میری تیز ڈرائیونگ سے ڈرتی تھی حالانکہ خود مجھ سے بھی زیادہ تیز ڈرائیونگ کرتی تھی۔

"اچھا، میں پہنچ رہا ہوں۔" میں نے سلسلہ منقطع کیا اور باتھ روم میں گھس گیا۔

میں ائرپورٹ پہنچا تو جینی کے ساتھ تیمور کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ جینی والہانہ انداز میں میری طرف بڑھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "جینی ڈیئر! خیال رکھنا، یہ امریکا نہیں پاکستان ہے۔" وہ کھسیانی سی ہوگئی لیکن بولی کچھ نہیں۔

"خبیث آدمی۔" میں نے تیمور سے کہا۔ "جب تو پہنچ ہی گیا تھا تو جینی کو لے کر گھر کیوں نہیں آیا؟"

"میں بھی ابھی تھوڑی دیر پہلے پہنچا ہوں۔ میں اس وقت جوگنگ کر رہا تھا جب جینی کی کال موصول ہوئی۔"

تیمور اور میں کے جی سے لے کر یونیورسٹی تک ایک ساتھ پڑھے تھے۔ ہم دونوں ایک ساتھ ہی امریکا گئے تھے، وہاں ایک کلب جوائن کرلیا تھا۔

جینی کو وہاں دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ اس سے زیادہ حیرت جینی کو ہوئی۔ پاکستانی اور خاص طور پر اسٹوڈنٹس وہاں اس قسم کے مہنگے شوق افورڈ نہیں کرسکتے اور جو افورڈ کرسکتے ہیں، وہ بھی وہاں جاکر تفریح میں وقت گزارتے ہیں۔

اسی کلب میں مجھے اندازہ ہوا کہ میں جواب تک تیمور کو بہترین فائٹر سمجھتا تھا، جینی بھی زبردست فائٹر تھی۔

ہمارے اور اس کے بیشتر شوق مشترک تھے۔ مارشل آرٹ کے ساتھ ساتھ وہ بھی ہماری طرح ایتھلیٹ تھی، بہترین تیراک تھی اور اس کا نشانہ غضب کا تھا۔

یوں بہت غیر محسوس طریقے سے وہ میرے نزدیک آگئی پھر یہ قربت نہ جانے کب محبت میں بدل گئی۔

تین سال بعد جب ہم واپس پاکستان آرہے تھے تو جینی بہت اداس تھی۔ تیمور نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا تھا کہ، تم تو یوں اداس اور اجڑی اجڑی لگ رہی ہو جیسے کامران جیسا کوئی دوسرا ہے ہی نہیں۔ یہاں بھی اس کی طرح چھ فٹ دو انچ، ایک سو دس پاؤنڈز اور براؤن بالوں والے بے شمار خوب رولڑکے مل جاتے ہیں بلکہ مجھ میں بھی یہ تمام خوبیاں موجود ہیں اور..."

جینی روتے روتے ہنسنے لگی۔ "تم اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ تیمور ورنہ تم مجھے جانتے ہو کہ..."

"جانتا ہوں کہ تم نے مارشل آرٹ میں بلیک بیلٹ لی ہے لیکن مجھے تو مت ڈراؤ۔"

"او بھائی!" تیمور نے کہا۔ "کیا اب یہیں کھڑے ایک دوسرے کو مرعوب ہی کرتے رہو گے یا گھر بھی چلو گے؟"

اس کے کہنے پر میں جینی کے سامان کی ٹرالی لے کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

میری لینڈ کروزر گولی کی طرح نکلی اور جیٹ کی رفتار سے شاہراہ فیصل پر دوڑنے لگی۔

"تمہاری ڈرائیونگ کا ابھی تک وہی حال ہے؟" جینی نے کہا۔ "ذرا آہستہ چلو، مجھے ابھی زندہ رہنا ہے۔" میں نے گاڑی کی اسپیڈ کم کر دی۔ "کامران! تم نے اپنے والدین کو تو میرے بارے میں بتا دیا ہے نا؟" جینی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں بتا دیا ہے۔" میں نے سگنل پر رکتے ہوئے کہا۔ "کہ جینی میری دوست ہے۔ امریکا میں اس کے والد کا بہت بڑا کاروبار ہے اور یہ کہ وہ گھومنے کے لیے پاکستان آرہی ہے۔" میں نے بھی سنجیدگی سے کہا اور کن انکھیوں سے جینی کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی۔

اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔ "بس... تم نے یہی کچھ بتایا ہے میرے بارے میں؟"

"نہیں اور بھی بتایا ہے۔" میں نے اس کی جھنجلاہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ "کہ جینی نے یونیورسٹی میں میری بہت مدد کی۔ وہ بہت ذہین اور خوب صورت لڑکی ہے اور یونیورسٹی سے فارغ ہوتے ہی کاروبار میں اپنے والد کا ہاتھ بٹا رہی ہے۔"

"اور؟" جینی نے بے چینی سے پوچھا۔

"اور یہ کہ... بس اور کیا بتاتا؟" میں جانتا تھا کہ وہ کیا سننا چاہ رہی ہے۔

وہ جھنجلا کر بولی۔ "وہاں تو تم نے بہت دعوے کیے تھے کہ میرے والدین بہت روشن خیال ہیں۔ انہیں..."

"ہمارے رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہی جاننا چاہ رہی تھیں نا تم؟ فرحانہ تو صرف تمہاری تصویر دیکھ کر تمہاری دیوانی ہوگئی ہے۔ تم نے ابھی فون پر شاید اسے اپنا نام نہیں بتایا ورنہ وہ بھی میرے ساتھ ائرپورٹ آنے کی ضد کرتی اور میں تمہیں زیادہ دیر

انتظار نہیں کرانا چاہتا تھا۔ اب گھر پہنچ کر سب کو حیران کردوں گا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

میں نے جینی سے شادی کا فیصلہ تو امریکا میں کرلیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں شادی کرکے پاکستان جاؤں لیکن میں مما اور پاپا کو بتائے بغیر اتنا بڑا قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ میری پسند پر اعتراض نہیں کریں گے۔ یہی ہوا بھی تھا۔ میں نے پاپا کو جینی کے بارے میں بتا دیا تھا۔ انہوں نے فراخ دلی سے کہا تھا۔ "زندگی تمہیں گزارنی ہے کامی! اگر تم سمجھتے ہو کہ وہ لڑکی تمہارے لیے بہتر ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

مما نے بھی بادل ناخواستہ میرے اس فیصلے کو قبول کیا تھا کیونکہ وہ میری شادی اپنی بھانجی سے کرنا چاہتی تھیں۔ میری خالہ زاد نوشین بہت اچھی بلکہ خوب صورت لڑکی تھی۔ سلیقہ مند تھی۔ انگلش میں ماسٹرز کر چکی تھی۔

نسیمہ خالہ اصل میں انڈیا میں رہتی تھیں۔ ہمارا اور ان کا کثرت سے آنا جانا رہتا تھا۔

ہم گھر پہنچے تو فرحانہ نے والہانہ طور پر ہمارا استقبال کیا۔ شاید تیمور نے ٹیلی فون کرکے اسے بتا دیا تھا کہ میں جینی کو لے کر آرہا ہوں۔ خلاف معمول اس دن پاپا بھی موجود تھے بلکہ نہ صرف موجود تھے بلکہ ان کے جسم پر ابھی تک سلیپنگ سوٹ اور ڈریسنگ گاؤن تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ آج آفس نہیں جائیں گے۔

میں نے خوش ہو کر پوچھا۔ "پاپا! آج آپ نے بھی چھٹی کرلی ہے؟"

"بھیا!" فرحانہ نے ہنس کر کہا۔ "آپ تو اپنی دوست کو دیکھ کر یہ بھی بھول گئے کہ آج اتوار ہے۔"

میں کھسیانا سا ہو کر بولا۔ "یہ تیمور ابھی تک نہیں آیا۔ تم ایسا کرو ہمارے لیے ناشتا لگاؤ۔ میں شاور لے کر ابھی آتا ہوں۔ جینی کو بھی اس کا کمرا دکھا دو۔"

جینی بھی، پاپا اور فرحانہ سے یوں باتیں کر رہی تھی جیسے انہیں برسوں سے جانتی ہو۔ فرحانہ اسے کمرا دکھانے لے گئی۔ مما نے سرد لہجے میں پوچھا۔ "کیا اس نے اسلام قبول کرلیا ہے؟"

"وہ ابھی اسلام کے بارے میں پڑھ رہی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ میری وجہ سے اسلام قبول کر رہی ہے بلکہ وہ بہت پہلے سے اسلامی کتابوں کا مطالعہ کر رہی ہے۔" یہ کہتے ہوئے میرے لہجے میں بھی کچھ تلخی آگئی اور میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مجھے پاپا کی آواز سنائی دی۔ "یہ ایسی باتیں کرنے کا کون سا موقع ہے؟ تم نے فضول میں یہ موضوع چھیڑ کر کامران کا موڈ خراب کردیا۔"

"میری بلا سے، وہ کچھ بھی کرتا پھرے۔ میں اس کے کسی معاملے میں نہیں بولوں گی۔"

"تم نہ ہی بولو تو اچھا ہے۔" پاپا نے تلخ لہجے میں کہا۔ مما اتنی بلند آواز میں بات کر رہی تھیں کہ اوپر پہنچنے کے بعد بھی مجھے ان کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

نہاتے ہوئے میں نے ٹھنڈے دل سے اس معاملے پر غور کیا۔ مما میری شادی اپنی بھانجی نوشین سے کرنے کے خواب سجائے بیٹھی تھیں۔ اگر جینی سے میری ملاقات نہ ہوتی تو میں بھی اس رشتے پر راضی ہو جاتا۔ ممکن ہے انہوں نے اس سلسلے میں اپنے طور پر نسیمہ خالہ سے بھی بات کی ہو۔ یہ سب سوچتے ہوئے مجھے غصے کے بجائے ان پر ترس آیا۔

نہانے دھونے کے بعد میں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا تو تیمور بھی پہنچ گیا۔ اس نے کن انکھیوں سے مما کی طرف دیکھا پھر میری طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا کہ سب ٹھیک ہے؟

میں نے بھی آنکھوں کے اشارے ہی سے بتایا کہ سب ٹھیک ہے۔

ناشتا کرنے کے بعد جینی آرام کرنے چلی گئی۔ وہ بیس بائیس گھنٹے کا سفر کرکے آئی تھی اس لیے فرحانہ زبردستی اسے بیڈروم میں لے گئی۔ اس کے جاتے ہی مما کا مسکراتا ہوا چہرہ سپاٹ ہوگیا۔ وہ محض میری خاطر جینی کو یہ احساس نہیں ہونے دینا چاہتی تھیں کہ اس کی آمد انہیں ناگوار گزری ہے۔

"مما!" میں نے آہستہ سے کہا۔ "آپ کو اگر جینی کا آنا اتنا ہی برا لگا ہے تو میں ایک ہفتے میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر واپس بھجوا دوں گا۔ آپ کی خوشی ہی میں میری خوشی ہے۔ آپ نہیں چاہتیں تو..." میری آواز بھرا گئی۔

"نہیں بیٹا!" مما جلدی سے بولیں۔ "تمہاری آنکھوں میں آنسو؟... جیتے رہو! تم خوش رہو! میں نے جو کچھ سوچا تھا وہ اتنا اہم نہیں ہے جان! تمہاری خوشی میرے لیے زیادہ اہم ہے۔"

"پھر آپ اداس کیوں ہیں؟"

"میں کہاں اداس ہوں چندا!" مما نے ہنس کر کہا۔ "بس وقتی طور پر میرا موڈ خراب ہوگیا تھا۔"

"واقعی مما؟" میں نے خوش ہو کر پوچھا۔

www.pkdigest.com

شام کو میں، تیمور، فرحانہ اور جینی گھومنے نکل گئے۔ جینی پہلے بھی پاکستان آچکی تھی۔ وہ کراچی، لاہور اور اسلام آباد وغیرہ گھوم چکی تھی۔ ہم لوگ شہر میں گھومتے رہے۔ کھانا بھی ہم نے باہر ہی کھایا۔ اس دن فرحانہ بہت خوش تھی۔ ایک تو وہ لانگ ڈرائیو کی دیوانی تھی پھر تیمور کا ساتھ۔ میں جانتا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ مما بہت جلد ان دونوں کی منگنی کرنے والی تھیں۔ وہ میری واپسی کے انتظار میں تھیں، شاید انہوں نے سوچا ہو کہ میری اور فرحانہ کی منگنی ایک ساتھ کریں گی۔

واپسی میں جینی نے کہا۔ ”کامی! کیا یہ ممکن ہے کہ ہم انڈیا گھوم سکیں؟“

”انڈیا!“ میں زیرلب بڑبڑایا۔ ”ہاں لیکن...“

”کوئی بہانہ نہیں کامی!“ جینی خوش ہو کر بولی۔ ”تم فکر مت کرو اگر تم انکل یا آنٹی کی وجہ سے فکرمند ہو تو ان سے اجازت میں لے لوں گی۔ تم لوگ بس تیاری کرلو۔ باقی کام میرا۔ تیمور! تم بھی تیار ہو جاؤ۔“

”ناممکن۔“ تیمور نے کہا۔ ”اس وقت میں کراچی چھوڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“

”اوہ کم آن یار!“ میں نے جھنجلا کر کہا۔ ”ایسی بھی کیا مجبوری... میں جانتا ہوں کہ...“

”تم نہیں جانتے۔“ تیمور نے کہا۔ ”ڈیڈی کل بیرون ملک جا رہے ہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں پورے دفتر کی ذمے داری مجھ پر آپڑی ہے۔ ہاں، یہ ہوسکتا ہے کہ میں ایک ہفتے بعد تم سے آملوں۔“

”تو پھر ہم ایک ہفتے بعد ہی جائیں گے۔“ میں نے کہا۔

”نہیں کامی!“ جینی نے کہا۔ ”ہم چلتے ہیں۔ جب تک تیمور آئے گا، ہم کافی گھوم چکے ہوں گے۔“

صبح ناشتے کی میز پر میں نے مما کو بتایا کہ ہم لوگ انڈیا جا رہے ہیں۔

”انڈیا!“ مما نے چونک کر پوچھا۔

”جی مما!“ میں نے کہا۔ ”جینی کو انڈیا دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ بس ایک ہفتے میں واپس آجائیں گے۔“

”نسیمہ کے یہاں مت ٹھہرنا۔“ مما نے زیرلب کہا۔

”جی مما!“ میں نے کہا۔ ”وہ ہماری وجہ سے خوامخواہ ڈسٹرب ہوں گی۔ اسی وجہ سے میں نے ہوٹل میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یوں بھی ہمیں انڈیا کے کئی شہروں میں گھومنا ہے۔ ایک ہی شہر میں ہم ٹک کر نہیں بیٹھ سکتے۔“

میں جانتا تھا کہ مما کس وجہ سے منع کر رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ نسیمہ خالہ مجھے داماد بنانا چاہتی تھیں۔ وہ جینی کو اپنے گھر میں کیسے برداشت کرسکتی تھیں۔

اسی دن...... میں نے ویزا کے لیے بھاگ دوڑ شروع کردی۔ کچھ جاننے والوں کے ذریعے میں نے کسی نہ کسی طرح دو دن میں انڈیا کا ویزا لے ہی لیا۔ جینی کے ویزا کا تو مسئلہ ہی نہیں تھا۔ اس کے پاس امریکن پاسپورٹ تھا اس لیے دنوں کا کام گھنٹوں میں ہو گیا۔

مما سے رہا نہیں گیا۔ انہوں نے نسیمہ خالہ سے ٹیلی فون پر بات کرلی تھی۔ جب نسیمہ خالہ کو یہ معلوم ہوا کہ میں ان کے گھر کے بجائے ہوٹل میں ٹھہروں گا تو وہ بہت ناراض ہوئیں۔ مما نے جیسے تیسے انہیں منالیا۔

میرے جانے سے فرحانہ بہت اداس تھی۔ وہ بے وقوف لڑکی میرے کہیں بھی جانے پر اداس ہو جاتی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”فری! میں صرف ہفتے دس دن کے لیے جا رہا ہوں تو تو اتنی اداس ہو رہی ہے، جب تو ہمیشہ کے لیے اس گھر سے چلی جائے گی تو کیا ہوگا؟“

فرحانہ میری بات کا جواب دیے بغیر تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

میرے منع کرنے کے باوجود تیمور اور فرحانہ ہمیں ائرپورٹ چھوڑنے آئے۔ میں نے چلتے چلتے تیمور سے پھر ایک دفعہ وعدہ لیا کہ وہ کام نمٹاتے ہی انڈیا آجائے گا۔

دنیا بھر کے انٹرنیشنل ائرپورٹس پر خوش اخلاق اور خوش شکل عملہ خاص طور پر رکھا جاتا ہے لیکن شاید انڈیا والوں کو بزنس کا یہ طریقہ نہیں آتا تھا یا پھر ان کے پاس خوش اخلاق لوگوں کا قحط تھا۔

مکروہ شکل کے ایک سکھ افسر نے سب سے پہلے تو پاکستانیوں کی ایک الگ لائن بنوائی اور ہمیں ایک کاؤنٹر پر بھیج دیا۔

جینی مشکل سے آدھا گھنٹے میں فارغ ہو کر آگئی۔

گرین پاسپورٹ والوں کی لائن بہت سست رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار مجھے جینی کے سامنے سبکی اور اپنے پاسپورٹ کی بے وقعتی کا احساس ہوا۔ جینی کا امریکن پاسپورٹ دیکھ کر شاید امیگریشن کے عملے نے اس سے زیادہ تفصیل سے سوال جواب بھی نہیں کیے تھے۔ ممبئی میں گرمی کچھ زیادہ ہی تھی اس لیے جینی بھی پریشان ہو رہی تھی۔

ائرپورٹ پر جینی ذرا سی دیر میں سارے مراحل سے

فارغ ہو گئی لیکن پاکستانی ہونے کے ناتے مجھے نمٹنے میں دو گھنٹے سے زیادہ وقت لگ گیا۔

ائرپورٹ سے باہر نکلے تو پھر ایک سکھ کے ہتھے چڑھ گئے۔ وہ سکھ ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ سکھ تو دنیا بھر میں ٹرانسپورٹ کے شعبے سے وابستہ ہیں، یہ تو پھر ان کا ملک تھا۔

اس نے بہت ادب سے دروازہ کھولا اور پنجابی نما انگلش میں بولا۔ ”سر! آپ کہاں جانا پسند کریں گے؟“

”کسی بھی اچھے ہوٹل لے چلو۔“ میں نے کہا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا جہاں ایک نئے دن کا آغاز ہو رہا تھا۔ دفتروں کے بابو، آفس میں کام کرنے والی جینز میں ملبوس لڑکیاں، موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں کا ایک ہجوم! ایک لمحے کو تو مجھے ممبئی اور کراچی میں ذرہ برابر فرق محسوس نہیں ہوا۔ فرق تھا تو صرف کالے کالے مردوں اور عورتوں کا!

ٹیکسی ڈرائیور نے تھوڑی دیر بعد اعلان کیا کہ ہم جوہو پہنچ چکے ہیں اور یہاں کا کنگ ہوٹل اچھا خاصا معقول تھا۔

ہوٹل کے کاؤنٹر پر موٹی سی صورت والی ایک خوش شکل لڑکی بیٹھی تھی۔ یہ ساری معلومات وہی دے رہی تھی۔ اس کے روشن اور کشادہ ماتھے پر بندیا بہت بھلی لگ رہی تھی۔ ممبئی میں وہ پہلی پُرکشش صورت تھی جو میں نے دیکھی تھی۔

”یس سر!“ اس نے بہت احترام سے پوچھا۔

میں نے ایک ڈبل روم کی فرمائش کی۔

”کتنے گھنٹے کے لیے؟“ اس نے پوچھا۔

”کیا روم یہاں گھنٹوں کے حساب سے ملتے ہیں؟“ جینی نے ترش لہجے میں پوچھا۔ ”اوکے! ہمیں چوبیس گھنٹے کے لیے کمرا چاہیے۔“

”آپ کو بہت مہنگا پڑے گا میم!“ موٹی صورت والی نے کہا۔

”یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔“ جینی کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

”اوکے!“ کاؤنٹر گرل نے جلدی سے کہا اور ایک رجسٹر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس میں اپنا نام پتا لکھا۔ لڑکی نے کمرے کی چابی ایک پورٹر کو دے دی۔

ہوٹل کا کمرا واقعی صاف ستھرا اور کشادہ تھا۔ ہم نے فلائٹ میں ناشتا کرلیا تھا اس لیے ناشتا کرنے کی ایسی خواہش نہیں تھی۔ البتہ جینی نے روم سروس سے کافی منگوالی۔

کافی پیتے ہوئے اچانک میری نظر سامنے والی دیوار پر پڑی۔ جینی نے کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا تھا۔ دھوپ کی شعاعوں سے مجھے دیوار پر کچھ عجیب سی جھلملاہٹ محسوس ہوئی۔

”اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو؟“ جینی نے پوچھا۔

خارش

ایک آدمی ایک نجومی کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ ”نجومی صاحب میرے بائیں ہاتھ میں کھجلی ہو رہی ہے۔“

نجومی نے ہاتھ دیکھتے ہوئے خوش خبری سنائی۔ ”عنقریب آپ کے ہاتھ میں دولت آنے والی ہے۔“

”نجومی صاحب میرے دائیں ہاتھ میں بھی کھجلی ہے۔“ آدمی بولا۔

”عنقریب جو دولت آئے گی وہ جانے والی ہے۔“ نجومی نے قدرے تشویش سے کہا۔

”نجومی صاحب! میرے تو بائیں پاؤں میں بھی کھجلی ہے۔“ اس نے انکشاف کیا۔

”عنقریب آپ کوئی بڑا سفر کرنے والے ہیں۔“ نجومی نے چند لمحوں کے غور و فکر اور حساب کتاب کے بعد بتایا۔

”نجومی صاحب! میرے تو دائیں پاؤں میں اور کمر میں بھی کھجلی ہے۔“ وہ بے چینی سے بولا۔

”یہ ذرا ٹیڑھا مسئلہ ہے۔ اس کے لیے تم کو سفید مگرمچھ کا انڈا اور ہرن کی کھال لانا ہوگی یا پھر مجھے تین ہزار روپے دے دو تو میں بندوبست کرلوں گا... یہ...!“

اس نے نجومی کی بات کاٹ کر کہا۔ ”تیری ایسی کی تیسی۔ مجھے تو کئی روز سے خارش ہے۔ میں تیرے کن آزمانے کے لیے یوں ہی چلا آیا تھا!“

میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور وہاں رکھے ہوئے پیڈ پر لکھا۔ ”یہ کمرا خطرناک ہے جینی! کسی پوشیدہ کیمرے کی مدد سے ہماری ہر حرکت دیکھی جا رہی ہے۔“ پھر میں نے بلند آواز میں کہا۔ ”سوچ رہا ہوں کہ ممبئی کی سیر کا آغاز کہاں سے کیا جائے؟“

”کہیں بھی چلو۔“ جینی نے بھی بلند آواز میں کہا اور کاغذ پر لکھا۔ ”اگر تمہارا خدشہ درست ہے تو ہمیں فوراً یہ ہوٹل چھوڑ دینا چاہیے۔ نہ جانے اس ٹیکسی ڈرائیور نے ہمیں کہاں لاکر پھنسا دیا ہے۔“

غور کرنے پر مجھے کیمرے کا وہ لینس نظر آگیا جسے بہت مہارت سے دیوار کے عجیب و غریب ڈیزائن میں چھپایا گیا تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، مجھے ایسی کوئی چیز نہ ملی جس سے میں وہ لینس توڑ سکتا۔ میں نے جھنجلا کر جینی کی باریک ایڑی والی چپل اٹھائی اور اس کی ایڑی خاصی قوت سے کیمرے پر رسید کردی۔ شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی اور اس

www.pkdigest.com

کی کچھ کرچیاں قالین پر بھی بکھر گئیں جنھیں میں نے بستر کے نیچے کر دیا۔

اب مجھے انتظار تھا ان لوگوں کا جنھوں نے یہ اہتمام کیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں وہ پوشیدہ مائیکروفون بھی تلاش کر رہا تھا جس کے ذریعے ہماری باتیں باہر کہیں سنی جا رہی تھیں۔

اچانک مجھے بہت باریک سا ایک تار نظر آ گیا۔ وہ وائر بالکل دیوار کے ہم رنگ تھا اور اگر مجھے شبہ نہ ہوتا تو میں بھی وہ تار نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ہوٹل کا سیکیورٹی آفیسر تھا۔ اس کے چہرے پر خشونت تھی۔ اسے دیکھتے ہی جینی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہوٹل کا یہ کمرا صاف ستھرا ہے لیکن یہاں چھپکلی کہاں سے آئی۔ میں چھپکلی سے بہت ڈرتی ہوں۔ میرے ساتھی نے اگر فوراً ہی اس پر چپل نہ کھینچ ماری ہوتی تو شاید میں بے ہوش ہی ہو جاتی۔ ہاں، اس سے تمہارے کمرے میں کچھ توڑ پھوڑ ہو گئی ہے۔ اس کا بل بھی کمرے کے بل کے ساتھ لگا دینا۔''

اس نے کچھ مشکوک سے انداز میں مجھے دیکھا، پھر کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے شیونگ کٹ سے بلیڈ نکالا اور دیوار کا ہم رنگ وہ تار بہت مہارت سے کاٹ دیا۔ اور جینی سے کہا۔ ''اپنا سامان پیک کرو۔ میں اسی وقت یہ ہوٹل چھوڑنا چاہتا ہوں۔''

جینی بھی معاملے کو سمجھ گئی تھی۔

میں لفٹ کے ذریعے جانے کے بجائے زینے سے نیچے اترا۔ اس وقت کاؤنٹر پر وہ موٹی صورت والی لڑکی نہیں تھی۔ زینے کے ساتھ ہی ایک کمرے سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں مزید آگے بڑھا تو وہ باتیں بھی واضح ہو گئیں۔ اندر دو سے زیادہ آدمی تھے۔

ان میں سے ایک بولا۔ ''یہ صرف اتفاق نہیں ہے ورما! وہ مسلا بہت چالاک ہے۔ اس نے جان بوجھ کر کیمرے کا لینس توڑا ہے۔''

''لیکن اسے معلوم کیسے ہوا کہ وہاں کوئی کیمرا بھی فٹ ہے؟'' دوسری آواز آئی۔ ''وہ مجھے کسی پاکستانی ایجنسی کا آدمی لگتا ہے۔ عام آدمی ان باتوں پر اتنا غور نہیں کرتا۔''

اسی وقت تیسری آواز بھی آئی۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اس نے مائیکروفون کا تار بھی کاٹ دیا ہے۔ یہ ضرور کوئی ایجنٹ ہے۔''

''وہ کوئی بھی ہو!'' پہلی آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔ ''ہمارا تو بھاری نقصان ہو گیا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ان امریکن لڑکیوں کی فلمیں منہ مانگے داموں بکتی ہیں۔ اب کسی طرح ان لوگوں کو دوسرے کمرے میں پہنچاؤ۔ میں ان لوگوں کو ایسے نہیں جانے دوں گا۔''

''اگر وہ اتنا ہی چالاک ہے تو کیا تم زبردستی ان کی فلم بنواؤ گے؟'' دوسرے آدمی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ہاں، ایسا ہی ہوگا۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ اس مسلے کی جگہ ورما ہوگا۔ اس لڑکی کو بھنگ پلا دیں گے تو وہ ہوش میں بھی رہے گی اور ہماری مرضی کی فلم بھی بن جائے گی۔''

ان کی باتیں سن کر میری کھوپڑی الٹ گئی۔ میں نے بمشکل تمام اپنے غصے پر قابو پایا اور کاؤنٹر پر جا کر اسے زور زور سے بجایا۔

فوراً ہی پچھلے کمرے سے موٹی صورت والی لڑکی نمودار ہوئی لیکن اس کے چہرے پر اس وقت خوش اخلاقی کے بجائے جھنجلاہٹ تھی۔ اس نے اپنے لہجے کو نرم کر کے پوچھا۔ ''یس سر؟''

''میں ابھی اور اسی وقت جانا چاہتا ہوں۔ میرا بل میرے کمرے میں بھجوا دیں اور کسی پورٹر کو بھیج دیں۔''

''کیوں سر! آپ کو یہاں کوئی تکلیف ہے؟ کیا ہماری سروس میں کوئی خامی ہے یا...'' وہ سراپا انکسار بن گئی۔

میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''مجھے یہاں ٹیکسی والا لے کر آیا تھا۔ میری دوست بڑے ہوٹلوں میں ٹھہرنے کی عادی ہے۔ یہاں قائیو تو کیا، تو اسٹارز کی سہولیات بھی نہیں ہیں۔ تم پورٹر کو بھیجو، میں بل یہیں کاؤنٹر پر ادا کروں گا، ہری اپ۔''

اسی وقت کمرے سے لمبا تڑنگا اور مضبوط جسم کا ایک شخص نکلا۔ اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔ ''کیا مسئلہ ہے شاردا؟''

گویا اس موٹی صورت والی کا نام شاردا تھا۔ اس نے کہا۔ ''ورما صاحب! یہ صاحب ابھی آئے ہیں اور ابھی جانا چاہتے ہیں۔''

''کیا یہ قانون کے خلاف ہے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میں تو بغیر استعمال کیے آپ کو کمرے کا پورا کرایہ دے رہا ہوں۔''

''آپ کہاں سے آئے ہیں؟'' ورما نے تحقیر آمیز لہجے میں سوال کیا۔

میں آپے سے باہر ہو گیا۔ ''میں تم بک ٹو سے آیا ہوں۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''میں نے تمہارے

رجسٹر میں سب کچھ لکھ دیا ہے، پھر بھی تم یہ احمقانہ سوال کر رہے ہو؟''

''مجھے افسوس ہے سر!'' ورما نے اپنی کرخت آواز میں نرمی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ''آپ ہمارے مہمان ہیں۔ اگر آپ کو یہاں کوئی تکلیف پہنچی ہے تو میں معذرت چاہتا ہوں۔'' پھر وہ شاردا سے بولا۔ ''صاحب کا بل بنا دو۔ اور سر! آپ جب تک ہمارے ساتھ ایک کافی پی لیں۔''

''نہیں، شکریہ!'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''یہاں کی کافی بھی ہوٹل کی طرح تھرڈ کلاس ہوگی۔''

''کافی تو سر آپ کو پینا ہی پڑے گی۔'' ورما نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

میں بھنا کر رہ گیا۔ اچھی زبردستی تھی۔ میں نے ترش لہجے میں کہا۔ ''مجھے آپ کی کافی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

ورما نے اچانک ریوالور نکال لیا اور بولا۔ ''اب بتاؤ، ضرورت ہے کہ نہیں ہے؟''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ بات اس حد تک بڑھ جائے گی۔ کاؤنٹر والی موٹی لڑکی یوں لاتعلق نظر آ رہی تھی جیسے اس کے سامنے ٹی وی پر کوئی فلم چل رہی ہو۔ اس کے چہرے پر البتہ خوف کے سائے تھے۔

''اب تم اتنے پیار سے کافی پلاؤ گے تو پینا ہی پڑے گی۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''چلو تمہاری کافی بھی پی لیتے ہیں۔''

''اس کے سامنے بڑے سے بڑا سورما کافی تو کیا کچھ اور بھی پینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔'' ورما نے بھونڈے انداز میں ہنس کر کہا۔ ''چلو، کمرے میں چلو۔'' اس نے ریوالور سے اسی کمرے کی طرف اشارہ کیا جس میں سے وہ برآمد ہوا تھا۔ اس نے ریوالور کچھ اس انداز سے پکڑ رکھا تھا کہ اگر کوئی اتفاق سے ہمیں دیکھ بھی لے تو ریوالور نظر نہ آئے۔

میں خاموشی سے اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرا اندر سے بہت شاندار تھا۔ فرش پر دبیز اور قیمتی قالین تھا۔ دیواروں پر مشہور زمانہ مصوروں کی تصاویر لگی تھیں۔ ان میں اقبال مہدی کی ایک خوب صورت تصویر دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔

صوفوں پر ورما ہی کی طرح کے دو مکروہ صورت آدمی بیٹھے تھے۔ انھوں نے عجیب مسکراہٹ سے مجھے دیکھا، پھر ان میں سے ایک بولا۔ ''تمہارا تعلق پاکستان کی کس خفیہ ایجنسی سے ہے؟''

''کیا تم لوگ پاکستان سے آنے والے ہر شخص کو خفیہ ایجنسی کا ایجنٹ سمجھتے ہو؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''تم نے حرکت ہی ایسی کی ہے۔'' صوفے پر بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔ اس کا جسم کسرتی اور ہاتھ پیر مضبوط تھے۔ وہ چہرے سے بھی کسی انگلش فلم کا بدمعاش لگ رہا تھا۔ اس نے ہنس کر کہا۔ ''ہمارے معزز مہمان کو کافی پلاؤ مگر یہ دھیان رکھنا کہ اس میں دوا کی مقدار اتنی زیادہ نہ ہو جائے کہ یہ پرلوک سدھار جائے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''تم لوگ مجھے کافی پلا کر بے ہوش کرنا چاہتے ہو؟ میں ابھی اپنے سفارت خانے سے بات کرتا ہوں۔ اس سے پہلے میں پولیس اسٹیشن فون کروں گا۔''

ورما نے اب ریوالور مجھ پر تان لیا۔ وہ مکروہ انداز میں ہنس کر بولا۔ ''اگر مرنے کے بعد موقع ملے تو پولیس اسٹیشن بھی فون کر دینا اور اپنے ہائی کمیشن بھی۔''

اس دوران میں تیسرا شخص کافی بنانے میں مصروف رہا۔

میں نے پہلی دفعہ غور کیا کہ صوفے کے ساتھ ہی ایک کیمرا اسٹینڈ، اعلیٰ قسم کا ایک مووی کیمرا اور ایک مائیکروفون رکھا تھا۔

کافی بنانے والے کے شانے سے بھی ایک انتہائی قیمتی ڈیجیٹل کیمرا لٹک رہا تھا۔ اس نے کافی بنانے کے بعد ایک پڑیا سے کچھ سفوف نکالا اور میری آنکھوں کے سامنے کافی میں ڈال دیا۔

تربیت

ایک صاحب نے طوطا پال رکھا تھا جو کہ گالیاں بہت دیتا تھا۔ یہ صاحب طوطے کی اس عادت سے بہت نالاں تھے۔ آخر وہ تنگ آ کر طوطے کو مولانا کے پاس لے گئے اور کہا کہ اس طوطے کو اچھی عادات سکھا دیں۔ مولانا صاحب نے دو ماہ کے لیے طوطا اپنے پاس رکھ لیا اور اس کی ٹریننگ کرنے لگے۔ دو ماہ بعد وہ صاحب مولانا کے پاس گئے اور طوطے کے بارے میں دریافت کیا۔ مولانا صاحب بولے ماشاءاللہ آپ کا طوطا گالیاں بکنا چھوڑ چکا ہے۔ اگر آپ اس کی ایک ٹانگ اٹھائیں گے تو یہ بولے گا۔ ''السلام علیکم۔'' دوسری ٹانگ اٹھائیں گے تو بولے گا۔ ''خدا حافظ۔''

ان صاحب نے پوچھا کہ اگر میں اس کی دونوں ٹانگیں اٹھا دوں تو؟''

اس سے پہلے کہ مولانا کچھ کہتے۔ طوطا طیش میں آ کر بولا۔ ''تو اٹھا تو سہی، میں تیرا ٹینٹوا دبا دوں گا۔''

www.pkdigest.com

میں نے اپنے لہجے میں مایوسی طاری کرتے ہوئے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ اب تم لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑو گے لیکن مرنے سے پہلے یہ تو بتا دو کہ اس سب کا مقصد کیا ہے؟“

بدمعاش نما شخص زور سے ہنسا اور بولا۔ ”ابے یار! میں نے تو سنا تھا کہ پاکستانی بہت بہادر ہوتے ہیں۔ تم تو بالکل ہی گئے گزرے نکلے۔ ہم تمہیں ماریں گے نہیں، صرف بے ہوش کریں گے۔ ہم تمہاری اس بلبل کی وڈیو فلم بنائیں گے جو تمہارے ساتھ آئی ہے۔ اسے ہم بے ہوش نہیں کریں گے بلکہ بھنگ پلائیں گے۔ بھنگ کے نشے میں امریکن تتلیاں بہت عجیب حرکتیں کرتی ہیں، بالکل آپے سے باہر ہو جاتی ہیں۔ پہلے ہم نے سوچا تھا کہ ہم تمہاری اور اس بلبل کی فلم بنائیں گے لیکن تم نے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہوشیاری دکھا دی۔ مجبوراً اب تمہارا کردار مجھے ادا کرنا پڑے گا۔ خیر، یہ بعد کی باتیں ہیں تم تو کافی پیو اور آسمانوں کی سیر کرو۔“

میں جانتا تھا کہ اس کافی میں ان لوگوں نے دوا کی مقدار ضرورت سے بہت زیادہ رکھی ہوگی۔ بعد میں وہ کوئی بہانہ بھی بنا سکتے تھے۔ وہ اس بات سے بھی مکر سکتے تھے کہ ہم ان کے ہوٹل میں ٹھہرے بھی تھے۔

مجھے خود سے زیادہ جینی کی فکر تھی۔ وہ آسانی سے ان کے قابو میں نہیں آتی لیکن اگر وہ دھوکے سے اسے بھنگ پلا دیتے تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

کیمرا مین اب کافی کی پیالی لے کر میری طرف بڑھ رہا تھا۔ ورما کے ہاتھ میں ابھی تک ریوالور تھا البتہ کیمرا مین اور بدمعاش خالی ہاتھ تھے۔ ممکن ہے وہ بھی مسلح ہوں لیکن ابھی تک انہوں نے کوئی ہتھیار نکالا نہیں تھا۔

کیمرا مین نے مجھے کافی کی پیالی دی جسے میں نے ہاتھ میں پکڑ لیا اور یوں ظاہر کیا جیسے میں بہت زیادہ خوف زدہ ہوں۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے اور کپ اور ساسر یوں بج رہے تھے جیسے جلترنگ بج رہا ہو۔

ورما نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”اب جلدی سے اسے پی جاؤ۔ یہ امرت دھارا ہے، امرت دھارا! یہ تمہیں زندگی کے ہر غم سے نجات دلا دے گا۔“

”اسے کچھ ٹھنڈا تو ہونے دو۔ اتنی گرم کافی مجھ سے نہیں پی جائے گی۔“ میں نے کانپنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ اس وقت میرا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے چائے کا کپ اٹھایا، اسے ہونٹوں تک لے گیا پھر اچانک اسے ورما کے چہرے پر اچھال دیا۔

اس کے حلق سے کرب آمیز آواز بلند ہوئی۔ گرم گرم کافی اس کی آنکھوں میں بھی گری تھی۔

میں نے کافی اس پر پھینکتے ہی بہت پھرتی سے اپنی جگہ تبدیل کر لی تاکہ اگر بوکھلاہٹ میں اس سے فائر ہو جائے تو میں اس سے محفوظ رہوں۔

لیکن اسے اتنا ہوش کہاں تھا۔ ریوالور تو فوراً ہی اس کے ہاتھوں سے گر گیا تھا۔ کیمرا مین میری رینج میں تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر ایک مکا رسید کر دیا۔

بدمعاش نے جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی لیکن میں نے تیزی سے گھوم کر اس کے چہرے پر لات رسید کر دی۔ دوسری لات میں نے ورما کے چہرے پر رسید کی جو آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح گر گیا۔

حیرت تو مجھے اس بدمعاش پر تھی۔ میری لات کھانے کے بعد بھی وہ دوبارہ جیب کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا۔

میں نے وہیں سے چھلانگ لگائی اور اسے ساتھ لیتا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کی دائیں کلائی میرے قبضے میں تھی۔

اس نے جھٹکے سے کلائی چھڑانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”اب اگر تم نے زور لگایا تو تمہاری کلائی کا جوڑ نکل جائے گا۔“ پھر میں نے بہت اطمینان سے اس کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے اعشاریہ تین آٹھ کا ایک ریوالور اور کرنسی نوٹوں سے بھرا پرس ملا۔

اس کی اچھی طرح تلاشی لینے کے بعد میں نے کہا۔ ”اب سیدھے کھڑے ہو جاؤ اور جو کچھ میں پوچھوں، سچ سچ بتانا۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ پاکستانی کتنے بہادر ہوتے ہیں۔ جھوٹ بولے تو میں اپنی بہادری کا ایسا نمونہ دکھاؤں گا کہ تم کسی کو شکل دکھانے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔ چلو اب شروع ہو جاؤ۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔“

”تم کیا سمجھتے ہو کہ تم یہاں سے بچ کر نکل جاؤ گے؟“ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا اور بولا۔ ”میں بچ کر نکلوں یا نہ نکلوں... تو میرے ہاتھوں سے نہیں بچ سکے گا۔“

میرا تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ اس کا بایاں رخسار پھٹ گیا اور ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔ اس وقت مجھے اپنی اس ورزش کا اندازہ ہوا جو میں ہاتھوں کے بل کئی کلومیٹر کرتا تھا۔ تیمور میرے پیر پیچھے سے پکڑ لیتا تھا اور میں ہاتھوں کے بل کئی کلومیٹر تک چلا جاتا تھا۔ اس ورزش سے میرے ہاتھ خاص طور پر ہتھیلیاں اتنی سخت اور مضبوط ہو گئی تھیں کہ میں پوری قوت سے تھپڑ مارتا تو شاید اس بدمعاش کی گردن کا منکا ہی ٹوٹ جاتا۔

”بتاؤ یہاں کیا چل رہا ہے اور تم لوگوں نے کمروں میں شارٹ سرکٹ کیمرے کیوں لگا رکھے ہیں؟“

”تم کیا سمجھتے ہو تم پاکستانی ہی جان دینا جانتے ہو؟“ وہ طنزیہ لہجے میں بولا وہ بار بار ہتھیلی کی پشت سے ہونٹوں اور گال سے بہتا ہوا خون صاف کر رہا تھا۔

میں نے دیکھا، کیمرا مین کسمسا رہا ہے۔ بدمعاش کے مقابلے میں وہ مجھے آسان شکار لگ رہا تھا۔ اس کی زبان کھلوانا زیادہ آسان تھا۔ زبان تو خیر میں اس بدمعاش کی بھی کھلوا لیتا لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ صبح کا وقت تھا اور کمرے میں کوئی بھی آ سکتا تھا۔ یہ بھی غنیمت ہی تھا کہ کمرے میں اب تک کوئی نہیں آیا تھا۔

”میں تیرا مرنے کا شوق ضرور پورا کروں گا۔“ میں نے کہا اور آگے بڑھ کر اس کی کنپٹی پر ایک جچا تلا ہاتھ رسید کر دیا۔

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا پھر تیورا کر فرش پر گر گیا۔

اس وقت تک کیمرا مین نے آنکھیں کھول دی تھیں اور وہ الوؤں کی طرح آنکھیں پٹپٹا کر ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا۔

میں نے اس کا گریبان پکڑ کر اٹھا لیا۔ وہ یوں اٹھا جیسے میں اسے ذبح کرنے والا ہوں۔ وہ گھگیا کر بولا۔ ”اس سارے چکر میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے صاحب! میں تو ان لوگوں کے لیے صرف کام کرتا ہوں اور پیسے لیتا ہوں۔“

”تمہارا ہاتھ نہیں ہے؟“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”تم ہی تو مجھے وہ کافی پلا رہے تھے۔ اب میں جو کچھ پوچھوں سچ سچ بتانا ورنہ تمہارا حشر بھی تمہارے ان دو ساتھیوں کی طرح ہوگا۔ پولیس کو یہاں دو کے بجائے تین لاشیں ملیں گی۔“

”تو... آپ نے... کیا... ان لوگوں... کو مار دیا؟“ وہ بوکھلا کر بولا۔

”ابھی تو نہیں مارا ہے لیکن میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ بتاؤ تم ان لوگوں کے لیے کیا کام کرتے ہو؟“

”میں تو کیمرا مین ہوں سر! مجھے تو کوئی بھی کام سے لگا سکتا ہے۔“ وہ گھگیا کر بولا۔

”تمہارے ساتھی نے ابھی بتایا ہے کہ تم عام حالات سے دس گنا زیادہ کماتے ہو۔ کیا یہ لوگ یہ رقم تمہیں انعام میں دیتے ہیں؟“

”میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں صاحب!“ اس نے رو دینے والے انداز میں کہا۔ ”اگر میں آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں تو کیا آپ مجھے چھوڑ دیں گے؟“

”ہاں، اگر تم نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔“

”صاحب! اس ہوٹل کے بہت سے کمروں اور غسل خانوں میں کیمرے لگے ہیں۔ یہ لوگ عموماً غیر ملکیوں اور نئے شادی شدہ جوڑوں کو ایسے کمرے دیتے ہیں پھر ان کی فلمیں تیار ہوتی ہیں اور وہ مارکیٹ میں سپلائی کر دی جاتی

ڈرائیور

مال روڈ پر اپنا کام نمٹانے کے بعد میں واپس آیا تو اسے غائب پایا۔ میں گاڑی کے پاس کھڑا ہو گیا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ میں شدید گرمی میں آدھا گھنٹا کھڑا رہا، وہ واپس آیا تو اس کے چہرے پر پشیمانی کے کوئی آثار نہ تھے بلکہ اس نے الٹا مجھے کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔ ”صاحب! آپ تو اندر جا کر بیٹھ ہی گئے، میں کافی دیر آپ کا انتظار کرتا رہا، پھر میں ٹہلنے چلا گیا۔ صاحب، مال روڈ کی بہت تعریفیں سنی ہوئی تھیں دیکھی آج ہے!“ پھر واپسی کے دوران گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑی ہو گئی اور کوشش کے باوجود اسٹارٹ نہ ہوئی، میں نے اسے کہا کہ ”بونٹ کھول کر چیک کرو کہ کیا خرابی ہے؟“ وہ بولا۔ ”صاحب، مجھے تو انجن کا کچھ پتا نہیں!“

”پھر کیا کیا جائے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں گاڑی میں بیٹھتا ہوں، آپ دھکا لگائیں۔“ اس نے سیدھا سا حل بتایا...!

مجھے بہت غصہ آیا مگر میں نے ایک دفعہ پھر ضبط سے کام لیا، اس سے چابی پکڑی اور اسٹیئرنگ پر بیٹھ کر اسے دھکا لگانے کے لیے کہا گاڑی اسٹارٹ ہو گئی!

”تم تو کہتے تھے کہ تمہیں گاڑی اور ڈرائیونگ کا بہت تجربہ ہے مگر لگتا ہے تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔“

”صاحب! مجھ پر الزام نہ لگائیں۔“ اس نے غصے سے کہا۔ ”میں گاؤں میں بیس سال ٹریکٹر چلاتا رہا ہوں اور میں نے نمبردار کے بیٹے کی گاڑی بھی چلائی ہے۔“

اس دفعہ میں نے بہت مشکل سے اپنے غصے پر قابو پایا، وجہ صاف ظاہر ہے، اس کے پاس پستول کا لائسنس تھا!

www.pkdigest.com

ہیں۔ اس دھندے میں انھیں ایک دو بڑے لوگوں کی سرپرستی بھی حاصل ہے۔"

"اور وہ فلمیں تم بناتے ہو؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"میں تو آپ سے پہلے ہی اپنے جرم کا اعتراف کر چکا ہوں۔" وہ مسکین سی شکل بنا کر بولا۔ "ان لوگوں نے کمروں میں تین مختلف کیمرے فٹ کر رکھے ہیں۔ وہ تو اتفاق تھا کہ جب آپ نے لینس توڑا تو وہی کیمرا آن تھا۔ ہاں جب وڈیو بناتے ہیں تو تینوں کیمرے آن کر دیے جاتے ہیں۔ اس کمرے میں جو آپ کو تین چار مانیٹر نظر آ رہے ہیں، وہ اسی مقصد کے لیے ہیں۔ وڈیو کے ساتھ ساتھ آڈیو بھی تیار ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں نے کمروں میں مائیکروفون بھی لگا رکھے ہیں۔"

"اب یہ بتاؤ کہ مجھے کافی پلانے کے بعد تم لوگوں کا کیا پروگرام تھا؟"

"کافی میں بے ہوشی کی دوا اتنی زیادہ تھی کہ آپ کا زندہ بچنا مشکل تھا۔ پھر وہ میڈم کی فلم بناتے اور انھیں بھی کہیں بیچ دیتے۔"

"ہوٹل کا اور کون ملازم اس دھندے میں شامل ہے؟"

"ہوٹل کے سبھی ملازم اس دھندے میں شامل ہیں صاحب! کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی شاردا آپ کو بہت معصوم نظر آ رہی ہوگی لیکن بعض اوقات تو وہ بھی شریف گھرانوں کی لڑکیاں گھیر کر یہاں لاتی ہے۔"

"دل تو چاہتا ہے کہ اس ہوٹل کے ہر ملازم کو گولی مار کے جہنم رسید کر دوں لیکن میں یہاں خون خرابا کرنے نہیں آیا ہوں۔" پھر میں اطمینان سے آگے بڑھا اور اچانک اس کی کنپٹی سہلا دی۔ وہ ایک مرتبہ پھر ناک آؤٹ ہو گیا۔

پھر میں نے بدمعاش اور ورما کو صوفے کے پیچھے ڈالا، کیمرا مین کو بھی ان پر پھینک دیا۔ اب اگر کوئی کمرے میں داخل ہوتا تو وہ پہلی نظر میں کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے بعد میں نے اپنا حلیہ درست کیا جو کوئی ایسا خاص نہیں بگڑا تھا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

کاؤنٹر پر وہ موٹی صورت والی لڑکی موجود تھی۔ اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ میں نے اس سے سرسری انداز میں پوچھا۔ "میرا بل بن گیا؟"

"س... وہ... بل..."

"کیا بک رہی ہو؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میں نے کہا تھا کہ مجھے ابھی اور اسی وقت جانا ہے... میرا بل ابھی تک تیار نہیں ہے؟"

"بل تیار ہے سر! لیکن وہ مسٹر ورما نے..."

"کیوں، کیا ان کی اجازت کے بغیر میں یہ ہوٹل نہیں چھوڑ سکتا؟ پورٹر کو بھیج کر میرا سامان منگواؤ اور بل بناؤ فوراً، بلکہ مجھے کمرے کا نمبر ملا کر دو... میں خود جینی سے بات کر لیتا ہوں۔"

لڑکی کی صورت پر مردنی چھا گئی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے میرے کمرے کا نمبر ملایا اور ریسیور مجھے دے دیا۔ دوسری طرف بیل بجتی رہی لیکن جینی نے فون ریسیو نہیں کیا۔ مجھے تشویش ہو گئی۔ جینی کہاں چلی گئی؟ اگر وہ واش روم میں بھی تھی تو فون تو ریسیو کر ہی سکتی تھی۔

میں نے چند منٹ کی تاخیر کے بعد دوبارہ اپنے کمرے کا نمبر ملایا۔ دوسری مرتبہ پہلی ہی بیل پر کسی نے ریسیور اٹھا لیا اور بولا۔ "ورما صاحب! اس عورت نے تو ہمیں بہت پریشان کیا ہے۔ یہ کیلاش اور گوپال کو بری طرح زخمی کر چکی ہے، بہت مشکل سے شنکر کے قابو میں آئی ہے۔ وہ بھی اس نے پیچھے سے اس کے سر پر وار کیا تھا۔"

میں بری طرح کھانسنے لگا۔ پھر بدلی ہوئی آواز میں حتی الامکان ورما کے لہجے میں بولا۔ "اس سے وہ کہاں ہے؟"

"اسے ہم نے باندھ کر ڈال دیا ہے۔ میں آپ کو کال کرنے ہی والا تھا۔"

میں پھر کھانسا اور پوچھا۔ "باقی لوگ کہاں ہیں؟"

"باقی لوگ تو آپ کے ساتھ ہی ہیں۔ راجو اور بابو دو بجے سے پہلے نہیں آتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، تم وہیں ٹھہرو میں آ رہا ہوں۔" میں نے کھانستے ہوئے جواب دیا تاکہ وہ آواز نہ پہچان لے۔

میرے پاس اس وقت دو دو ریوالور تھے۔ ورما کا جرمن لیوگر اور بدمعاش کا اعشاریہ تین آٹھ کولٹ! اسلحہ آدمی کے پاس ہو تو اسے خاصی تقویت رہتی ہے۔

میں نے دیکھا کہ موٹی صورت والی کالے من کی لڑکی بہت غیر محسوس طریقے سے کوئی نمبر ملانے کی کوشش کر رہی ہے۔

میں نے ریسیور اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور ایک ہی جھٹکے میں اس کا تار توڑ دیا پھر میں خونخوار لہجے میں بولا۔ "چلو اٹھو تم میرے ساتھ اوپر چلو۔"

"م... میں... میں تو..."

"اٹھو!" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں بھی تمہارے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو تم لوگ دوسروں کے

ساتھ کرتے ہو، جلدی کرو۔"

وہ اپنی جگہ سے یوں کانپتی اور ڈگمگاتی ہوئی اٹھی جیسے اسے پھانسی گھاٹ پر لے جایا جا رہا ہو۔

ہم لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچے۔ میں نے احتیاطاً ریوالور نکال لیا اور شاردا کو آگے رکھا۔ اس نے کمرے پر پہنچ کر دستک دی۔

فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ میں دیوار کی آڑ میں تھا۔ اندر سے کسی نے حیرت سے پوچھا۔ "ورما کہاں ہے؟ اس نے تمہیں کیوں بھیجا ہے؟"

میں اچانک شاردا کو آگے دھکیل کر کمرے میں گھس گیا۔ دروازہ کھولنے والا مجھے دیکھ کر ساکت رہ گیا۔ اس نے ہکلا کر کہا۔ "تت... تم... تو..."

"مر گئے تھے؟" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اب زندہ کیسے ہو گئے؟" اس کے ساتھ ہی میں نے اس کے منہ پر اتنے زور کا تھپڑ رسید کیا کہ وہ چھپکلی کی طرح پیٹ سے زمین پر گر گیا۔

کھڑکی کے بند شیشے پر کوئی سایہ سا لہرایا۔ میں پھرتی سے فرش پر بیٹھ گیا۔ مجھ پر پیچھے سے کسی نے حملہ کیا تھا۔ وہ اپنے ہی زور میں مجھ سے ٹکرا کر آگے کی طرف گرا۔ میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ خاصا طاقتور آدمی تھا لیکن اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ پاکستان سے آیا ہوا ایک ماڈرن شخص اس کی گردن یوں دبوچ لے گا۔

اس کے ہاتھ میں خاصا وزنی ہیمر تھا۔ وہ ہیمر اگر میرے سر پر پڑ جاتا تو میری کھوپڑی کے پرخچے اڑ جاتے۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کا ہیمر والا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے زوردار جھٹکا دیا۔ ہیمر اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔

اس دوران میں شاردا نے بھاگنے کی کوشش کی مگر میں نے اپنی ٹانگ اڑا کر اسے گرا دیا۔ منہ کے بل گرنے کی وجہ سے اس کے چہرے پر خاصی چوٹ آئی تھی۔ شاید آگے کے دو تین دانت بھی ہل گئے ہوں۔

مجھے جینی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اپنے شکار سے پوچھا۔ "جینی کہاں ہے؟"

"وہ... وہ..." پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ "میری... گردن..."

میں نے اس کی گردن پر اپنی گرفت کچھ ڈھیلی کر دی۔

"وہ باتھ روم میں ہے۔" اس نے گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

سینئر گدھے!

زندگی کے مختلف شعبوں میں کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو ایک عمر اس شعبے میں گزارنے کے باوجود اپنے نامۂ اعمال میں کوئی نیکی درج نہیں کرا سکے یعنی انھوں نے کوئی ایسا کارنامہ انجام نہیں دیا جس پر وہ فخر کر سکیں، وہ صرف اپنی سنیارٹی پر فخر کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی ناقدری کا رونا بھی بہت روتے ہیں اور جب ان سے پوچھا جائے کہ بھائی وہ وجوہات بتائیں جن کی بنا پر آپ کی قدر کی جائے تو وہ جواب میں صرف یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ وہ گزشتہ اتنے برسوں سے اس شعبے میں کام کر رہے ہیں مگر انھیں پوچھتا کوئی نہیں۔ کچھ ستم ظریفوں نے ایسے لوگوں کے لیے "خر کہنہ مشق" کی ترکیب ایجاد کی ہے جسے آسان لفظوں میں "سینئر گدھے" کہا جا سکتا ہے۔

"میرا نام شنکر ہے۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے سکون سے کمرے کا جائزہ لیا تو مجھے بیڈ کے آس پاس دو آدمی آڑے ترچھے پڑے نظر آئے۔ انھیں یقیناً جینی نے بے ہوش کیا ہوگا۔ تیسرا وہ تھا جس نے دروازہ کھولا تھا اور میرے تھپڑ کا شکار ہو گیا تھا۔

شاردا ایک مرتبہ پھر اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اس کے سر پر ہلکی سی ایک کک رسید کر دی۔ وہ دوبارہ انٹاغفیل ہو گئی۔

جینی کے سر کے پچھلے حصے پر زخم کا نشان تھا جس سے کچھ خون بھی بہا تھا لیکن خون اتنا زیادہ نہیں تھا کہ تشویش کی کوئی بات ہوتی۔ وہ اس وقت ہوش میں تھی۔ شنکر کو دیکھتے ہی وہ گندی گندی گالیاں دینے لگی۔ اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔ "تم خود تو نیچے تفریح کرنے چلے گئے اور مجھے یہاں چھوڑ گئے۔ یہ ہوٹل ہے یا جرائم کا اڈا۔ میں ابھی اپنے سفارت خانے سے رابطہ کرتی ہوں۔"

"فوری طور پر یہاں سے نکلو۔" میں نے کہا۔

میں نے یہ کہتے ہوئے شنکر کے منہ پر بھی زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔

پھر ہم بہت عجلت میں وہاں سے نکلے۔ میں نے حتی الامکان ان جگہوں کو صاف کر دیا جہاں میرے یا جینی کی انگلیوں کے نشانات ہو سکتے تھے۔

ہمارے پاس دو بڑے سوٹ کیس اور دو چھوٹے سفری بیگ تھے۔ میں نے دونوں بیگ جینی کو دیے، خود دونوں سوٹ کیس اٹھائے اور لفٹ کے بجائے احتیاطاً

www.pkdigest.com

زینے کے ذریعے نیچے پہنچا۔ ورما کے کمرے میں خاموشی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ ابھی تک ادھا شغل تھے۔ میں کاؤنٹر پر پہنچا اور سب سے پہلے شارزوا کی دراز کھول کر اپنا اور جینی کا پاسپورٹ نکالا۔ پھر میں نے ہوٹل کی انٹری کا رجسٹر تلاش کیا۔ پہلے میں نے سوچا کہ اس میں سے وہ صفحہ پھاڑ لوں جس پر میرا اور جینی کی آمد کا اندراج تھا۔ پھر میں نے پورا رجسٹر ہی اپنے قبضے میں کر لیا۔ اس کے بعد مجھے کمپیوٹر کا خیال آیا۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر اس سسٹم اندر سے توڑ پھوڑ دیا پھر رجسٹر اور سی ڈی منز جینی کے سفری بیگ میں ٹھونس دیں۔

ہم بغیر کسی رکاوٹ کے ہوٹل سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

میں باہر نکلا تو مجھے حیرت ہوئی۔ ہوٹل کے گیٹ پر وہی ٹیکسی ڈرائیور موجود تھا جو ہمیں ائرپورٹ سے یہاں لایا تھا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھا اور بولا۔ ”صاحب! آپ جا رہے ہیں، کیا ہوٹل پسند نہیں آیا؟“

”اصل میں میرین ڈرائیو میں میرا ایک دوست رہتا ہے۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ میں اس کے فلیٹ کے بجائے ہوٹل میں ٹھہرا ہوں تو وہ بہت ناراض ہوا۔ اب تم ہمیں میرین ڈرائیو لے چلو۔“

ٹیکسی ڈرائیور کے چہرے پر مایوسی کے آثار ظاہر ہوئے۔ شاید اسے اپنے اس کمیشن کی فکر تھی جو اب اسے نہیں ملتا۔ اس نے بہت بے دلی سے ہمارا سامان گاڑی کی ڈکی میں رکھا اور روانہ ہو گیا۔

ہوٹل سے کافی دور آنے کے بعد وہ ایک نسبتاً سنسان سڑک پر مڑ گیا۔ وہاں ٹریفک کی آمدورفت بھی برائے نام تھی۔ میں ڈرائیور کو بھی سبق دینا چاہتا تھا۔ اس نے خود ہی اس کا موقع فراہم کر دیا۔ اس نے جینی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سر! آپ کی مسز کے سر پر چوٹ کیسے لگی؟“

”یہ پھسل کر گر گئی۔“ میں نے کہا۔

”میرے پاس ایک بہت اچھا مرہم ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میری دادی جڑی بوٹیوں سے خود ہی وہ مرہم بناتی ہے۔ زخم تو منٹوں میں بھر جاتا ہے۔“ اس نے کہا اور ڈیش بورڈ کھول کر ایک ڈبیا نکال لی۔ اس نے جب ڈیش بورڈ کھولا تھا تو مجھے اس میں کسی گن کی جھلک دکھائی دی تھی۔

”ذرا گاڑی روکو!“ میں نے کہا۔ ”میری دوست کو قے ہونے والی ہے۔“

اس نے پھرتی سے گاڑی روک دی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی ٹیکسی جینی کی قے سے گندی ہو۔

میں نے جینی کو نیچے اترنے کا اشارہ کیا... اور خود بھی نیچے آ گیا۔ پھر میں نے ڈرائیور سے کہا۔ ”تمہارے پاس پانی تو ہوگا؟“

”جی صاحب! پانی کی بوتل تو میں اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔“ وہ پانی کی بوتل نکال لایا اور بوتل میری طرف بڑھائی۔

میں نے بوتل پکڑنے کے بجائے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

وہ لمحے بھر کو حیران رہ گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے بوتل چھینی اور اس کے ہاتھ کو زوردار جھٹکا دے کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ بری طرح مجھ سے ٹکرایا۔

اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”کیا ہوا صاحب! مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی کیا؟“

”تم مجھے اس ہوٹل میں لے کر کیوں گئے تھے؟“ میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

وہاں سے اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ میں نے ڈرائیور کا ہاتھ یوں تھام رکھا تھا جیسے وہ میرا کوئی بہت نزدیکی دوست ہو۔

”میرا تو کام ہی لوگوں کو مختلف ہوٹلوں میں لے جانا ہے۔“ ڈرائیور نے کہا۔ ”آپ نے کہا کہ کسی اچھے ہوٹل میں لے چلو، میں آپ کو وہاں لے گیا۔ کیا وہاں آپ کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے؟“

”دیکھو، جھوٹ بولو گے تو میں تمہارا ہاتھ کندھے سے اکھاڑ دوں گا۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”سچ سچ بتاؤ، تم مجھے وہاں کیوں لے گئے تھے اور تمہیں وہاں سے کتنا کمیشن ملتا ہے؟“

”کمیشن تو وہ ہر ٹیکسی والے کو دیتے ہیں۔“ ڈرائیور نے ڈھٹائی سے کہا۔

میں نے اچانک اس کی پنڈلی کے اگلے حصے پر ٹک ماردی۔ تکلیف سے اس کا چہرہ مسخ ہو گیا مگر میں نے اسے جھکنے نہیں دیا۔ ”اب بھی اگر تم سچ نہ بولے تو میں تمہارے دونوں ہاتھ کندھوں سے اکھاڑ کر تمہیں معذور کر دوں گا۔ پھر دیکھوں گا کہ تم کیسے ٹیکسی چلاتے ہو اور کتنا کمیشن کماتے ہو۔“

”آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں؟“ وہ مضمحل انداز میں بولا۔

”میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس ہوٹل کا اصل بزنس کیا ہے؟ یہ بات ذہن میں رکھنا کہ مجھے ورما، منیجر اور دوسرے لوگوں کی حقیقت معلوم ہو چکی ہے۔ میں صرف

تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔“

اس نے طویل سانس لی اور شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ ”جب آپ کو سب کچھ معلوم ہو گیا ہے تو میں کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ وہ ہوٹل نہیں ہے بلکہ عیاشی کا اڈا ہے۔ وہ لوگ نئے نویلے شادی شدہ جوڑوں کو کمرے دیتے ہیں پھر ان کی قابل اعتراض فلمیں بنا کر انہیں بلیک میل کرتے ہیں۔ جن لوگوں میں بلیک میل ہونے کی سکت نہیں ہوتی ان کی فلمیں مارکیٹ میں مہنگے داموں فروخت کر دی جاتی ہیں۔ ورما اصل میں سابق پولیس کمشنر ہے، بھارت کی دوسری ایجنسیوں سے بھی اس کے تعلقات ہیں۔ اس کے علاوہ کئی ایم ایل اے اور منسٹر بھی اس کے ذاتی دوست ہیں، میرا خیال ہے کہ وہ بھی اس کاروبار میں اس کے شریک ہیں اسی لیے وہ اتنی دیدہ دلیری سے یہ کام کرتا ہے۔ ہوٹل کا مالک تیجے کمار بہت بڑا بزنس مین ہے۔ اصل میں تو اس کی کئی اسٹیل ملز ہیں۔ ہوٹل تو وہ محض شوقیہ چلاتا ہے۔ باقی لوگ ورما کے ملازم ہیں۔ ان میں سے بھی زیادہ تر پولیس کے ریٹائرڈ لوگ ہیں۔“

”تمہیں وہاں سے کتنا کمیشن ملتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”پارٹی پر منحصر ہوتا ہے سر! اگر پارٹی پیسے والی ہے تو کمیشن دس ہزار تک بھی مل جاتا ہے۔ غریب ہو تو بھی اتنا ہی کمیشن ملتا ہے۔“

”میں تمہیں دس ہزار دوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن شرط یہ ہے کہ تم اس واقعے کو بالکل بھول جاؤ گے۔ نہ تم مجھے ائرپورٹ سے ہوٹل لائے تھے، نہ میں تمہیں یہاں لے کر آیا تھا۔ میں نے تمہاری ٹیکسی کا نمبر نوٹ کر لیا ہے۔ اب تک تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں انڈیا کے انڈر ورلڈ ڈان کا آدمی ہوں۔“

اس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ”آپ... داؤد بھائی کے آدمی... بھائی! آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ مجھ سے کوئی بھول ہوئی ہو تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔ میں آپ کے پیر پڑتا ہوں۔ میں...“

اس نے جھک کر میرے پیر پکڑنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے روک دیا۔ پھر میں نے جیب سے دس ہزار روپے نکالے اور اس کی طرف بڑھا دیے۔ ”لو، یہ رکھ لو۔“

”اس کی کیا ضرورت ہے بھائی؟“ وہ جلدی سے بولا۔ ”سمجھیں کہ میں سب کچھ بھول گیا۔“

”یہ میں تمہیں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ بھائی کے آدمی وعدہ خلاف لوگوں کو کبھی معاف

ملک بھر میں

گھر بیٹھے رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

صرف 600 روپے سالانہ بینک ڈرافٹ، پے آرڈر یا منی آرڈر کے ذریعے جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے نام مندرجہ ذیل پتے پر ارسال کر دیں اور 12 ماہ اپنے گھر کی دہلیز پر اپنی پسند کا پرچہ رجسٹرڈ ڈاک سے وصول کرتے رہیں۔ 600 روپے فی پرچہ کے حساب سے آپ ایک سے زائد پرچوں کے لیے یکمشت رقم بھیج کر طویل مدت کے لیے بے فکر ہو سکتے ہیں۔

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

فون: 5895313 فیکس: 5802551

E-mail:jdpgroup@hotmail.com

اگر آپ کو پرچوں کے حصول میں دقت پیش آ رہی ہے تو مندرجہ ذیل فون نمبر پر رابطہ کر سکتے ہیں

ثمر عباس: 0301-2454188

نہیں کرتے، بس اب تم مجھے میرین ڈرائیو چھوڑ دو۔ ہاں، اگر تمہارے پاس ورما اور دوسرے لوگوں کے ایڈریس ہوں تو وہ مجھے نوٹ کرا دینا۔"

اس دوران میں جینی بالکل خاموش رہی تھی۔ اس کے پلے کچھ پڑا ہی نہیں تھا کیونکہ ہم لوگ اردو میں یا بقول ڈرائیور کے ہندی میں گفتگو کر رہے تھے۔

ڈرائیور اب بہت مؤدب نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک نوٹ بک میری طرف بڑھا دی جس میں ورما اور دوسرے لوگوں کے ایڈریس اور فون نمبرز تھے۔ پھر اس نے ہمیں جلد ہی میرین ڈرائیو کے علاقے میں اتار دیا۔ اس نے تو سامان اوپر فلیٹ تک لے جانے کی آفر بھی کی لیکن میں نے انکار کر دیا اور کہا کہ میرے دوست کا ملازم سامان لے جائے گا۔ بس تم اپنا وعدہ یاد رکھنا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اس علاقے کا جائزہ لیا۔

"اب کیا سارا وقت یہیں کھڑے رہو گے؟" جینی نے کہا۔ "میرے سر میں شدید تکلیف ہے۔ اب کسی اچھے ہوٹل میں چلو۔"

"میں فوری طور پر ممبئی چھوڑنا چاہ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

جینی نے مجھے یوں دیکھا جیسے اسے میرے ذہنی توازن پر شبہ ہو۔ "تم ان بدمعاشوں سے ڈر کے ممبئی سے بھاگ رہے ہو؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"وہ محض بدمعاش نہیں تھے جینی!" میں نے کہا۔ "وہ بہت اثر رسوخ والے لوگ ہیں۔ ان میں سے ایک پولیس کا سابق کمشنر ہے، دوسرا انڈیا کا اسمگلنگ کنگ ہے۔ اس کے علاوہ کئی ایم ایل اے بھی اس بزنس میں ملوث ہیں۔"

"کس بزنس میں؟" جینی نے پوچھا۔ اسے تو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان ہوٹل والوں کا بزنس کیا ہے؟ کیونکہ ساری گفتگو اردو میں ہوئی تھی۔

میں نے اسے مختصراً اس گھناؤنے بزنس کے بارے میں بتایا۔

وہ یہ سن کر گنگ رہ گئی اور بولی۔ "میں تو سمجھی تھی کہ ہوٹل والوں نے محض اپنی سیفٹی کے لیے وہاں ٹی وی کیمرا لگایا ہے لیکن..."

اس وقت مجھے ایک خالی ٹیکسی نظر آ گئی۔ میں نے اشارے سے اسے روک لیا اور ائرپورٹ چلنے کو کہا۔

میں فوری طور پر دہلی جانا چاہتا تھا۔ وہاں خالہ نسیمہ تھیں، خالو تھے اور ان کی فیملی کے دوسرے لوگ تھے جو کانگریس میں اچھے عہدوں پر تھے۔

دہلی کی فلائٹ ایک گھنٹے بعد تھی۔ ہم لاؤنج میں بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ میں نے جینی سے کہا۔ "ان بدمعاشوں نے تو سوچا بھی نہیں ہوگا کہ ہم ممبئی چھوڑ کر کہیں اور نکل جائیں گے۔ وہ ہمیں ممبئی کے ہوٹلوں میں تلاش کرتے رہیں گے اور ہم..." میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔

مجھے لاؤنج میں ورما کی جھلک نظر آئی تھی۔ وہ ہم سے خاصے فاصلے پر تھا۔ میں نے جلدی سے اخبار اپنے چہرے کے سامنے کر لیا اور جینی سے کہا کہ تم سر پر کیپ لگا کر چشمہ لگا لو اور کوئی میگزین اٹھا لو، سر کی چوٹ تمہاری سب سے بڑی شناخت ہے۔

ورما واقعی پولیس کمشنر تھا۔ اس نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ ان حالات میں ہم ممبئی میں ٹھہرنے کی حماقت نہیں کریں گے۔ ممکن ہے اس کے کچھ آدمی ہمیں ریلوے اسٹیشن اور بسوں کے اڈوں پر بھی تلاش کر رہے ہوں۔

مجھے خطرہ یہ تھا کہ ورما نے کہیں مسافروں کی لسٹ نہ دیکھ لی ہو۔ لسٹ میں ہمارے اصلی نام تھے۔

اسی وقت اعلان ہوا کہ دہلی جانے والا جہاز اڑان بھرنے کو تیار ہے۔ مسافروں سے درخواست ہے کہ وہ جہاز میں سوار ہو جائیں۔

میں نے جینی کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ٹہلنے والے انداز میں آگے بڑھ گیا۔ ابھی ایک خطرہ اور بھی تھا۔ ورما اپنی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر فلائٹ کے دروازے پر کھڑا ہو سکتا تھا۔ وہ جہاز میں داخل ہو کر ایک ایک مسافر کا جائزہ لے سکتا تھا لیکن یہ خطرہ تو مول لینا ہی تھا۔

شکر ہے کہ یہ خطرہ بھی ٹل گیا۔ آدمی کتنا ہی گھاگ اور ذہین ہو، کہیں نہ کہیں غلطی ضرور کرتا ہے۔ غلطی ورما سے نہیں بلکہ اس کے آدمی سے ہوئی تھی۔

ہم اپنی سیٹ پر بیٹھ چکے تو ورما جہاز میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ پولیس کے کچھ آدمی تھے۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اب ورما کے ہتھے چڑھنا گویا پھانسی کے تختے پر چڑھنا تھا۔

ہماری سیٹیں خاصی آگے تھیں۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اخبار اپنے چہرے کے سامنے پھیلا لیا۔ لیکن میں ورما ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ ہم سے چند سیٹوں کے فاصلے پر تھا کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے فون کان سے لگایا اور بولا۔

"ہیلو... کیا... تم نے انہیں کہاں دیکھا... ریلوے اسٹیشن پر... لیکن ان کا نام تو... اچھا... میں ابھی ریلوے اسٹیشن پہنچ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے واپسی کے لیے پلٹ گیا اور بلند آواز میں پولیس والوں سے بولا۔ "یہ کامران واقعی پاکستانی ایجنسی کا ایجنٹ ہے۔ اسی ٹیکسی ڈرائیور کا فون تھا جو اسے ائرپورٹ سے ہوٹل لے گیا تھا۔ وہاں سے نکلنے کے بعد بھی وہی ڈرائیور اسے ائرپورٹ لایا تھا۔ اس نے دہلی کے دو ٹکٹ خریدے، پھر ممکن ہے کسی اور کو دے دیے ہوں۔ وہاں سے وہ بسوں کے اڈے پر گیا اور دوسری ٹیکسی پکڑ کر ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ مہندر اس وقت ریلوے اسٹیشن پر تھا۔ اس لڑکی کے سر پر چوٹ لگی ہے اس لیے وہ اسے پہچان گیا۔ ویسے کامران کو بھی لاکھوں میں شناخت کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے قد کاٹھ اور شکل صورت سے ترک یا امریکن لگتا ہے۔ اب جلدی کرو۔ میں ان لوگوں کو چھوڑوں گا نہیں۔"

وہ لوگ تیزی سے باہر نکل گئے۔ میں نے سکون کا طویل سانس لیا اور جینی کو مختصراً بتایا کہ ورما واپس چلا گیا۔

بقیہ سفر اطمینان اور سکون سے گزرا لیکن ابھی ایک خطرہ اور تھا۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی ورما دہلی کی پولیس کو مطلع کر سکتا تھا۔ اس نے نہ جانے مجھ پر کیا کیا الزام لگا رکھے تھے۔ سب سے بڑا الزام تو یہی تھا کہ میں اس کی نظروں میں ایجنٹ تھا۔

"کامران! اس ٹیکسی ڈرائیور نے ہماری جان بچائی ہے تم کم از کم فون کر کے اس کا شکریہ ہی ادا کر دو۔" جینی نے کہا۔

"میں خود بھی یہی چاہتا تھا لیکن اگر ورما کو ڈرائیور پر شبہ ہو گیا تو اس کے سیل فون میں میرا نمبر دیکھ کر وہ سمجھ جائے گا کہ ڈرائیور کا مجھ سے کوئی تعلق ہے۔ میرا نمبر پاکستانی ہے۔"

"ایک منٹ!" جینی نے کہا۔ پھر اپنے سامنے بیٹھی ہوئی عورت سے بولی۔ "میڈم! کیا میں آپ کا سیل فون استعمال کر سکتی ہوں۔ میرا سیل فون یہاں کام نہیں کر رہا ہے۔"

"ضرور!" خاتون نے خوش دلی سے کہا اور اپنا فون جینی کی طرف بڑھا دیا۔

میرے پاس مہندر (ٹیکسی ڈرائیور) کا نمبر موجود تھا۔ میں نے اس کا نمبر ملایا تو دوسری ہی گھنٹی میں اس نے اٹھا لیا۔ "ہیلو!"

"کیسے ہو مہندر؟" میں نے پوچھا۔

بیرونِ ملک مقیم قارئین

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ ، ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ، ماہنامہ سرگزشت

کے

سالانہ خریدار

بن کر بذریعہ رجسٹرڈ ائرمیل
اپنا پسندیدہ ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کریں

ایشیا یورپ اور افریقہ کے لیے فی ڈائجسٹ

زرِ سالانہ 4500 روپے یا 65 امریکی ڈالر

امریکا، آسٹریلیا، کینیڈا اور نیوزی لینڈ کے لیے فی ڈائجسٹ

زرِ سالانہ 5500 روپے یا 80 امریکی ڈالر

اپنے ڈرافٹ اور منی آرڈر ادارے کے نام، درج ذیل پتے پر ارسال کریں۔ یہ کراچی میں قابلِ ادائیگی ہونا ضروری ہیں۔ بیرونِ شہر ادائیگی کی صورت میں کوریئر چارجز اور چیک کیشن کے 600 روپے اور بیرونِ ملک ادائیگی والے ڈرافٹ وغیرہ پر اس مد میں 20 امریکی ڈالر کا اضافہ کر لیں

رابطہ کیجیے

ثمر عباس: 0301-2454188

یا

بدرالدین سرکولیشن منیجر
فون نمبر (92)(21)5802552,5804200
فیکس نمبر (92)(21) 5802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C PHASE II EXTENSION ,
D.H.A., MAIN KORANGI ROAD,
,KARACHI 75500
E-MAIL :JDPGROUP@HOTMAIL.COM

"کون صاحب بول رہے ہیں؟" اس نے ٹریفک کے رش میں میری آواز نہیں پہچانی۔

"مہندر! تم نے ورما کو دھوکا دے کر مجھ پر جو احسان کیا ہے، میں اسے ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جن سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔"

"ارے کامران صاحب! اچھا ہوا آپ نے فون کر لیا۔ ورما پاگل کتے کی طرح آپ کو پورے شہر میں تلاش کر رہا ہے۔ اس نے دہلی کی پولیس کو بھی مطلع کر دیا ہے کہ پاکستانی ایجنٹ اس فلائٹ سے دہلی پہنچ رہا ہے۔ اس کے ساتھ اس کی امریکن بیوی بھی ہے۔"

"شکریہ مہندر!" میں نے کہا۔ "اب میں زیادہ محتاط رہوں گا۔" میں نے سلسلہ منقطع کر کے نمبر صاف کیا اور فون ہم سفر خاتون کو شکریے کے ساتھ واپس کر دیا۔

اب مجھے ایک اور خطرے کا سامنا تھا ... میرا ذہن بہت تیزی سے اس مسئلے پر غور کر رہا تھا۔ میں نے جینی کو بھی اس خطرے سے آگاہ کر دیا۔ وہ بھی فکرمند تھی۔ اگر ورما نے واقعی دہلی پولیس کو میری آمد سے مطلع کر دیا تھا تو پھر دنیا کی کوئی طاقت مجھے بھارتی پولیس اور خفیہ ایجنسیوں سے نہیں بچا سکتی تھی۔

ایک دفعہ تو میرے جی میں آئی کہ میں یہ طیارہ اغوا کر لوں لیکن پھر خود ہی مجھے اس خیال پر ہنسی آ گئی۔ میں بغیر کسی ہتھیار کے وہ طیارہ کیسے اغوا کر سکتا تھا؟ روانگی سے پہلے میں نے ورما اور اس کے آدمی سے چھینے ہوئے دونوں ریوالور کچرے کے ڈبے میں پھینک دیے تھے۔ کسی بھی فلائٹ پر اسلحہ لے کر سوار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ خود کو دہشت گرد ثابت کر دو۔ مجھے تو ورما نے ویسے بھی ایجنٹ بنا دیا تھا۔

جوں جوں دہلی ائرپورٹ نزدیک آ رہا تھا، میرے اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے جینی سے کہا۔ "تم مجھ سے الگ ہو کر ائرپورٹ سے باہر نکلنے کی کوشش کرنا۔ تمہارا امریکن پاسپورٹ دیکھ کر کسی کی جرأت نہیں ہوگی کہ تمہیں روکے۔"

"اور تم؟ تم کیا کرو گے؟"

"میں بھی کچھ نہ کچھ تو کر ہی لوں گا۔ ہاں، تم باہر نکلنے کے بعد حالات پر نظر رکھنا۔"

جینی کے چہرے پر شدید تناؤ تھا۔ وہ مجھے چھوڑ کر جانے پر آمادہ نہیں تھی لیکن میں نے اسے کسی نہ کسی طرح راضی کر ہی لیا۔

جب ہم وزیٹر لاؤنج میں پہنچے تو میں نے جینی سے الوداعی ملاقات کی اور اس سے کہا کہ تم باہر کسی ٹیکسی کو بک کر لینا۔ ممکن ہے ہمیں بہت عجلت میں یہاں سے بھاگنا پڑے۔ حالات کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔

جینی اپنے سامان کے لیے کنویئر بیلٹ کی طرف چلی گئی۔

اچانک میری نظر لاؤنج کے غسل خانے پر پڑی۔ میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح آیا۔ میں نے سامان ایک ٹرالی میں رکھا اور ٹرالی وہیں چھوڑ کر ٹہلتا ہوا غسل خانے کی طرف چلا گیا۔ وہاں لائن سے غسل خانے تھے اور سب شیشے کی طرح چمک رہے تھے۔ باتھ روم کے باہر ایک قطار میں واش بیسن اور آئینے لگے ہوئے تھے۔ میں یونہی ایک واش بیسن پر منہ دھونے لگا۔ وہاں اس وقت بالکل سناٹا تھا۔

اچانک وہاں صفائی کرنے والا ایک شخص نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کی بالٹی اور فرش صاف کرنے کا پوچا تھا۔

میرا ارادہ تھا کہ ائرلائن کے عملے کے کسی آدمی کو شکار کر لوں گا لیکن اسے دیکھ کر میرا ارادہ بدل گیا۔

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "سنو، کیا نام ہے تمہارا؟"

"رام پیارے سرکار!" اس نے گھگیا کر کہا۔

"یہاں کی صفائی تم کرتے ہو؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"جی حضور!" اس نے لجاجت سے کہا۔

"ذرا اس غسل خانے کی حالت دیکھو۔" میں نے غسل خانے کی قطار کے آخری غسل خانے کی طرف اشارہ کیا۔ "ایسا لگتا ہے جیسے مہینوں سے اس کی صفائی نہیں ہوئی ہے۔"

"ہم تو ہر پندرہ منٹ بعد صفائی کرتے ہیں حضور! یہاں ہر طرح کا مسافر آتا ہے۔ میں ابھی صفائی کر دیتا ہوں۔"

"پہلے تم اس غسل خانے کی صفائی کرو۔" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "تم شاید مجھے پہچانتے نہیں ہو۔"

"میں ابھی صفائی کرتا ہوں حضور!" اس نے اپنی بالٹی اور پوچا اٹھایا اور آخری سرے والے غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔

میں اس سے چند قدم پیچھے تھا۔

وہ جونہی غسل خانے میں داخل ہوا، میں بھی اس کے پیچھے داخل ہو گیا۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا، پھر صاف ستھرے غسل خانے کو دیکھا، کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے اسے اتنا موقع ہی نہیں دیا۔ میں نے اچانک اس کے منہ پر ہاتھ رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی کنپٹی ... پر دباؤ ڈالا۔ وہ لمحوں میں میرے ہاتھ میں جھول گیا۔ ائرپورٹس کے غسل خانوں میں جگہ بہت تنگ ہوتی ہے۔ میں نے بمشکل تمام اس کی میلی ڈانگری اتاری اور پھرتی سے اپنی جینز اور ٹی شرٹ پر وہ ڈانگری کسی نہ کسی طرح چڑھا ہی لی۔ اس کی ڈانگری میں سے بہت غلیظ بُو آ رہی تھی لیکن اپنی جان بچانے کے لیے مجھے وہ بُو برداشت کرنا تھی۔ اس کے غلیظ جوتے میرے پیروں میں بڑے تھے لیکن کام چلانے کے لیے کافی تھے۔ اس کی میلی اور پسینے میں تر ٹوپی لگاتا تو مزید جان جوکھوں کا کام تھا۔ میں نے وہ ٹوپی بھی لگا لی۔

ہر طرح سے تیار ہو کر میں نے اپنے جوتوں کو رام پیارے کی بالٹی میں پھینک دیا۔ میں نے احتیاطاً رام پیارے کی کنپٹی پر ایک ہاتھ مزید رسید کر دیا تاکہ وہ کم از کم ایک گھنٹے تک ہوش میں نہ آ سکے۔

میں نے جھانک کر باہر دیکھا۔ کچھ دیر پہلے مجھے باہر سے پانی گرنے کی آواز آئی تھی۔ شاید کوئی مسافر وہاں آیا تھا لیکن اب وہاں سناٹا تھا۔

میں نے واش بیسن کے شیشے میں اپنا جائزہ لیا۔ پہلی نظر میں تو میں بھی خود کو نہیں پہچان سکا۔ بس ایک پریشانی تھی ... میری صاف ستھری رنگت اس حلیے سے میل نہیں کھا رہی تھی۔ وہاں کوئی چیز ایسی بھی نہیں تھی جس سے اپنی سرخ و سفید رنگت کو بدل سکتا۔ یہ رسک تو بہرحال لینا ہی تھا۔ میں نے رام پیارے کا شناختی کارڈ گلے میں لٹکایا اور باہر نکلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

اچانک وہاں ... دو پولیس والے داخل ہو گئے۔

میں نے کسی گھبراہٹ کا مظاہرہ کیے بغیر فرش پر پوچا لگانا شروع کر دیا اور ساتھ ساتھ بھونڈی آواز میں گانے بھی لگا۔

"نہ لحاف نہ غلاف، ٹھنڈی ہوا بھی خلاف سسری!"

"تجھے اتنی گرمی میں لحاف کی سوجھ رہی ہے؟" ایک پولیس والے نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

میں اس کی بات کا جواب دیے بغیر اپنا کام کرتا ہوا سر جھکائے باہر نکل گیا۔

میں باہر نکلا تو میرے سامان کی ٹرالی غائب تھی۔ کسی نے لاوارث جان کر اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ سامان سے زیادہ مجھے اپنے پاسپورٹ کی فکر تھی جو اس سامان میں تھا۔

میں صفائی کرتا ہوا ائرپورٹ لاؤنج سے باہر نکلنے لگا تو مجھے گیٹ پر ائرپورٹ سیکیورٹی کے ساتھ پولیس کا ایک سب انسپکٹر اور دو کانسٹیبل بھی نظر آئے۔

ان لوگوں نے مجھ پر توجہ دیے بغیر میرا راستہ چھوڑ دیا۔ البتہ ائرپورٹ سیکیورٹی والے نے میرے شناختی کارڈ کو غور سے دیکھا۔

کافی دور جا کر برآمدے کے ایک پلر کی آڑ میں میں نے وہ غلیظ بالٹی اور پوچا رکھ دیا اور ٹہلنے والے انداز میں آگے بڑھا۔ وزیٹرز لاؤنج اور برآمدے میں پولیس کتوں کی طرح میری بُو سونگھ رہی تھی۔

اب مجھے جینی کی تلاش تھی۔ وہ مجھے ایک ریڈیو کیب کے پاس کھڑی نظر آئی۔ میں اس غلیظ ڈانگری اور ٹوپی میں تو اس کیب میں سوار بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ وزیٹرز لاؤنج کے باہر بھی تو باتھ روم ہوتے ہیں۔ میں نے دوبارہ بالٹی اور پوچا اٹھایا اور باتھ روم کی طرف روانہ ہو گیا۔

باہر کے باتھ روم اندر کے مقابلے میں زیادہ گندے تھے۔ میں نے ایک باتھ روم میں داخل ہو کر رام پیارے کی ڈانگری اور ٹوپی سے نجات حاصل کی پھر اس کے جوتے بھی اتار دیے اور اپنے گیلے جوتے دوبارہ پہن لیے۔ میں نے رام پیارے کے کپڑے اسی بالٹی میں ڈال دیے اور باتھ روم سے باہر آ گیا۔

اب مجھے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی کیونکہ اب میں اپنے اصلی حلیے میں تھا لیکن پولیس کی ساری توجہ وزیٹرز لاؤنج اور امیگریشن کاؤنٹرز پر تھی۔

میں ٹہلتا ہوا جینی کے پاس پہنچا اور خالص امریکن لہجے میں کہا۔ "ہیلو سوئٹی! آر یو الون؟"

"آف کورس!" جینی نے ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آئی ایم فرام کینیڈا۔" میں نے کہا۔

"میرا تعلق امریکا سے ہے!" جینی مسکرا کر بولی۔ "میں اپنے ایک فرنچ بوائے فرینڈ کا انتظار کر رہی تھی لیکن لگتا ہے کہ اسے کوئی اور گرل فرینڈ مل گئی ہے۔ ویسے تم بھی برے نہیں ہو۔ آؤ، گاڑی میں آ جاؤ۔"

"میں پہلی دفعہ انڈیا آئی ہوں۔" جینی نے ڈرائیور سے کہا۔ "یہاں کے سب سے اچھے ہوٹل چلو۔"

"او کے میڈم!" ڈرائیور نے کہا اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

امریکا میں رہ کر میں نے اور تیمور نے تھوڑی بہت اسپینش بھی سیکھ لی تھی۔ جینی تو باقاعدگی سے اسپینش سیکھتی رہی تھی۔

www.pkdigest.com

انڈیا کا تقریباً ہر فرد انگلش سمجھتا ہے۔ اس کا کریڈٹ نہرو حکومت کو جاتا ہے۔ اس نے اردو دشمنی میں تمام اسکولوں میں انگلش رائج کردی۔ اب وہاں کا کوئی چھوٹا موٹا اسکول ہو یا یہاں کے انگلش لیول کا اسکول، ہر اسٹوڈنٹ کم از کم روانی سے انگریزی ضرور بول لیتا ہے۔ پھر وہاں کے ٹیکسی ڈرائیور تو انگلش کچھ زیادہ ہی روانی سے بولتے ہیں۔

میں نے اسی خدشے کے پیشِ نظر جینی کو انگلش میں آگاہ کیا کہ میرا سامان گم ہوگیا ہے۔

''ڈرائیور! یہاں کہیں اچھی کافی ملتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔ میں اس بہانے نسیمہ خالہ کو ٹیلی فون کرنا چاہتا تھا۔

''تمہیں کافی کی پڑی ہے۔ میری بھوک کے مارے جان نکلی جارہی ہے۔'' جینی نے کہا۔ ''مجھ سے تو فلائٹ پر بھی کچھ نہیں کھایا گیا۔''

''آپ فکر مت کریں میڈم!'' ڈرائیور نے مہذب لہجے اور شستہ انگلش میں کہا۔ ''یہاں ایک بہترین ریسٹورنٹ ہے، وہاں کی کافی تو مشہور ہے ہی، وہاں بہت اچھے سینڈوچز اور پیٹیز بھی ملتے ہیں۔''

چند منٹ بعد اس نے گاڑی ایک صاف ستھرے ریسٹورنٹ کے سامنے روک دی۔

وہاں اچھی بات یہ تھی کہ فیملیز کے لیے علیحدہ کیبن بنے ہوئے تھے۔ میں نے ویٹر کو کافی اور سینڈوچز کے ساتھ ساتھ برگرز کا بھی آرڈر دے دیا۔

پھر میں نے جیب سے اپنا سیل فون نکالا اور نسیمہ خالہ کا نمبر ملایا۔۔۔ میں نے روانگی سے پہلے انٹرنیشنل رومنگ کی سہولت حاصل کرلی تھی۔

نمبر ملتے ہی دوسری طرف سے ایک مترنم آواز سنائی دی۔ ''ہیلو!''

''آپ کون بول رہی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کون ہیں؟'' پوچھنے والی کا لہجہ اب سخت ہوگیا۔ اس قسم کے سوالات وہی لوگ کرتے ہیں جو لڑکیوں سے خوامخواہ فری ہونا چاہتے ہیں۔

''مجھے نسیمہ خالہ سے بات کرنی ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا کہ مبادا وہ فون بند نہ کردے۔

''نسیمہ خالہ؟'' اس مرتبہ بولنے والی کے لہجے میں الجھن تھی، پھر وہ چہک کر بولی۔ ''وہاٹ اے سرپرائز! کامی بھائی، یہ آپ ہیں؟''

''ہاں، اتفاق سے میں ہی ہوں۔ تم شاید کیا بلکہ یقیناً نوشین ہو۔''

''آپ نے بالکل صحیح پہچانا۔'' نوشین نے کہا۔ ''ایک منٹ ہولڈ کریں۔ میں امی سے بات کراتی ہوں۔ ویسے آپ بول کہاں سے رہے ہیں؟''

''فی الحال تو منہ سے بول رہا ہوں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ پھر سنجیدہ ہوکر بولا۔ ''نوشین! میں اس وقت دہلی میں موجود ہوں اور بہت مصیبت میں گرفتار ہوں۔ پولیس میری تلاش میں ہے۔''

''مذاق مت کریں کامی بھائی!'' نوشین نے بے یقینی سے کہا۔ ''اپریل کو گزرے ہوئے بھی کافی عرصے سے زیادہ ہو گیا ہے۔''

''میں مذاق نہیں کررہا ہوں نوشین۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''پولیس کسی بھی وقت مجھے گرفتار کرسکتی ہے۔''

''لیجیے امی آگئیں، آپ ان سے بات کیجیے۔'' نوشین نے کہا۔ اس کے لہجے میں ابھی تک بے یقینی تھی۔

''ہیلو!'' دوسری طرف سے خالہ نسیمہ کی آواز سنائی دی۔

''السلام علیکم خالہ جان!'' میں نے کہا۔ ''میں کامران بول رہا ہوں۔''

''جیتے رہو بیٹا!'' نسیمہ خالہ نے کہا۔ ''تمہاری اماں نے تو ٹیلی فون پر بتایا تھا کہ تم اپنی کسی دوست کے ساتھ انڈیا آرہے ہو۔ کیا ابھی تک وہاں سے چلے نہیں؟''

''میں دہلی پہنچ چکا ہوں خالہ جان!'' میں نے کہا۔ ''اور اس وقت بہت مصیبت میں ہوں۔ دہلی کی پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ یہ لوگ مجھے کسی بھی وقت گرفتار کر سکتے ہیں۔''

''یا اللہ خیر!'' خالہ جان نے کہا۔ ''تم نے ایسا کیا کر دیا کہ یہ لوگ تمہارے پیچھے لگ گئے۔ خیر، تم گھبراؤ مت! تم اس وقت ہو کہاں؟''

''میں اس وقت ہوٹل اشوکا کی طرف جارہا ہوں تاکہ بعد میں ٹیکسی والا ہماری نشاندہی نہ کرسکے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم وہاں پہنچ کر ہوٹل کے لاؤنج میں سعید کا انتظار کرو۔ میں اسے بھیج رہی ہوں۔'' سعید میرا کزن تھا۔

''اوکے۔۔۔ میں دس منٹ میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔''

پھر میں نے جینی کو اپنی گفتگو سے آگاہ کیا۔ یہ بات اب مجھے کھلنے لگی تھی کہ جینی کے لیے ہر بات کو دہرانا پڑتا تھا۔

''اب تمہیں پتا چلا کہ میں کافی کیوں پینا چاہتا تھا؟'' میں نے جینی سے کہا۔ ''میں اصل میں آنٹی سے بات کرنا

چاہتا تھا جو ٹیکسی ڈرائیور کی موجودگی میں ممکن نہیں تھا۔ تم بھوک سے مری جارہی تھیں نا! اب جلدی سے یہ سب ٹھونسو اور یہاں سے نکلو۔ سعید بھائی ہم سے پہلے ہی وہاں پہنچ جائیں گے۔''

ہم نے جلدی جلدی کافی ختم کی اور پھر ریسٹورنٹ سے باہر آگئے۔ ٹیکسی ڈرائیور ہمارا انتظار کررہا تھا۔

اس نے دس منٹ سے بھی کم وقت۔۔۔ میں ہمیں ہوٹل پہنچا دیا۔

ہمیں دیکھ کر ہوٹل کے پورٹر ہماری طرف لپکے اور پھرتی سے سامان اتار لیا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو فارغ کیا اور جینی کے ساتھ اندر داخل ہوگیا۔

کاؤنٹر پر پہنچ کر میں نے خوب صورت سی خاتون کو بیٹھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر کاروباری مسکراہٹ گویا چسپاں کردی گئی تھی۔

''یس سر!'' اس نے مزید مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے پوچھا۔

''میرا تعلق ملٹی نیشنل کمپنی پریزما سے ہے!'' میں نے کہا۔ ''مجھے پندرہ کمرے درکار ہیں اپنے افسران کے لیے۔۔۔''

لڑکی کا چہرہ سنتے ہی ایک لمحے کو تاریک ہوگیا لیکن اس نے لمحوں میں خود کو سنبھال لیا اور بولی۔ ''سر! اس کے لیے تو آپ کو کم از کم ہمیں ایک ہفتے پہلے مطلع کرنا تھا۔ لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں، میں سب سنبھال لوں گی۔ آپ تشریف رکھیں، میں اپنے منیجر سے بات کرکے آپ کو ابھی بتاتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں بھی مسکرایا۔

میں جینی کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھ گیا۔ یہاں بھی پولیس کا خطرہ تھا اس لیے میں نے جینی سے کہا کہ تم مجھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھو اور اگر پولیس مداخلت کرے تو تم کسی بھی صورت میں شناسائی ظاہر مت کرنا۔

جینی ایک میگزین لے کر مجھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔ میں نے بھی اخبار اٹھالیا اور اسے اپنے چہرے کے سامنے پھیلالیا۔

میری نظریں بظاہر اخبار پر تھیں لیکن میں ہوٹل کے داخلی دروازے کا جائزہ لے رہا تھا۔

اچانک ہوٹل میں پولیس کا ایک انسپکٹر داخل ہوا اور سیدھا کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ وہ غالباً یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ہم لوگ اس ہوٹل میں ہیں یا نہیں؟

اسی وقت سعید بھائی لاؤنج میں داخل ہوئے۔ وہ متلاشی نظروں سے اردگرد دیکھ رہے تھے لیکن وہ مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے کیونکہ میرا چہرہ اخبار کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ مجھے یہ خطرہ تھا کہ سعید بھائی کہیں یہ سمجھ کر باہر نہ چلے جائیں کہ ہم اب تک وہاں پہنچے نہیں ہیں۔

وہ چند قدم آگے آئے تو میں نے اخبار کی اوٹ ہی سے انہیں آواز دی۔ ''سعید بھائی!''

انہوں نے چونک کر دیکھا اور تیر کی طرح میری طرف آئے۔ ''شکر ہے کہ تم اب تک محفوظ ہو۔ باہر پولیس کی ایک جیپ کھڑی ہے اور ابھی ایک انسپکٹر تمہاری تلاش میں اندر بھی آیا ہے۔''

اچانک مائیکروفون پر اعلان ہوا۔ ''مسٹر ایڈمنسٹریٹر فرام پریزما انٹرنیشنل! پلیز کاؤنٹر پر رپورٹ کریں۔''

''چلو جلدی باہر نکلو۔'' سعید بھائی نے کہا۔ ''اور وہ لڑکی کہاں ہے جو تمہارے ساتھ آئی ہے؟''

جینی اس وقت ہماری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے اٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اٹھ گیا۔

پورچ میں سعید بھائی کی گاڑی موجود تھی۔ انہیں دیکھ کر شوفر نے بہت مؤدب انداز میں گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

میں نے پہلے جینی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر خود بھی جلدی سے بیٹھ گیا۔ سعید بھائی ڈرائیور کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھ گئے۔

ہم گھر پہنچے تو وہاں عجیب کشیدگی کا ماحول تھا۔ نسیمہ خالہ بہت پریشان تھیں۔ نوشین کے چہرے پر بھی پریشانی تھی۔ انکل ابھی تک آفس سے نہیں آئے تھے۔ آنٹی نے غالباً انہیں مطلع بھی نہیں کیا تھا ورنہ وہ بھی اس وقت موجود ہوتے۔

نوشین نے جینی کو دیکھا تو اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ پھر وہ فوراً ہی سنبھل گئی اور جینی سے بولی۔ ''آپ انڈیا گھومنے آئی ہیں لیکن بدقسمتی سے ایسے حالات پیدا ہوگئے ہیں کہ آپ یہ ٹرپ انجوائے نہیں کرسکیں گی۔ انڈیا تو میں بھی گھمادیتی لیکن کامی بھائی ساتھ ہوتے تو آپ زیادہ مزے اٹھاتیں۔ خیر، ابھی تو آپ چل کر فریش ہوجائیں۔ میں نے آپ کا کمرا سیٹ کردیا ہے۔ باقی باتیں ڈنر کے بعد کریں گے۔''

''کامران! میرا خیال ہے کہ تم بھی فریش ہو جاؤ۔'' سعید بھائی نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ تم کئی دن سے نہائے نہیں ہو۔''

مجھے ہنسی آگئی۔ میں انہیں کیا بتاتا کہ میرے کپڑوں کی بو دراصل اس سوپر کی ڈانگری کی بدبو ہے جس کی بدولت

www.pkdigest.com

میری جان بچی ہے۔

میں نے غسل خانے میں آدھا گھنٹا لگایا۔ ٹھنڈے پانی سے نہانے کے بعد مجھے واقعی ایسا لگا جیسے میری توانائی میں کئی گنا اضافہ ہوگیا ہو۔ میرے کپڑے تو موجود نہیں تھے لیکن نوشین نے سعید بھائی کے کپڑے نکال دیے۔ ان کا قد کاٹھ تو میرے ہی جتنا تھا لیکن وزن کچھ کم تھا۔ ان کے کپڑے میرے جسم پر کچھ تنگ تھے لیکن معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ یہ میرے کپڑے نہیں ہیں۔

ڈنر سے پہلے انکل بھی آگئے۔ وہ مجھے دیکھ کر زیادہ حیران تو نہیں ہوئے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ میں انڈیا آنے والا ہوں۔

حیران تو وہ ان واقعات کی تفصیل پر ہوئے جو اب تک ہمارے ساتھ پیش آئے تھے۔

''سعید!'' انہوں نے کھانے سے فارغ ہو کر پوچھا۔ ''کامران کے پاسپورٹ کے سلسلے میں کیا ہوسکتا ہے؟''

''ارجن سنگھ سے بات کرنا پڑے گی۔'' سعید بھائی نے کہا۔ ''وہی اس قسم کے معاملات میں ماہر ہے۔''

''تم جانو۔'' انکل نے کہا۔ ''میں تو ان معاملات میں پڑتا نہیں۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''کامران بیٹا! تم پریشان مت ہو۔ تم یہاں بالکل محفوظ ہو۔ کسی کی جرأت نہیں ہوسکتی کہ وہ میرے گھر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ ہاں! جب تک تمہارے پاسپورٹ کا مسئلہ حل نہ ہو جائے، تم باہر کم ہی نکلنا۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

میں اپنے کمرے میں پہنچ کر بہت دیر خالی الذہنی کے عالم میں لیٹا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اس منحوس ملک سے واپس کیسے جاؤں گا؟ میرا پاسپورٹ گم ہوچکا تھا اور اس پر... کوئی انٹری نہیں تھی۔ قانونی طور پر تو میں بلا کسی دستاویز کے بارڈر کراس کرکے انڈیا آیا تھا۔ میں ایک دفعہ ان کے پھندے میں پھنس جاتا تو وہ بہت آسانی سے مجھے گھس بیٹھیا (درانداز) ثابت کرکے گولی مار سکتے تھے، مجھ پر جاسوسی کا مقدمہ چلا سکتے تھے یا پھر مجھے پاکستانی ایجنٹ بنا کر ظلم و ستم کا نشانہ بنا سکتے تھے۔ اس وقت تو گویا میں بھارتیوں کے رحم و کرم پر تھا۔ انکل لاکھ بارسوخ سہی، ان کے خاندان کے لوگ کانگریس میں سہی لیکن وہ پاکستانی ایجنٹ کو پناہ دے کر اپنی وفاداری کیوں مشکوک بناتے؟ لے دے کر مجھے سعید بھائی سے امید تھی۔ انہوں نے کسی ارجن سنگھ کا حوالہ دیا تھا۔ وہ یقیناً جعل سازی میں ماہر ہوگا۔

''کیا سوچ رہے ہیں کامی بھائی؟'' نوشین کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ میرے لیے دودھ لے کر آئی تھی۔ گویا وہ جانتی تھی کہ میں سونے سے پہلے ایک گلاس دودھ ضرور پیتا ہوں۔ اس کے سراپا کی دل کشی اور جسم سے اٹھتی ہوئی مسحور کن مہک سے میں وقتی طور پر سب کچھ بھول گیا۔ نوشین انتہائی خوب صورت لڑکی تھی۔ اگر جینی درمیان میں نہ آتی تو شاید کیا یقیناً وہی میری ہونے والی بیوی ہوتی۔ وہ مجھے پسند بھی کرتی تھی۔ اس کی ہر ہر ادا سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مجھے دیوانہ وار چاہتی ہے۔ امریکا جانے سے پہلے میں بھی اسے پسند کرتا تھا لیکن کبھی اظہار کی نوبت نہیں آئی تھی۔ یہ بھی ایک طرح سے اچھا ہی ہوا تھا ورنہ میرے ضمیر پر ایک بوجھ اور بڑھ جاتا۔

میں نے اس کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس لیا تو وہ بیڈ کے ایک سرے پر بیٹھ گئی اور بولی۔ ''آپ نے بتایا نہیں کہ آپ کس گتھی کو سلجھا رہے تھے؟''

''نوشین! اس وقت سب سے بڑا مسئلہ میری شناخت کا ہے۔ میں نہ پاکستانی ہوں نہ بھارتی۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے یہ ملک میرے لیے ایک بہت بڑا قید خانہ بن گیا ہے۔''

''ارے آپ چنتا کیوں کرتے ہیں؟'' اس نے بھارت میں بولی جانے والی ہندی نما اردو میں کہا۔ ''ہمارے خالو کانگریس کے اچھے بڑے عہدے دار ہیں، دن رات تو وہ سونیا گاندھی اور من موہن سنگھ کے ساتھ رہتے ہیں پھر راہل گاندھی (اندرا گاندھی کا پوتا) بھائی جان کا بہت اچھا دوست ہے۔ پاپا بھی بہت سے ایم ایل ایز کو جانتے ہیں۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں، انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا اور اگر خدانخواستہ ایسا نہ بھی ہوا تو ہم آپ کو ایک نئی شناخت اور نئے نام کے ساتھ یہیں روک لیں گے۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

دروازے پر دستک ہوئی اور جینی اندر آگئی۔ وہ اس وقت ڈھیلے ڈھالے سلیپنگ سوٹ میں تھی اور چلتی پھرتی قیامت لگ رہی تھی۔ اس کے آنے سے نوشین کا حسن کچھ ماند پڑگیا۔

''معاف کیجیے گا، میں آپ لوگوں کے درمیان مخل ہوئی۔'' جینی نے کہا لیکن اس کے لہجے کی طنزیہ کاٹ کو میں نے محسوس کرلیا۔ وہ نوشین کے بارے میں جانتی تھی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' نوشین نے رواں انگلش میں کہا۔ ''کامی پریشان ہو رہا تھا۔ میں اسے سمجھا رہی تھی کہ ہماری فیملی کے ہوتے ہوئے اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔''

''میں بھی اسی لیے آئی تھی۔'' جینی نے مسکرا کر کہا۔

''کامران بنتا تو سپرمین ہے لیکن بہت جلدی بوکھلا جاتا ہے۔''

''تمہیں شاید اس وقت میری پوزیشن کا اندازہ نہیں ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اگر خدانخواستہ میں پکڑا گیا تو یہ معاملہ بہت اوپر تک جائے گا۔ بھارتی حکومت میڈیا کے ذریعے میری ایسی تشہیر کرے گی کہ امریکن صدر بھی پیچھے رہ جائے گا۔''

''خیر، ابھی تو تم آرام کرو۔'' جینی نے کہا۔ ''اس مسئلے پر صبح غور کریں گے۔''

پھر نوشین اور جینی دونوں اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ چلی گئیں۔ میں نے دودھ کا گلاس پیا اور تمام خیالات کو ذہن سے جھٹک کر سونے کی کوشش کرنے لگا پھر نہ جانے کب مجھے نیند آگئی۔

عادت کے مطابق صبح ساڑھے پانچ بجے میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں اچھا خاصا اندھیرا تھا۔

میں سر کے بل کھڑے ہونے کی ایکسرسائز شروع کرنے ہی والا تھا کہ میرے کانوں میں اذان کی آواز آئی۔ مؤذن انتہائی خوش الحان تھا۔

پھر نہ جانے میرے جی میں کیا آئی کہ میں نے پہلے وضو کیا اور جائے نماز کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی پھر جو چادر نوشین نے مجھے اوڑھنے کے لیے دی تھی، میں نے وہی چادر بچھائی۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ قبلے کا رخ کس طرف ہے۔ خیر اللہ تو نیتوں کا حال جانتا ہے۔

نہ جانے کتنے عرصے بعد میں نے نماز ادا کی تھی۔ دعا مانگتے وقت مجھ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ میں زار و قطار رونے لگا۔ میرا پورا چہرہ آنسوؤں سے تر ہوگیا۔ میں نے کہا۔ ''یا اللہ! تو جانتا ہے کہ میں نے آج تک کسی کا برا نہیں چاہا، کسی کے ساتھ فراڈ نہیں کیا، کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ مجھے اس ابتلا اور آزمائش سے بچا لے میرے معبود! میں تیرا انتہائی گناہ گار بندہ ہوں۔ تیری مخلوق میں سب سے برا ہوں لیکن تیری رحمتیں میرے گناہوں کے مقابلے میں بے پایاں و بے کنار ہیں اور تو انتہائی بخشنے والا مہربان ہے میرے معبود!'' دعا مانگتے ہوئے میری ہچکی بندھ گئی۔

میں نماز پڑھ کر فارغ ہوا تو نوشین کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے اپنا سر اور چہرہ دوپٹے میں لپیٹ رکھا تھا۔ گویا وہ بھی نماز سے فارغ ہو کر آئی تھی۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور کہا۔ ''کامی! آپ رو رہے ہیں؟ مرد روتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا کامی!''

''میں کسی بندے کے سامنے نہیں بلکہ اپنے رب کے سامنے رو رہا تھا۔'' میں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''اچھا، یہ بتاؤ کہ میں تمہارے لیے چائے لاؤں یا جوس؟'' وہ اچانک کامی بھائی سے کامی اور ''آپ'' سے تم پر آگئی تھی۔

''نوشین! تم جانتی ہو میں صبح ورزش کرنے کے بعد ہی جوس پیتا ہوں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''ارے ہاں، میں تو بھول ہی گئی۔'' نوشین نے کہا۔ ''تم ورزش کرو۔ میں اس وقت تک جوس تیار کرتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے نکل گئی۔

مجھے کپڑوں کی الماری سے ایک ٹریک سوٹ مل ہی گیا۔ میں نے ٹریک سوٹ پہنا اور سر کے بل کھڑا ہوگیا۔ یہ میری مخصوص ورزش تھی۔ اس کے بعد ہی میں جوگنگ کرتا تھا۔

آدھے گھنٹے کے بعد میں سیدھا ہوا اور حسب معمول جوگنگ کے لیے نکل گیا۔

انکل کی کوٹھی کا لان بہت بڑا تھا۔ میں نہ جانے کس دھن میں تھا کہ لان میں جوگنگ کرنے کے بجائے گیٹ سے باہر نکل گیا۔ گارڈ نے مجھے روکنے کی کوشش بھی کی لیکن مجھے کافی دن بعد جوگنگ کا موقع ملا تھا اس لیے میں نے اس کی بات سنی ان سنی کردی۔ یوں بھی بھارتی پولیس اتنی مستعد نہیں ہے کہ وہ منہ اندھیرے میری تلاش میں نکل کھڑی ہوتی۔

وہ دہلی کا پوش ایریا تھا۔ بڑی بڑی کوٹھیاں اس وقت سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ کئی کوٹھیوں سے کتوں کی خوف ناک غراہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ علاقے کی سڑکیں کشادہ تھیں اور اس وقت تو سڑک پر ٹریفک کا نام و نشان نہیں تھا۔

میں دوڑتا ہوا شاید دو میل تک چلا گیا۔

ابھی میں مزید اتنا ہی دوڑنا چاہتا تھا کہ پیچھے سے آنے والی ایک گاڑی کی وجہ سے سڑک کے کنارے پر آگیا۔

گاڑی میرے عین نزدیک آکر رک گئی۔ وہ پولیس جیپ تھی۔ اسے دیکھ کر گویا میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس میں ایک سب انسپکٹر اور چار کانسٹیبل سوار تھے۔

انسپکٹر نے مسکرا کر کہا۔ ''سر! آپ کو تو پندرہ سو کلومیٹر... ریس کی چیمپئن شپ میں حصہ لینا چاہیے۔ آپ کی رفتار تو ہماری گاڑی جتنی ہے۔''

انسپکٹر مجھے پہچانا نہیں تھا۔ اس کی بات سن کر میری جان میں جان آئی۔

''میں کئی ورلڈ ٹائٹل جیت چکا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''انڈیا کی چیمپئن اوشا بھی میری شاگرد رہ چکی ہے۔''

"سوری سر!" انسپکٹر نے کہا۔ "میں نے آپ کا ردھم توڑ دیا۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

میں جذبات میں کوٹھی سے بہت دور نکل آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب مجھے واپس چلنا چاہیے۔

ابھی میں مشکل سے آدھا کلومیٹر دوڑا ہوں گا کہ ایک کوٹھی سے مجھے ایک شخص دوڑتا ہوا نظر آیا۔ اس کے جسم پر سلیپنگ سوٹ تھا۔ وہ ننگے پیر تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہا ہے۔

پھر فوراً ہی اسی کوٹھی سے چار آدمی بھاگتے ہوئے نکلے۔ وہ لوگ شکلوں سے چھٹے ہوئے بدمعاش لگ رہے تھے۔ وہ چاروں کے چاروں ڈنڈوں اور ہاکیوں سے مسلح تھے۔ ان میں سے ایک شخص کے ہاتھ میں ریوالور بھی تھا۔ اس نے بھاگنے والے پر دو فائر کیے لیکن بھاگنے والا بچ گیا، پھر فائر کرنے والے کا نشانہ اچھا نہیں تھا۔ ریوالور پر شاید سائیلنسر فٹ تھا اس لیے فائرز کی ہلکی سی آواز گونج کر رہ گئی۔

ریوالور والے نے جھنجلا کر تیسرا فائر کیا جو بھاگنے والے کے بائیں بازو میں لگا۔ اس کا ہاتھ جھول کر رہ گیا اور خون بہنے لگا۔ اب اس کی رفتار بھی کم ہو گئی تھی۔ ہاکی اور ڈنڈا بردار لمحوں میں اس کے سر پر پہنچ گئے۔

اب میرے لیے خاموش تماشائی بنا رہنا ناممکن ہو گیا۔ وہ لوگ مجھ سے خاصے فاصلے پر تھے لیکن سوال ایک آدمی کی زندگی کا تھا۔ میں نے ادرگرد دیکھ کر خاصا بڑا ایک پتھر اٹھا لیا۔ اسی وقت ایک ہاکی والا بھاگنے والے کے سر پر ہاکی کا وار کرنے والا تھا۔ میں نے ہاکی والے کا نشانہ لے کر پتھر پوری قوت سے اس کی طرف اچھال دیا۔

پتھر اس کے سینے پر پڑا اور وہ الٹ کر گر پڑا۔

میں اس دوران میں بجلی کی سی تیزی سے وہاں تک پہنچ گیا۔ اس سے پہلے کہ دوسرا آدمی مجھ پر وار کرتا، میں نے ایک ہی کک میں اسے زمین چٹا دی اور بڑھ کر اس کی گری ہوئی ہاکی اٹھالی۔

"کون ہے بے تُو؟" ریوالور والے نے ڈپٹ کر پوچھا۔ "اپنے کام سے کام رکھو ورنہ اس کے ساتھ ساتھ تیرا بھی رام نام ست ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر اس نے ریوالور کا رخ میری طرف کر دیا۔

میں نے اچانک ہاکی کا وار اس کے ہاتھ پر کیا تو ریوالور اس کے ہاتھ سے گر گیا۔

"تُو خود کو بہت بڑا بدمعاش سمجھتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ان کھلونوں سے تو بچے بھی بڑے بڑے سورماؤں کو مار دیتے ہیں۔ تُو اگر واقعی مرد ہے تو اس کھلونے کے بغیر لڑ کر دکھا۔"

میں نے اس پر نفسیاتی وار کیا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ اس کے دوسرے ساتھی بھی مسلح ہوں گے۔ اگر وہ لوگ ایک ساتھ گنز نکال لیتے تو بھاگنے والا بچتا یا مرتا، میرا ضرور رام نام ست ہو جاتا۔

اس کا جو ساتھی میرے پتھر کی ضرب سے گر گیا تھا، اب وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ دونوں میری طرف جھپٹے تو ریوالور والے نے کہا۔ "کوئی بیچ میں نہیں آئے گا۔ اس فیشن ایبل اور دولت مند لونڈے کو میں بتاؤں گا کہ مرد کیا ہوتا ہے۔ تم اس "ذلیل" کا خیال رکھنا۔" اس نے آخری جملہ بھاگنے والے کے لیے کہا۔

پھر اچانک اس نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ مجھے اس کے گینڈے جیسے جسم اور قدوقامت سے اتنی پھرتی کی توقع نہیں تھی۔ وہ مجھے لیتے ہوئے زمین پر گر گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے میرا گلا دبوچا اور گھٹنا میرے سینے پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ انسان بعض اوقات اوورکانفیڈنس میں بھی مار کھا جاتا ہے۔ مجھے اس گینڈے کی چال ڈھال اور جسامت سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی پھرتی کا مظاہرہ کرے گا۔ اس کا منحوس وزنی گھٹنا میرے سینے پر رکھا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی کچھ دیر میں میری پسلیاں ٹوٹ جائیں گی۔ اس کا دوسرا گھٹنا میرے دائیں بازو پر تھا اور دائیں ہاتھ سے وہ میرا گلا پوری قوت سے دبوچ رہا تھا۔ اگر کچھ دیر یہی صورت حال برقرار رہتی تو واقعی میرا رام نام ست ہونے والا تھا۔ وہ میرے سینے پر کچھ اس انداز سے بیٹھا تھا کہ میں اپنے پیروں سے بھی اس کے جسم پر بھرپور ضرب نہیں لگا سکتا تھا۔ میں نے دو ایک مرتبہ اسے کک مارنے کی کوشش کی لیکن ضرب اتنی ہلکی اور پھسپھسی تھی کہ اس گینڈے پر ذرہ برابر اثر نہیں ہوا۔

میری گردن پر گینڈے کا دباؤ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ میری سانس رک رہی تھی اور توانائی تیزی سے زائل ہو رہی تھی۔

اپنے ہاتھوں کا خیال آتے ہی مجھے یاد آیا کہ ابھی میرا بایاں ہاتھ آزاد ہے۔ میں نے پہلے اس ہاتھ سے گینڈے پر وار کرنے کی کوشش کی لیکن اس وقت اس کا سر مجھ سے دور تھا۔ اب وہ ایسی پوزیشن ... میں تھا کہ اگر میں پوری قوت سے اس کے سر پر وار کرتا تو نہ صرف وار بھرپور پڑتا بلکہ ممکن ہے میری گردن پر اس کے ہاتھ کا شکنجہ بھی کچھ کمزور پڑ جاتا۔

میں نے آخری امید کے طور پر اپنے جسم کی بچی کھچی قوت اپنے بائیں ہاتھ میں مجتمع کی اور پوری قوت سے اس کے تربوز نما سر کو نشانہ بنا دیا۔

گینڈے کے حلق سے اذیت بھری کراہ نکلی۔ اس ضرب سے نہ صرف میری گردن پر اس کے ہاتھ کا دباؤ کم ہو گیا بلکہ میرے دائیں ہاتھ پر رکھا ہوا اس کا منحوس وزنی گھٹنا بھی ہٹ گیا۔ دایاں ہاتھ آزاد ہوتے ہی میں نے ایک مرتبہ پھر دائیں ہاتھ سے اس کی کھوپڑی کو پوری قوت سے نشانہ بنایا۔

اس کے حلق سے کربناک آواز بلند ہوئی اور وہ بائیں طرف لڑھک گیا۔ میری یہ ضرب ایسی تھی کہ اگر میں کسی بیل کے سر پر بھی مار دیتا تو شاید وہ بھی گر جاتا لیکن مجھے گینڈے کی قوت برداشت پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کی کنپٹی پر ایک ہاتھ مزید رسید کر دیا۔ وہ اوندھے منہ گرا تو پھر نہیں اٹھا۔ میں جانتا تھا کہ اب یہ کم از کم ایک گھنٹا نہیں تو آدھے گھنٹے کے لیے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا ہے۔

اس کے دونوں ساتھی دم بخود تھے۔ وہ دونوں ایک ساتھ مجھ پر ہاکیوں سے حملہ آور ہوئے لیکن میں نے دونوں ہاتھوں سے ان کی ہاکیاں پکڑ لیں پھر ایک ہی جھٹکے میں دونوں ہاکیاں ان کے ہاتھوں سے نکل گئیں۔

وہ لوگ لڑنے بھڑنے کے فن سے واقف تھے۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹے اور اچانک انہوں نے چاقو نکال لیے۔ گویا ان لوگوں کے پاس ریوالور نہیں تھے۔

وہ دونوں ایک ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ اس وقت بھاگنے والے سے یہ غلطی ہوئی کہ وہ میری ہمدردی میں مجھے بچانے کے لیے ان کے سامنے آگیا۔ ان میں سے ایک کا چاقو اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ دوسرے کا چاقو میرا ٹریک سوٹ پھاڑتا ہوا میرے بائیں ہاتھ پر زخم کی ایک لمبی لکیر کھینچ گیا۔

میں نے بھنا کر چاقو والے کے پیٹ میں اتنی زوردار کک رسید کی کہ وہ کئی فٹ دور اچھل کر جا گرا۔ دوسرا بدمعاش بھاگنے کا موقع دیکھ رہا تھا میں نے اس پر چھلانگ لگائی اور اس کے سر پر اتنے زور سے پنچ مارا کہ اس کی کھوپڑی چٹخنے کی آواز مجھے خود بھی عجیب سی لگی۔

پھر میں زخمی کی طرف متوجہ ہوا۔ چاقو اس کے سینے میں دائیں طرف پیوست تھا۔ میں نے چاقو نکال لیا۔ زخم زیادہ کاری نہیں تھا کیونکہ چاقو کا پھل بہت کم اس کے سینے میں پیوست تھا۔ گولی لگنے سے اس کا خون پہلے ہی بہت ضائع ہو چکا تھا۔ اب اس کے سینے سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اب کیا کروں؟

"تمہیں فوری مدد کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔

"یہاں نزدیک کوئی اسپتال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میری فکر چھوڑ دو۔" اس نے نحیف لہجے میں کہا۔ "تم اپنی جان بچانے کی کوشش کرو۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ تینوں مر چکے ہیں۔ یہ راجن کے خاص آدمی ہیں۔ ان کی موت پر راجن زمین آسمان ایک کر دے گا۔"

"کون راجن؟" میں نے پوچھا۔

"تم راجن کو نہیں جانتے؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "شاید انڈیا میں نئے ہو ورنہ راجن تو یہاں دہشت کی علامت ہے۔ وہ خود کو انڈر ورلڈ کا کنگ کہتا ہے۔"

"یہ راجن کے آدمی ہوں یا ساجن کے۔" میں نے کہا۔ "میں تمہیں اس حال میں نہیں چھوڑ سکتا۔ میں کوئی سواری دیکھتا ہوں۔ اس وقت تک تم خود کو سنبھالو۔"

"گاڑی تو میرے گھر میں بھی موجود ہے۔" زخمی نے جواب دیا۔ "لیکن وہاں تک پہنچنا مشکل ہے۔"

"تمہارا گھر وہی ہے جہاں سے تم باہر بھاگے تھے؟" میں نے پوچھا۔ "وہ تو زیادہ دور نہیں ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اسے اچانک کندھے پر اٹھالیا اور اس کے گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس وقت کندھوں پر ویٹ اٹھا کر جوگنگ کرنے کی ایکسرسائز میرے کام آئی۔ مجھے خطرہ یہ تھا کہ کوئی ہمیں اس حالت میں دیکھ نہ لے۔ صبح کا وقت تھا اس لیے اس وقت گھروں اور سڑک پر سناٹا تھا۔

میں زخمی کو لے کر دوڑتا ہوا چند منٹ میں اس گھر پر پہنچ گیا جہاں سے وہ فرار ہوا تھا۔

زخمی پر اب غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ پورچ میں جدید ماڈل کی لینڈ کروزر موجود تھی۔

"گاڑی کی چابی کے لیے تمہیں اوپر میرے بیڈ روم میں جانا ہوگا۔ بیڈ کی سائڈ پر میرا موبائل فون اور گاڑی کی چابی کے علاوہ میرا پرس بھی موجود ہے۔ ہاں واپسی میں میرے لیے کوئی شرٹ بھی لیتے آنا۔" اس نے غنودہ لہجے میں کہا۔

میں نے اسے اطمینان سے پورچ کی سیڑھی پر بٹھا دیا اور ایک ایک قدم میں دو، دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر پہنچا۔ زخمی کے بتائے ہوئے بیڈ روم میں گاڑی کی چابی، سیل فون اور رقم کا بٹوا موجود تھا۔ کرسی کی پشت پر اس کی ٹی شرٹ اور

www.pkdigest.com

چینٹ بھی پڑی تھی۔ میں نے چلتے ہوئے اس کے جوتے بھی اٹھا لیے اور اسی تیزی سے باہر نکل گیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں زخمی بے ہوش نہ ہو جائے۔

میں تمام چیزیں لے کر پھرتی سے نیچے پہنچا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ گاڑی کے پاس ایک دراز قد آدمی کھڑا تھا۔ اس کے جسم پر جینز اور ٹی شرٹ تھی۔ اس کے سر کے پچھلے حصے پر خون کا دھبا تھا جو اس کی گردن سے ہوتا ہوا ٹی شرٹ کو بھی رنگین کر گیا تھا۔

اس شخص نے ابھی تک مجھے نہیں دیکھا تھا۔ میں دبے پاؤں اس کی طرف بڑھا۔ یوں بھی میری جانب اس کی پشت تھی اور وہ زخمی کی طرف متوجہ تھا۔

میں نے چھلانگ لگائی اور دراز قد کی گردن دبوچ لی۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کا منہ بند کر دیا۔

زخمی ابھی تک ہوش میں تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ”یہ میرا گارڈ ہے۔ اسے چھوڑ دو۔“

میں نے اسے چھوڑ دیا اور اس سے کہا۔ ”انہیں اسپتال لے جانا ہے لیکن میں اس ملک میں اجنبی ہوں۔ مجھے یہاں کے راستوں کا علم نہیں ہے۔“

”آپ فکر مت کریں صاحب! میں آپ کو راستہ بتاؤں گا۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا، زخمی کو عقبی نشست پر لٹایا اور اس کے گارڈ کو اپنے ساتھ بٹھا لیا۔

پھر میں آندھی طوفان کی طرح وہاں سے نکلا اور گارڈ کے بتائے ہوئے راستے پر ڈرائیو کرتے ہوئے پندرہ منٹ میں ایک پرائیویٹ کلینک پر پہنچ گیا۔ اس وقت تک زخمی بے ہوش ہو چکا تھا۔ راستے میں مجھے گارڈ نے بتایا۔ ”امجد بھائی کا یہ بنگلا بہت خفیہ ہے اور یہاں کا پتا بس کچھ لوگوں ہی کو ہے۔ وہ ہر ہفتے دس دن بعد یہاں شیری سے ملاقات کرنے آتے ہیں۔ اس دفعہ پتا نہیں کیسے دشمنوں کو بھائی کے اس ٹھکانے کا علم ہو گیا۔ بھائی زیادہ بھیڑ بھاڑ پسند نہیں کرتے اس لیے میرے سوا یہاں کوئی گارڈ بھی نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ لوگ صبح پانچ اور ساڑھے پانچ کے درمیان آئے ہوں گے کیونکہ اس وقت میری آنکھ لگ گئی تھی۔ ان لوگوں نے پہلے تو کوئی بھاری چیز مار کے مجھے بے ہوش کیا، پھر بھائی کی تلاش میں اوپر گئے ہوں گے۔

”مجھے نہیں معلوم کہ وہاں کتنے آدمی تھے لیکن اتنا جانتا ہوں کہ بھائی اکیلا بھی دس پر بھاری ہے۔ مجھے نہیں پتا کہ اس کے بعد کیا ہوا؟ شیری میڈم کہاں گئی اور ان لوگوں نے بھائی کو زخمی کیسے کیا؟ یہ باتیں تو وہ خود ہی بتائیں گے۔“

”کیا امجد صاحب تمہارے بھائی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

اس پر گارڈ یوں مسکرایا جیسے میں نے کوئی بہت احمقانہ بات کہہ دی ہو۔ وہ ہنس کر بولا۔ ”صاحب! آپ تو واقعی انڈیا میں نئے ہو۔ آپ بھائی کا مطلب بھی نہیں جانتے ؟“

”اچھا اچھا، وہ بھائی!“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”تمہارا تعلق کس گینگ سے ہے؟“

”بھائی انڈیا میں داؤد ابراہیم کا ایک طرح سے رائٹ ہینڈ ہے۔ اصل میں تو یہاں کا کاروبار رستم خان چلاتا ہے لیکن سب کچھ بھائی کے حکم ہی سے ہوتا ہے۔ رستم خان خود بھی انڈیا میں بہت کم ٹھہرتا ہے۔“

اسپتال پہنچ کر گارڈ نے مجھے گاڑی عقبی سمت لے جانے کو کہا۔ ظاہر ہے کہ وہ ”بھائی“ تھا تو سامنے سے کیسے جا سکتا تھا۔ امجد خان کے گارڈ کا نام دلاور تھا۔ اسے دیکھ کر اسپتال کا عملہ ایک دم مستعد ہو گیا۔ امجد خان کو فوراً اسٹریچر کے ذریعے چوتھی منزل پر شفٹ کر کے آئی سی یو میں لے جایا گیا۔ میں دلاور کے ساتھ وزیٹرز لاؤنج میں بیٹھ گیا۔

مجھے یہ فکر بھی تھی کہ میرے اچانک غائب ہونے سے گھر میں ایک بھونچال آچکا ہوگا۔ خاص طور پر سعید بھائی تو بہت پریشان ہوں گے اور عینی تو ممکن ہے کہ اب تک مجھے ڈھونڈنے نکل پڑی ہو۔

اس وقت میرے پاس سیل فون بھی نہیں تھا۔ میں نے دلاور سے کہا۔ ”تمہارے پاس سیل فون ہے؟“

”ہاں صاحب!“ وہ مؤدب انداز میں بولا۔۔۔اور جیب سے سیل فون نکال کر مجھے دے دیا۔ اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کسے کال کروں؟ تمام نمبرز میرے سیل فون میں تھے۔ خالہ نسیمہ کا لینڈ لائن نمبر مجھے یاد نہیں تھا۔ پھر میرے ذہن میں ایک ترکیب آگئی۔ مجھے اپنے سیل فون کا نمبر یاد تھا۔ میں نے اس پر کال کر دی۔ تھوڑی دیر بیل بجتی رہی، پھر نوشین کی محتاط آواز سنائی دی۔ ”ہیلو!“

”نوشین! میں کامران بول رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تم کہاں ہو کامی؟“ وہ گویا پھٹ پڑی۔ ”گھر میں ایک بھونچال آگیا ہے۔ بابا اور بھائی جان تمہاری گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے پولیس اسٹیشن گئے ہیں۔ عینی بھی ایک گھنٹے سے غائب ہے۔ وہ بھی تمہاری تلاش میں نکلی ہے۔ امی کا رو رو کر برا حال ہے۔ تمہیں ہم لوگوں کا بالکل خیال نہیں ہے؟“

”اب اگر تم بول چکی ہو تو میری بات بھی سن لو۔“ میں نے کہا۔ ”میں جاگنگ کے لیے نکلا تھا۔ اچانک میں نے ایک ایکسیڈنٹ دیکھا۔ ایک تیز رفتار کار نے ایک نوجوان کو ہٹ کر دیا۔ میں اسے اس حالت میں چھوڑ کر آ تو سکتا تھا لیکن میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا۔ میں اسے اسپتال لے گیا، اب اس کے ہوش میں آنے کا انتظار ہے۔ تم سب سے پہلے تو یہ کرو کہ انکل اور سعید بھائی کو بتا دو کہ میں خیریت سے ہوں اور آدھے گھنٹے میں گھر پہنچ جاؤں گا۔ اگر عینی کا سیل نمبر ہے تو اسے بھی مطلع کر دو۔ اور پلیز! خالہ جان کو سمجھاؤ کہ میں بالکل خیریت سے ہوں۔“

”اب تو تم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ زخمی کو اسپتال پہنچا دیا۔ اب زیادہ ہمدرد دواخانہ بننے کی کیا ضرورت ہے، فوراً گھر پہنچو۔“

”اچھا بابا! میں پہنچ رہا ہوں۔ تم انکل کو اطلاع کر دو۔ اگر انہوں نے ایف آئی آر درج کرا دی تو الٹی آنتیں گلے پڑ جائیں گی۔“

”تمہارا یہی نمبر ہے نا؟“

”یہ میرا نمبر نہیں ہے۔ میں تو کسی سے عاریتاً فون لے کر بات کر رہا ہوں۔ اور میرا سیل فون اب تم اپنے ہی پاس رکھنا کیونکہ مجھے صرف یہ نمبر ہی یاد ہے۔“ پھر میں نے جلدی سے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اسی وقت ڈاکٹر اوٹی سے باہر نکلا اور بولا۔ ”امجد بھائی کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔ ایک گولی ان کے ہاتھ میں لگی تھی جو بازو کا گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اس سے ان کی ہڈی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔ چاقو کا زخم البتہ کچھ خطرناک ہے لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ پریشانی یہ ہے کہ خان صاحب کا خون بہت ضائع ہو گیا ہے۔ ہم انہیں خون دے رہے ہیں۔“ پھر وہ دلاور سے بولا۔ ”ارے! تم بھی تو زخمی ہو، تم نے ابھی تک بتایا کیوں نہیں؟“

”میں اتنا زخمی نہیں ڈاکٹر صاحب! زخمی تو ہمارا یہ دوست ہے جس نے بھائی کی جان بچائی ہے۔“

”آپ دونوں ادھر میرے روم میں آجائیں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

وہ ڈاکٹر بھی ان بھائی لوگوں کے اعتماد کا ہوگا ورنہ دوسرے اسپتالوں میں تو بغیر پولیس انٹری کے اس قسم کے کیسز کو ہاتھ بھی نہیں لگایا جاتا۔

ہم دونوں ڈاکٹر کے روم میں آگئے۔ دلاور نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! آپ پہلے ہمارے دوست کا زخم دیکھیں، جب تک میں آر کے کو انفارم کر دوں ورنہ وہ بہت ناراض ہوں گے۔“

”آر کے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”آر کے کا اس سے کیا تعلق؟ کیا انہیں بھی تم لوگ فنانس فراہم کرتے ہو؟“

”آر کے کا مطلب آر کے فلمز نہیں ہے کامران صاحب! اس کا مطلب ہے رستم خان! وہ انڈر ورلڈ میں آر کے کے نام سے مشہور ہیں۔“

ڈاکٹر نے مجھے قمیص اتارنے کو کہا۔ میں نے قمیص اتار دی۔ میرے بازو سے لے کر کہنی کے پچھلے حصے تک چاقو کے زخم کی گہری لکیر تھی۔ اس لکیر کے اردگرد خون جم گیا تھا اور اچھا خاصا خون ٹریک سوٹ کے اپر میں بھی لگا ہوا تھا۔

”آپ اسے معمولی زخم کہہ رہے ہیں؟“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”میرا تو خیال ہے کہ مجھے ٹانکے لگانے پڑیں گے۔“

زخم خاصا گہرا تھا۔ فوری طور پر مجھے محسوس نہیں ہوا تھا لیکن اب تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔

ابھی میں ٹانکے لگوا کر فارغ ہوا ہی تھا کہ اسپتال میں ایک بار پھر کھلبلی مچ گئی۔ معلوم ہوا کہ وہاں آر کے بنفس نفیس آ رہا ہے۔ اسپتال کا پورا عملہ یوں مستعد نظر آ رہا تھا جیسے بھارت کا وزیراعظم اسپتال آ رہا ہو۔

آر کے نے سب سے پہلے امجد خان کو دیکھا۔ وہ ابھی بے ہوش تھا اور آئی سی یو میں تھا اسی لیے وہ اسے باہر ہی سے دیکھ کر ڈاکٹر کے کمرے میں آگیا۔

وہ پینتیس چھتیس سال کا خوب رو اور وجیہہ آدمی تھا۔ رنگت سرخ و سفید تھی اور بالوں کا رنگ براؤن تھا۔ اس کا قد دراز اور جسم کسرتی تھا۔ وہ اس وقت بہت نفیس قسم کے ململ کے کرتے اور پاجامے میں ملبوس تھا۔ چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں جو اس کی مردانہ وجاہت میں اضافہ کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے شاید اسے پہلے ہی میرے بارے میں بتا دیا تھا۔ مجھے دلاور بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید بقیہ تفصیل اسے دلاور نے بتائی تھی۔

اسے دیکھ کر میں کھڑا ہو گیا۔ ٹانکوں کی وجہ سے میں نے قمیص اتاری ہوئی تھی۔ اس نے توصیفی انداز میں میرا جائزہ لیا۔ پھر اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”میں رستم خان ہوں، لوگ مجھے آر کے کے نام سے جانتے ہیں۔“

میں نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کی گرفت مضبوط تھی۔ میں نے بھی جان بوجھ کر اپنی گرفت سخت رکھی۔ اس کے

چہرے پر لمحے بھر کو حیرت کے تاثرات نظر آئے لیکن وہ فوراً ہی نارمل ہو گیا۔

''میں کامران ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کے ملک میں اجنبی ہوں۔ میرا تعلق پاکستان سے ہے۔''

''تم پاکستانی ہو؟'' اس نے خوش ہو کر کہا۔ ''یقین کرو، مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ یہ کوئی رسمی جملہ نہیں ہے بلکہ مجھے واقعی پاکستانیوں سے مل کر خوشی ہوتی ہے۔ پھر تم نے تو میرے انتہائی قیمتی آدمی کی جان بچائی ہے۔ تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے تو میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔''

''کسی کی جان لینا اور بچانا کسی بندے کے اختیار میں نہیں ہے مسٹر آر کے!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''آپ نام سے مجھے مسلمان لگ رہے ہیں اس لیے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ میں تو بس وہاں سے گزر رہا تھا کہ یہ واقعہ رونما ہو گیا۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔''

''ویسے تمہاری باڈی سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم بہت پابندی سے ورزش کرتے ہو۔ تمہارا یہ زخم مجھ پر قرض ہے۔'' اس نے میرے بازو کے زخم کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور آر کے کوئی بھی قرض زیادہ دن تک رکھنے کا قائل نہیں ہے۔''

میں نے قمیص پہنتے ہوئے کہا۔ ''آر کے صاحب! اب امجد خان صاحب کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ مجھے بھی اجازت دیں۔ میرے میزبان میری تلاش میں پاگل ہو رہے ہیں۔''

''میں تمہیں روکوں گا نہیں۔ تم پہلے ہی گزشتہ تین ساڑھے تین گھنٹے سے یہاں ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھے اپنا پتا بھی نہیں دو گے لیکن میری خواہش ہے کہ تم سے دوبارہ ملاقات ہو اور بہت خوش گوار انداز میں ہو۔''

''آپ نے یہ کیسے کہہ دیا کہ میں آپ کو اپنا پتا نہیں دوں گا؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہیں اندازہ تو ہو گیا ہو گا کہ میرا تعلق انڈر ورلڈ سے ہے۔ انڈر ورلڈ والوں سے لوگ کچھ دور ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔ ہاں، یہ میرا کارڈ رکھ لو۔'' پھر اس نے کارڈ کی پشت پر ایک فون نمبر لکھا اور کہا۔ ''یہ میرا ڈائریکٹ فون نمبر ہے اور بہت خاص لوگوں کے پاس ہے۔''

میں قمیص پہن چکا تھا۔ میں نے اس کا کارڈ جیب میں رکھا اور باہر جانے کے لیے نکلا تو اس نے کہا کہ میرا ڈرائیور تمہیں چھوڑ دے گا۔

میں نے ڈرائیور سے کہا کہ مجھے امجد بھائی کے بنگلے کے پاس اتار دینا۔ میں وہاں سے چلا جاؤں گا۔

ڈرائیور نے مجھے امجد بھائی کے بنگلے سے کچھ فاصلے پر اتار دیا۔

میں خالہ نسیمہ کے بنگلے کی طرف بڑھا تو مجھے کچھ فاصلے پر لوگوں کا ایک جم غفیر نظر آیا۔ وہاں پولیس کی کئی گاڑیاں بھی تھیں۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں ان لوگوں کو یہ علم تو نہیں ہو گیا کہ ایک پاکستانی ایجنٹ اس بنگلے میں ٹھہرا ہوا ہے؟

میں سر جھکا کر آگے بڑھا تو معلوم ہوا کہ لوگوں کی توجہ اور پولیس کا رش اس جگہ ہے جہاں میرا ان لوگوں سے مقابلہ ہوا تھا۔ میں کسی طرف دیکھے بغیر سیدھا خالہ کے بنگلے کی طرف بڑھا اور گیٹ کی گھنٹی بجا دی۔

فوراً ہی دروازہ کھلا اور انکل کے گارڈ نے باہر جھانکا۔ میں اندر داخل ہوا تو اس نے مجھ سے کہا۔ ''صاحب! آپ سویرے سویرے کہاں چلا گیا تھا؟ بڑا صاحب بہت غصے میں تھا۔ وہ تو ہم کو نوکری سے نکال رہا تھا کہ تم نے مہمان کو باہر کیوں جانے دیا؟''

''اس وقت بڑے صاحب کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اور چھوٹے صاحب ابھی ابھی کہیں گئے ہیں۔ وہ گوری موجود ہے جو آپ کے ساتھ آئی تھی۔''

میں خاموشی سے اپنے کمرے میں داخل ہوا اور سیدھا غسل خانے میں گھس گیا تاکہ جلد سے جلد ٹریک سوٹ بدل سکوں ورنہ اس سلسلے میں بھی مجھے بہت سے سوالوں کے جوابات دینا پڑتے۔ کپڑے تبدیل کر کے اور اپنا حلیہ درست کر کے میں غسل خانے سے باہر آیا۔ میں نے ٹریک سوٹ کا گولہ سا بنا کر اسے دوبارہ الماری میں ٹھونس دیا۔ اس سے پہلے میں نے اس میں سے آر کے کا کارڈ نکال لیا تھا۔

میں کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ ٹوشین آ گئی۔ اسے شاید گارڈ سے معلوم ہو گیا تھا۔ وہ بری طرح رونے لگی اور بولی۔ ''کامی! تم نے بہت پریشان کیا ہے۔ یہاں سب ہی سمجھ رہے ہیں کہ تمہیں پولیس نے پکڑ لیا ہے۔ پاپا اور بھائی جان تو رپورٹ لکھوانے پولیس اسٹیشن بھی چلے گئے تھے۔ اگر تمہارا ٹیلی فون دو منٹ بعد آتا تو وہ رپورٹ لکھوا چکے ہوتے۔''

''سوری ٹونی!'' میں بچپن میں اسے ٹونی کہہ کر چھیڑتا تھا۔ ''بس میں پھنس کر رہ گیا۔''

''مجھ سے زیادہ تو پاپا اور بھائی جان غصے میں ہیں۔ امی بھی بہت غصے میں ہیں اور وہ تمہاری دوست جینی۔ وہ تو اتنی غصے میں ہے کہ شاید تمہیں کچا ہی چبا جائے گی۔''

''سوری اگین ڈیئر کزن!'' میں نے کہا۔ ''اب تم

کھانسی، نزلہ، زکام
کسی موسم یا کسی وقت کے پابند نہیں

ہمدرد کی مجرب دوائیں ان کا علاج بھی ہیں اور ان سے محفوظ رہنے کی مؤثر تدبیر بھی

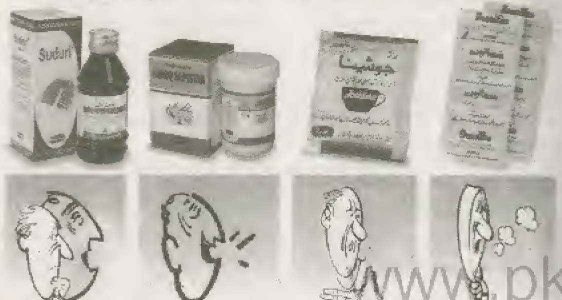

سُعالین
مفید جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ سُعالین گلے کی خراش اور کھانسی کا آسان اور مؤثر علاج۔ آپ گھر میں ہوں یا گھر سے باہر، سرد و خشک موسم یا گرد و غبار کے سبب گلے میں خراش محسوس ہو تو فوراً سُعالین لیجیے۔ سُعالین کا باقاعدہ استعمال گلے کی خراش اور کھانسی سے محفوظ رکھتا ہے۔

جوشینا
نزلہ، زکام، فلو اور ان کی وجہ سے ہونے والے بخار کا آزمودہ علاج۔
جوشینا کا روزانہ استعمال موسم کی تبدیلی اور فضائی آلودگی کے مضر اثرات بھی دور کرتا ہے۔
جوشینا بند ناک کو فوراً کھول دیتی ہے۔

لعوق سپستاں
نزلے زکام میں سینے پر بلغم جم جانے سے شدید کھانسی کی تکلیف طبیعت نڈھال کر دیتی ہے۔
اس صورت میں صدیوں سے آزمودہ ہمدرد کا لعوق سپستاں، اخراجِ بلغم کے اخراج اور شدید کھانسی سے نجات کا مؤثر ذریعہ ہے۔
ہر موسم میں، ہر عمر کے لیے

صُدوری
مؤثر جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ خوش ذائقہ شربت۔ خشک اور بلغمی کھانسی کا بہترین علاج۔ صدوری سانس کی نالیوں سے بلغم خارج کر کے سینے کی جکڑن سے نجات دلاتی ہے اور پھیپھڑوں کی کارکردگی کو بہتر بناتی ہے۔ بچوں، بڑوں سب کے لیے یکساں مفید۔
شوگر فری صدوری بھی دستیاب ہے۔

سُعالین، جوشینا، لعوق سپستاں، صُدوری - ہر گھر کے لیے بے حد ضروری

ہمدرد

www.hamdard.com.pk

مجھے ذرا اچھی سی کافی پلا دو اور کوئی درد کی دوا ہو تو وہ لا دو۔"
"درد کی دوا؟" اچانک جینی کی آواز آئی۔ وہ خاموشی سے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ "میرے پاس مین کلر ہے۔ کہو تو وہی دے دوں؟"
"وہ اس وقت تو تمہارے پاس نہیں ہوگی ورنہ یقیناً تم دے چکی ہوتیں۔ ممبئی ائرپورٹ پر فلائٹ میں سوار ہونے سے پہلے کسی گن کے ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"
"تم شاید بھول رہے ہو کہ میں مارشل آرٹ میں ماہر ہوں اور میں ان ہاتھوں سے بھی تمہارا گلا دبوچ سکتی ہوں۔"
اسی وقت خالہ نسیمہ کمرے میں آگئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے انکل اور سعید بھائی بھی تھے۔ انہیں بھی میں نے وہی کہانی سنا کر مطمئن کر دیا کہ ایک ایکسیڈنٹ کے زخمی کو اسپتال لے گیا تھا۔
بمشکل تمام ان سب کے غصے اور لعن طعن سے میری جان چھوٹی۔ انکل نے سخت لہجے میں کہا۔ "آج کے بعد تم اس گھر کے گیٹ سے باہر قدم نہیں رکھو گے ورنہ گارڈز کے ہاتھوں اپنی بے عزتی کے خود ذمے دار ہو گے۔ بعد میں مجھ سے شکایت مت کرنا۔"
نوشین گرما گرم کافی، سموسے اور دیگر لوازمات لے آئی۔ میں نے بھی صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ چیزیں دیکھ کر میری بھوک چمک اٹھی اور میں بھوکوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑا۔
جینی نے بھی میرا ساتھ دیا مگر وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ پھر وہ اچانک جذباتی ہو کر بولی۔ "کامران! اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں کس منہ سے تمہاری ماں بہن کا سامنا کرتی اور کیا منہ لے کر امریکا جاتی؟ اور تم پکڑے جاتے تو وہ لوگ مجھے بھی نہیں چھوڑتے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
"ارے تمہارے پاس تو امریکن پاسپورٹ ہے۔ وہ تمہیں تو پکڑ بھی نہیں سکتے۔ پکڑنا تو دور کی بات ہے، وہ یہ بات سوچ بھی نہیں سکتے ہیں۔"
"میں ابھی اپنے پاسپورٹ کو آگ لگا دوں گی۔ طعنے دینے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔"
یہ جذباتی منظر دیکھ کر نوشین وہاں سے کھسک گئی۔ اس کے چہرے پر البتہ مجھے تاریک سا سایہ لہراتا محسوس ہوا۔
اس کے جانے کے بعد جینی نے کہا۔ "یہاں سے کچھ فاصلے پر تین آدمی مر گئے ہیں۔"
"مر گئے ہیں؟" میں نے تعجب کا اظہار کیا۔ مجھے واقعی تعجب ہوا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ تینوں ہی مر جائیں گے۔
"زیادہ بھولے مت بنو کامران!" جینی نے آہستہ سے کہا۔ "میں جانتی ہوں کہ یہ کام تمہارا ہے۔ ان لوگوں سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟ کیا وہ لوگ بھی ورما کے آدمی تھے؟"
"ایسی کوئی بات نہیں ہے جینی!" میں نے اسے ٹالنا چاہا۔ "میں بھلا ان لوگوں کو کیوں ماروں گا؟"
"میں تمہارا ہر اسٹائل جانتی ہوں۔ تم نے اپنے پنچ سے ایک آدمی کی کھوپڑی توڑی ہے۔ دوسرے آدمی کے پیٹ میں اتنی زوردار لات بھی تم ہی مار سکتے ہو اور تیسرا آدمی سر میں لگنے والی کک سے مرا ہے۔" جینی نے باوثوق انداز میں کہا۔
"یہ خوبیاں تو تم میں بھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "تو کیا میں تم پر شک کروں؟"
"مجھے شک نہیں، یقین ہے۔" جینی نے کہا اور اپنی جینز کی جیب سے نکال کر وہ چین میرے سامنے رکھ دی جو ہمیشہ میرے گلے میں ہوتی تھی۔ وہ چین جینی ہی نے مجھے گفٹ کی تھی اور اس کے لاکٹ پر خاص طور پر میرا نام کھدوایا تھا۔
"اب بولو!" اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔
"اب کیا بولوں؟" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "یہ لمبی کہانی ہے۔ فرصت میں سناؤں گا۔ ویسے کیا واقعی وہ تینوں آدمی مر گئے؟"
"ہاں، ان میں سے دو تو موقع پر مر گئے تھے۔ تیسرے نے اسپتال جاتے ہوئے راستے میں دم توڑ دیا۔"
ابھی جینی بیٹھی ہی تھی کہ سعید بھائی آگئے۔ وہ انہیں دیکھ کر اٹھ گئی۔ سعید بھائی چند لمحے تک خاموشی سے مجھے دیکھتے رہے، پھر سنجیدگی سے بولے۔ "کامی! تمہیں یاد ہے، بچپن میں جب تم کوئی شرارت کیا کرتے تھے تو مجھے ضرور بتایا کرتے تھے تاکہ میں تمہیں انکل اور آنٹی سے بچا سکوں۔ مجھے امید ہے کہ تم اب بھی مجھ سے جھوٹ نہیں بولو گے۔"
"سعید بھائی! میں نے آپ سے پہلے بھی جھوٹ بولا ہے جواب بولوں گا۔" میں نے کہا۔
"تو پھر جو کچھ میں پوچھوں اس کا جواب سچ سچ دینا۔" انہوں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
ان کے لہجے پر میں بھی چونک کر رہ گیا۔ نہ جانے وہ مجھ سے کیا پوچھنے والے تھے؟

"جی سعید بھائی، پوچھیں۔"
"تم نے کہا ہے کہ تم کسی روڈ ایکسیڈنٹ کے زخمی کو اسپتال لے گئے تھے۔ وہ ایکسیڈنٹ کہاں ہوا تھا اور کس گاڑی سے ہوا تھا؟"
میں لمحے بھر کو بوکھلا گیا پھر سنبھل کر بولا۔ "سعید بھائی! آپ تو جانتے ہیں کہ مجھے یہاں کی سڑکوں اور علاقوں کے نام یاد نہیں رہتے۔ وہ یہیں کی کوئی سڑک تھی۔ ایک نوجوان سڑک کراس کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک تیز رفتار گاڑی کی زد میں آگیا۔ بس اتنی سی بات ہے۔"
"اتنی سی بات نہیں ہے کامران!" سعید بھائی نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے معلوم کر لیا ہے۔ یہاں آس پاس تو کیا، دور دور تک ایسا کوئی ایکسیڈنٹ نہیں ہوا جس میں کوئی نوجوان زخمی ہوا ہو۔ ہاں دو تین ایکسیڈنٹ ہوئے ہیں۔ دو گاڑیاں آپس میں ٹکرا گئی ہیں۔ ایک بس کی ٹکر سے ایک موٹر سائیکل سوار ہلاک ہوا ہے اور ایک گاڑی کی زد میں اسکول کی دو بچیاں آئی ہیں۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ جھوٹ نہیں بولو گے اور تم مسلسل جھوٹ بول رہے ہو۔" سعید بھائی کے لہجے میں خفگی تھی۔
"سعید بھائی... آپ میری بات کا... یقین... کریں...
میں... میں رک رک کر بولا۔
"کیسے یقین کر لوں تمہاری بات کا؟" سعید بھائی اچانک طیش میں آگئے۔ "وہ تو شکر کرو کہ ابھی تک پاپا اس واقعے کی گہرائی میں نہیں گئے۔ تم مجھے سچ سچ بتاتے ہو یا میں پاپا کو بتاؤں اور پاکستان فون کر کے انکل اور آنٹی کو بتا دوں؟" انہوں نے منہ بنا کر کہا۔ "ہم کاروبار میں روزانہ دنیا بھر کو بے وقوف بناتے ہیں، یہ ہمیں ہی بے وقوف بنانے چلے ہیں۔"
"سعید بھائی!" میں نے آہستہ سے کہا۔ "میں ایک شرط پر آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔ آپ اس بات کا تذکرہ کسی سے نہیں کریں گے۔"
"اچھا تو آپ کی کوئی شرط بھی ہے؟ چلو مان لی تمہاری شرط۔ کسی سے تذکرہ نہیں کروں گا۔"
میں نے انہیں شروع سے لے کر آخر تک سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔
وہ حیرت سے منہ کھولے میری باتیں سن رہے تھے۔ پھر وہ حیران ہو کر بولے۔ "جو آدمی تمہارے ہاتھوں مارے گئے ہیں، جانتے ہو وہ کون ہیں؟ وہ یہاں کے انڈر ورلڈ ڈان راجن کے آدمی ہیں۔ راجن پولیس سے بھی زیادہ خطرناک اور باخبر ہے۔ وہ زمین کی تہ میں سے بھی اپنے دشمنوں کو کھود نکالتا ہے۔ دوسری طرف ممبئی کا ایک اور بہت بڑا گینگسٹر آر کے ہے۔ وہ داؤد ابراہیم کا سیدھا ہاتھ ہے۔ آر کے گینگ راجن سے بھی چار ہاتھ آگے ہیں۔ اگر ان دونوں میں گینگ وار شروع ہو گئی تو تم بیچ میں سینڈوچ کی طرح پس جاؤ گے۔"
انہوں نے پُرتشویش انداز میں مجھے دیکھا پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالا اور اضطراب کے عالم میں سگریٹ سلگا کر کچھ سوچنے لگے۔
"اس واقعے کا آر کے، کے علاوہ کتنے لوگوں کو علم ہے؟" سعید بھائی نے پوچھا۔
"زخمی ہونے والا نوجوان امجد اور اس کا ایک گارڈ اس بارے میں جانتے ہیں۔ ڈاکٹر کو بھی شاید تفصیل کا علم نہیں ہوگا۔"
"لیکن جب وہ ٹی وی پر خبریں دیکھے گا اور اخبار پڑھے گا تو سمجھ جائے گا کہ یہ تمہارا کارنامہ ہے۔" وہ پھر سگریٹ پھونکنے لگے اور ٹہلنے لگے۔
"ہاں، اس بارے میں جینی بھی جانتی ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ پھر انہیں بتایا کہ جینی کو اس بات کا علم کیسے ہوا۔
سعید بھائی نے سکون کی طویل سانس لی اور بولے۔ "شکر کرو، جینی نے تمہاری وہ چین وہاں سے ہٹا دی ورنہ اب تک پورے دہلی کی پولیس اس مکان کو گھیر چکی ہوتی۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ "قرول باغ میں ہمارا ایک بنگلا خالی پڑا ہے۔ جب بھی کوئی غیر ملکی مہمان آتا ہے یا پاپا آل انڈیا لیول پر کوئی فنکشن کرتے ہیں تو اس بنگلے میں مہمانوں کو ٹھہراتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم کچھ دنوں کے لیے وہاں شفٹ ہو جاؤ۔"
"وہ بنگلا پورے انڈیا میں انکل کی ملکیت کے طور پر جانا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے کسی ایسی جگہ شفٹ کریں جس کے بارے میں کوئی نہ جانتا ہو۔"
"تمہاری بات میں وزن ہے۔" سعید بھائی نے آدھی سگریٹ عالم اضطراب میں قالین پر پھینک کر جوتے سے مسل دی اور نئی سگریٹ سلگانے لگے۔ پھر وہ اچانک چونک کر بولے۔ "بن گیا کام۔" میں نے ابھی حال ہی میں اکبر روڈ کے ایک لگژری فلیٹ کا سودا کیا ہے۔ فروخت کرنے والے کو یہ علم نہیں ہے کہ خریدار میں ہوں کیونکہ درمیان میں ایک تیسرا آدمی ہے۔ تم کسی فرضی نام کے ساتھ اس فلیٹ میں

www.pkdigest.com

شفٹ ہو جاؤ۔ ہمارے دو گارڈز مستقل تمہارے ساتھ رہیں گے۔ ویسے ارجن کے بدمعاشوں کی موت دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تمہیں گارڈز کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔"

"انکل سے کیا کہیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"ان سے کہہ دوں گا کہ میں تمہیں اس وقت تک منظر سے باہر رکھنا چاہتا ہوں جب تک تمہارے پاسپورٹ کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا۔"

"ایک مسئلہ اور بھی ہے۔ جینی بھی میرے ساتھ رہنے کی ضد کرے گی۔"

"ارے یار! اس کے لیے تو کوئی مسئلہ نہیں ہے نا! کہہ دوں گا کہ وہ بوریت سے بچنے کے لیے انڈیا گھومنے نکل گئی۔ بس اب تم تیاری کر لو۔ میرے وہ کپڑے جو تمہارے کام کے ہوں، ایک بیگ میں رکھ لو... اور اپنا ناپ مجھے دے دینا میں تمہارے لیے کپڑے لے آؤں گا۔ کچھ عرصہ جوگنگ نہیں کی تو تمہاری موت واقع نہیں ہو جائے گی۔ ہاں تم کہو گے تو میں جم کا سارا سامان وہاں اکٹھا کر دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔

☆☆☆

جب نسیمہ خالہ نے یہ سنا کہ میں ان کے بنگلے سے کہیں اور شفٹ ہو رہا ہوں تو انہوں نے پورا گھر سر پر اٹھا لیا۔

"ایک بچے کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ ان وزیروں اور سفیروں سے تعلقات کا کیا فائدہ؟ میں اپنی بہن کو کیا منہ دکھاؤں گی کہ خطرہ دیکھ کر میرے بچے کو گھر سے نکال دیا۔"

سعید بھائی نے بہت مشکل سے انہیں سمجھایا کہ یہاں میرے لیے زیادہ خطرہ ہے۔ کچھ ہی دن کی تو بات ہے۔ کامران کا پاسپورٹ بن جائے گا تو وہ پورے انڈیا میں آزادی سے گھوم سکے گا۔

پلان کے مطابق جینی مجھ سے پہلے ہی نکل گئی تھی۔ سعید بھائی نے اپنے ڈرائیور کے ساتھ اسے فلیٹ پر بھیج دیا تھا۔

میں نکلنے لگا تو نوشین کی عجیب حالت تھی۔ وہ بھی عجیب لڑکی تھی۔ اچھی طرح جانتی تھی کہ اب میری اور اس کی شادی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ جینی سے مل بھی چکی تھی اور میرے ساتھ اس کا رویہ دیکھ بھی چکی تھی۔ اس کے باوجود وہ میرے لیے دکھی ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "جاؤ کامی! تمہیں اللہ کی امان میں دیا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔"

میں جلدی سے گاڑی میں سوار ہو گیا۔ پھر آدھے گھنٹے کے اندر اندر ہم اس فلیٹ پر پہنچ گئے۔ دروازہ جینی نے کھولا۔ وہ فلیٹ واقعی لگژری تھا۔ صاف ستھرا، کشادہ اور ہوادار۔ گیٹ پر سیکیورٹی کا بھی بہترین انتظام تھا۔ پھر میرے ساتھ جو گارڈز تھے، وہ دونوں سعید بھائی کے سابق کمانڈوز تھے اور ان میں سے ایک آدمی بیس پر بھاری تھا۔

فلیٹ میں پانچ کمرے تھے۔ آخری سرے کا ایک کمرا میں نے گارڈز کو دے دیا۔

وہ فلیٹ خاصا وسیع و کشادہ تھا لیکن اس تک محدود ہو جانا گویا ایسا تھا جیسے مجھے کسی نے قید کر دیا ہو۔

دو دن اسی قید و بند کی حالت میں گزر گئے۔ سعید بھائی روزانہ رات کو دس بجے کے بعد آتے تھے۔ وہ اپنی گاڑی کہیں دور پارک کرتے تھے اور خود چھپتے چھپاتے مجھ تک پہنچتے تھے۔

جینی البتہ آزادی سے باہر جاتی تھی۔ سعید بھائی نے ایک دن دبی زبان میں کہا کہ جینی کو بھی اتنی آزادی سے باہر مت جانے دو۔ تمہارے ساتھ ایک امریکن لڑکی کا حوالہ بھی موجود ہے۔ پولیس یا ارجن کے آدمی جینی کے تعاقب میں یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ میرے پاسپورٹ کا مسئلہ ابھی تک التوا میں پڑا ہوا تھا۔ سعید بھائی کی ارجن سنگھ سے ملاقات ہی نہیں ہو رہی تھی۔

اس دن رات کا کھانا ہم نے کافی دیر سے کھایا تھا۔ جینی اس دن نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھاننے کے بعد پہنچی تھی۔ اسی وجہ سے کھانے میں دیر ہو گئی۔ دونوں گارڈز اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ وہ تو بس برائے نام گارڈز تھے۔ ممکن ہے وہ کمانڈوز ہوں، بہترین لڑاکے ہوں لیکن یہاں تو وہ محض ڈیوٹی کی رسم پوری کر رہے تھے۔

کھانے کے بعد میں اور جینی فلیٹ کے لاؤنج میں ٹہلتے رہے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ باہر کا ایک چکر لگا لوں لیکن جینی نے سختی سے انکار کر دیا۔ یوں بھی سعید بھائی نے باہر نکلنے کو منع کیا تھا۔

"یہ سب کب تک چلتا رہے گا کامران؟" جینی نے میرے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس کی دو صورتیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "یا تو میرا پاسپورٹ بن جائے یا پھر میں ہی اس دنیا میں نہ رہوں۔"

"زیادہ بکواس مت کرو۔ میں نے سنجیدگی سے ایک سوال کیا تھا۔ تمہاری آنٹی بھی مجھے عجیب نظروں سے دیکھتی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ..."

"انہیں سمجھنے دو۔" میں نے اس کی بات کاٹ

دی۔ "بے چاری مشرقی تہذیب کی پروردہ ہیں۔ شادی سے پہلے لڑکی اور لڑکے کا ایک ساتھ رہنا ہمارے یہاں بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ہمیں اچھی نظروں سے تو انکل اور سعید بھائی بھی نہیں دیکھتے ہیں۔ یہ بات وہ ظاہر نہیں کرتے ہیں۔ اس کا ایک حل اور ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "ہم لوگ شادی کر لیں اور پھر آرام سے رہیں۔ ویسے رہنے کے لیے بھارت بھی بری جگہ نہیں ہے۔ بس فرق یہ ہوگا کہ میں گھر میں تمہارا انتظار کروں گا اور تم باہر کام کرو گی۔ ضروری تو نہیں ہے کہ عورتیں ہی بچے پالیں۔ مرد بھی تو یہ کام کر سکتے ہیں۔"

"میں ایک کام اور بھی کر سکتی ہوں۔" جینی نے کہا۔ "تمہیں اس فلیٹ کی کھڑکی سے اٹھا کر باہر پھینک سکتی ہوں۔"

میں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مجھے کوریڈور میں کوئی کھٹکا سا محسوس ہوا۔ میں نے جینی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود دبے پاؤں فلیٹ کے داخلی دروازے سے کان لگا دیے۔

"وہ حرامزادہ یہیں کسی فلیٹ میں ہے۔" ورما نے کہا۔ "رمیش نے اس گوری کو چوتھی منزل پر آتے دیکھا ہے۔"

"سر! ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ گوری ہمیں دھوکا دینے کے لیے اس منزل تک لفٹ کے ذریعے آئی ہو پھر زینوں کے ذریعے اوپر یا نیچے چلی گئی ہو۔" وہ شخص بہت دور کی کوڑی لایا تھا۔ اگر جینی یہ کرتی تو وہ لوگ پوری عمارت کی تلاشی لیے بغیر مجھے تلاش نہیں کر سکتے تھے۔

www.pkdigest.com

جینی بھی میرے ساتھ ہی دروازے کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ لوگ اردو میں بات کر رہے تھے لیکن اسے اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ باہر خطرہ ہے۔

وہ بے آواز قدموں سے اپنے بیڈ روم تک گئی اور وہاں سے وہ جرمن لیوگر اور ان کے بہت سے فاضل میگزین لے آئی۔ مجھے حیرت تھی کہ اس نے یہ ہتھیار کہاں سے حاصل کیے ہیں؟

پھر اچانک کال بیل کی کرخت آواز نے فلیٹ کا سناٹا مجروح کر دیا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں صاحب جی؟" کوئی آواز سنائی دی۔ "اس طرح تو وہ لوگ چوکنے ہو جائیں گے۔"

"پہلے تو یہ معلوم ہو کہ وہ لوگ اس فلیٹ میں ہیں بھی یا نہیں اور چوکنے ہوتے ہیں تو ہوں.... چوتھی منزل ہو یا دسویں منزل... اس بلڈنگ سے بھاگ کر کہاں جا سکتے ہیں؟"

میں نے جینی کا ہاتھ پکڑا اور دبے پاؤں اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔ میں جانتا تھا کہ ابھی گھنٹی کی آواز سن کر دونوں گارڈز دروازے پر آ جائیں گے۔

میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ دونوں گارڈز دبے پاؤں دروازے تک پہنچے اور ان میں سے ایک نے کرخت لہجے میں پوچھا۔ "کون ہے؟"

"پولیس!" باہر سے بھی کوئی کرخت لہجے میں بولا۔

گارڈ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔ "کیا پولیس کا یہی کام رہ گیا ہے کہ وہ رات کو لوگوں کی نیندیں حرام کرتی رہے؟"

"یہاں کون رہتا ہے؟" ورما کی کرخت آواز سنائی دی۔

"یہاں وجے صاحب رہتے ہیں۔ وہ تو شکر کرو کہ وہ اس وقت موجود نہیں ہیں ورنہ تم لوگوں کو اچھی طرح مزہ چکھا دیتے۔"

"گھر میں اس وقت کوئی بھی موجود نہیں ہے؟" ورما نے پوچھا۔

"اب تمہیں کیا لکھ کر دیا جائے کہ اس وقت فلیٹ میں کوئی موجود نہیں ہے۔ وجے صاحب اور ان کی وائف کسی پارٹی میں گئے ہیں۔"

اچانک جینی کو زوردار چھینک آ گئی۔ پھر بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ "شٹ!"

"تم نے تو کہا تھا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ یہ آواز کیسی تھی؟"

"یہ گھر کی ملازمہ کی آواز ہو گی۔" گارڈ نے کہا۔ "تمہیں آخر اس کی اتنی چنتا کیوں ہے؟"

میں کمرے کی کھڑکی کھول کر پہلے ہی باہر کا جائزہ لے چکا تھا۔ کھڑکی کے نیچے ڈیڑھ دو فٹ کا چھجا تھا۔ اگر کوئی وہاں سے فرار ہونا بھی چاہتا تو بازی گری کا کرتب دکھاتا ہوا دوسرے فلیٹ کی کھڑکی تک پہنچ سکتا تھا۔ اگر وہ صحیح سلامت وہاں تک پہنچ بھی جاتا تو اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ وہ کھڑکی بھی کھلی ہوئی ملے گی۔

"تم ان لوگوں کو روکنے کی کوشش کرنا۔ میں اس کھڑکی کے ذریعے جا رہا ہوں۔ میرا سیل نمبر تو تمہارے پاس ہے۔ مجھ سے رابطے میں رہنا۔"

"کیا تم پاگل ہو گئے ہو کامران؟" جینی نے ہذیانی لہجے میں کہا۔ "یہاں سے نیچے گرے تو تمہاری ہڈی پسلی سلامت نہیں رہے گی۔"

"اور اگر میں ان لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا تو جان کے ساتھ ساتھ عزت کی بھی دھجیاں بکھر جائیں گی۔ یہ لوگ میڈیا

پر مجھے ایجنٹ بنا کر پیش کریں گے۔ ہاں، اپنے دونوں ریوالور مجھے دے دو۔ تلاشی لینے پر اگر وہ ریوالور برآمد ہوئے تو وقتی طور پر تم بھی مصیبت میں پڑ جاؤ گی۔"

جینی نے دونوں ریوالور اور ان کے اضافی میگزین میرے حوالے کر دیے جو میں نے اپنی جیکٹ کی جیب میں ٹھونس لیے پھر میں نے جینی کو گلے لگایا اور کھڑکی کے راستے باہر نکل گیا۔

باہر ہوا بہت تیز اور یخ تھی۔ موسم بدل رہا تھا اس لیے ہوا میں خنکی تھی۔

لاؤنج میں دونوں گارڈز ابھی تک ورما اور اس کے آدمیوں سے بحث ومباحثے میں الجھے ہوئے تھے۔ جینی کھڑکی کھولے باہر جھانک رہی تھی۔

"کھڑکی بند کر دو احمق!" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "ورنہ وہ لوگ سیدھے کھڑکی کی طرف آئیں گے اور تم بیڈ پر لیٹ کر سونے کی اداکاری کرو۔"

جینی نے کھڑکی بند کر دی۔

میں نے نیچے نظر دوڑائی۔ مجھے سڑک پر دوڑتی ہوئی گاڑیاں اور بسیں کھلونوں کی طرح نظر آئیں۔ نیچے دیکھنے سے مجھے جھرجھری آ گئی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب نیچے نہیں دیکھوں گا۔ میں چھپکلی کی طرح کھڑکی سے چپکا ہوا کھڑا تھا۔ میرے قدموں کے نیچے بہ مشکل ڈیڑھ فٹ کا چھجا تھا۔ ایک لمحے کو تو خیال آیا کہ کاش میں سپرمین ہوتا اور اڑتا ہوا یہاں سے کہیں دور نکل جاتا یا پھر میرے ہاتھوں اور پیروں میں ایسے مقناطیسی جوتے ہوتے جو مجھے دیوار کے ساتھ چپکائے رکھتے۔

میرے پاس وقت بالکل نہیں تھا۔ اندر سے گارڈز اور ورما کی تیز تیز آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ لوگ کسی بھی وقت... بیڈروم میں آ سکتے تھے۔

میں نے اللہ کا نام لیا اور اس ڈیڑھ فٹ کے چھجے پر قدم جماتا ہوا کھسک کر آگے بڑھنے لگا۔ میں اپنے جسم کو ہاتھوں سے بھی متوازن کر رہا تھا۔ میں ایک ایک انچ سرکتا ہوا دوسری کھڑکی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

وہ تو غنیمت ہے کہ اس وقت وہاں اندھیرا تھا ورنہ ...... دیکھنے والوں کے لیے تو یہ بھی ایک تماشا ہوتا۔

دیوار بالکل سپاٹ تھی ورنہ مجھے دوسری کھڑکی تک پہنچنے میں اتنی دقت پیش نہ آتی۔ میں ایک ایک انچ سرک کر اب دونوں کھڑکیوں کے درمیان پہنچ گیا تھا۔ ہوا خاصی تیز تھی اور اس میں خنکی تھی۔ اس کے باوجود میرا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ ایک ایک انچ سرکنے سے بہتر ہے کہ اپنی رفتار بڑھا دی جائے۔ رفتار تیز ہو... تو خود کو متوازن کرنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔

میں نے دونوں ہاتھ دیوار پر جمائے اور اپنی رفتار کچھ بڑھا دی۔

اب وہ کھڑکی مجھ سے محض دو فٹ کے فاصلے پر تھی۔ اپنے فلیٹ سے مجھے ورما اور جینی کی چیخ پکار سنائی دے رہی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ "تم لوگوں کی جرأت کیسے ہوئی میرے بیڈروم میں گھسنے کی؟"

"آپ کے ملازموں نے جھوٹ بولا تھا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔" ورما نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"وہ دونوں سو رہے تھے۔" جینی نے کہا۔ "میں ابھی تھوڑی دیر پہلے آئی ہوں۔ فلیٹ کی ایک چابی میرے پاس بھی ہے۔"

میں نے تیزی سے دو تین لمبے لمبے قدم بڑھائے اور دوسرے فلیٹ کی کھڑکی کی چوکھٹ پکڑ لی۔ اس کوشش میں، میں کچھ لڑکھڑا گیا تھا۔ اگر فوراً ہی کھڑکی کی چوکھٹ میرے ہاتھ میں نہ آ جاتی تو میں چوتھی منزل کی بلندی سے نیچے گرتا پھر پولیس کو میری لاش کے بجائے پیچھے سے میرا ملبہ اٹھانا پڑتا۔

کھڑکی کی چوکھٹ پکڑ کر میں نے گہرے گہرے سانس لیے۔ پھر سنبھل کر اس کے ایک پٹ پر زور سے دھکا دیا۔ مجھے یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ کھڑکی اندر سے بند تھی۔ کھڑکی میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ چوتھی منزل پر لوگ عموماً گرل نہیں لگاتے۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتے کوئی دیوار سے چپکا ہوا چھپکلی کی طرح ان کی کھڑکی تک پہنچ جائے گا۔

پہلے میں نے سوچا کہ کھڑکی پر دستک دوں لیکن اس میں یہ امکان تھا کہ دستک سننے والا خوف زدہ ہو جائے کہ اس طرف سے کون آ گیا۔ وہ مجھے بھوت سمجھ کر کھڑکی کھولنے کے بجائے فلیٹ ہی سے نکل بھاگے۔ مجھے اندازہ تھا کہ کھڑکی کی چٹخنی کہاں ہو گی۔ میں اس کے نزدیک کا شیشہ توڑنے والا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے کھڑکی کی چوکھٹ پکڑ کر جیب سے ریوالور نکالا اور کھڑکی کے اوپری شیشے پر ہلکی سی ضرب لگائی۔

شیشہ ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ ہی میرے فلیٹ سے فائرنگ کی آواز آئی۔ میرے گارڈ ورما کے آدمیوں سے الجھ گئے تھے۔

اسی وقت فلیٹ سے ایک نسوانی اور خوف زدہ آواز سنائی دی۔ "کون ہے؟"

میں اس وقت تک شیشے میں ہاتھ ڈال کر کھڑکی کی چٹخنی کھول چکا تھا۔ پھر ہلکے سے دھکے سے کھڑکی کے دونوں پٹ کھل گئے۔ میں بہت پھرتی سے اندر داخل ہوا اور کھڑکی دوبارہ بند کر دی۔

کھڑکی کے نزدیک ہی بیڈ تھا جس پر کوئی عورت یا لڑکی حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ کمرے میں زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا۔ اس کی مدھم روشنی میں لڑکی کا چہرہ مزید خوف زدہ لگ رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا لیکن میں نے جھپٹ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور نرم لہجے میں بولا۔ "گھبراؤ مت، میں تمہیں نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ میرے کچھ دشمن میری جان لینا چاہتے ہیں۔ میں ان ہی سے بچ کر یہاں آیا ہوں۔ مجھ سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ اگر تم شور نہ مچانے کا وعدہ کرو تو میں تمہارے منہ سے ہاتھ ہٹا دوں؟"

اس نے زور زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا دیا۔ لڑکی نے گہرے گہرے سانس لیے پھر سرگوشی میں بولی۔ "تم یہاں تک آئے کیسے؟"

"میں یہاں تک اڑتا ہوا آیا ہوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تم یہ سوچ کر پریشان مت ہو کہ میں یہاں کیسے آیا ہوں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ میں یہاں سے باہر کیسے نکلوں؟"

"باہر جانے کا تو ایک ہی راستہ ہے۔" لڑکی نے کہا۔

"میں فی الحال اس راستے سے نہیں جا سکتا۔ باہر کوریڈور میں اور بلڈنگ کے آس پاس میرے دشمن موجود ہیں۔ کیا تم مجھے صبح تک یہاں پناہ دے سکتی ہو؟"

"میں یہاں اس وقت بالکل اکیلی ہوں۔" لڑکی نے کہا۔ میرا شوہر قومی ائرلائن میں پائلٹ ہے۔ وہ دو دن بعد آئے گا۔ تم چاہو تو دو دن تک بھی یہاں رہ سکتے ہو۔"

"کیا تم اپنے شوہر سے بہت بیزار ہو؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"میں بھی اسی ائرلائن میں ائرہوسٹس تھی۔ میں نے وکرم کو پہلی دفعہ وہیں دیکھا تھا۔ میں جوش وجذبات میں آ کر اس کی شاندار شخصیت سے دھوکا کھا گئی اور شادی کر بیٹھی حالانکہ وہ عمر میں مجھ سے کم سے کم بیس سال بڑا ہے۔ ہم دونوں میں جنریشن گیپ ہے۔ ہماری شادی کو ایک سال ہو گیا ہے لیکن اختلافات شادی کے دوسرے ہی مہینے شروع ہو گئے۔ وہ انتہائی شکی مزاج آدمی ہے۔ اسی لیے اس نے میری ملازمت چھڑوا دی اور اس خوب صورت قید خانے تک محدود کر دیا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی ایک بیوی اور بھی ہے اور اس کی بڑی بیٹی بھی عمر میں مجھ سے دو ایک سال بڑی ہو گی۔ فلائٹ کے بعد بھی وہ زیادہ وقت اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گزارتا ہے۔ کبھی کبھار بھولے بھٹکے یہاں بھی چلا آتا ہے۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں تو روز ہی آتا تھا بلکہ ایک مہینے کی چھٹی لے کر پورا مہینا اس نے میرے ساتھ اسی فلیٹ میں گزارا ہے۔ اب میں نے سنا ہے کہ وہ کسی اور ائرہوسٹس پر ڈورے ڈال رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بوڑھے اتنے ہوس پرست کیوں ہوتے ہیں؟" لڑکی کی زبان قینچی کی طرح چل پڑی تھی۔ وہ رواں انگلش میں بول رہی تھی۔

میں نے اس سے کہا۔ "کیا تم ہندی میں بات نہیں کر سکتیں؟ انگلش میں بات کر کر کے میرے جبڑے دکھنے لگے ہیں۔ میری بیوی بھی امریکن ہے۔"

"میں تو خود تمہیں ابھی تک غیرملکی ہی سمجھ رہی تھی۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرا نام سنیتا ہے۔"

"میں اجے ہوں۔" میں نے کہا۔

"میرے خیال میں تم بھوکے ہو گے؟" وہ یوں بولی جیسے میں اس کے گھر مہمان آیا ہوں۔ "میں کچھ کھانے کے لیے لاتی ہوں۔"

"کھانا میں کھا چکا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ہو سکے تو مجھے گرما گرم کافی کا ایک کپ پلا دو اور کوئی درد کی دوا ہو تو دے دو۔ تمہارے گھر تک پہنچنے میں میرا جوڑ جوڑ دکھ گیا ہے۔"

وہ بیڈ سے اتری اور ہاتھ بڑھا کر تیز روشنی کا بلب روشن کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے چودہ کیا بلکہ اٹھائیس طبق روشن ہو گئے۔ وہ صرف باریک سی ایک نائٹی میں ملبوس تھی۔ چہرہ بہت دلکش، قد دراز اور رنگ گندمی تھا۔

میں نے گھبرا کر سر جھکا لیا اور اس نے کہا۔ "ابھی خطرہ ٹلا نہیں ہے۔ یہاں روشنی دیکھ کر کوئی ادھر بھی متوجہ ہو سکتا ہے۔ وہ لوگ ابھی اسی بلڈنگ میں ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے ساتھ تم جیسی خوب صورت لڑکی بھی ماری جائے۔"

اس نے خوف زدہ ہو کر لائٹ آف کر دی اور پھرتی سے کچن کی طرف چلی گئی۔

مجھے اس پر اس حد تک اعتماد نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کچن سے فلیٹ کا داخلی دروازہ بہت قریب تھا۔ وہ فلیٹ کا دروازہ

www.pkdigest.com

کھول کر کسی کو بھی اپنی طرف متوجہ کر سکتی تھی۔ باہر ورما اور اس کے آدمی اب بھی موجود ہوں گے۔

میں بھی ریوالور لے کر دبے پاؤں اس کے پیچھے چل دیا۔ وہ واقعی کچن میں گئی اور گنگنا رہی تھی۔ ”چلیں جیسے ہوائیں سنن سنن، اڑیں جیسے پرندے گگن گگن... میں بھی...“

اس کا گانا ادھورا رہ گیا کیونکہ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ وہ حواس باختہ سی کچن سے باہر نکلی۔ میں نے اسے پُرسکون رہنے کا اشارہ کیا اور خود بیڈ روم میں چلا گیا۔

”کون ہے؟“ اس نے بلند آواز میں پوچھا۔

”میں بلڈنگ کا سیکیورٹی گارڈ ہوں میڈم!“ باہر سے کسی نے مؤدب لہجے میں کہا۔

”خیریت تو ہے، اس وقت میری نیند خراب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ وہ کچھ زیادہ ہی باتونی تھی۔ پھر اس نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ اس سے پہلے اس نے لاؤنج کی لائٹ آن کر دی تھی۔

سیکیورٹی گارڈ اندر آیا۔ اس کی ہوس ناک نظریں سنیتا کے جسم پر تھیں۔

”کیا بات ہے؟“ سنیتا نے سخت لہجے میں پوچھا اور لاؤنج کی کرسی پر پڑی ہوئی بڑی سی ایک تولیا اٹھا کر اپنے جسم پر ڈال لی۔

”میڈم! بلڈنگ میں ایک انتہائی خطرناک قاتل موجود ہے۔ اس نے یہاں کے ایک فلیٹ میں چار آدمیوں کو قتل کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی لڑکی بھی ہے۔“

”تو یہ بات تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟“ سنیتا نے منہ بنا کر کہا۔ ”بلڈنگ کی سیکیورٹی تمہاری ذمے داری ہے۔“

”میں صرف آپ کو ہوشیار کرنے آیا تھا۔ ممکن ہے وہ آپ کے فلیٹ میں گھسنے کی کوشش کرے۔“

”تم کہہ رہے تھے کہ اس کے ساتھ کوئی لڑکی بھی ہے۔ تمہیں کیسے معلوم کہ اس کے ساتھ کوئی لڑکی بھی ہے؟“

”میں نے اس لڑکی کو بلڈنگ سے بھاگتے دیکھا ہے۔ میں سمجھا کہ یہ فائرنگ سے خوف زدہ ہو کر بھاگ رہی ہے۔ آپ ہی کی منزل پر برابر والے فلیٹ میں چار آدمی قتل ہو چکے ہیں۔ ایک آدمی زخمی تھا اسے ابھی اسپتال بھیجا ہے۔ دو آدمی گولی لگنے سے مرے ہیں اور دو آدمیوں کی گردنیں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ تیسرے آدمی کی گردن پر بھی کسی چیز سے وار کیا ہے لیکن وہ بچ گیا ہے۔“

”اچھا ہوا تم نے مجھے بتا دیا۔ اب میں ہوشیار رہوں گی، اطلاع کرنے کا شکریہ۔“

اس شخص کے جانے کے بعد سنیتا نے تولیا پھر کرسی پر پھینکا اور کچن میں گھس گئی۔

وہ کافی لے کر آئی تو میں نے کافی پیتے ہوئے سوچا۔ ’ان آدمیوں کو میرے دشمنوں نے مارا ہوگا اور باقی دو کو جینی نے ہلاک کیا ہوگا۔ مجھے حیرت یہ تھی کہ تیسرا کیسے بچ گیا؟

”کیا سوچ رہے ہو؟“ سنیتا نے مجھے چونکا دیا۔

”دشمن میرے گرد گھیرا تنگ کرتے جا رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ان سے کب تک بچوں گا۔ میں اس شہر میں اجنبی ہوں۔ مجھے تو یہاں کوئی جانتا بھی نہیں ہے۔ میں کہاں پناہ حاصل کروں گا؟“

”تم فکر مت کرو اجے۔“ اس نے کہا۔ ”میرے بوڑھے پتی نے اس فلیٹ کے علاوہ ایک فلیٹ اور بھی دیا ہے۔ ابھی تک وہ فلیٹ خالی ہے۔ میں اسے کرائے پر اٹھانا چاہ رہی تھی۔ وہاں ضرورت کی چیزیں موجود ہیں۔ تم جب تک چاہو وہاں رہ سکتے ہو۔ اس فلیٹ کا کسی کو علم نہیں ہے۔“

”لیکن میں یہاں سے نکلوں گا کیسے؟“ میں نے کہا۔

”یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔“ سنیتا نے کہا۔ ”میں ابھی تھوڑی دیر میں تمہیں یہاں سے نکال دوں گی لیکن ابھی اس میں خطرہ ہے۔ تمہیں کم از کم ایک دن تو یہاں گزارنا پڑے گا۔ بلڈنگ کی سیکیورٹی ہے تو نہیں بس نام کی لیکن پھر بھی ساتھ والے فلیٹ میں چار قتل ہو چکے ہیں۔ ابھی تو بلڈنگ میں پولیس موجود ہوگی۔“

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میرا دماغ اتنا ماؤف ہو رہا تھا کہ اتنی سامنے کی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ابھی بلڈنگ میں واقعی پولیس والوں کی بھرمار ہوگی۔ ان کے ماہرین فنگر پرنٹس اٹھا رہے ہوں گے۔ نشانات لگا رہے ہوں گے۔ پھر وہ اس فلیٹ کو سیل کر دیں گے اور اس کے مالک کی تلاش شروع ہو جائے گی۔ آخر کار پولیس سعید بھائی تک پہنچ جائے گی۔ پھر میری وجہ سے وہ پورا گھرانا زیرِ عتاب آ جائے گا۔

”اجے! تم بالکل فکر مت کرو۔ میرے فلیٹ میں کوئی میری لاش پر سے گزر کر ہی داخل ہو سکے گا۔ تم اطمینان سے رہو۔“

”سنیتا میڈم! یہ ڈائیلاگ ہندی فلموں میں اتنا استعمال ہوا ہے کہ اب لوگ اسے فلموں میں بھی استعمال نہیں کرتے۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”یہ فلمی ڈائیلاگ نہیں ہے اجے!“ سنیتا جذباتی ہو گئی۔ ”یہ تو میرے دل کی آواز ہے۔ اب میں تمہیں اپنا دل چیر کر تو دکھانے سے رہی۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو پہلی ہی

نظر میں دل میں اتر جاتے ہیں اور ایسا لگتا ہے جیسے ہم انہیں صدیوں سے جانتے ہیں۔“

”جیسے تمہارا شوہر!“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اسے بھی تو تم نے پہلی ہی نظر میں پسند کر لیا تھا۔“

”مجھے طعنہ مت دو۔ وہ میری کم عقلی تھی۔“

”اگر تمہاری اجازت ہو تو میں شاور لے لوں؟“ میں نے کہا۔

”اس میں میری اجازت کی کیا ضرورت ہے؟“ سنیتا نے کہا۔ ”الماری میں سریش کے کپڑے بھی موجود ہیں۔ اس کا کوئی سلیپنگ سوٹ لے لو۔ اس کا جسم بھاری ہے لیکن قد میں تم سے کچھ ہی چھوٹا ہوگا۔“

پھر اس نے خود ہی ایک سلیپنگ سوٹ اور تولیا نکال کر مجھے دے دیا۔

مجھے جینی کی فکر تھی۔ غسل خانے میں جا کر میں نے پانی کا نل کھولا اور سیل فون نکال کر جینی کا نمبر ملا لیا۔ اس نے دوسری ہی بیل پر فون ریسیو کر لیا۔

”ہیلو جینی! تم کہاں ہو؟“

”مجھے اس وقت خود معلوم نہیں کہ میں کہاں ہوں۔“ جینی نے کہا۔ ”تم تو خیریت سے ہو؟“

”ہاں، میں خیریت سے برابر والے فلیٹ میں پہنچ گیا تھا۔“

”میں دیکھ رہی تھی۔ ورما اور دو پولیس والے پہلے ہمارے گارڈز سے بحث کرتے رہے۔ پھر انہوں نے مجھے گرفتار کرنے کی دھمکی دی۔ ان کا خیال تھا کہ میری گرفتاری کی خبر سن کر تم خود پولیس اسٹیشن پہنچ جاؤ گے۔ گارڈز کسی بھی قیمت پر راضی نہیں ہو رہے تھے۔ ورما نے اچانک ریوالور نکالا اور ان بے چاروں کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ہلاک کر دیا۔

میں نے ورما پر حملہ کر دیا۔ اس کا ریوالور ہاتھ سے نکلا تو دونوں کانسٹیبل حرکت میں آ گئے۔ میں اس وقت غصے میں بھری ہوئی تھی۔ میں نے ایک ایک وار میں ان دونوں کی گردنیں توڑ دیں۔ تیسرا وار میں نے ورما پر کیا لیکن وہ عین وقت پر اپنی جگہ سے ہٹ گیا اس لیے وار اچٹ گیا۔ دعا کرو کہ وہ ہوش میں آنے سے پہلے ہی مر جائے۔“

”وہ مرے یا جیے...“ میں نے کہا۔ ”تم مجھ سے رابطے میں رہنا۔ میں اپنا سیل سائلنٹ پر رکھوں گا۔ اگر ریسیو نہ کروں تو سمجھ جانا کہ ابھی میں کال ریسیو کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ تم بھی اپنا سیل فون سائلنٹ ہی پر رکھنا۔ ابھی تو میں اسی فلیٹ میں ہوں۔ یہاں پوری بلڈنگ میں پولیس بھری ہوئی ہے۔ جب یہاں سے نکلوں گا تو تمہیں اطلاع کر دوں گا اور تم بھی مجھے تمام حالات سے باخبر رکھنا... ٹھیک ہے...“

میں نے سلسلہ منقطع کیا تھا کہ سیل فون میں دوبارہ وائبریشن ہونے لگی۔ دوسری طرف سعید بھائی تھے۔

”ہیلو!“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”یہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو؟“ سعید بھائی کی آواز میں جھنجلاہٹ اور غصہ تھا۔ ”کیا تم پاکستان سے کلنگ لائسنس لے کر آئے ہو؟ اب تک تمہارے کھاتے میں پانچ قتل ہو چکے ہیں اور چھٹا ہونے والا ہے۔“

”سعید بھائی! وہ لوگ اچانک ہی ہمارے فلیٹ میں گھس آئے تھے۔“ میں نے کہا۔ ”انہوں نے پہلے میرے دونوں گارڈز کو ہلاک کیا۔ پھر میں نے ایکشن لیا ورنہ وہ تو مجھے بھی مار دیتے۔ آپ کیا چاہتے ہیں، گارڈز کی طرح میں بھی مر جاتا؟“

”تم اس وقت کہاں ہو؟“

”میں اس وقت ترکمان گیٹ کے پاس چھوٹے سے ایک مکان بلکہ کھولی میں ہوں اور یہاں بہت محفوظ ہوں۔ خطرہ ٹلتے ہی آپ سے رابطہ کروں گا۔“

”جینی کہاں ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جس وقت وہ لوگ فلیٹ میں داخل ہوئے تھے جینی موجود نہیں تھی۔“ پھر میں نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ”مجھے افسوس اس بات کا ہے سعید بھائی کہ میری وجہ سے اب آپ بھی مصیبت میں پڑ جائیں گے۔ پولیس کو فلیٹ کے مالک کی تلاش ہوگی اور آخرکار وہ آپ تک پہنچ جائے گی۔“

”اس فلیٹ کا مالک قانونی طور پر ابھی تک میں نہیں ہوں۔“ سعید بھائی نے کہا۔ ”یہ سودا میں ایجنٹ کے ذریعے کر رہا تھا۔ ایجنٹ بہت آسانی سے کہہ دے گا کہ اس کا گاہک امریکا یا لندن میں ہے۔ میں اسے ایسے لوگوں کے نام اور پتے بھی بتا دوں گا جو میری بات کی تصدیق کریں گے۔ اس کی تم فکر مت کرو، تم اپنا خیال رکھنا۔ اوکے ٹیک کیئر۔“ یہ کہہ کر انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

نہاتے ہوئے مجھے اپنے زخم کی وجہ سے بہت تکلیف ہوئی۔ زخم خاصا گہرا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ کہیں پانی پڑنے سے اس میں پس نہ پڑ جائے۔ میں نے حتی الامکان ہاتھ کو پانی سے بچانے کی کوشش کی۔

میں گرم پانی سے شاور لے کر نکلا تو خود کو خاصا ہلکا

www.pkdigest.com

محسوس کر رہا تھا۔ اسی دوران میں سیتا بھی شاور لے چکی تھی۔ اس کے بالوں سے شیمپو کی مسحور کن مہک اٹھ رہی تھی لیکن جسم پر ابھی تک وہی نائٹی موجود تھی۔

''چلو، پہلے ناشتا کرلو۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے آج اپنے لیے خاص طور پر آلو کے پراٹھے بنائے ہیں۔''

''اس سے پہلے ایک کام کرلو۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اس سے پہلے تم کوئی معقول لباس پہن لو ورنہ مجھ سے ناشتا نہیں کیا جائے گا۔''

''اوکے باس۔'' وہ شوخی سے بولی۔ میرے طنز کو شاید وہ اپنی تعریف سمجھی تھی۔

ناشتا کرنے کے بعد میں ٹی وی کھول کر بیٹھ گیا۔ ٹی وی پر ابھی چار آدمیوں کے وحشیانہ قتل کی خبر چل رہی تھی۔ دوسری تشویشناک اطلاع یہ تھی کہ تیسرے زخمی کی حالت خطرے سے باہر تھی اور وہ کسی بھی وقت ہوش میں آسکتا تھا۔

نیوز کاسٹر کہہ رہی تھی۔ ''مسٹر ورما پولیس کے ایکس کمشنر رہ چکے ہیں۔ انہوں نے ایک طویل عرصہ ایف بی آئی میں بھی گزارا ہے۔ انہوں نے قاتل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

میں جانتا تھا کہ ورما میڈیا کے سامنے کیا زہر اگلے گا۔ وہ مجھے پاکستانی...... ایجنٹ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دے گا۔ اس کے پاس ہمارا پاسپورٹ تھا۔ وہ ان تصویروں کے ذریعے ہم دونوں کی تشہیر کرسکتا تھا۔ یہاں سے پاکستانی میڈیا اس خبر کو پک کر لیتا اور لمحوں میں وہ خبر پاکستان کیا دنیا بھر میں پھیل جاتی کہ پاکستان..... کے ایک ایجنٹ اور اس کی ساتھی لڑکی نے انڈیا کے کئی افراد کو وحشیانہ انداز میں موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔

میں نے سیتا سے کہا کہ تم ذرا باہر کی سن گن لے کر آؤ۔ باہر پولیس موجود ہے یا جا چکی ہے اور یہ کہ عمارت کی نگرانی تو نہیں ہو رہی۔

''میں ابھی باہر جاؤں گی تو ساری معلومات لے کر آؤں گی۔'' سیتا نے کہا۔

مجھے اب ہر صورت میں اس پر اعتماد کرنا تھا۔ وہ چاہتی تو مجھے پولیس کے حوالے کر دیتی۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد سیتا بن ٹھن کر باہر چلی گئی۔ اس کے ہاتھ میں گاڑی کی چابیاں بھی تھیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس کے پاس گاڑی بھی ہے۔

''تم چاہو تو کوئی فلم لگا کے دیکھ لو یا انٹرنیٹ پر بیٹھ جاؤ، یوں بور ہونے سے بچ جاؤ گے۔ ہاں، تمہارے لیے سگریٹ وغیرہ کچھ لے کر آؤں؟''

''میں اسموکنگ نہیں کرتا۔ ہو سکے تو میرے ناپ کے کچھ کپڑے اور جوتے لیتی آنا لیکن کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ یہ مردانہ اشیا ہیں۔'' پھر میں نے اسے پیسے دینے کی کوشش کی لیکن میرے لاکھ اصرار کے باوجود اس نے انکار کر دیا۔

اس کے جانے کے بعد...... میں تنہا ہوا تو سوچوں نے گھیر لیا۔ میں نے سوچا، اس کھڑکی سے باہر کا جائزہ لوں جس کے ذریعے میں اس فلیٹ میں داخل ہوا تھا۔

وہاں پہنچ کر مجھے شیشے کے ٹکڑے نظر آئے۔ کوئی بھی ذہین آدمی وہ شیشے کے ٹکڑے دیکھ کر سمجھ سکتا تھا کہ شیشے کو توڑا گیا ہے تاکہ کھڑکی کھولی جاسکے۔

میں نے وہ تمام ٹکڑے صاف کیے۔ اب مسئلہ اس خالی فریم کا تھا جس کا شیشہ میں نے توڑ دیا تھا۔ مجھے اس کی بھی ترکیب سوجھ گئی۔ کچن میں بھی اسی طرح کی کھڑکی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہاں کا شیشہ نکال کر اس فریم میں فٹ کر دوں۔ پھر میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور کافی بنانے لگا۔ مجھے کافی کی طلب ہو رہی تھی۔

کچھ دیر میں نے ٹی وی دیکھا۔ کچھ دیر کمپیوٹر پر بیٹھ کر اپنی میلز چیک کیں، کچھ دیر سیتا کے سی ڈی پلیئر پر گانے سنے، پھر میں بور ہو کر بیڈ پر لیٹ گیا۔

سیتا کو گئے ہوئے تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ اسے اب تک واپس آجانا چاہیے تھا۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ داخلی دروازے میں چابی گھومنے کی آواز آئی اور سیتا ایک مزدور کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ میں جلدی سے پردے کی اوٹ میں ہو گیا۔ مزدور نے خاصا بڑا سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے سیتا سے پوچھا۔ ''اس سوٹ کیس میں کیا ہے؟''

اس نے جواب دینے کے بجائے سوٹ کیس کھول دیا۔ اس میں ٹی شرٹس، شرٹس، ڈریس پینٹس، جینز، جوتوں کے کئی جوڑے، شیونگ کٹ، پرفیومز، انڈر ویئرز، بنیان اور نہ جانے کیا کیا تھا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ سبزی اور ترکاری ہے۔'' وہ شوخی سے بولی۔ ''حد ہے بھئی، نظر نہیں آرہا ہے کہ یہ کیا ہے؟''

www.pkdigest.com

پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔ ''ایک بری خبر بھی ہے۔ پولیس والے اب یہاں کے ہر فلیٹ کی تلاشی لینے والے ہیں۔ ان کے خیال میں قاتل ابھی تک اسی بلڈنگ میں ہے کیونکہ ابھی تک اسے کسی نے باہر جاتے نہیں دیکھا۔''

''یہ کیسی بچوں والی باتیں کر رہی ہو؟ کیا یہاں پورے دہلی کی پولیس موجود ہے؟ جو وہ ایک آدمی پر نظر رکھ سکیں کہ وہ عمارت سے نکلا یا نہیں۔ آخر وہ لڑکی بھی تو نکل ہی گئی۔''

''میں صرف تمہیں اطلاع دے رہی ہوں۔'' سیتا نے کہا۔

''تمہارا وہ موکا لڈ مسبنڈ کب آتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کے آنے کا کوئی خاص وقت نہیں ہے۔ وہ کسی بھی وقت آجاتا ہے۔'' سیتا نے کہا۔

''یعنی رات میں دو بجے یا چار بجے یا دن میں کسی بھی وقت؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، اس کی فلائٹ کے اوقات کار ایسے ہی ہیں۔ اس کا موڈ ہوتا ہے تو وہ یہاں آجاتا ہے ورنہ اپنے بیوی بچوں کے پاس چلا جاتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، آج پھر وہ آئے گا اور رات کو ایک بجے کے بعد آئے گا۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کیا اس نے تمہیں فون کیا تھا یا پھر اس کا کوئی میسج آیا تھا؟''

''کبھی کبھی اپنی اس خوب صورت کھوپڑی کو بھی استعمال کر لیا کرو۔'' میں نے کہا۔ ''وہ قومی ائرلائن میں پائلٹ ہے۔ میں وارڈ روب میں اس کا یونیفارم دیکھ چکا ہوں۔ اگر میں وہ یونیفارم پہن کر باہر نکلوں تو کیا پولیس والوں یا سیکیورٹی والوں کو شبہ ہوگا؟''

''اچھا خیال ہے۔'' سیتا نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''میں ابھی ان کا سوٹ کیس تو لا ہی چکی ہوں۔ وہ بھی کسی وقت آگئے ہوں گے بلکہ میں تو سیکیورٹی والوں سے جا کر یہ پوچھوں گی کہ فلیٹ کی چابیاں سریش کو کس نے دی تھیں؟ اس میں سے ایک چابی گم ہے۔ پہلے تو وہ حیران ہوں گے پھر معذرت کریں گے اور اس بات پر حجت کریں گے کہ مسٹر سریش کو ہم نے چابیاں نہیں دیں۔''

وہ واقعی احمق تھی نہیں جتنی نظر آتی تھی۔ اس نے کہا کہ میں ابھی سیکیورٹی والوں سے جا کر چابی کے بارے میں پوچھتی ہوں۔

میں اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ تقریباً بیس منٹ بعد وہ ہنستی ہنستی آئی اور بتایا کہ یہاں کوئی غلطی ماننے کو تیار ہی

نہیں ہوتا۔ سیکیورٹی کے دونوں گارڈ کہہ رہے ہیں کہ ہم نے مسٹر سریش کو چابیاں نہیں دیں بلکہ ہم نے تو انہیں اوپر جاتے بھی نہیں دیکھا۔ پولیس والے بھی ان کی تائید کر رہے ہیں۔ انہوں نے بھی ائرلائن کے کسی باوردی پائلٹ کو اوپر جاتے نہیں دیکھا۔

''اب سے ٹھیک تین گھنٹے بعد غیلا کے لیے تمہاری فلائٹ ہے۔ تمہیں ڈیڑھ گھنٹے پہلے یہاں سے نکلنا ہے۔''

''لیکن ابھی تو دن ہے اور دن کی روشنی میں کیسے ممکن ہوگا؟''

''یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔ سریش یونہی اچانک آتا ہے اور یونہی چلا جاتا ہے۔ بس تم اس کا کوئی یونیفارم پہن لو۔''

اس نے خود ہی وارڈ روب سے سریش کا... ایک یونیفارم نکال کر دو۔ یونیفارم پہن کر واقعی میری شخصیت بدل گئی۔ پی کیپ لگانے کے بعد تو ایک لمحے کے لیے میں بھی خود کو نہیں پہچان سکا۔

''اب تم ایسی اداکاری کرنا جیسے تم نے بہت زیادہ پی ہے اور تم میرا سہارا لے کر چل رہے ہو۔ سریش کی واپسی عموماً اسی حالت میں ہوتی ہے۔ پہلے میں تمہارا سوٹ کیس گاڑی میں رکھواؤں گی پھر تمہیں لے کر باہر نکلوں گی۔''

اس کا منصوبہ تو ہر طرح سے مکمل تھا لیکن میرا دل انجانے خوف سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے اس کی نظر بچا کر چینی کے دیے ہوئے دونوں ریوالور بھی اپنی جیبوں میں ڈال لیے اور کپڑا لے کر ہر وہ جگہ امکانی طور پر صاف کر دی جہاں میری انگلیوں کے نشانات ہو سکتے تھے۔

سیتا نے انٹرکام پر سیکیورٹی آفیسر سے کہا کہ کسی آدمی کو اوپر بھیج دے۔ کیپٹن صاحب کا سوٹ کیس اٹھانا ہے۔ وہ ابھی جانے والے ہیں۔

تھوڑی دیر میں سیکیورٹی کا ایک آدمی آگیا۔ میں دانستہ پشت کر کے کھڑا ہو گیا تاکہ وہ مجھے دیکھ لے۔ وہ سوٹ کیس لے کر چلا گیا۔ سیتا نے اسے گاڑی کی چابی دی کہ اسے ڈکی میں رکھ دینا اور میری گاڑی باہر نکال دینا۔

سریش سگار بھی پیتا تھا۔ سیتا نے ایک سگار سلگا کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی سگریٹ نہیں پی تھی۔ میرے لیے سگار پینا تو بہت جان جوکھوں کا کام تھا۔ میں نے سگار کا پہلا ہی کش لیا تھا کہ مجھے زور کی کھانسی آئی اور میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''تم سگار صرف منہ میں لگا کر رکھنا، پینا مت ورنہ سیکیورٹی والوں اور پولیس والوں کو فضول میں شک ہو جائے گا۔''

میں نے سلگتا ہوا سگار ہونٹوں سے لگایا۔ سینیا کا سہارا لیا اور لڑکھڑاتا ہوا روانہ ہو گیا۔ میرا چہرہ سینیا کے کھلے بالوں میں کسی حد تک چھپ کر رہ گیا تھا۔ اس کے بالوں سے انتہائی مسحور کن مہک اٹھ رہی تھی اور کم بخت نے نہ جانے کون سا پرفیوم استعمال کیا تھا کہ اچھا بھلا شریف اور پارسا آدمی بھی مشتعل ہو جائے۔ اس پر اس کا گداز جسم!

زینے پر کھڑے ہوئے پولیس والوں نے ہمیں دیکھا اور ایک دوسرے کو آنکھ ماری۔ لفٹ پر موجود پولیس والوں نے بھی ہمیں دلچسپی سے دیکھا اور سینیا پر حسرت بھری ہلک ہوس ناک نگاہ ڈالی اور شاید میری قسمت پر رشک کیا کہ مجھے اتنی خوب صورت لڑکی کا ساتھ بلکہ سہارا میسر تھا۔

لفٹ نیچے پہنچی تو وہی سیکیورٹی آفیسر لپک کر آیا اور سینیا کو گاڑی کی چابی دیتے ہوئے بولا۔ ''میڈم! آپ کی گاڑی بلڈنگ کے باہر کھڑی ہے۔ صاحب کا سوٹ کیس میں نے ڈکی میں رکھ دیا ہے۔'' پھر وہ بولا۔ ''آپ کہیں تو میں صاحب کو سہارا دے کر گاڑی تک پہنچا دوں؟''

''تم صاحب کی عادت جانتے نہیں ہو۔ وہ یہ بات کب مانتے ہیں کہ انہیں سہارے کی ضرورت ہے۔''

پھر میں لڑکھڑاتا ہوا باہر کی طرف بڑھا۔

''ایک منٹ سر!'' پیچھے سے پولیس انسپکٹر کی آواز آئی۔

میرے اعصاب تن گئے۔ سینیا کا چہرہ بھی فق ہو گیا۔ شاید اس نے کوئی ایسی چیز دیکھ لی تھی جس نے اسے مشکوک کر دیا تھا۔

میں اپنی جگہ تھم کر رہ گیا اور میرا بایاں ہاتھ غیر محسوس طور پر جیب میں رینگ گیا جس میں لوڈڈ ریوالور موجود تھا۔

''سر! یہ آپ کا سگار۔'' پولیس والے نے بہت مؤدب انداز میں کہا۔

''شکریہ!'' سینیا نے سکون کی طویل سانس لی۔ ''ان کو اپنا ہوش نہیں ہے تو سگار کا کیا ہوش ہوگا؟''

پھر ہم گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر سینیا تھی۔ اس نے فوراً ہی گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

''شکر ہے!'' وہ بولی۔ ''اتنا بڑا کام کتنی آسانی سے ہو گیا۔ اب میں تمہیں اپنے اس فلیٹ پر لے جا رہی ہوں جس کا علم کسی کو نہیں ہے۔''

''اور اگر ابھی ایک آدھ دن میں سریش آ گیا تو؟''

''تو کیا؟'' سینیا نے کہا۔ ''اسے کچھ یاد کب رہتا ہے اور اس سے پوچھنے کی جرأت بھی کون کرے گا کہ وہ دو دن پہلے آیا تھا تو کیوں آیا ہے؟''

گاڑی آدھے گھنٹے تک چلنے کے بعد ایک صاف ستھرے اور پوش علاقے میں داخل ہوئی۔

''اب تم یہ یونیفارم اتار دو۔'' سینیا نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے کہ کوٹ، جیکٹ اور ٹائی اتار دو۔ چینٹ تو لوگ عموماً اس قسم کی استعمال کرتے ہیں۔''

میں بغیر کسی پریشانی کے سینیا کے نئے فلیٹ میں شفٹ ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر بعد وہاں ضرورت کی دوسری چیزیں بھی لے آئی اور بولی۔ ''میں اب چلتی ہوں، کل دوپہر تک آؤں گی۔''

اس کے جانے کے بعد میں نے ایک مرتبہ پھر جینی کو کال کی۔ وہ انڈیا گیٹ کے نزدیک کسی چھوٹے سے ہوٹل میں مقیم تھی۔ اس نے مقامی لباس یعنی شلوار قمیص پہن لیا تھا اور اپنا نام بھی نتاشا ڈی سوزا لکھوایا تھا۔ اس نے خود کو انڈین ظاہر کیا تھا۔ انڈیا میں عموماً کرسچن کو ہندی نہیں آتی یا وہ لوگ جان بوجھ کر نہیں بولتے۔ جینی نے اسی سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اس نے بتایا کہ میں نے اپنے سفارت خانے سے رابطہ کیا تھا اور انہیں بتایا تھا کہ انڈین پولیس مجھے فضول میں پریشان کر رہی ہے۔

اس فلیٹ میں ٹی وی بھی موجود تھا۔ میں نے ٹی وی کھولا تو اسپورٹس کا کوئی پروگرام چل رہا تھا۔ میں نے چینل بدلنا چاہا تو خبریں شروع ہو گئیں۔ نیوز کاسٹر کہہ رہی تھی۔ ''اکبر روڈ کے فلیٹ میں ہونے والے قتل کے ایک زخمی شری ورما کو ہوش آ گیا ہے۔ انہوں نے ہمارے نمائندے سے بات چیت کرتے ہوئے بتایا کہ کامران پاکستانی..... ایجنٹ ہے۔ ممبئی میں بھی وہ ہمارے ملازمین کو قتل کر کے بھاگا تھا۔ پھر وہ بہت چالاکی سے دہلی ائرپورٹ سے باہر نکل گیا۔ اس کے ساتھ ایک امریکن لڑکی بھی ہے۔ وہ بھی پاکستان..... کی معاونت کر رہی ہے۔ میرے پاس کامران کا پاسپورٹ بھی ہے جو وہ دہلی ائرپورٹ پر چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یہاں کون کون لوگ کامران کی مدد کر رہے ہیں۔ وہ اکبر روڈ کے فلیٹ میں موجود تھا، پھر وہ وہاں سے کہاں گیا؟ کیا اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا... پولیس جلد ہی اس کا پتا چلا لے گی۔''

اس کمینے ورما نے ممبئی میں اپنے دو آدمیوں کو خود ہی قتل کیا ہوگا... اور اب وہ دونوں قتل بھی اس نے میرے کھاتے میں ڈال دیے تھے۔

جاری ہے

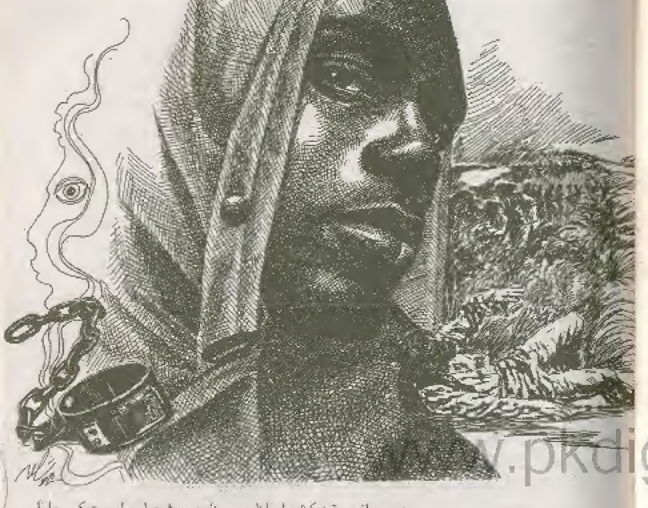

www.pkdigest.com

آزادی

محمد عفان آزان

سرزمین افریقہ کئی لحاظ سے منفرد حیثیت اور اہمیت کی حامل ہے... وہاں کے مکینوں کے عقائد... رہن سہن، رسم و رواج... اور سب سے اہم غربت اور دورِ غلامی... نسل در نسل چلنے والے غلامی کے سلسلے نے وہاں کی معیشت کو کسی بھی پیمانے پر پنپنے نہیں دیا

دہشت پسند گروہوں کی ظالمانہ... سفاکانہ کارروائیوں کا پُردرد احوال

تاکشی کا گاؤں جنوبی انگولا کے شورش زدہ علاقے کے پاس ہی تھا۔ گزشتہ تین دہائیوں سے یہ خطہ خانہ جنگی کی آگ میں جل رہا تھا۔ تاکشی اور اس کے گاؤں کے لوگ کئی بار اس آگ کا نشانہ بنے۔ حالانکہ وہ بڑا امن اور اپنے کام سے کام رکھنے والے لوگ تھے جن کی معیشت کا انحصار زراعت پر تھا۔ کسی زمانے میں یہاں ایک سونے کی کان تھی لیکن اس میں سے بیشتر سونا نکالنے کے بعد کوئی تیس برس پہلے یہاں تجارتی کان کنی بند کر دی گئی تھی... لیکن اب بھی گاؤں کے لوگ فارغ اوقات میں کام کر کے کچھ سونا نکال لیا کرتے تھے۔ اس سونے کو گاؤں کی اجتماعی بھلائی کے لیے خرچ کیا جاتا۔ سونے کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم سے گاؤں میں اسکول اور ایک مرکزِ صحت چلایا جا رہا تھا۔ اسکول میں دو استاد گاؤں کے بچوں کو تعلیم دیتے تھے جبکہ مرکزِ صحت میں ہفتے میں دو بار ایک ڈاکٹر آ کر مریضوں کو دیکھا کرتا۔

تاکشی سولہ سال کا مضبوط جسم والا ذہین اور چست لڑکا تھا۔ اس کے تین بہن بھائی اور تھے۔ اس کا باپ کسان تھا اور اپنی زمین پر مکئی اور سورج مکھی کے ساتھ سبزیاں کاشت کرتا تھا۔ اس کے پاس ایک گائے اور چند بکریاں بھی تھیں۔ اس لحاظ سے اس کا شمار گاؤں کے کھاتے پیتے لوگوں میں ہوتا تھا۔ تاکشی سے بڑے دو بھائی زمین پر باپ کا ہاتھ بٹاتے تھے

جبکہ تاکشی اپنی چھوٹی بہن اور ماں کے ساتھ جانوروں کی دیکھ بھال کرتا۔ وہ روز گائے کا دودھ نکال کر گاہکوں کے گھر پہنچاتا جبکہ بکریوں کا دودھ وہ لوگ خود استعمال کرتے۔ اس کے علاوہ کچھ مرغیاں بھی تھیں، ان سے انڈے مل جاتے تھے۔ ان لوگوں کی زندگی مزے میں گزر رہی تھی۔

بس انہیں ایک دھڑکا لگا رہتا کہ کب کسی مسلح گروہ کے لوگ گاؤں میں داخل ہوں اور وہاں سے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو اٹھا کر لے جائیں۔ ہر گروہ کو اپنی طاقت برقرار رکھنے کے لیے نئے خون کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اس طرح سے اپنی طاقت بڑھاتے تھے۔ مسلح گوریلے رات کی تاریکی میں اچانک کسی گاؤں پر دھاوا بول دیتے اور وہاں سے بارہ سے سولہ سال تک کے تمام بچوں کو اسلحے کے زور پر ساتھ لے جاتے۔ جو ان کی راہ میں حائل ہونے کی کوشش کرتا، اسے وہ بے دریغ قتل کر دیتے۔ ایک زمانہ تھا کہ انگولا کے لوگ وچ ڈاکٹر سے سب سے زیادہ ڈرتے لیکن اب وہ ان مسلح گروہوں سے ڈرتے تھے جو ان کے بچے اٹھا کر لے جاتے تھے۔

تاکشی کے گاؤں میں بھی کئی بار متحارب گروہوں نے ہلا بولا اور ان کے گاؤں سے کم سے کم تیس افراد کو لے جا چکے تھے۔ ان کے گھر والے آج بھی انہیں روتے تھے اور ان کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ زندہ بھی تھے یا مر چکے تھے۔ گوریلا گروپ اس معاملے میں بہت سخت تھے۔ اگر ان کا کوئی آدمی بھاگنے کی کوشش کرتا تو وہ اسے تو مارتے ہی تھے، ساتھ ہی اس کے گھر والوں کو بھی مار دیتے۔ تاکشی کے گاؤں میں ایسا ایک واقعہ پیش آچکا تھا جب ایک گروہ کے لوگ بھاگنے کی کوشش کے دوران مارے جانے والے گوریلے کی لاش لے کر گاؤں میں آئے اور لاش اس کے گھر کے سامنے رکھ کر گھر والوں کو بھی باہر نکالا اور ایک قطار میں کھڑا کر کے گولی سے اڑا دیا۔ اس واقعے میں تین بے گناہ افراد کا خون ہوا تھا۔ ان کی یہ سفاکی ان کے چنگل میں پھنس جانے والوں کو مجبور کرتی تھی کہ وہ بھاگنے کی کوشش نہ کریں۔ ورنہ اس کا خمیازہ ان کے ساتھ ان کے پیاروں کو بھگتنا پڑے گا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ اس گاؤں سے تعلق رکھنے والے کسی اور زبردستی کے گوریلے نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ دو سال سے کسی مسلح گروہ نے ان کے گاؤں کا رخ نہیں کیا تو وہ خاصی حد تک مطمئن ہو گئے لیکن... اچانک ہی ایک رات دو جیپوں اور ایک بڑی بس میں سوار گوریلے ان کے گاؤں میں گھس آئے۔ گاڑیوں کا شور سن کر لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ جن گھروں میں جوان لڑکے لڑکیاں تھے، ان کی حالت خراب ہونے لگی اور انہوں نے اپنے بچوں کو بھگانے کی کوشش کی کہ وہ جا کر جنگل یا سونے کی متروک کان میں پناہ لے لیں۔ بہت سارے بچے بھاگ گئے اور بہت سارے ماں باپ سے چپٹے رہے۔

گوریلوں نے پورا گاؤں گھیر لیا اور اس کے بعد گھر گھر میں گھس کر اندر موجود لوگوں کو باہر نکال کر گاؤں کے وسط میں چوک پر جمع کرنے لگے۔ جب انہوں نے سارے گاؤں کے لوگوں کو جمع کر لیا تو اس کے بعد انہوں نے بچوں کو الگ کرنا شروع کر دیا۔ بارہ سال سے سولہ سال کی عمر تک کے لڑکے لڑکیوں کو الگ کر کے ایک جگہ کیا جانے لگا۔ ان کے ماں باپ مزاحمت کر رہے تھے اور اپنے بچوں سے لپٹے جا رہے تھے۔ گوریلے انہیں دور کرنے کے لیے ماں باپ پر رائفلوں کے بٹوں سے تشدد کر رہے تھے۔ وہاں ایک چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ عورتیں اپنے بچوں کے لیے ابھی سے سر پر خاک ڈال کر بین کر رہی تھیں۔

تاکشی اس وقت آٹھ سال کا تھا اور اپنے باپ کے بیچ وں سے لپٹا ہوا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس کی چھوٹی بہن اس کی ماں سے لپٹی جا رہی تھی جبکہ اس کے دونوں بھائی جنگل کی طرف بھاگ گئے تھے۔ سب کی طرح تاکشی کے ماں باپ بھی ہراساں تھے کہ ان کے بچوں کو نہ پکڑ لیا جائے کیونکہ گوریلے بھاگنے والے کئی بچوں کو پکڑ لائے تھے۔ ان کے سر پر رائفل رکھ کر انہوں نے ان بچوں کے ماں باپ کو سامنے آنے پر مجبور کیا اور اس کے بعد ان لوگوں کو بے دردی سے مارا کہ انہوں نے بچوں کو چھپایا کیوں۔

دو گھنٹے میں اپنا کام کر کے گوریلے کوئی ایک درجن لڑکے لڑکیوں کو لے کر ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ لے جانے والے بچوں میں چار لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ اس وقت تو تاکشی کو پتا نہیں تھا کہ گوریلے لڑکیوں کو کیوں لے گئے تھے لیکن بعد میں اسے پتا چلا کہ ان لڑکیوں سے گوریلے اپنی تسکین کا سامان کرتے تھے اور وہ ان کے ناجائز بچوں کی مائیں بنتی تھیں۔ یہ بچے بھی گروہ میں شمار ہوتے تھے اور بڑے ہو کر بھی ان کے لیڈر رہتے تھے... کیونکہ اغوا کر کے لائے گئے کسی بچے کو گوریلے لیڈر نہیں بناتے تھے۔ وہ جب تک زندہ رہتے، عام گوریلے ہی رہتے یا معمولی درجے تک پہنچ جاتے۔ اصل میں ان گروہوں کو زبردستی کے بنائے ہوئے گوریلوں پر اعتبار نہیں تھا۔

تاکشی اس واقعے سے اتنا خوف زدہ ہوا کہ کئی راتوں

تک خواب میں گوریلوں کو دیکھ کر چیخ مار کر اٹھ جاتا۔ اسے ڈر تھا کہ گوریلے پھر آئیں گے اور اسے بھی پکڑ کر لے جائیں گے۔ اسے معمول پر آنے میں کئی مہینے لگ گئے۔ گاؤں کی فضا بھی بہت دن تک سوگوار رہی۔ جن گھروں کے بچے گئے تھے، ان کے لیے تو سوگ کا سا سماں تھا۔ کئی دن تک رونے دھونے کی آوازیں آتی رہیں لیکن رفتہ رفتہ انہیں بھی صبر آ گیا۔

اس کے بعد سے گاؤں کے لوگوں نے مل کر غور کیا کہ اس مصیبت سے کس طرح نجات حاصل کی جائے لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان مسلح گروہوں کے خلاف آدمی کس طرح لڑے اور اپنے بچوں کو ان سے کس طرح بچائے۔ بس یہی ایک طریقہ ہو سکتا تھا کہ جب گوریلے آئیں تو وہ اپنے بچوں کو چھپا دیں۔ یہ بات لوگوں کے ذہن میں آئی۔ انہوں نے یہ کیا کہ جن گھروں میں بچے تھے، وہاں چھپنے کے لیے زمین میں گڑھے بنا کر ان کے منہ پر مٹکے رکھ دیے۔ یہ گڑھے اندر سے اتنے بڑے تھے کہ ان میں بیک وقت کئی بچے آ سکتے تھے اور ان میں ہوا کی آمد و رفت کا بھی خیال رکھا گیا تھا۔ بعض لوگوں نے یہ کیا کہ اپنے بڑے ہوتے ہوئے بچوں کو دور دراز کہیں بھیج دیا لیکن یہ مسئلے کا حل نہیں تھا۔ خود ان سے بچوں کی جدائی برداشت نہیں ہوئی تو انہوں نے بچوں کو واپس بلا لیا۔

اس کے بعد گوریلے کئی بار ان کے گاؤں میں آئے لیکن گاؤں والوں نے اپنے بچوں کو چھپا دیا اور جب بچے نہ ملے تو مشتعل گوریلوں نے ان پر تشدد کیا تو انہوں نے جھوٹ کہہ دیا کہ ان کے بچے دوسرے گروہ والے لے گئے ہیں۔ اب ان کے پاس بچے رہے ہی کہاں ہیں۔ دو تین دفعہ یہ جھوٹ بولنے کے بعد گوریلوں نے اس گاؤں کا رخ کرنا چھوڑ دیا۔ ظاہر ہے، جب بچے نہیں تھے تو وہ وہاں آ کر کیا کرتے؟ اس طرح گاؤں میں دو تین سال تک امن و سکون رہا۔

ان دنوں انگولا میں متحارب گروپوں میں ایک نیا نام ابھر کر سامنے آیا۔ یہ گوریلا لیڈر نکلاشا تھا۔ نکلاشا تاکشی کے گاؤں کے پاس ہی ایک گاؤں سے بچپن میں اغوا ہوا تھا لیکن بڑے ہونے پر وہ ان گوریلوں کے رنگ میں رنگ گیا اور اس نے ظلم و تشدد کی ایسی داستانیں رقم کیں کہ لوگ اس کے نام سے خوف کھانے لگے۔ اس کے آدمی جہاں سے گزرتے، اپنے پیچھے صرف جلی ہوئی بستیاں اور لاشوں کے انبار چھوڑ جاتے۔ وہ ایک خاص مکتبۂ فکر کا دشمن تھا اور اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اسے مغربی طاقتوں اور خاص طور سے امریکا کی پشت پناہی حاصل ہے۔ امریکا اسے ہتھیار اور رقم فراہم کر رہا تھا تاکہ وہ اس خطے میں امریکا مخالف گروہوں کا صفایا کر دے۔ اس نے یہ کام اتنی دل جمعی سے کیا کہ وہ ان نام نہاد امن پسند طاقتوں کی آنکھ کا تارہ بن گیا۔

امریکی دولت اور ہتھیاروں کے بل بوتے پر معمولی سا گوریلا لیڈر نکلاشا یک دم ہی اوپر آیا تھا۔ اس نے دوسرے گروہوں سے لوگ توڑے اور نئی بھرتیاں کیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس علاقے پر چھا گیا۔ اپنے مخالفوں پر خوفناک مظالم کے سبب اس کا نام بین الاقوامی میڈیا میں بھی آیا اور انسانی حقوق کی تنظیموں نے اس کے خلاف متعدد رپورٹس شائع کیں۔ البتہ یہ ذکر ان کی رپورٹس میں نہیں تھا کہ نکلاشا کو ہتھیار اور اسلحہ مغربی طاقتیں فراہم کر رہی ہیں۔ خاص طور سے ایک گاؤں میں ہونے والے قتل عام کی تصاویر نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ ان تصویروں میں گولیوں سے چھلنی اور پھانسی پر لٹکے انسانوں کی جلتی لاشیں تھیں۔ بچوں کو ایک ہی رسی سے پھندے بنا کر تار یل کے درختوں سے لٹکا دیا۔ عورتوں کو بے حرمتی کے بعد ٹکڑوں میں کاٹ دیا گیا تھا اور پورا گاؤں نذر آتش کر دیا گیا تھا۔ ان تصویروں سے لوگوں کو یہ تو پتا چل گیا

گجرات
شہر کے بک سیلرز، دکان دار اور ہاکر حضرات
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ اور ماہنامہ سرگزشت
کے حصول کے لیے
خالد بک ڈپو
مسلم بازار گجرات سے رجوع فرمائیں
رابطہ کریں
محسن احمد: 0333-8421027
عامر صدیقی: 0333-8443093
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 5895313 فیکس: 5802551

www.pkdigest.com

کہ انگولا میں ایک اور عفریت جنم لے چکا ہے لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کا مائی باپ کون ہے۔

تاکشی کے گاؤں والوں کی بدقسمتی تھی کہ نکتا شا ایک اغوا شدہ شخص تھا اور اسے معلوم تھا کہ دیہاتی، گوریلوں سے اپنے بچوں کو بچانے کے لیے کیا طریقے استعمال کرتے ہیں اس لیے اس کے آدمی کسی گاؤں میں جاتے تو بچوں کو تلاش کر ہی لیتے۔ ان خبروں نے تاکشی کے گاؤں میں تشویش کی لہر دوڑا دی اور انہوں نے پھر سر جوڑ کر غور کیا کہ اپنے بچوں کو بچانے کے لیے کیا کریں۔ تاکشی کے باپ نے تجویز دی کہ اس کام کے لیے سونے کی کان کو استعمال کیا جائے۔ یہ اندر سے بہت بڑی اور اتنی پیچیدہ تھی کہ کوئی اجنبی اس کے اندر گھس کر راستہ یاد نہیں رکھ سکتا تھا۔

تاکشی اور اس کے ساتھی اس کان میں کھیل کود کر ہی بڑے ہوئے تھے اور فارغ دنوں میں اپنے بڑوں کے ساتھ جاتے تھے تاکہ کان سے سونے کے ذرات والی ریت جمع کر کے لائیں۔ اس لیے کان کی ساری سرنگیں ان کی دیکھی بھالی تھیں مگر گاؤں سے کان کا فاصلہ کوئی نصف کلومیٹر تھا اور اگر گوریلے آ جاتے تو بچوں کو کان تک جانے کے لیے چند منٹ درکار تھے۔ اس لیے گاؤں والوں نے فیصلہ کیا کہ وہ راتوں کو کسی اونچی جگہ پر پہرا دیں گے۔۔۔ اگر گاؤں کی طرف کوئی آتا نظر آیا تو لوگوں کو ہوشیار کر دیا جائے گا اور وہ اپنے بچوں کو کان کی طرف بھیج دیں گے۔

پہرے دار کے لیے گاؤں کے اس حصے میں ایک بلند درخت پر سیڑھی بنا کر مچان کا بندوبست کیا گیا جس طرف سے گوریلے آتے تھے۔ اصل میں آنے کا راستہ یہی تھا کیونکہ ایک طرف دریا تھا اور دوسری طرف کان تھی اس لیے گاڑیوں میں سوار لوگ اسی طرف سے آتے تھے۔ پہرے دار کے پاس ایک نرسنگھا ہوتا۔ وہ کسی کو آتے دیکھتا تو یہ نرسنگھا بجا دیتا۔ ایک رات گوریلے آ گئے تو پہرے دار نے انہیں دور سے دیکھ کر نرسنگھا بجا دیا۔ گاؤں کے لوگ اس کی آواز سن کر اٹھ گئے اور انہوں نے جلدی سے اپنے بچوں کو کان کی طرف روانہ کر دیا۔

آنے والے نکتا شا کے آدمی تھے۔ انہوں نے گاؤں کا محاصرہ کر لیا لیکن اتنی دیر میں بچے جا چکے تھے گاؤں میں اب بڑے تھے یا بہت چھوٹے بچے تھے۔ گوریلوں نے لوگوں کو گھروں سے نکال کر جمع کرنا شروع کر دیا اور جب کسی درمیانی عمر کے بچے کو نہیں پایا تو انہوں نے غصے سے بے تاب ہو کر لوگوں پر تشدد شروع کر دیا۔ وہ ان سے پوچھ رہے تھے کہ ان کے بچے کہاں گئے۔ لوگ مار برداشت کر رہے تھے لیکن اپنے بچوں کے بارے میں بتانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جب گوریلوں کو بچے نہیں ملے تو انہوں نے دو جوان لڑکیوں کو قبضے میں لے لیا اور گاؤں والوں کو دھمکی دی کہ اگلی بار وہ آئیں تو انہیں بچے ملنے چاہئیں ورنہ ان کے ساتھ اچھا نہیں ہوگا، وہ نکتا شا کے لوگ ہیں۔ جن کی لڑکیاں تھیں، وہ روتے رہ گئے اور گوریلے انہیں لے کر روانہ ہو گئے۔

تاکشی اور اس کے ساتھ کوئی تین درجن لڑکے لڑکیاں سونے کی کان میں جا کر چھپ گئے۔ جب صبح ہوئی اور گاؤں والوں نے آ کر ان کو نکالا تو انہیں پتا چلا کہ گاؤں والوں پر کیا قیامت گزر چکی ہے۔ مگر وہ بے بس لوگ تھے، کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ نکتا شا سے گاؤں والوں کا پہلا عملی تعارف تھا۔ نکتا شا نے گاؤں والوں کو سزا دینے کے لیے ان لڑکیوں کو اپنے پاس نہیں رکھا بلکہ ان کی کٹی پھٹی لاشیں اگلے ہی دن گاؤں کے باہر سے مل گئیں۔ لڑکیوں کی لاشیں دیکھ کر گاؤں والے سہم گئے اور انہیں احساس ہونے لگا کہ ان کا واسطہ ایک درندے سے پڑا ہے۔

اس بار گاؤں والوں نے سوچ لیا کہ اب گوریلوں کو گاؤں میں بچوں کے ساتھ کوئی جوان لڑکی بھی نہیں ملے گی۔ انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا تو ان کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مگر انہوں نے طے کر لیا تھا کہ اپنے بچے ان کے حوالے نہیں کریں گے۔ مشکل سے پانچ سو افراد پر مشتمل اس گاؤں کا مستقبل یہی بچے تو تھے۔ اگر گوریلے ان سے ان کے بچے چھین کر لے جاتے رہتے تو وہ ایسے ہی ختم ہو جاتے۔ گاؤں کے بڑوں نے حساب لگایا تو پتا چلا کہ پچھلے تین سالوں میں ان کے گاؤں کی آبادی بڑھنے کے بجائے کم ہوئی تھی کیونکہ اس دوران میں بے شمار بچوں کو گوریلے چھین کر لے گئے تھے اور کئی جوان افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

نکتا شا کی آمد سے پہلے ماحول اتنا کشیدہ نہیں تھا اور گاؤں والے تھوڑا ہنس بول لیا کرتے تھے لیکن جب سے اس کی اس علاقے پر اجارہ داری ہوئی تھی۔ لوگ ہنسنا بھول گئے تھے۔ پہلے سارے دن کے کاموں کے بعد گاؤں میں چوپال جمتی تھی جس میں قصے کہانیاں ہوتی تھیں اور لوگ ایک دوسرے کو لطیفے سناتے تھے۔ موسیقی کے ردھم پر رقص ہوتا تھا اور جوان جسم آگ کے گرد ناچتے تھے مگر اب لوگ کاموں سے فارغ ہو کر گھروں میں گھس جاتے تھے۔ ذرا سی آہٹ ہوتی تو ڈر جاتے۔ تاکشی یہ سب دیکھتا۔۔۔ تو اس کا خون کھولتا تھا۔

دوسری بار نکتا شا کے لوگ جب گاؤں کی طرف آنے لگے تو پہرے دار نے پھر خبردار کر دیا اور لوگوں نے اپنے بچوں کے ساتھ جوان کنواری لڑکیوں کو بھی کان کی طرف بھیج دیا۔ وہ افراتفری میں بھاگے اور جنگل سے گزرتے ہوئے کان میں گھس گئے۔ ان کے بڑوں نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ انہوں نے کان کے بالکل اندر والے حصوں میں گھسنا ہے اور سب نے ایک جگہ جمع نہیں ہونا بلکہ وہ الگ الگ جگہ رہیں تاکہ گوریلے کان میں گھس آئیں تو سب ہی نہ پکڑے جائیں۔ تاکشی کے ساتھ اس کی چھوٹی بہن بھی تھی۔ وہ پندرہ سال کی تھی لیکن جب تاکشی کان میں گھسنے لگا تو اس نے دیکھا کہ اس کی بہن نہیں ہے۔ اس نے بے قرار ہو کر اسے آوازیں دیں پھر دوسروں سے پوچھا۔ کسی نے اس کی بہن کو نہیں دیکھا تھا۔ تاکشی کو خیال آیا کہ وہ گاؤں میں ہی نہ رہ گئی ہو۔ اگر ایسا تھا تو گوریلے لازمی طور پر اسے ساتھ لے جاتے۔

تاکشی واپس جانے لگا۔ وہ گاؤں کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ گوریلے گاؤں والوں کو گاؤں کے چوک پر جمع کر رہے تھے۔ وہ چھپتا چھپاتا وہاں پہنچا تو جمع ہونے والوں میں اس کے گھر کے لوگ بھی شامل تھے اور تاکشی کا خون یہ دیکھ کر خشک ہو گیا کہ اس کی بہن بھی گھر والوں کے ساتھ موجود تھی۔ نہ جانے کیوں وہ واپس چلی گئی تھی۔ وہ بہت خوب صورت تھی اور یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ گوریلے اسے نظرانداز کر دیتے۔ کچھ دیر میں سارے گاؤں والے وہاں جمع ہو گئے۔ تاکشی ایک جھونپڑی کی چھت پر چڑھا ہوا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ گوریلے تعداد میں دو درجن سے زیادہ نہیں تھے لیکن وہ سب جدید ترین خودکار ہتھیاروں سے مسلح تھے۔۔۔ اگر وہ چاہتے تو تمام گاؤں کو دس منٹ میں موت کی نیند سلا سکتے تھے۔ پھر ایک پستہ قد آدمی سامنے آیا۔ اس نے نیلے رنگ کی فوجی وردی پہن رکھی تھی جیسی کہ عام طور سے امریکی فوجی پہنتے ہیں۔ اس کے شانے سے رائفل لٹکی تھی اور پتلون کی بیلٹ سے اس کے اضافی میگزین بندھے تھے۔ اس کی وردی پر سامنے کی طرف دستی بم لٹکے ہوئے تھے اور وہ شاید خود کو ہالی ووڈ کی فلموں کا ایکشن ہیرو سمجھ رہا تھا جو سر سے پاؤں تک اسلحے سے لیس ہوتا ہے۔ اس نے لوگوں کا جائزہ لیا اور چلا کر بولا۔

''میرے آدمیوں نے تمہیں خبردار کیا تھا کہ اگلی بار کوئی بچہ نہیں چھپانا ہے ورنہ تم لوگوں کو سخت سزا ملے گی۔ بچے مجھے اب بھی نظر نہیں آ رہے۔ بچے کہاں ہیں؟''

کوئی نہیں بولا تو پستہ قد شخص نے ایک بوڑھے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ گوریلے اسے پکڑ کر اس کے سامنے لے آئے۔ پستہ قد شخص نے اس کے سر پر اپنا پستول رکھا اور بلند آواز سے بولا۔ ''میرا نام نکتا شا ہے، بچے کہاں ہیں؟''

اس بار بھی جواب نہیں ملا تو اس نے بنا کسی وارننگ کے فائر کر دیا۔ بوڑھا آدمی بنا کوئی آواز نکالے زمین پر گرا اور مر گیا۔ یہ منظر دیکھ کر لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ بوڑھے کے رشتے دار بلند آواز سے رونے لگے اور ان کے رونے دھونے کی پروا کیے بغیر نکتا شا نے اس بار تاکشی کے باپ کو سامنے آنے کو کہا۔ وہ لرزتا ہوا سامنے آیا۔ نکتا شا نے اسے گھٹنوں کے بل بیٹھنے کو کہا اور اس کے سر پر پستول رکھ دیا۔ اس نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

''بچے کہاں ہیں؟''

''نہیں۔'' تاکشی کی ماں تڑپ کر شوہر کی طرف بھاگی تو نکتا شا نے اس کے قریب آنے سے پہلے گولی اس کے سینے میں اتار دی۔ وہ تیورا کر گری اور چند سیکنڈ میں تڑپ کر جان دے دی۔ تاکشی اور اس کے بہن بھائیوں کے منہ سے بیک وقت چیخیں نکلیں اس لیے گوریلے نہیں جان سکے کہ کوئی ایک اور آواز کہیں اور سے آئی ہے۔ تاکشی کی بہن دوڑتی ہوئی آ کر ماں کی لاش سے لپٹ گئی۔ لیکن فوراً ہی دو گوریلے اسے وہاں سے کھینچ کر لے گئے۔ تاکشی کے بھائی آگے آنے لگے تو گوریلوں نے ان پر رائفلیں تان لیں۔ وہ بے بسی سے وہیں رک گئے۔

''بچے کہاں ہیں؟'' نکتا شا نے پھر پوچھا۔

''گاؤں میں کوئی بچہ نہیں ہے۔'' تاکشی کے باپ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''تمام بچوں کو دوسرا گوریلا گروپ لے گیا ہے۔''

یہ سنتے ہی نکتا شا نے تاکشی کے باپ کو بھی گولی مار دی۔ تاکشی کے بھائی دھاڑیں مار کر رونے لگے لیکن تاکشی کے منہ سے آواز نہیں نکلی۔ وہ بس پھٹی پھٹی نظروں سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ نکتا شا نے چلا کر کہا۔

''اگر میرے عتاب سے بچنا چاہتے ہو تو اگلی بار مجھے اس گاؤں سے ایک درجن لڑکے چاہئیں۔ میں ان کے بدلے تمہیں ہر مہینے رقم دوں گا لیکن مجھے لڑکے ہر قیمت پر درکار ہیں۔''

نکتا شا کے اشارے پر اس کے آدمی اپنی گاڑیوں کی طرف چلے گئے مگر جاتے ہوئے وہ تاکشی کی بہن کو بھی لے گئے۔ جب وہ چلے گئے اور گاؤں والے بین کرتے ہوئے لاشوں کے گرد جمع ہونے لگے تو تاکشی بھی جھونپڑی سے اتر

آیا۔ اسے دیکھ کر اس کے بھائی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے لیکن اس وقت بھی اس کے آنسو خشک تھے۔ لوگ اس کے گلے لگ لگ کر روتے رہے مگر وہ چپ رہا۔ وہ نہیں رویا تو سب نے اسے رلانے کی کوشش بھی کی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ صدمے نے اسے گنگ کر دیا ہے مگر وہ دوسروں کی کوشش کے باوجود نہیں رویا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے آنسو اندر ہی اندر گر رہے ہوں۔

اگلے دن ماں باپ کو ان کے رواج کے مطابق دفنا دیا گیا۔ درحقیقت انہوں نے تاشی کی بہن کو بھی دفنا دیا تھا۔ انگولا میں موت کا فرشتہ اور متحارب گروہ ایک جیسے تھے۔ وہ جسے لے جاتے وہ پھر کبھی واپس نہیں آتا تھا۔ تاشی اس واقعے کے بعد سارا سارا دن بے چین پھرتا رہتا۔ اس نے کام کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بھائی اسے سمجھاتے لیکن وہ ان کی بات خاموشی سے سن لیتا مگر کرتا وہی تھا جو اس کا دل چاہتا۔

گاؤں پر خوف و دہشت کی فضا مزید گہری ہو گئی تھی۔ بہت سے لوگوں نے تو اپنے بچوں کو بچانے کے لیے یہاں سے جانے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ یہاں اس ماحول میں رہنا بہت مشکل کام تھا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ نکل کر کہاں جاتے؟ سارے ملک میں یہی ہو رہا تھا۔ بس چند علاقے محفوظ تھے تو وہاں پر کتنے لوگ جا کر رہ سکتے تھے۔ سارے ملک سے لوگوں کا سیلاب ان محفوظ علاقوں کا رخ کر رہا تھا۔

سب کو معلوم تھا کہ نکتاشا کے آدمی جلد یا بدیر پھر ان کے گاؤں کا رخ کریں گے۔ ایک بار پھر انہیں ظلم و تشدد برداشت کرنا پڑے گا۔ ان کی توقعات کے عین مطابق ایک رات نکتاشا کے آدمی ان کے گاؤں آ پہنچے۔ اس بار وہ گاڑیوں کی روشنیاں بند کر کے آئے تھے اس لیے جب تک وہ گاؤں کے بالکل پاس نہیں آ گئے، پہرے دار کو پتا بھی نہیں چلا۔ اس نے نرسنگھا بجایا۔ لوگ بدحواسی میں بچوں کو اٹھا کر کان کی طرف بھیجنے لگے مگر اس دوران میں گوریلے گاؤں میں داخل ہو چکے تھے اور انہوں نے بھاگتے بچوں کا تعاقب کر کے انہیں پکڑنا شروع کر دیا۔ بچے بے چارے تیز رفتاری سے نہیں بھاگ سکتے تھے۔ جس وقت گوریلے آئے، تاشی سو رہا تھا۔ اس کے بھائیوں نے اسے اٹھا کر کان کی طرف جانے کو کہا۔

”جلدی کان کی طرف جاؤ... نکتاشا کے آدمی گاؤں میں گھس آئے ہیں۔“

اس نے جواب دیا۔ ”میں نہیں جاؤں گا۔“

”پاگل مت بنو... وہ تمہیں لے جائیں گے۔“ اس کے بڑے بھائی نے اسے جھنجوڑا۔ ”جانتے ہو، وہ تم سے دوسروں کو قتل کروائیں گے۔“

”میں نہیں جاؤں گا۔“ تاشی نے کہا۔

”اگر تم نہیں گئے تو میں گوریلوں کو تمہیں لے جانے نہیں دوں گا۔ چاہے وہ مجھے قتل کر دیں۔“ بڑے بھائی نے اسے دھمکی دی تو وہ مجبور ہو گیا۔ وہ گھر سے نکلا اور کان کی طرف جانے والے راستے پر دوڑنے لگا۔ اس کے اردگرد شور تھا۔ جن بچوں کو گوریلے پکڑ رہے تھے، وہ چلا چلا کر فریاد کر رہے تھے۔ تاشی کی رفتار تیز تھی اس لیے وہ پیچھا کرنے والے گوریلوں کو چکما دے کر بھاگتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ اور بھی بہت سارے بچے تھے جو گوریلوں سے بچ کر کان تک پہنچنے میں کامیاب رہے تھے اور اب اندر گھس رہے تھے۔ تاشی کا سانس پھول گیا تھا۔ اسے راستے میں دس بارہ سال کی دو لڑکیاں ملیں، وہ انہیں بھی کھینچتا ہوا اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس نے کان کے دہانے پر آ کر انہیں اندر دھکیلا۔ ”تم لوگ جاؤ۔“

”تم بھی آؤ۔“ ایک لڑکی نے کہا۔

تاشی نے مڑ کر دیکھا۔ گوریلے تاریکی میں لپکتے ہوئے آ رہے تھے۔ اس نے لڑکیوں کو پھر دھکا دیا اور بولا۔ ”جلدی جاؤ ورنہ وہ تمہیں پکڑ لیں گے۔“

لڑکیوں نے بھی گوریلوں کو آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ جلدی سے کان کے اندر بھاگ گئیں۔ تاشی کان کے دہانے پر ہی تھا۔ گوریلوں نے اسے دیکھ لیا اور وہ اس کی طرف لپکے۔ ذرا سی دیر میں گوریلوں نے اسے جکڑ کر زمین پر گرا دیا۔ اور لاتوں اور رائفل کے بٹوں سے اسے مارنے لگے۔ وہ جوان تھا اس لیے وہ اس پر بے فکری سے غصہ نکال رہے تھے۔ جب ان کا دل بھر گیا تو وہ اسے کسی مردہ کتے کی طرح کھینچ کر گاؤں میں لے آئے اور اسے وہاں ڈال دیا جہاں انہوں نے اور بھی بچے جمع کر رکھے تھے۔ ان بچوں کے ماں باپ بلک رہے تھے اور دہائیاں دے رہے تھے کہ ان کے بچوں کو آزاد کر دیا جائے۔

گوریلے اس شور شرابے کے عادی تھے اس لیے بے فکری سے اپنا کام کر رہے تھے۔ کوئی ان کے کام میں عملی طور پر دخل دینے کی کوشش کرتا تو ان کے پاس رائفلیں تھیں۔ چند گھنٹے کے اندر انہوں نے فرار ہونے والے تقریباً تمام بچوں اور لڑکیوں کو پکڑ لیا۔ وہ کان میں گھس کر بھی بچوں کو پکڑ لائے

تھے۔ ان سب کو گاؤں میں جمع کیا اور پھر ان کے ماں باپ پر تشدد کرنے لگے جنہوں نے اپنے بچوں کو بھگایا تھا۔ نکتاشا اس بار بھی خود آیا تھا۔ اس نے گاؤں والوں سے کہا۔

”میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے ایک درجن لڑکے چاہئیں لیکن تم لوگوں نے اس بار بھی دھوکا دینے کی کوشش کی۔ یہ دیکھو، ہم نے تمہارے دو درجن سے زیادہ بچے پکڑ لیے ہیں۔ اگر تم خود بچے ہمارے حوالے کر دیتے تو میں ایک درجن بچے لے کر چلا جاتا۔ لیکن تم نے دھوکا کیا ہے اس لیے سزا کے طور پر میں سب کو لے جا رہا ہوں اور تم لوگ بھی کئی سال تک سکون سے رہو گے... کیونکہ اب اس گاؤں میں کوئی بچہ نہیں ہوگا جس کے لیے کوئی یہاں آئے۔“

نکتاشا نے تقریر کے بعد بچوں کو بس میں بھرنے کا حکم دیا تو اس کے آدمی انہیں دھکیل کر بس میں لے جانے لگے۔ اس بار نکتاشا نے کسی کو قتل تو نہیں کیا تھا لیکن وہ گاؤں اجاڑ کر جا رہا تھا۔ وہ ستائیس بچے لے جا رہا تھا جو اس گاؤں کی زندگی تھے۔ بچوں کے ماں باپ اور رشتے دار رو رہے تھے۔ ساتھ ہی بچے بھی چلا چلا کر انہیں پکار رہے تھے۔ گوریلے انہیں خاموش رکھنے کے لیے گالیاں دیتے ہوئے ڈرا دھمکا رہے تھے لیکن بس چلنے تک وہ روتے چلاتے ہی رہے۔ صرف تاشی جیسے چند لڑکوں نے خود پر قابو رکھا ہوا تھا۔

تاشی کے زخم دکھ رہے تھے اس لیے اسے ہوش نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور ویسے بھی اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ اب اسے دوبارہ کبھی ان لوگوں کے چنگل سے نکلنے کا موقع نہیں ملتا۔ صرف موت ہی آ کر اسے ان سے چھڑا سکتی تھی۔ تاشی کو معلوم تھا کہ وہ اسے حربی تربیت دے کر اپنی فوج میں شامل کر لیں گے اور اسے دوسروں سے لڑائی میں استعمال کریں گے۔ اگر وہ انکار کرے گا تو اس پر تشدد ہوگا اور اگر وہ پھر بھی ہتھیار نہیں ڈالے گا تو دوسروں کو عبرت دلانے کے لیے اسے سب کے سامنے اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد گاؤں میں اس کے بھائیوں کو بھی مار دیا جائے گا۔

”نہیں۔“ وہ یہ سوچ کر کانپ گیا کہ اس کی وجہ سے اس کے بھائیوں پر مصیبت آئے۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ گوریلوں کی کسی بات سے انکار نہیں کرے گا۔ چند گھنٹے بعد بس اور گاڑیاں ایک کیمپ میں داخل ہوئیں۔ یہ باقاعدہ کسی فوجی کیمپ کی طرح تھا۔ ان سب کو ایک بانسوں سے بنی جھونپڑی میں دھکیل دیا گیا۔ لڑکیوں کو ابھی ان سے

فریبی

ایک حسین و جمیل سیکریٹری غصے سے بھری باس کے کمرے سے باہر نکلی۔ ساتھی ورکر نے پوچھا۔ ”جب تم اندر گئی تھیں تو بڑے خوش گوار موڈ میں تھیں۔ اب غصے سے بھری واپس آئی ہو، کیا بات ہے؟“

سیکریٹری نے ناک سکیڑتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا اب مجھے فرصت ہے، میں نے کہا فرصت ہی فرصت ہے۔ میرا جواب سن کر اس نے مجھے چالیس صفحے ٹائپ کرنے کے لیے دے دیے۔ فریبی کہیں کا۔“

الگ نہیں کیا گیا تھا۔ ان میں جو جوان لڑکیاں تھیں وہ دہشت سے لرز رہی تھیں کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ان کے ساتھ اب کیا سلوک کیا جائے گا اور جو نابالغ تھیں، وہ بے چاری انجان تھیں۔

صبح ہوئی تو ان لوگوں کو جھونپڑی سے نکالا گیا۔ سب کو ایک میدان میں لایا گیا اور لڑکے لڑکیوں کو الگ الگ کر کے زمین پر دو قطاروں میں بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد ایک گوریلا ایک رجسٹر لے کر آیا اور اس نے سب سے ان کے نام پوچھ کر مع ولدیت کے اندراج کرنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد اس نے ان لوگوں سے ان کے رشتے داروں کے بارے میں پوچھنا شروع کیا۔ دوسرے تو نہیں لیکن تاشی سمجھ گیا تھا کہ اس پوچھ گچھ کا مطلب کیا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی فرار کی کوشش کرتا یا حکم سے سرتابی کرتا تو سزا اس کے ساتھ اس کے رشتے داروں کو بھی ملتی۔ سوال کرنے والے نے انہیں دھمکی دی تھی کہ اگر کسی نے غلط بیانی کی تو اسے سزا بھی ملے گی اس لیے سب ٹھیک ٹھیک بتائیں۔ بچوں نے ڈرتے ہوئے اس کے سوالوں کے جواب دیے۔ جب تاشی سے اس کے گھر والوں کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کہہ دیا کہ اس کا کوئی نہیں، وہ اکیلا رہتا تھا۔

اس کے بعد لڑکیوں کو الگ کہیں بھیج دیا گیا اور لڑکوں کو پہلے عمر کے لحاظ سے الگ کیا گیا۔ ایک گروپ ان لڑکوں کا بنا جو تقریباً جوان تھے اور دوسرا جو ابھی بچے تھے۔ جوان لڑکوں کے گروپ میں تاشی کے ساتھ تین لڑکے اور بھی تھے اور انہیں ایک ایسے جھونپڑے میں پہنچا دیا گیا جس میں جوان زیرِ تربیت لڑکے موجود تھے۔ کچھ دیر تو وہ ڈرے سہمے رہے پھر وہاں موجود لڑکوں سے گھل مل گئے۔ لڑکوں نے بتایا کہ انہیں بھی زبردستی اغوا کر کے لایا گیا تھا اور اب انہیں فوجی تربیت دی جا رہی ہے۔ ان کو مختلف طرح کے ہتھیار استعمال کرنا

سکھائے جاتے تھے اور ساتھ ہی جسمانی لڑائی کی تربیت بھی دی جاتی تھی۔

اپنے قابو میں رکھنے کے لیے ان لڑکوں کو منشیات کا عادی بنایا جاتا تھا۔ جو لڑکے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے تھے، انہیں ان کی پسند کی منشیات اور لڑکیاں فراہم کر دی جاتیں۔

چھوٹے لڑکوں کی تربیت کا آغاز اس طرح کیا جاتا کہ ان سے مخالف گروہوں کے پکڑے جانے والے گوریلوں پر مجمع میں فائرنگ کر کے ان سے قتل کرواتے اور ان مناظر کی مووی بناتے۔ یہ مووی بھی ان لڑکوں کو قابو میں رکھنے کے لیے ہوتی تھی۔ اگر کوئی فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کی مووی میڈیا والوں کو دے دی جاتی۔ اس کے بعد وہ کسی شہر میں پناہ نہیں لے سکتا تھا اور نہ ہی کسی اور ملک میں جا سکتا تھا کیونکہ ہر جگہ اسے قانون کا سامنا کرنا پڑتا۔

گویا یہ متحارب گروپ ہر ممکن کوشش کرتے کہ ان کے پاس آنے والا فرار یا بغاوت کا نہ سوچے اور ان کا وفادار بن کر رہے... کیونکہ انہی کے بل بوتے پر وہ دوسرے گروہوں سے لڑائیاں لڑتے اور اپنی دادا گیری قائم کرتے۔

انگولا جنوبی بحر اوقیانوس کے ساتھ ایک بڑا افریقی ملک ہے۔ اس کی آبادی بھی خاصی ہے اور قدرت نے اسے قدرتی وسائل سے بھی نواز رکھا ہے لیکن بین الاقوامی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں نے اس خوب صورت ملک کو خانہ جنگی کی آگ میں جھلسا کر رکھ دیا ہے۔

خط استوا کے پاس ہونے کی وجہ سے اس ملک میں بارشیں بہت ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے انگولا سرسبز اور زرخیز زمین رکھنے والا ملک ہے۔ یہاں مونگ پھلی، کوکو، مکئی، کافی اور ناریل کی کاشت کی جاتی ہے مگر اس سے کہیں زیادہ بدامنی کی فصل اگتی ہے۔ افریقی اقوام اور اقوام متحدہ کی پُرامن کوششوں پر متحارب گروہوں نے ہمیشہ پانی پھیرا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ان گروہوں کے پیچھے جو ممالک ہیں، وہ یہاں امن قائم نہیں ہونے دینا چاہتے۔ وہی ان گروہوں کو اسلحہ اور رقم فراہم کر رہے ہیں جس کی مدد سے یہ اپنے ہی لوگوں کا قتل عام کرتے ہیں۔

تاکشی اور اس کے ساتھ پکڑے جانے والے لڑکوں کو پہلے جسمانی تربیت دی گئی۔ انہیں دست بدست لڑنا سکھایا گیا۔ روز انہیں صبح سویرے اٹھا دیا جاتا اور پھر ان کا ورزشوں کا وقت شروع ہو جاتا۔ اس سے فارغ ہو کر وہ ناشتا کرتے پھر انہیں لڑائی کی تربیت دی جاتی۔ باکسنگ اور جوڈو سکھایا جاتا۔ یہ تربیت وقفے وقفے سے سارا دن ہی جاری رہتی۔

چھٹی کے بعد پانچ سے رات دس بجے تک کا وقت ان کا اپنا ہوتا اور اس دوران میں وہ جو چاہتے کرتے۔ پینے پلانے اور عیاشی کے دوسرے کام کر کے رات دس بجے انہیں سونے کے لیے بھیج دیا جاتا۔ اس کے بعد جو بلا وجہ جاگتا پایا جاتا اسے سزا ملتی۔ پہلے تین مہینے تک ان کو یہی تربیت دی گئی۔ اس کے بعد انہیں ہتھیاروں کا استعمال سکھانا شروع کیا گیا۔ اس کا آغاز پستول کی شوٹنگ سے ہوا۔ تاکشی کے ہاتھ میں پہلی بار پستول اس طرح دیا گیا کہ دو گوریلے اس پر رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ پستول ہاتھ میں آتے ہی وہ پہلے ان پر فائر کرنے کی کوشش نہ کرے کیونکہ اس قسم کے بہت سارے واقعات ہو چکے تھے، جب اغوا کر کے لائے جانے والے لڑکے نے پستول پکڑتے ہی کسی گوریلے کو شوٹ کرنے کی کوشش کی۔ چند ایک بار گوریلے مارے بھی گئے لیکن عام طور سے اس قسم کے واقعات میں لڑکا ہی مارا جاتا کیونکہ وہ بے چارہ ناتجربے کار اور اسلحے کے استعمال سے ناواقف ہوتا تھا۔ اس قسم کے واقعات کے بعد گوریلے نئے لڑکوں کے ہاتھ میں ہتھیار دیتے ہوئے محتاط رہنے لگے تھے۔ جب زیر تربیت لڑکے پریکٹس کرتے تو ان کے سروں پر چوکنا مسلح گوریلے مسلط رہا کرتے تھے۔

www.pkdigest.com

تاکشی نے جب پہلا فائر کیا تو اس کے ہاتھ بری طرح لرز رہے تھے اس وجہ سے گولی اپنے نشانے سے بہت دور گئی۔ گوریلے اس کے نشانے پر قہقہے لگانے لگے۔ اس پر تاکشی کو غصہ آ گیا اور اس نے پھر فائر کیا اور لگاتار کرتا چلا گیا۔ اس کی آخری گولیاں نشانے کے پاس لگیں۔ اسے پستول دینے والے گوریلے نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

”تم نے اچھا نشانہ لیا۔“

کئی مہینے تک تاکشی اور اس کے ساتھیوں کو آتشیں اسلحے کی مشق کرائی جاتی رہی۔ تاکشی نے دیکھا کہ ان لوگوں کے پاس اسلحے کی کمی نہیں تھی۔ کیمپ میں اسلحے کے بے پناہ ذخائر تھے اور مسلسل نیا اسلحہ اور گولہ بارود ان لوگوں کو مل رہا تھا۔ وہ مشقوں میں بھی اتنی بے دردی سے ایمونیشن استعمال کرتے تھے کہ اس کا کوئی حساب نہیں تھا۔ تاکشی دن بھر میں کئی سو فائر کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کا نشانہ اتنا اچھا ہو گیا کہ وہ سو قدم کی دوری سے انسان کا سر اڑا سکتا تھا۔ مشقوں کے دوران وہ بارہا اس کا مظاہرہ کر چکا تھا۔ اس کے افسر کٹر اس سے بہت خوش تھے۔

نکاشا عام طور سے کیمپ میں نہیں ہوتا تھا اور اگر آتا بھی تھا تو اس کے اردگرد زبردست پہرا ہوتا تھا۔ اس کی آمد کے وقت تمام زیر تربیت افراد کو بیرکس میں بند کر دیا جاتا اور غیر متعلقہ افراد سے ان کا اسلحہ لے لیا جاتا۔ تاکشی نے یہاں چند ایک بار دور سے اس کی جھلک دیکھی تھی جب وہ اپنے محافظوں کے جھرمٹ میں آ جا رہا تھا۔ اس کا حلیہ وہی کمانڈو ٹائپ تھا۔

تاکشی کو اپنی بہن کے بارے میں فکر تھی کہ وہ کہاں ہے۔ اس نے اس دوران میں اس کیمپ میں موجود تمام لڑکیوں کو دیکھ لیا لیکن اس کی بہن ان میں نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ یا تو اسے کہیں اور رکھا گیا ہے یا وہ مر گئی تھی۔ گوریلے اغوا کی جانے والی لڑکیوں سے کیا سلوک کرتے تھے، اس کا مشاہدہ وہ اس کیمپ میں کر چکا تھا۔ وہاں آئے دن کوئی نہ کوئی لڑکی یا عورت ان کی درندگی کے ہاتھوں زندگی ہار جاتی اور اس کی لاش یہ لوگ جنگل میں پھینک آتے۔

صرف لڑکیوں سے ہی نہیں بلکہ اغوا شدہ لڑکوں اور بچوں سے بھی گوریلوں کا سلوک اچھا نہیں تھا۔ مار پیٹ، تشدد اور...... قتل معمول کی بات تھی۔ جو لڑکے تربیت حاصل کر لیتے تھے انہیں باقاعدہ ایک تقریب میں گروہ میں شامل کیا جاتا اور ان کو پھر کہیں اور محاذ پر روانہ کر دیا جاتا۔ ان کی جگہ تربیت کے لیے دوسرے لڑکے آ جاتے۔ پاسنگ آؤٹ کی سلامی لینے نکاشا خود آتا اور جو لڑکے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے، ان کو اپنے ہاتھ سے انعام دیتا تھا۔ تاکشی بھی پوری جاں فشانی سے تربیت حاصل کر رہا تھا اور اسے امید تھی کہ وہ نمایاں رہے گا۔ نکاشا اسے اپنے ہاتھ سے انعام دے گا۔ اسے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ مگر وہ سب سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

تاکشی اور اس کے ساتھیوں سے پہلے جس گروپ نے تربیت حاصل کی تھی، اس کی پاسنگ آؤٹ تھی اور اس میں بھی نکاشا خود آیا تھا۔ اس تقریب کے دوران نئے لڑکوں کو قیدیوں پر گولیاں چلا کر اپنے نشانے کا مظاہرہ کرنا تھا۔ جب ان لوگوں کے پاس مخالف گروہ کے لوگ آتے تھے، یہ تقریب لازمی ہوتی تھی۔ تاکشی اور اس کے ساتھی بھی اس تقریب میں موجود تھے۔ ان کے سامنے نشے میں دھت نئے لڑکوں نے خودکار رائفلوں سے فائرنگ کر کے ایک درجن سے زیادہ قیدیوں کو ہلاک کر دیا۔ انہیں ایک کچی دیوار کے سامنے کھڑا کر کے ان پر گولیاں چلوائی گئیں۔ بعض لڑکے اتنے چھوٹے تھے کہ ان سے رائفل بھی نہیں اٹھائی جا رہی تھی۔ ان کی مدد گوریلے کر رہے تھے۔ ہر قیدی کے مرنے پر وہ لوگ شور کرتے تھے اور بچے کو شاباشی دیتے تھے۔ تاکشی یہ سب نہیں دیکھنا چاہتا تھا لیکن اسے دیکھنا پڑ رہا تھا۔

پھر اس تقریب کے دوران اس نے اپنی بہن کو دیکھ لیا۔ اس نے زرق برق لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے گلے میں سونے کا ہار تھا لیکن وہ بہت کمزور ہو رہی تھی اور وہ نکاشا کے ساتھ تھی۔ تاکشی کو ایسا لگا کہ اس کے اندر کوئی بگولا سا اٹھا ہو لیکن اس سے پہلے وہ بے قابو ہوتا، نکاشا اس کی بہن سمیت وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اب وہ اگلی پاسنگ آؤٹ کے موقع پر ہی کیمپ میں آتا۔ اگر اس سے پہلے وہ آتا، تب بھی تاکشی اس کے پاس نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اسے اس کے ساتھیوں سمیت بند کر دیا جاتا۔

اس کیمپ میں تاکشی اور دوسرے لڑکوں کو ہر طرح کی آزادی تھی، سوائے وہاں سے باہر جانے کے اور رات کو باہر پھرنے کے۔ انہیں کھانا پینا بہت اچھا دیا جاتا تھا۔ تفریح کے لیے شراب اور لڑکیوں کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ کھیلوں کا انتظام تھا اور انہیں ٹی وی بھی دیکھنے کو ملتا تھا..... تاکشی نے پہلی بار ٹی وی اسی کیمپ میں دیکھا تھا اور ٹی وی کے توسط سے ہی اسے معلوم ہوا کہ نکاشا دنیا کی واحد سپر پاور کا منظور نظر ہے۔ اسے تعجب ہوا کہ کیا اس سپر پاور کو معلوم نہیں تھا کہ نکاشا انگولا میں کیا کر رہا ہے؟ اس کی حرکتوں سے قطع نظر وہ اسے اسلحہ اور مدد فراہم کر رہے تھے۔ نکاشا ایک سیٹلائٹ... ٹی وی بھی چلا رہا تھا اور اس میں وہ اکثر تقریریں کرتا نظر آتا۔ وہ انگولا کے لوگوں کو اکساتا کہ وہ اس کا ساتھ دیں تو وہ ملک سے غیر ملکی اثرات ختم کر دے گا اور انگولا کو حقیقی آزادی سے ہمکنار کرے گا۔ حالانکہ وہ اپنے ہی ملک کے لوگوں کو جس قسم کی آزادی سے ہمکنار کر رہا تھا، وہ ساری دنیا کے سامنے تھا۔

تاکشی آخری امتحان سے قبل دل جمعی سے تربیت حاصل کر رہا تھا۔ اس آخری امتحان پر منحصر تھا کہ اس کی کیا پوزیشن بنتی ہے۔ اسے اس کیمپ میں آئے ہوئے ایک سال ہونے کو آیا تھا اور اس دوران میں ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا تھا جب اسے اپنے ماں باپ اور ان کی لاشیں نہ یاد آئی ہوں اور اپنی بہن کا خیال نہ آتا ہو۔ جب وہ ان کے بارے میں سوچتا تو اس کا عزم اندر ہی اندر بکھرنے لگتا۔ اب اسے بے چینی سے پاسنگ آؤٹ کا انتظار تھا۔ اس کے بعد اسے آزادی مل جاتی۔

تاکشی کو خوشی ہوئی جب اس کا نام پہلے تین تربیت

حاصل کرنے والوں میں آیا اور اسے بتایا گیا کہ جناب نکلا شا خود اسے اپنے ہاتھ سے ایک قیمتی امریکی رائفل انعام میں دیں گے۔ تقریب دو دن بعد تھی۔ اس سے ایک رات پہلے تاکشی جاگتا ہی رہا۔ اسے اپنے بھائیوں کا خیال آرہا تھا۔ جب وہ ان کے بارے میں سوچتا تو اس کا دل ڈول سا جاتا۔

اگلے روز تقریب صبح سویرے تھی لیکن نکلا شا دیر سے آیا اس لیے تقریب کا وقت بدل کر دوپہر کو کر دیا گیا کیونکہ نکلا شا کے آنے پر حفاظتی انتظامات مکمل کیے جاتے اور اس کے بعد ہی وہ کیمپ کی کسی سرگرمی میں حصہ لیتا۔ پاسنگ آؤٹ کے دوران سوائے اس کے محافظوں کے، کسی کا مسلح ہونا ممنوع تھا۔ پاسنگ آؤٹ کرنے والے لڑکوں کے پاس بھی خالی رائفلیں ہوتی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ لڑکوں کو دی جانے والی رائفلیں ناکارہ کر دی جاتیں۔ اگر کوئی کہیں سے گولی حاصل کر بھی لیتا تو وہ اسے چلا نہیں سکتا تھا۔

تاکشی کو حیرت تھی کہ دوسروں پر بے پناہ ظلم کرنے والا یہ شخص کس قدر بزدل ہے کہ اپنی بادشاہت میں بھی اتنے خوف سے رہتا۔ تاکشی کے خیال میں ایک گوریلا لیڈر کو اتنا بزدل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ تقریب شروع ہوئی۔ تاکشی اور اس کے ساتھیوں کو جو رائفل دی گئی، وہ خالی اور ناکارہ تھی۔ انہوں نے سلامی کے چبوترے کے سامنے پریڈ کی اور نکلا شا کو سلامی دی۔ اس کے بعد انعامات کی باری تھی۔ تاکشی سے پہلے دو لڑکے گئے۔ نکلا شا نے انہیں رائفل انعام میں دی۔ ان کے بعد تاکشی کی باری تھی۔ وہ نکلا شا کے پاس پہنچا تو اسے دیکھ کر نکلا شا چونک گیا۔ شاید اس لیے کہ اس کی شکل بہن سے بہت مشابہ تھی۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”تاکشی جناب۔“ اس نے کہا۔

”کہاں سے تعلق ہے؟“

تاکشی نے اپنے گاؤں کا نام بتایا تو وہ مزید چونک گیا۔ اس نے مڑ کر تاکشی کی بہن کو سامنے آنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”اس سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“

”کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”جھوٹ مت بولو... تمہاری صورت اس سے بہت ملتی ہے۔“ نکلا شا نے تاکشی کی بہن کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ اتفاق ہے جناب۔“ تاکشی نے اس سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

نکلا شا اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے تاکشی کے انداز سے شبہ ہو گیا۔ اس نے تاکشی کی بہن کو قریب کھینچا اور اپنا پستول نکال کر اس کے سر سے لگا دیا۔ ”اگر تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے تو میں اسے گولی مار دوں؟“

”نہیں۔“ تاکشی نے تڑپ کر کہا۔ ”اسے مت مارنا۔“

”کیوں... اس سے کیا تعلق ہے تمہارا؟“

تاکشی کے پاس اب اعتراف کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ”یہ میری بہن ہے جناب۔“

نکلا شا مسکرانے لگا۔ اس نے تاکشی کی بہن کو چھوڑ دیا۔ ”مجھے پہلے ہی شبہ ہو گیا تھا لیکن تم نے یہ بات کیوں چھپائی؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نکلا شا کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے کہ تم میرے خلاف کوئی سازش کر رہے ہو۔ میں تمہیں اور تمہاری بہن کو اپنے جلادوں کے حوالے کر دوں گا۔“

”نہیں، ایسا مت کرنا۔“ اس نے کہا۔

”تم مجھے نہیں روک سکتے۔“ نکلا شا بولا اور اس نے مڑ کر اپنے پاس کھڑے گوریلے کو کچھ کہنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی تاکشی نے چلاتے ہوئے اس پر حملہ کر دیا۔ وہ اس سے لپٹ گیا۔ نکلا شا اس کے حملے سے کچھ دیر کے لیے بوکھلا گیا اس کا خیال تھا کہ لڑکے کے پاس کوئی ہتھیار ہے لیکن جب تاکشی اسے خالی ہاتھوں سے مارنے لگا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنے ہاتھ میں پکڑا پستول تاکشی کے جسم سے لگا کر فائر کر دیا۔ اسے جھٹکا لگا لیکن نکلا شا پر سے اس کی گرفت کمزور نہیں ہوئی۔ نکلا شا نے دوسرا فائر کیا۔ اس کی گرفت کمزور ہوئی اور تیسرے فائر پر اس کی گرفت ختم ہو گئی۔ وہ نکلا شا کے قدموں میں گر گیا۔ تاکشی کی بہن چلانے لگی۔ وہ تاکشی کی طرف جانا چاہتی تھی لیکن ایک گوریلا اسے کھینچ کر نکلا شا اور تاکشی سے دور لے جانے لگا۔ تاکشی زمین پر گرا ہوا ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ نکلا شا اپنے لباس پر لگ جانے والے خون سے بے پروا اس کی طرف جھکا اور آہستہ سے بولا۔ ”تیری بہن اور دوسرے رشتے داروں کو بھی ایسے ہی ماروں گا۔“

”نہیں، تم ایسا نہیں کر سکو گے۔“ تاکشی نے کمزور لہجے میں جواب دیا اور ہاتھ اوپر کیا۔ تب نکلا شا نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں دستی بم کی پن تھی۔ نکلا شا نے گھبرا کر اپنے سینے پر بندھے دستی بم کی طرف دیکھنا چاہا لیکن اسے مہلت نہیں ملی اور ایک دھماکے سے اس کا جسم متعدد ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔

میتھیوز نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے ایک نظر بے خبر سوئی ایلین کو دیکھا۔ وہ اس طویل سفر سے بیزار ہو کر سو گئی تھی۔ وہ گزشتہ دن ہی جرمنی کی سرحد عبور کر کے چیک ری پبلک میں داخل ہوئے تھے اور اس وقت پولینڈ اور سلوا کیہ کی مشترکہ سرحد کے پاس تھے۔ ان کا ارادہ پولینڈ کے راستے یوکرائن میں داخل ہو کر بلیک سی تک جانے کا تھا۔ تین دن پہلے وہ لندن سے روانہ ہوئے تھے اور پورا ڈیڑھ دن فرانس میں سفر کرنے کے بعد جرمنی میں داخل ہوئے۔ جرمنی میں بھی ان کو اتنا ہی وقت لگا تھا۔ ان دونوں ملکوں میں ان کو سوائے یہاں سے گزرنے کے کوئی کام نہیں تھا اس لیے وہ بس سفر کرتے رہے۔

میتھیوز لندن یونیورسٹی میں آثاریات کا طالب علم تھا اور ایلین اس کی گرل فرینڈ تھی۔ بہت عرصے سے میتھیوز مشرقی یورپ جانے کا پروگرام بنا رہا تھا لیکن اس کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے۔ یونیورسٹی کے بعد وہ پروفیسر جونز آکنگ کے پاس کام کرتا تھا۔ پروفیسر جونز...... بھی لندن یونیورسٹی میں ہوتے تھے اور ان دنوں انگلینڈ کی تاریخ پر کام کر رہے تھے۔ انہوں نے میتھیوز کی ذہانت سے متاثر ہو کر اسے اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا۔ میتھیوز خود کو خوش قسمت سمجھتا تھا جو ملازمت کرنے کے ساتھ تعلیم بھی حاصل کر رہا تھا۔ اس ملازمت سے اسے اتنا مل جاتا کہ وہ اپنے اخراجات پورے

ایڈونچر کے شائقین کے لیے جرم اور محبت کے سنسنی خیز امتزاج کی حامل تیز رفتار تحریر

وقت کے تقاضے ہر نوعیت کی تبدیلی چاہتے ہیں..... مثبت انداز میں آنے والی تبدیلیاں بنی نوع انسان کے فائدے کے لیے ہیں... نقصان دہ نہیں... جرائم کی دنیا بھی ان تبدیلیوں سے مبرا نہیں... ایک ایسے ہی شخص کا ماجرا جو انسانوں کے لیے درندگی کی علامت تھا۔

تنگ آمد

کاشف زبیر

کرلیتا اور تعلیم کے لیے اسے اسکالرشپ ملا ہوا تھا۔ یہ اس کا ماسٹر کا آخری سال تھا اور اس کے بعد اس کا ارادہ ایم فل میں داخلہ لینے کا تھا اور وہ اس کے اسکالرشپ کے لیے ابھی سے تیاری کررہا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ اپنے تھیسس کے لیے وہ مشرقی یورپ کے آثار یات کو موضوع بنائے اسی لیے وہ ایک بار مشرقی یورپ کا سفر کرنا چاہ رہا تھا مگر اس کے پاس اس سفر کے لیے وسائل نہیں تھے۔ اس لیے ایسا لگ رہا تھا کہ اسے صرف کتابوں کے سہارے ہی اپنا تھیسس مکمل کرنا پڑے گا۔

ایلن ایک لارڈ کی بیٹی تھی اور اس نے خاصے ناز و نعم میں پرورش پائی تھی لیکن محبت اس نے میتھیوز سے کی تھی۔ اس کے باپ نے اگرچہ اس محبت کی مخالفت کی لیکن وہ محبت ہی کیا جو مخالفت کی پروا کرے۔ انہوں نے طے کرلیا تھا کہ جیسے ہی میتھیوز ایم فل کرکے کہیں ملازمت کرے گا، وہ شادی کرلیں گے۔ وقت گزاری کے لیے ایلن گریجویشن کرنے کے بعد کرسٹل پینٹنگ کا ایک کورس کررہی تھی۔ اتفاق سے اس کی بنائی ہوئی ایک تصویر نے ایک مقابلے میں پہلا انعام حاصل کیا اور اس تصویر کو ایک لارڈ نے دو ہزار پاؤنڈز میں خرید لیا۔

ایلن کو توقع نہیں تھی کہ یہ تصویر اتنی رقم میں فروخت ہو سکے گی۔ بہرحال، وہ خوش تھی اور پھر اسے ایک انوکھا خیال آیا۔ اس نے یہ ساری رقم میتھیوز کو دے دی۔ اس نے رقم لینے سے انکار کرتے ہوئے احتجاج کیا۔ ”لیکن کیوں... اس پر تمہارا حق ہے۔“

”مجھے معلوم ہے لیکن اس کی زیادہ ضرورت تمہیں ہے، تم مشرقی یورپ کا سفر کرنا چاہ رہے ہو۔“

میتھیوز ہچکچایا۔ ”ہاں، وہ تو ہے۔“

”بس تو پھر اس رقم کی مدد سے یہ سفر کرسکتے ہو۔ اس طرح تم جو تھیسس لکھو گے وہ کہیں بہترین ہوگا اور تمہاری کامیابی میری کامیابی ہوگی۔“

دو ہزار پاؤنڈز ایک معقول رقم تھی لیکن اس طویل سفر کے لیے بہت کافی بھی نہیں تھی کیونکہ میتھیوز کو تقریباً ڈھائی ہزار میل سفر کرنا تھا اور اس دوران میں اسے کم سے کم دس جگہیں دیکھنا تھیں۔ اس نے ایلن کی پیشکش قبول کرلی لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ کیا اس رقم میں یہ سفر ہو سکے گا؟ ایلن نے اسے ایک تجویز بھی دی۔

”اگر تم اپنی کار میں سفر کرو تو یہ رقم کافی بھی ہوسکتی ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”تمہارے پاس شیوی کار ہے، اس کی پچھلی سیٹ نکل جاتی ہے اور عقبی حصہ خاصا لمبا ہے۔ اس میں سونے کے لیے جگہ بن سکتی ہے۔ اگر تم ہوٹلوں میں رکنے کے بجائے اس میں ہی سو یا کرو تو خاصی بچت ہو جائے گی۔ آج کل موسم اچھا ہے، باہر سونے میں مسئلہ بھی نہیں ہوگا۔“

میتھیوز یہ مشورہ سن کر اچھل پڑا۔ ایلن نے اس کا مسئلہ ہی حل کردیا تھا۔ اگر وہ ہوٹلوں میں رکنے کے بجائے اپنی کار میں سوتا تو یہ رقم کافی ہو جاتی۔ پھر اسے خیال آیا۔ اس نے ایلن سے کہا۔ ”تم بھی ساتھ چلو۔“

”میں؟“ ایلن نے غور کیا۔ اس کا کورس ختم ہو چکا تھا اور وہ فارغ تھی اس لیے وہ مان گئی۔ ”اوکے... لیکن ایک شرط پر۔“

”وہ کیا؟“

”ان دو ہزار پاؤنڈز سے میرا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ میں اپنے اخراجات خود ادا کروں گی۔“

کسی قدر بحث کے بعد ان میں طے پا گیا کہ ایلن کھانے پینے اور دوسرے اخراجات میں اپنا حصہ ڈالے گی۔ یہ بھی طے ہوا کہ جیسے ہی میتھیوز آخری امتحان سے فارغ ہوگا، وہ روانہ ہو جائیں گے۔ ستمبر کا آخر وسطی اور مشرقی یورپ میں خاصا سرد ہو جاتا ہے لیکن اتنا بھی نہیں کہ وہ رات باہر کار میں نہ گزار سکیں۔ میتھیوز نے روانہ ہونے سے پہلے اپنی کار کے پچھلے حصے میں موجود نشستیں نکال دیں اور فوم کا گدا ڈال دیا۔ ان کے پاس ہوا سے بھرنے والے بستر تھے اور ان کے ساتھ ملکے کمبل بھی تھے۔ ان کا گزارہ بہ خوبی ہو جاتا۔

کھانے پینے کے لیے انہوں نے طے کیا کہ وہ بند غذا لے لیں گے اور زیادہ تر اسی پر گزارہ کریں گے۔ یہ انہیں سستی پڑتی اور ان کو خاص طور سے کھانے کے لیے کہیں رکنا نہیں پڑتا۔ وہ پندرہ دن کے لیے نکلے اور اس دوران میں میتھیوز اپنا کام بھی نمٹا لیتا۔ ایلن سفر کے شروع میں بڑی پُرجوش تھی لیکن پھر وہ سفر کے دوران ایک جیسے مناظر دیکھ کر اکتانے لگی۔ ان کا مغربی یورپ میں رکنے کا ارادہ نہیں تھا اس لیے وہ صرف آرام کرنے، سونے اور کھانے کے لیے رکتے تھے۔ سفر جلدی کرنے کے لیے میتھیوز نے ہائی ویز کا انتخاب کیا تھا جو بڑے شہروں اور قصبوں سے ہٹ کر گزرتی ہیں اس وجہ سے وہ زیادہ تر ویرانوں میں سفر کرتے رہے۔ برٹش پاسپورٹ کی وجہ سے خاص مشکل پیش نہیں آئی اور ان کا پاسپورٹ دیکھ کر ہی ان کو اگلے ملک میں داخلے کی اجازت مل جاتی۔ وہ شام کے وقت چیک ری پبلک کے دارالحکومت سے روانہ ہوئے اور رات کے نو بجے پولینڈ کی سرحد کے قریب پہنچ گئے تھے۔ روانہ ہوتے وقت ایلن نے کہا۔

”کیا رات میں سرحد عبور کرنا لازمی ہے؟“

”اس سے ہمیں آسانی رہے گی۔“ میتھیوز نے جواب دیا۔ ”رات کو ہم آرام سے سرحد عبور کرلیں گے کیونکہ رش نہیں ہوگا۔ دن میں تو گاڑیوں کی لمبی قطار ہوگی اور سرحد عبور کرنے میں ہی خاصا وقت لگ جائے گا۔“

صبح ان کا ایک گھنٹا رش کی وجہ سے ضائع ہو جاتا جبکہ وہ رات کو سرحد عبور کرکے اس کے بعد کہیں رک کر سو جاتے اور صبح دوبارہ سفر شروع کرسکتے تھے۔ ان کا وقت ضائع نہیں ہوتا۔ کھانا انہوں نے روانہ ہونے سے پہلے ہی کھا لیا تھا۔

ایلن نے پیٹ بھر کر کھانا کھا لیا تھا اس لیے اسے نیند آرہی تھی جبکہ مزید ڈرائیونگ کی وجہ سے میتھیوز نے کھانا ہلکا لیا تھا تاکہ اسے غنودگی نہ آئے۔ رات کے وقت ہائی وے پر ڈرائیو کرنا ویسے ہی مشکل کام ہوتا ہے اور اس شاہراہ پر بڑے ٹرکوں کی قطاریں جا رہی تھیں، اس لیے میتھیوز زیادہ ہی محتاط تھا۔ ایلن کھڑکی سے ٹکی سو رہی تھی اور اس نے اپنا کوٹ اوڑھ لیا تھا۔ رات ہوتے ہی موسم خاصا سرد ہو گیا تھا۔ میتھیوز کچھ دیر پہلے ریڈیو پر اپنی پسند کا میوزک سنتا رہا، پروگرام اب ختم ہو گیا تھا اس لیے کار میں خاموشی تھی۔

کچھ دیر بعد سامنے ٹرکوں اور گاڑیوں کی لمبی لائن نظر آنے لگی۔ سرحدی چیک پوسٹ تھی۔ لمبی لائن دیکھ کر میتھیوز کا دل ڈوب گیا۔ اس کا خیال غلط نکلا تھا کہ رات کے وقت رش نہ ہونے کے برابر ہوگا اور وہ مزے سے پاسپورٹ دکھا کر سرحد عبور کر جائیں گے۔ ٹرکوں کے لیے الگ لائن تھی اور گاڑیوں کے لیے الگ لائن۔ جب وہ گاڑیوں کی لائن میں لگا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ وہ وہاں تین چار ہی گاڑیاں تھیں۔ اس نے گاڑی لائن میں لگا کر انجن بند کردیا۔ سرحدی عملہ چیکنگ میں مصروف تھا۔ وہ پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات دیکھ رہے تھے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ دس بارہ گاڑیاں ایک ساتھ چیک کرکے ان کو جانے دیتے تھے، اس طرح ڈرائیوروں کو بار بار انجن اسٹارٹ کرکے قطار میں آگے نہیں سرکنا پڑتا تھا۔ وہ ایک ہی دفعہ رکتے اور چیک ہونے کے بعد روانہ ہو جاتے۔

گاڑیوں کا یہ گروپ ابھی چیک ہونے کا منتظر تھا کہ میتھیوز کو اپنے مثانے میں دباؤ محسوس ہوا۔ اس نے ایلن کو جگایا اور اسے دونوں پاسپورٹ دیے۔ ”میں واش روم.... جا رہا ہوں، اگر کوئی آجائے تو اسے دکھا دینا۔“

”ٹھیک ہے۔“ ایلن سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

میتھیوز جیکٹ کی زپ بند کرکے نیچے اتر آیا۔ بائیں طرف ٹرکوں کی قطار تھی اور ان کی کار کے ساتھ جو ٹرک تھا اس کا ڈرائیور شیشہ کھولے ان کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ تاریکی میں تھا اس لیے خدوخال واضح نظر نہیں آرہے تھے لیکن اس کی جسامت سے لگ رہا تھا کہ وہ بھاری جسم کا آدمی ہے۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر ایک لمحے کو میتھیوز کو عجیب سا احساس ہوا لیکن پھر وہ آنے والے شخص کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ سرحدی محافظ تھا اور اس سے کار سے اترنے کی وجہ پوچھنے آیا تھا۔ اس کی انگریزی واجبی سی تھی لیکن میتھیوز نے اسے سمجھا دیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

”اوکے... اوکے... کم ود می۔“ اہلکار نے کہا۔ وہ میتھیوز کو لے کر دائیں طرف سے ٹرک کے عقب سے گزرا، یہ اسی شخص کا ٹرک تھا۔ وہاں سے گزرتے ہوئے میتھیوز نے دیکھا کہ ٹرک کی بیک لائٹ پروں کی صورت میں ایک تتلی بنی ہوئی تھی۔ اہلکار اسے ایک طرف بنی چھوٹی سی عمارت کی طرف لے آیا اور اسے اندر جانے کو کہا۔ میتھیوز اندر آگیا۔ یہ عمارت حوائج ضروریہ کے لیے مخصوص تھی۔ ایک طرف خواتین کے لیے واش روم بنے تھے اور دوسری طرف مردوں کے لیے۔ وہ اندر آیا تو وہاں کئی افراد تھے۔ وہ واپس آیا تو ان

سفارش

سفارش تلاش کرنے والوں کی ایک قسم اور بھی ہے، وہ انتہائی ناجائز کام آپ کے پاس لے کر آئیں گے جس کے کرنے والے کو موقع پر ہتھکڑیاں لگ جائیں اور سفارشی عمر بھر ضمیر کی خلش محسوس کرتا رہے۔ آپ اسے کہیں گے کہ بھئی یہ کام ناجائز ہے، یہ نہیں ہوسکتا، اس پر اس کا عمومی جواب یہ ہوتا ہے کہ جناب اگر جائز کام ہوتا تو مجھے آپ ہی کے پاس آنا تھا؟ اس سے اور کچھ ہوتا ہو آپ کو یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ شہر میں آپ کی ریپوٹیشن کیا ہے؟ ایک گاؤں سے میرے ایک جاننے والے کی وساطت سے کچھ لوگ میرے پاس آئے اور کہا۔ ”ایک چھوٹا سا کام ہے، اس کے لیے آپ کے پاس آتے ہوئے شرم آتی تھی لیکن چودھری صاحب نے کہا کہ وہ صرف آپ ہی کو جانتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں، آپ کام بتائیں!“ بولے۔ ”یہ جو چنا آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہے، اس نے مخالفوں کے تین چار بندے لا دیے ہیں (قتل کردیے ہیں) اب پولیس اسے گرفتار کرنے کے لیے گھر پر چھاپے مار رہی ہے، گھر میں پردہ دار بیبیاں ہیں، ہم عزت دار لوگ ہیں، ذرا آئی جی صاحب کو فون کرکے ان پولیس والوں کی پٹھوں تو اتروائیں۔“

کی چیکنگ بھی ہو گئی تھی۔ ایلن نے اس کے اور اپنے پاسپورٹ دکھا دیے تھے لیکن اس کا موڈ آف تھا۔ میتھیوز نے بھانپ لیا۔

"کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" ایلن نے ٹالنا چاہا لیکن پھر اس کے اصرار پر بتا دیا۔ "برابر میں جو ٹرک تھا، اس کا ڈرائیور اتر کر آیا تھا اور مجھ سے بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جب میں نے شیشے نہیں کھولے تو واہیات اشارے کرتا ہوا چلا گیا۔"

"کہاں ہے وہ حرامزادہ؟" میتھیوز نے برابر میں دیکھا تو وہ ٹرک جا چکا تھا اور انہیں بھی روانگی کا اشارہ کیا جا رہا تھا کیونکہ پیچھے گاڑیوں کا ایک اور گروپ آ گیا تھا۔ میتھیوز نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ کچھ دیر بعد وہ پولینڈ کی چیک پوسٹ پر تھے، وہاں انہیں زیادہ دیر نہیں رکنا پڑا۔ روانہ ہونے سے پہلے میتھیوز نے ایک اہلکار سے اس ہائی وے پر آگے کسی قصبے کے بارے میں پوچھا جہاں وہ رات رک سکتے۔ اہلکار نے اسے بتایا کہ بیس کلومیٹر بعد ہی ایک آبادی آئے گی جہاں وہ رک سکتے ہیں لیکن اگر انہیں ری فریش ہونا تھا تو کچھ آگے ایک کیفے اور گیس اسٹیشن تھا۔ وہاں کھانا بھی مل جاتا اور کافی شراب بھی۔

"مجھے کافی کی خواہش ہو رہی ہے؟" ایلن نے کہا۔ "یہاں سردی کچھ زیادہ ہی ہے۔"

"ہاں، اصل میں مشرقی یورپ زیادہ سرد ہے۔"

دس منٹ بعد وہ کیفے اور گیس اسٹیشن کے پاس تھے۔ یہ جگہ شاید ٹرک والوں میں مقبول تھی کیونکہ وہاں پارکنگ میں بہت سارے ٹرک بھی کھڑے تھے۔ میتھیوز نے کار ایک طرف روک دی۔ وہ اتر کر اندر آئے۔ رات بارہ بجے بھی وہاں کا ماحول پُر رونق تھا۔ اندر لوگ کھا پی رہے تھے۔ ایک طرف چھوٹا سا بار بھی تھا۔ میتھیوز کو بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے کافی کے ساتھ سینڈوچز بھی لے لیے۔ جب وہ یہ چیزیں لے کر میز پر آیا تو ایلن منہ بنائے بیٹھی تھی۔ اس نے میتھیوز کو دیکھتے ہی کہا۔ "یہاں سے جلدی چلو۔"

"کیوں... کیا ہوا؟"

"مجھے لگ رہا ہے، یہ وہی ٹرک ڈرائیور ہے۔" ایلن نے دو میز آگے بیٹھے لمبے تڑنگے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے نصف آستین کی شرٹ اور اس پر بغیر آستین کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ اپنے سامنے واڈکا کی بوتل رکھے ہوئے ان کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ جب میتھیوز نے اسے دیکھا تو وہ کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر بوتل اٹھا کر منہ سے لگا لی۔

"میں اس سے بات کرتا ہوں۔" میتھیوز اٹھتے ہوئے بولا۔

"نہیں... نہیں۔" ایلن نے گھبرا کر اس کا بازو تھام لیا۔ "ممکن ہے یہ وہ نہ ہو اور بلاوجہ بات بڑھ جائے۔"

ایلن کے اصرار پر میتھیوز واپس بیٹھ گیا۔ ویسے بھی وہ اس دیو قامت شخص کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کا قد ساڑھے پانچ فٹ اور وزن ایک سو تیس پاؤنڈز تھا جبکہ وہ شخص کم سے کم ساڑھے چھ فٹ کا اور اس کا وزن ڈھائی سو پاؤنڈز سے کم نہیں تھا۔ انہوں نے بے چینی کے عالم میں کافی پی اور سینڈوچز کھائے لیکن ان کے اٹھنے سے پہلے ہی وہ شخص اٹھ گیا۔ ایلن نے ایک ہی سینڈوچ کھایا تھا پھر اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔

"میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

میتھیوز نے خیال کیا کہ وہ اس ٹرک ڈرائیور کی وجہ سے گھبرا رہی ہے۔ ابھی وہ یہاں سے نکلیں گے تو اس کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ بل ادا کر کے باہر آئے۔ ایلن جلدی سے کار میں گھس گئی۔ میتھیوز نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر چابی نکالنی چاہی تو اسے پتا چلا کہ چابی تو اس کے پاس ہے ہی نہیں۔

"یہ چابی کہاں رہ گئی؟" اس نے اپنی جیبیں ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"کہیں تم میز پر تو نہیں بھول آئے؟" ایلن بولی۔

اگرچہ میتھیوز کو یاد نہیں تھا لیکن جب چابی نہیں ملی تو اس نے کار سے اترتے ہوئے کہا۔ "تم دروازے اندر سے بند کر کے بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ کیفے میں آیا۔ پہلے اس نے میز پر دیکھا لیکن وہاں چابیاں نہیں تھیں۔ پھر اسے واش روم کا خیال آیا اور وہ واش روم میں آیا۔ جب چابیاں وہاں بھی نظر نہیں آئیں تو اس نے کاؤنٹر والوں سے پوچھنے کا سوچا کیونکہ اگر اس کی چابی یہاں گری تھی تو ممکن ہے جس کو ملی ہو، اس نے کاؤنٹر پر جمع کرا دی ہو۔ وہ کیفے کے کاؤنٹر پر آیا اور اس نے وہاں موجود لڑکی سے کہا۔

"میری کار کی چابیاں کہیں گر گئی ہیں۔"

"اوہ... وہ تمہاری چابی تھی۔" لڑکی چونک کر بولی۔ "تم یہاں بھول گئے تھے۔"

تب میتھیوز کو یاد آیا کہ جب وہ کافی اور سینڈوچز لے رہا تھا تو اس نے چابیاں یہاں رکھ دی تھیں۔ لڑکی نے اس کے سامنے چابیاں رکھیں تو وہ خوش ہو گیا۔ اس نے چابیاں اٹھائیں۔ "تمہارا شکریہ مس۔"

"کوئی بات نہیں... لیکن تمہیں اپنا ڈرائیونگ لائسنس دکھانا ہو گا۔"

میتھیوز نے اسے ڈرائیونگ لائسنس اور پھر پاسپورٹ دکھایا۔ لڑکی نے دونوں کے نمبر اپنے پاس موجود رجسٹر میں اتارے۔ اس کام میں کچھ دیر لگ گئی۔ وہ چابیاں لے کر واپس آیا تو اسے کار کے قریب پہنچنے پر احساس ہوا کہ کار خالی ہے۔ وہ کار کی طرف بھاگا۔ کار کا ایلن کی سیٹ والا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے بے تابی سے اندر جھانکنا چاہا تو اس کے پیروں تلے کوئی چیز آ کر کانچ کی طرح ٹوٹ گئی۔ ایلن اندر نہیں تھی اور اس نے نیچے دیکھا تو اسے ایلن کے کرسٹل کے ہار کے نگ بکھرے ہوئے نظر آئے۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ ایلن کے ساتھ کچھ ہوا تھا۔ اسی لمحے اس کی نظر ہائی وے کی طرف مڑتے ٹرک کی طرف گئی۔ اس کی عقبی سرخ روشنی پر وی کی شکل کا نشان صاف نظر آ رہا تھا۔ اچانک ہی ایک رونگٹے کھڑے کر دینے والا خیال میتھیوز کے ذہن میں آیا کہ ٹرک میں ایلن بھی ہے۔ ٹرک والا اسے زبردستی لے گیا تھا اور مزاحمت کے دوران ایلن کے گلے کا ہار ٹوٹ گیا تھا... ورنہ اس کے غائب ہونے کی کوئی تک نہیں تھی۔ میتھیوز کے پاس وقت نہیں تھا۔ ٹرک نکل جاتا تو وہ ایلن کو کھو دیتا۔ اس نے کار میں بیٹھتے ہوئے تیزی سے انجن اسٹارٹ کیا اور کار کو موڑتے ہوئے ہائی وے کی طرف چل پڑا۔ اس کے ذہن میں ایلن [illegible] رفتار تیز کرتے ہوئے کہا۔ "میں آ رہا ہوں میری جان۔"

ہائی وے پر آتے ہی اس نے کار کا ایکسلریٹر پورا دبا دیا۔ اس کی کار کا انجن زیادہ طاقت ور نہیں تھا لیکن اسے امید تھی کہ وہ ٹرک کو جا لے گا۔ اس کا یہ سوچ سوچ کر خون کھول رہا تھا کہ ٹرک والے نے ایلن کو اغوا کر لیا ہے۔ اچانک اسے خیال آیا اور اس نے اپنا موبائل فون نکالا۔ اس پر سگنل آ رہے تھے لیکن اس وقت وہ پولینڈ میں تھا اور اسے نہیں معلوم تھا کہ یہاں کا ایمرجنسی نمبر کیا ہے۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا کرے، اسی لمحے اسے ٹرک کا عقبی حصہ نظر آ گیا۔ اس نے موبائل فون واپس رکھا اور پوری توجہ سے ڈرائیونگ کرنے لگا۔ ٹرک خاصی رفتار سے جا رہا تھا اور میتھیوز کو اس کے تعاقب میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ کاش اس کے پاس کوئی طاقت ور کار ہوتی۔ اس دوران میں ٹرک کی رفتار بھی بڑھ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ٹرک ڈرائیور کو تعاقب کا احساس ہو گیا ہے۔

اب معاملہ یہ تھا کہ وہ ٹرک کو کوئی سو گز کی دوری سے نظر میں تو رکھے ہوئے تھا لیکن وہ اس کے قریب نہیں جا پا رہا تھا۔ اس کی کار مزید تیز رفتاری سے نہیں دوڑ سکتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں پیٹرول ختم نہ ہو جائے۔ اسی لمحے اس کی نظر گیج پر گئی تو وہ یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ اس کی سوئی آخر میں تھی۔ اب کسی بھی وقت پیٹرول کی کمی سے کار کی رفتار اور گھٹ جاتی اور پھر وہ رک جاتی۔ اس دوران ٹرک ایلن کو لے کر نہ جانے کہاں نکل جاتا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ ایلن نہ جانے کس حال میں ہو گی اور ٹرک والے نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کی ہو۔ یہ تو واضح تھا کہ اس کی نیت درست نہیں ہے ورنہ وہ اغوا جیسا قدم نہ اٹھاتا۔

اس نے ایک بار پھر موبائل فون اٹھایا اور سروس کی ہیلپ لائن کا نمبر ملایا۔ کچھ مراحل سے گزر کر اس نے آپریٹر تک رسائی حاصل کی۔ اس نے پوچھا۔ "میں تمہاری کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

میتھیوز جلدی سے بولا۔ "میں اس وقت پولینڈ میں ہوں... مجھے یہاں کا ایمرجنسی پولیس نمبر چاہیے۔"

"ایک سیکنڈ۔" آپریٹر نے کہا اور پھر بولی۔ "نمبر نوٹ کر لو۔"

میتھیوز نے جلدی سے نوٹ بک اٹھا کر اس پر نمبر اتارا اور کال منقطع کر کے ایمرجنسی کا نمبر ملایا لیکن یہاں سروس میں کچھ خلل آ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے نمبر ملا تو پولیس آپریٹر کی آواز صحیح نہیں آ رہی تھی۔ میتھیوز چیخ چیخ کر اسے اپنی افتاد کے بارے میں بتانے لگا۔ "میری گرل فرینڈ کو ایک ٹرک والا اغوا کر کے لے جا رہا ہے۔"

"ایک منٹ... کون کسے لے جا رہا ہے؟" دوسری طرف سے خستہ حال انگریزی میں کہا گیا۔

میتھیوز نے پھر اپنی بات دُہرائی۔ "میں اس ٹرک کے پیچھے ہوں۔"

"کس کے پیچھے ہو؟" آپریٹر بولی۔ "تمہاری آواز ٹھیک نہیں آ رہی ہے۔"

اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات دُہراتا کال منقطع ہو گئی۔ اس نے جلدی سے اسکرین پر دیکھا۔ سگنل غائب ہو گئے تھے۔

"لعنت ہو۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔ اس نے موبائل برابر والی نشست پر پھینک دیا۔ اس دوران میں اس کی کوشش تھی کہ ٹرک کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دے۔ فیول گیج کی سوئی خطرے کی حد میں داخل ہو چکی تھی اور وہ دعا کر رہا تھا کہ کوئی گیس اسٹیشن ہی نظر آ جائے تاکہ وہ ٹنکی بھروا کر آگے تعاقب تو جاری رکھ سکے۔ اب اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے ٹرک کا نمبر کیوں نوٹ نہیں کیا۔ لیکن اس وقت اس نے سوچا کب تھا کہ اس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آ جائے گا۔

www.pkdigest.com

کار کی رفتار سست ہونے لگی۔ ٹرک اب تیزی سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے بے بسی سے دور جاتے ٹرک کو دیکھا اور کار کا ایکسلریٹر دبایا لیکن اس کی رفتار میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ پھر اسے کچھ دور روشنیاں نظر آنے لگیں۔ شاید وہاں کوئی گیس اسٹیشن تھا ورنہ اسے مدد تو مل سکتی تھی۔ اس کی کوشش تھی کہ انجن بند ہونے سے پہلے وہ اس جگہ پہنچ جائے۔ کار کی رفتار ہر گزرتے لمحے کے ساتھ کم ہوتی جا رہی تھی۔ روشنیاں گیس اسٹیشن کی ہی تھیں لیکن اب وہاں تک جانا ہی محال لگ رہا تھا۔ کار جھٹکے لے لے کر رینگ رہی تھی۔ خدا خدا کر کے وہ گیس اسٹیشن میں داخل ہوا۔ کار ایک پمپ کے سامنے پہنچ کر خود ہی رک گئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کار نے بھی اپنے مالک کے لیے پورا زور لگایا تھا اور اسے منزل تک پہنچا کر بے دم ہو گئی۔

میتھیوز اچھل کر کار سے نکلا اور اس نے کسی کا انتظار کیے بنا خود ہی ٹینک کا ڈھکن کھول کر پائپ اس میں لگا دیا۔ وہاں ایک کونے میں موجود شخص اس کی طرف لپکا اور مقامی زبان میں اس پر غصہ کرنے لگا۔ میتھیوز نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ عجلت میں ہے لیکن اس نے ایک نہ سنتے ہوئے ٹنکی میں لگا پائپ نکالنے کی کوشش کی۔ میتھیوز نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ اس پر اس نے جھنجھلاتے ہوئے جا کر پمپ سے پیٹرول بند کر دیا۔

”پیٹرول کھولو احمق انسان۔“ میتھیوز نے دہاڑ کر کہا تو اس شخص نے خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھا اور اندر کی طرف بھاگا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ پولیس کو کال کرنے یا کوئی ہتھیار لینے جا رہا ہے۔ میتھیوز نے مناسب سمجھا کہ کسی مصیبت میں پڑنے کے بجائے وہاں سے بھاگ نکلے۔ ویسے بھی کوئی چار پانچ لیٹر پیٹرول اس کی کار میں آ چکا تھا۔ اس نے پائپ نکال کر پھینکا اور کار میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ کئی بار کی کوشش کے بعد انجن غرایا۔ وہ تیزی سے گیس اسٹیشن سے نکلا۔ ہائی وے پر آتے ہوئے اس نے گیس اسٹیشن والے کو ایک رائفل سمیت باہر آتے دیکھا۔ اس نے شکر ادا کیا کہ وہ بروقت وہاں سے نکل آیا۔ سڑک پر آتے ہی اس نے چوتھا گیئر ڈالا اور ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ سڑک کو دور تک ویران پا کر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ ٹرک اتنی دیر میں نہ جانے کتنی دور جا چکا تھا اور اگر وہ کسی اور سڑک پر مڑ گیا تھا تو میتھیوز کے لیے اسے پانا ناممکن ہو جاتا۔ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ ٹرک اسی سڑک پر ہو اور اس کا ٹائر پنکچر ہو جائے یا اس کا انجن خراب ہو جائے۔

اس نے ایک بار پھر موبائل دیکھا لیکن اس پر اب تک سگنل نہیں آئے تھے۔ اگر گیس اسٹیشن والا اس سے یہ سلوک نہ کرتا تو وہ اس کی مدد حاصل کر سکتا تھا اور ... کم سے کم پولیس کو اطلاع تو دے سکتا تھا۔ میتھیوز نے اس سفر کے شروع میں سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ کار کو ہر ممکن رفتار سے چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک جگہ جہاں ہائی وے اونچائی پر پہنچ کر نشیب کی طرف جا رہی تھی، بلندی پر آتے ہی اسے دور کسی قصبے کی روشنیاں دکھائی دیں۔ ان روشنیوں کا پھیلاؤ زیادہ نہیں تھا۔ وہ کوئی درمیانے درجے کا قصبہ یا ایسی ہی کوئی جگہ لگ رہی تھی۔

جب وہ اس جگہ کے نزدیک پہنچا تو اس نے دیکھا کہ یہ کوئی قصبہ نہیں ہے بلکہ کوئی انڈسٹریل ایریا ہے۔ وہاں کارخانوں کی روشنیاں تھیں اور ایک طرف بہت بڑی خشک گودی تھی جس میں کنٹینرز کے کئی کئی منزلہ انبار تھے۔ ان کو اٹھانے رکھنے والی کرینیں تھیں۔ ایک طرف بہت بڑی پارکنگ تھی جہاں بے شمار قطاروں میں سیکڑوں ٹرک کھڑے تھے۔ وہ جس ٹرک کا تعاقب کر رہا تھا، یہ سارے اسی قسم کے تھے۔ اس نے کار پارکنگ کی طرف گھما دی۔ رات کا پہر تھا اور وہاں کوئی سرگرمی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

”شاید وہ ٹرک والا بھی یہاں آیا ہو۔“ اس نے سوچا اور قطاروں کے درمیان سے گزرتا ہوا ٹرکوں کو دیکھنے لگا مگر مصیبت یہ تھی کہ سارے ٹرکوں کا سامنے والا حصہ نظر آ رہا تھا اور سامنے سے بالکل پتا نہیں چل رہا تھا کہ اس کا مطلوبہ ٹرک اس جگہ ہے یا نہیں۔ اس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ کار سے اتر کر ٹرکوں کا پچھلا حصہ دیکھے اور بیک لائٹ پر وہی کا نشان تلاش کرے۔ اس نے کار ایک کونے میں روک دی اور ٹارچ لے کر نیچے اتر آیا۔ وہ پہلی قطار میں کھڑے ٹرکوں کے پیچھے آیا اور ٹارچ کی روشنی میں ان کی بیک لائٹس کا معائنہ کرنے لگا۔ اس قطار میں کوئی پچاس ٹرک کھڑے تھے۔ تمام قطاروں کو دیکھنے میں اسے شاید کئی گھنٹے لگ جاتے مگر اس کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔

وہ روشنی ڈالتا ہوا چل رہا تھا کہ اچانک اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ایک ٹرک کی بیک لائٹ پر اسے ویسا ہی وی کا نشان نظر آیا۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ وہ گھوم کر سامنے والے حصے کی طرف بڑھنے لگا تو اچانک کسی نے اس کا بازو عقب سے پکڑ کر یوں گھمایا کہ وہ ٹوٹنے جیسا ہو گیا۔ پکڑنے والا بہت طاقت ور تھا۔ میتھیوز کراہا۔ ”چھوڑو مجھے۔“

جواب میں کسی نے مقامی زبان میں کچھ کہا اور اسے وہاں سے کھینچ کر لے جانے لگا۔ میتھیوز سمجھ رہا تھا کہ شاید وہ ٹرک ڈرائیور ہے اور اس نے اسے دیکھ لیا ہے۔ وہ اپنی جسامت کے لحاظ سے طاقت ور بھی بہت تھا، اس نے میتھیوز کو کسی بچے کی طرح قابو کر رکھا تھا۔ پکڑنے والے شخص نے اسے ایک جگہ روشنی کے کھمبے کے پاس لا کر چھوڑا تو میتھیوز نے تڑپ کر اسے دیکھا مگر وہ ٹرک ڈرائیور نہیں تھا۔ اس نے گارڈ کی وردی پہن رکھی تھی اور شاید اس جگہ کا گارڈ تھا۔ اس نے پھر مقامی زبان میں کچھ کہا۔ میتھیوز ہانپتے ہوئے بولا۔

”مجھ سے انگریزی میں بات کرو، میں مقامی زبان نہیں جانتا۔“

”تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے تھے؟“ اس بار اس نے انگریزی میں کہا۔

”میں اپنی گرل فرینڈ کو تلاش کر رہا تھا۔“ میتھیوز نے ابھی کہا تھا کہ گارڈ نے اسے دوبارہ پکڑ لیا اور زمین پر گرا کر اس کی کلائیاں عقب میں کر کے ان میں ہتھکڑی ڈال دی۔ میتھیوز مزاحمت کرتے ہوئے بولا۔ ”ارے... یہ کیا کر رہے ہو؟ میں سچ کہہ رہا ہوں۔“

”بکو مت... تم چوری کرنے آئے تھے۔“ گارڈ غرایا اور ہتھکڑی پہنا کر اسے کھینچ کر کھڑا کر دیا۔ ”میں تمہیں پولیس کے حوالے کروں گا تو وہ تم سے خود سب اگلوا لے گی۔“

”پلیز میری بات سنو، میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ میتھیوز نے لجاجت سے کہا۔ ”تم صرف ایک منٹ کے لیے میری بات سن لو۔“

اس کے لہجے میں سچائی محسوس کر کے گارڈ پسیج گیا، اس نے سر ہلایا۔ ”کہو، کیا کہنا ہے؟“

میتھیوز جلدی جلدی اسے بتانے لگا کہ وہ کس طرح سرحد عبور کر کے یہاں آیا اور اس کے ساتھ اس کی گرل فرینڈ ایلین بھی تھی جسے ایک ٹرک ڈرائیور اغوا کر کے لے آیا تھا اور اس کا ٹرک یہاں موجود تھا۔ ”یہ اسی کا ٹرک ہے جس کے پاس سے تم نے مجھے پکڑا ہے۔“

گارڈ نے دور کھڑے ٹرک کی طرف دیکھا۔ ”تم سچ کہہ رہے ہو؟“

”ہاں... کیا یہ ٹرک کچھ دیر پہلے ہی یہاں آیا ہے؟“

گارڈ نے سر ہلایا۔ ”کوئی نصف گھنٹا پہلے ہی آیا ہے۔“

”اسی سے اندازہ لگا لو کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔“

گارڈ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے میتھیوز کی ہتھکڑی کھولی تو وہ خوش ہو گیا لیکن فوراً ہی اس کی خوشی کافور ہو گئی جب گارڈ نے اس کی ہتھکڑی اس بلب والے کھمبے کے گرد اس کے ہاتھ گھما کر دوبارہ لگا دی تھی۔ بس فرق اتنا تھا کہ اب ہتھکڑی سامنے کر کے لگائی تھی۔ وہ کہیں بھاگ نہیں سکتا تھا۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”تم یہاں آرام سے رہو، میں ابھی آتا ہوں۔“ گارڈ نے کہا اور ٹرک کی طرف چلا گیا۔ میتھیوز بے بسی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ گارڈ ٹرک تک گیا اور سامنے سے اس کے کیبن میں جھانکنے لگا۔ اسی لمحے میتھیوز نے پچھلے ٹرک کی سائڈ سے اسی دیو قامت ڈرائیور کو نکلتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ تھا۔ میتھیوز بے ساختہ چلایا۔ ”ارے... دیکھو تمہارے پیچھے...“

لیکن جب تک گارڈ چونک کر مڑتا، ڈرائیور نے اس کے سر پر اس چیز سے وار کیا تو وہ تیورا کر گر پڑا۔ ڈرائیور نے اسی ایک وار پر بس نہیں کیا بلکہ وہ بار بار گارڈ کے سر پر وار کرتا رہا۔ میتھیوز نے گارڈ کے سر سے خون کا فوارہ نکلتے دیکھا۔ ڈرائیور اسے ختم کرنے کے لیے وار کر رہا تھا۔ میتھیوز کا خوف سے برا حال ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ گارڈ کے بعد اس کی باری آئے گی اور ڈرائیور اسے بھی ختم کر دے گا۔ وہ اس کھمبے سے بندھا بے بس تھا۔ اس نے اوپر کی طرف دیکھا، کھمبا کوئی دس فٹ اونچا تھا۔ اگر وہ اس کے سرے تک رسائی حاصل کر لیتا تو اپنے ہاتھ اس میں سے نکال سکتا تھا۔ اس نے ہاتھوں سے فولادی پائپ کو پکڑا اور دونوں جوتے اس پر جما کر اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا... اسے فوراً اندازہ ہو گیا کہ یہ کام آسان نہیں ہے۔ چار انچ موٹا فولادی پائپ چکنا تھا اور اس پر ہاتھ سلپ کر رہے تھے۔ اس نے جھک کر زمین سے مٹی ہاتھوں اور کھمبے پر لگائی اور پھر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس بار اسے کامیابی ہوئی اگرچہ اس کی رفتار بہت سست تھی۔ وہ ایک فٹ اوپر جاتا تھا تو آدھا فٹ نیچے پھسل جاتا۔ اس کے جوتے بھی سلپ کر رہے تھے مگر وہ جان بچانے کے لیے دیوانہ وار جدوجہد کر رہا تھا۔ ایلین کو بچانے کے لیے ضروری تھا کہ پہلے وہ خود کو بچاتا۔ اس دوران میں اس کی نظر ڈرائیور پر گئی۔ وہ گارڈ کو مار چکا تھا... یا اگر نہیں بھی مارا تھا تو اسے اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ اس کا پیچھا کر سکے۔ اب وہ اس کی طرف آ رہا تھا اور اس کا انداز ایسا تھا جیسے اسے کوئی جلدی نہ ہو اور اسے یقین ہو کہ اس کا شکار بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔

میتھیوز اسے آتے دیکھ کر پاگل ہو گیا اور ہر ممکن کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح کھمبے کے سرے تک رسائی حاصل کر لے۔ ایک بار اس نے ہاتھ اوپر کیے تو وہ بلب کے شیشے کے گلوب سے ٹکرائے، وہ بہت گرم ہو رہا تھا مگر میتھیوز نے اس کی پروا کیے بغیر آنکھیں بند کر کے اس پر ہاتھ مارا۔ ہتھکڑی ایک خاص قسم کے پلاسٹک کی تھی اسے نہ تو کاٹا جا سکتا اور نہ

www.pkdigest.com

ہی توڑا جاسکتا تھا۔ اس لیے وہ گلوب توڑنے کے لیے بے کار تھی۔ اس کے ہاتھ پر چوٹ آئی لیکن گلوب ٹوٹ گیا اور اس نے جلدی سے اوپر سے ہاتھ گزارا اور نیچے چھلانگ لگا دی۔ اس کے پاؤں میں ہلکی سی چوٹ آئی جس کا اسے ہوش نہیں تھا۔ ڈرائیور اب اس سے کوئی بیس گز دور تھا۔ اسے آزاد ہوتے دیکھ کر وہ اس کی طرف بھاگا لیکن ہلکے پھلکے میتھیوز کی رفتار اس سے زیادہ تیز تھی اور پھر اس کی جان پر بنی تھی۔ اسے بھاگتے دیکھ کر ڈرائیور نے وہ چیز پھینک کر ماری جس سے اس نے گارڈ کے سر پر وار کیے تھے۔ میتھیوز بال بال بچا۔ وہ چیز اس کے سر کے پاس سے گزر کر سامنے گری۔ یہ جیک کا کوئی ڈھائی فٹ لمبا لیور تھا اور اس کے ایک سرے پر خون لگا تھا۔

سامنے جھاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ میتھیوز کا خیال تھا کہ وہ وہاں تک پہنچ گیا تو ڈرائیور اسے آسانی سے تلاش نہیں کر سکے گا۔ وہ اپنے بھاری جثے کی وجہ سے تیز بھاگ بھی نہیں سکتا تھا اسی وجہ سے وہ پیچھے رہ گیا۔ میتھیوز جب جھاڑیوں میں گھسا اور اس نے پلٹ کر دیکھا تو ڈرائیور اس سے بہت دور تھا اور اب وہ اسے نہیں پکڑ سکتا تھا۔ یہ بات ڈرائیور نے بھی محسوس کر لی۔ اس لیے وہ رک گیا پھر اس نے جھک کر جیک کا لیور اٹھایا اور واپس چلا گیا۔ میتھیوز ہانپتے ہوئے اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ دو منٹ بعد قطار سے ایک ٹرک نکل کر ہائی وے کی طرف جاتا نظر آیا۔ ٹرک گھوما تو اس کی بیک لائٹ کا وی صاف نظر آرہا تھا۔

میتھیوز دیوانہ وار بھاگا۔ اس کا رخ اپنی کار کی طرف تھا۔ اس سے پہلے کہ ٹرک اس کی نظروں سے پھر اوجھل ہو جاتا، وہ تیزی سے کار میں گھسا اور اس نے ڈیش بورڈ سے لائٹر نکال کر اسے جلایا اور بڑی مشکل سے کلائی گھما کر ہتھکڑیوں کا درمیانی حصہ شعلے پر رکھ دیا۔ پلاسٹک پگھلنے لگا۔ ساتھ ہی شعلہ اس کی کلائی کو بھی جلا رہا تھا۔ وہ اذیت برداشت کرتا رہا۔ پھر ایک جھٹکے سے درمیانی ڈوری ٹوٹ گئی اور اس نے لائٹر بجھا دیا۔ کلائی کا ایک حصہ تھوڑا سا جل گیا تھا اور وہاں ایک آبلہ پڑ گیا تھا۔ اس نے درد برداشت کرتے ہوئے کار اسٹارٹ کی اور تیزی سے ہائی وے کی طرف موڑ دی۔ ٹرک خاصا آگے جا چکا تھا۔ میتھیوز نے ہیڈ لائٹس بجھا دیں تاکہ ڈرائیور اس کے تعاقب سے بے خبر رہے۔ اب ٹرک کی رفتار زیادہ نہیں تھی اس لیے وہ آرام سے اس کا پیچھا کرتا رہا۔

ڈرائیور نے جتنی بے دردی سے گارڈ کو مارا تھا، اس سے میتھیوز کو اندازہ ہوا کہ وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے بلکہ سفاک اور مجرمانہ ذہن رکھنے والا شخص ہے۔ میتھیوز کو یہ اندیشہ بھی تھا کہ اس نے ایلین کو کسی خاص مقصد کے تحت اغوا کیا ہے۔ ٹرک ابھی ہائی وے پر ہی جا رہا تھا لیکن اس کی کم رفتار سے میتھیوز نے اندازہ لگایا کہ اس کی منزل کہیں قریب ہی ہے۔ اسے یقین تھا کہ ایلین ٹرک کے پچھلے حصے میں ہے۔ یہ کوئی تیس فٹ لمبا اور پندرہ فٹ چوڑا کنٹینر تھا اور اس کا دروازہ پیچھے سے بند تھا۔ اس میں ایلین کیا کسی ہاتھی کو بھی رکھا جاسکتا تھا۔

ٹرک کی رفتار ایک جگہ سست ہوئی اور پھر وہ ایک کچے راستے پر مڑ گیا۔ میتھیوز ہائی وے پر اس جگہ کچھ دیر کے لیے رکا اور پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے کار اس کچے راستے پر موڑ دی۔ اس کے ذہن میں اندیشہ تھا کہ ٹرک ڈرائیور نے کہیں تعاقب ہوتے محسوس نہ کر لیا ہو اور وہ اس سے نمٹنے کے لیے اسے سڑک سے دور لے جا رہا ہو۔ لیکن وہ صرف اپنے اندیشے کی وجہ سے اس کا تعاقب ترک نہیں کر سکتا تھا۔ ٹرک کچھ دور تھا اور کچے پر ہونے کی وجہ سے سست روی سے سفر کر رہا تھا۔ اچانک میتھیوز کی کار کا انجن گھر گھرانے لگا اور اس سے شوں شاں کی آوازیں آنے لگیں۔ اس نے دیکھا تو حدت بتانے والی سوئی سرخ نشان کے آخر میں تھی اور سامنے بونٹ سے بھاپ کے بادل اٹھ رہے تھے۔ ریڈی ایٹر کا پانی ختم ہو گیا تھا۔ اس نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارا اور کار روک دی ورنہ انجن سیز ہو جاتا۔ اس کے پاس پانی بھی نہیں تھا کہ وہ ریڈی ایٹر میں ڈال کر کام چلا لیتا۔

اس دوران میں ٹرک اتنا دور جا چکا تھا کہ اس کی روشنیاں بھی نظر نہیں آرہی تھیں۔ میتھیوز کار سے اترا۔ اس نے ٹارچ لی اور کچے راستے پر بھاگنے لگا۔ کچھ دور جا کر اسے ٹرک کے انجن کا شور سنائی دیا اور پھر اس کی روشنیاں بھی نظر آنے لگیں۔ ٹرک سست روی سے چل رہا تھا۔ اسی اثنا میں میتھیوز کو کچھ دور ایک اور سڑک سے گزرتی کسی تیز رفتار گاڑی کی روشنی نظر آئی۔ ٹرک اصل میں اسی سڑک کی طرف جا رہا تھا۔ میتھیوز اس بار بے تحاشا بھاگا۔ وہ ٹرک کے سڑک تک پہنچنے سے پہلے اس تک پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن اس کی بدقسمتی کہ جب وہ سڑک تک پہنچا تو ٹرک رفتار پکڑ چکا تھا اور تیزی سے اس سے دور جا رہا تھا۔ میتھیوز بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گیا لیکن وہ رکا نہیں جب تک اس کے دم میں دم رہا، وہ بھاگتا رہا اور جب اس کا سانس جواب دے گیا تو وہ چلنے لگا۔ اس دوران میں وہ وقفے وقفے سے موبائل دیکھ رہا تھا کہ اس پر سگنل آجائیں تو وہ پولیس سے مدد طلب کر سکے لیکن سگنل نہیں تھے۔

شاید اس سروس کے سگنل نہیں تھے جو میتھیوز استعمال کر رہا تھا۔ جب وہ زیادہ ہی تھک جاتا تو چند لمحے کے لیے رک جاتا لیکن پھر اسے ایلین کا خیال آتا تو وہ دوبارہ..... چلنا شروع کر دیتا۔ جب ذرا حوصلہ ہوتا تو بھاگنے لگتا۔ وہ اس بات کا خیال رکھ رہا تھا کہ دائیں بائیں نکلنے والے راستوں کو بھی دیکھتا جائے کہ ٹرک ان میں سے کسی پر نہ مڑ گیا ہو۔ کچے راستے پر اس کے ٹائروں کے نشان نظر آجاتے۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ موسم خاصا سرد تھا لیکن مسلسل چلنے کی وجہ سے اس کا جسم گرم تھا اور اسے باقاعدہ پسینا آرہا تھا۔

چلتے چلتے وہ بے حال ہونے لگا۔ یہ علاقہ بالکل ویران تھا۔ اسے کہیں کوئی آبادی یا کوئی گھر نظر نہیں آیا جہاں وہ کسی سے مدد لے سکتا۔ یورپ میں عام طور سے آبادیاں زیادہ دور دور نہیں ہیں کیونکہ یہاں رقبہ کم ہے اور آبادی زیادہ ہے لیکن پولینڈ کی آبادی زیادہ نہیں ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کے سرحدی علاقے میں لوگ آباد نہیں تھے۔ ایک بار اسے شبہ ہوا کہ درختوں کے پار کہیں روشنی ہو رہی ہے۔ کچھ دور چلنے کے بعد اسے یہ روشنی صاف نظر آنے لگی۔ سڑک سے کوئی فرلانگ دور کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ فی الحال درختوں اور جھاڑیوں کی وجہ سے اسے کوئی آبادی یا مکان نظر نہیں آرہا تھا لیکن روشنی یقینی طور پر کسی مصنوعی ذریعے کی تھی۔ اس نے راستہ بدلا اور درختوں میں گھس گیا کیونکہ اسے اس روشنی تک جانے کا کوئی باقاعدہ راستہ نظر نہیں آیا تھا۔ یہاں بالکل اندھیرا تھا اور اس کے پاس ٹارچ نہ ہوتی تو اسے بہت دشواری پیش آتی۔

ذرا دیر بعد وہ خاردار تاروں سے گھرے ایک احاطے کے سامنے تھا۔ اس احاطے کے اندر کھمبے پر ایک بڑا بلب روشن تھا لیکن احاطہ اتنا بڑا تھا کہ اس بلب کی روشنی ناکافی تھی۔ احاطے میں دو لکڑی کے بنے کیبن نظر آرہے تھے اور دونوں کیبن اونچے پلیٹ فارمز پر تھے۔ احاطے میں جا بجا لوہے کا ناکارہ سامان اور مشینیں پڑی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس احاطے میں کوئی کباڑی رہتا ہے۔ خاردار تاریں اتنی پاس پاس لگی تھیں کہ ان میں سے کوئی چھوٹے سائز کا کتا بھی مشکل گزر سکتا تھا۔ تاروں کے ساتھ جھاڑیاں اور گھاس اگ آئی تھی۔ وہ تاروں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اسے امید تھی کہ اسے کہیں سے راستہ مل جائے گا کیونکہ اندر جانے کا کوئی نہ کوئی راستہ تو ہوگا۔ اسے ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ کہیں یہ احاطہ ویران نہ ہو، حالانکہ وہاں روشنی ہو رہی تھی اور ظاہر ہے کسی نہ کسی نے یہ روشنی کی تھی۔

وہ چلتے چلتے رک گیا۔ اسے لگا جیسے کوئی عورت چیخی ہو۔ اس کے خون کی روانی تیز ہو گئی اگرچہ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کسی عورت کے چیخنے کی ہی آواز تھی یا اس کی سماعت کا دھوکا تھا۔ اب تک وہ احاطے کو کسی عام آدمی کی جگہ سمجھ رہا تھا مگر چیخ نما آواز سن کر اسے خیال آیا کہ یہ اسی ڈرائیور کا مسکن تو نہیں ہے۔ پھر ایلین کا سوچ کر وہ بے قرار ہو گیا کہ کہیں وہ وحشی ڈرائیور اس پر کوئی ظلم تو نہیں کر رہا۔ اس نے بے چین ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ اسے ایک درخت نظر آیا جس کی شاخیں خاردار تاروں کے اوپر تک گئی تھیں۔ اس نے کوشش کی اور درخت پر چڑھ گیا۔ البتہ جب وہ اس کی شاخ پر چڑھ کر تاروں کے اوپر جانے لگا تو شاخ اس کے بوجھ سے جھکنے لگی۔ وہ تاروں سے ٹکرانے لگی۔ وہ ذرا اور آگے بڑھا تو شاخ آکر تاروں پر ٹک گئی۔ تاروں کی وجہ سے شاخ مزید جھکنے سے بچ گئی۔ وہ اس کے سرے تک پہنچا اور اسے پکڑ کر لٹک گیا۔ زمین اب بھی اس کے پیروں سے کوئی چھ فٹ نیچے تھی۔ اس نے شاخ چھوڑی تو نیچے گرتے ہوئے اس کا پاؤں مڑ گیا اور اس کا گھٹنا کسی پتھر سے ٹکرایا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی چیخ روکی۔ پھر بھی اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔

اس نے گھٹنے کا معائنہ کیا۔ زخم نہیں آیا تھا لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ اس تصادم میں اس کا گھٹنا ٹوٹ گیا ہے۔ اگر ایسا تھا تو وہ بڑی مشکل میں پڑ جاتا۔ کچھ دیر وہ یونہی پڑا رہا پھر اس نے ہمت کر کے کھڑے ہونے کا سوچا۔ وہ بڑی مشکل سے کھڑا ہوا اور چلنے کی کوشش کی تو اسے قدرے اطمینان ہوا۔ اسے تکلیف تو ہو رہی تھی لیکن وہ چل رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے گھٹنے کی ہڈی کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔ ورنہ وہ چلنا تو ایک طرف... اس پاؤں پر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ لنگڑاتے ہوئے احاطے میں پڑے سامان کے درمیان راستہ بناتا ہوا کیبنوں کی طرف بڑھنے لگا۔ اسے ایک کیبن میں روشنی بھی نظر آرہی تھی جبکہ دوسرا کیبن تاریک پڑا تھا۔

ملبے کے درمیان چلنے کو راستہ بھی مشکل سے مل رہا تھا لیکن یہ ملبا کیبنوں سے کچھ دور تک ہی تھا۔ اس کے بعد صاف میدان تھا جس میں فٹ بھر اونچی گھاس اگی ہوئی تھی۔ وہ ملبے میں تھا کہ اس کی نظر ایک طرف کھڑے اس ٹرک پر پڑی جس کا تعاقب کرتا وہ یہاں تک آگیا تھا۔ ایک لمحے کو اس کا دل رک گیا۔ اگر یہ ٹرک وہی تھا تو ایلین کو بھی یہیں ہونا چاہیے تھا لیکن پہلے اس کی تصدیق ضروری تھی۔ وہ ملبے سے نکل کر اس کی طرف بڑھا تو اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا اور فوراً ہی کہیں گھنٹیاں بجنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میتھیوز چونکا۔ اس نے جھک کر دیکھا۔ گھاس کے درمیان ایک پتلی سی تار

www.pkdigest.com

گزر رہی تھی۔ اس کا پاؤں اسی سے ٹکرایا تھا اور یہ تار کہیں گھنٹیوں سے بندھی تھی۔ تار میں حرکت ہوتے ہی گھنٹیاں بجنے لگیں اور اب ٹرک ڈرائیور کی آمد لازمی تھی۔ اس نے یہ انتظام اسی لیے کیا تھا کہ کوئی چھپ کر احاطے کے اندر آئے تو اسے خبر ہو جائے۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ وہ جس کا تعاقب کر رہا تھا، اسی کی جگہ پہنچ گیا تھا۔

گھنٹیاں بجنے کے ایک منٹ کے اندر روشنی والے کیبن کا دروازہ کھلا اور وہی طویل قامت شخص باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک شاٹ گن تھی۔ اس نے خالی میدان کا معائنہ کیا اور نیچے اتر آیا۔ اس کی تیز نظریں چاروں طرف گردش کر رہی تھیں۔ وہ اس کو تلاش کر رہا تھا جس کی وجہ سے گھنٹیاں بجی تھیں۔ اس نے پہلے ملبے کو دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ پھر اس کی نظر اپنے ٹرک کی طرف گئی۔ وہ شاٹ گن سامنے کیے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اسے کھولنے والا تھا کہ اسے عقب میں آہٹ سنائی دی اور اس نے بے ساختہ گھومتے ہوئے فائر کر دیا۔ فوراً ہی ایک جنگلی بلی گھاس کے درمیان سے اچھل کر بھاگی۔ ڈرائیور اپنی بدحواسی پر ہلکے سے ہنسا اور اس نے ٹرک کا دروازہ دیکھے بغیر بند کر دیا۔

اندر سیٹوں پر دم سادھے لیٹے ہوئے میتھیوز نے اپنی زندگی کا سب سے طویل سانس لیا۔ جب ٹرک ڈرائیور نے ٹرک کا دروازہ کھولا تو اس نے خود کو پکڑے جانے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ اسے چھپنے کے لیے سب سے قریبی جگہ یہی نظر آئی تھی۔ اس کی خوش قسمتی کہ گھاس میں ایک بلی بھی چھپی تھی ورنہ وہ پکڑا جاتا اور مارا جاتا۔ ٹرک ڈرائیور کی سفاکی وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ ٹرک ڈرائیور کو پتا ہی نہیں چلا کہ وہ اس کے سامنے سیٹوں پر لیٹا ہے۔ اگر وہ دروازہ بند کرنے سے پہلے ذرا سا سر گھما لیتا تو اسے دیکھ لیتا۔ دروازہ بند کر کے وہ اندر چلا گیا۔

میتھیوز ٹرک سے نکلا اور اس بار اس نے گھاس کے میدان میں گھسنے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ زمین پر بہت دیکھ بھال کر چل رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ رک کر کوئی آواز سننے کی کوشش کرتا۔ اسے امید تھی کہ ایلین جہاں موجود ہوگی وہاں وہ کوئی نہ کوئی آواز نکال رہی ہوگی۔ لیکن ابھی تک اسے کوئی آواز نہیں سنائی دی تھی۔ خدا جانے وہ کس حال میں تھی۔ اس نے بے چین ہو کر سوچا۔ ”کہیں اس ظالم نے ایلین کو مار تو نہیں دیا۔“

یہ سوچ کر اس کا غصے سے برا حال ہو گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اگر اس نے ایلین کو مار دیا ہوگا تو وہ بھی اسے قتل کر دے گا۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ اس دیو قامت شخص کا کسی صورت مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ صرف جسمانی لحاظ سے ہی اس پر بھاری نہیں تھا بلکہ مسلح بھی تھا اور اس میں ایک وحشت بھی تھی جو میتھیوز میں یقیناً نہیں تھی۔ ایسے شخص کا مقابلہ کرنا آسان نہیں تھا جبکہ اس کے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔ اس نے آس پاس دیکھا۔ اسے کچھ دور زمین پر پڑا ایک لوہے کا زنگ خوردہ پائپ نظر آیا۔ اس نے اسے اٹھا کر تولا۔ یہ کوئی ڈھائی فٹ لمبا اور کوئی چار کلوگرام وزنی تھا۔ وہ اس کیبن کی طرف بڑھا جہاں سے دیو قامت شخص نکلا تھا لیکن اس کے پاس جا کر اسے ایک خیال آیا کہ اسے پہلے دوسرے کیبن کو دیکھنا چاہیے... ممکن ہے اس نے ایلین کو وہاں رکھا ہو۔ وہ رخ بدل کر عمارت کے عقب سے گزرا۔ یہاں بھی وہ زمین پر پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا کہ کہیں اس نے کوئی اور ٹریپ نہ بچھا رکھا ہو۔ اس جیسے شخص سے کچھ بعید نہیں تھا۔ اس نے زمین میں نہ جانے کہاں کہاں شکاری پھندے لگا رکھے ہوں، بس کسی کا پاؤں پڑے اور یہ پھندے اس کا پاؤں فولادی شکنجے میں جکڑ لیں۔

اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ٹرک ڈرائیور کوئی جرائم پیشہ شخص ہے ورنہ کسی عام آدمی کو کیا ضرورت ہے کہ ایسی جگہ رہے اور اس ویرانے میں بھی اس قسم کے حفاظتی انتظامات کر کے رکھے۔ وہ ٹرک ڈرائیور تھا۔ ممکن ہے وہ اسمگلنگ کرتا ہو اور ممنوعہ چیزیں لے جاتا ہو۔ وہ منشیات بھی لے جا سکتا تھا اور اسلحہ بھی۔ وہ تاریک کیبن تک آیا۔ اس میں داخل ہونے کے لیے دروازہ صرف سامنے کی طرف تھا۔ وہ پلیٹ فارم پر چڑھا اور اس نے دروازہ کھولا۔ وہ کھلا ہوا تھا، یعنی لاک نہیں تھا، صرف باہر سے کنڈی بند تھی۔ اسے مایوسی ہوئی کیونکہ اس جگہ کو اس طرح چھوڑ دینے کا مطلب تھا کہ ڈرائیور نے ایلین کو یہاں نہیں رکھا ہوگا۔

پھر بھی اس نے سوچا کہ ایک نظر دیکھ لے، ممکن ہے اسے یہاں کوئی ہتھیار ہی مل جائے۔ وہ اندر آیا اور اس نے دروازہ بند کر کے ٹارچ روشن کی۔ یہ جگہ شاید گودام کے طور پر استعمال کی جاتی تھی کیونکہ وہاں مختلف ریک میں اشیا رکھی تھیں۔ جیسے انجن اور اوزار وغیرہ۔ ایک طرف شراب کے کریٹ رکھے تھے اور ان کی تعداد خاصی زیادہ تھی۔ شاید وہ شراب بھی اسمگل کرتا تھا لیکن میتھیوز کو کوشش کے باوجود وہاں کوئی ہتھیار نہیں ملا اور نہ ہی کوئی ایسی چیز جسے وہ ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتا۔ اس کے پاس بس یہی زنگ آلود فولادی پائپ تھا۔

مایوس ہو کر وہ باہر آیا۔ اس نے ٹارچ بجھا دی۔ وہ پلیٹ فارم سے اترا۔ اس بار وہ دوسری عمارت کی طرف بڑھا۔ وہ بہت محتاط تھا۔ دبے قدموں پلیٹ فارم پر چڑھ کر اس نے دروازے کے پاس رک کر سن گن لی لیکن اسے کوئی آواز نہیں آئی۔ اس نے دروازے کا ہینڈل پکڑ کر اسے آہستہ سے گھمایا، وہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ ذرا سا کھولا اور اندر جھانکا۔ اسے سامنے ایک راہداری سی نظر آ رہی تھی جس کے دائیں بائیں چار فٹ اونچے پنجرے رکھے تھے... لیکن نہ تو وہ شخص نظر آ رہا تھا اور نہ ہی کوئی آواز آ رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے... اتنا دروازہ کھولا کہ اندر جا سکے اور اندر گھستے ہی اسے بند کر دیا۔ یہ راہداری ہی تھی اور سامنے بیچ بیچ کے پنجرے رکھے تھے۔ اندر آنے کے بعد اسے ایسی آواز آئی جیسے کوئی نہا رہا ہو۔

وہ محتاط انداز میں ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک ہی اسے کسی عورت کی سسکی سنائی دی۔ وہ ساری احتیاط بھول کر بے تابی سے اس سمت بڑھا جہاں سے آواز آئی تھی۔ آواز پنجروں کی طرف سے آئی تھی۔ یہ موٹے تاروں کے بنے ایسے پنجرے تھے جیسے کتے رکھنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس نے پہلے پنجرے میں جھانکا، وہ خالی تھا۔ پھر دوسرے پنجرے میں دیکھا۔ وہ بھی خالی تھا۔ پھر آواز کہاں سے آئی تھی؟ ... عقب سے سسکی کی آواز دوبارہ آئی تو وہ اچھل پڑا۔ اس نے گھوم کر دیکھا تو اسے دوسری طرف موجود پنجرے میں ایک لڑکی گھٹنوں میں سر دیے نظر آئی۔ اس کے سنہری بال دیکھ کر میتھیوز بے تاب ہو گیا۔

”ایلین!“ اس نے آہستہ سے پکارا۔

لڑکی نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا تو میتھیوز کو مایوسی ہوئی، وہ ایلین نہیں تھی۔ اسے دیکھ کر لڑکی سہم کر پنجرے میں سمٹ گئی۔ میتھیوز کو لگا کہ وہ ڈر کر چیخنا نہ شروع کر دے۔ اس نے اسے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ لڑکی اسے خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میتھیوز نے سرگوشی میں کہا۔ ”سنو... کیا تم ایلین سے واقف ہو... وہ تمہاری ہی عمر کی ہے، سنہری بال ہیں... گرے کوٹ میں تھی۔“

جواب میں لڑکی اسے خاموشی سے دیکھتی رہی۔ میتھیوز نے التجا کی۔ ”پلیز! میری مدد کرو۔ وہ میری گرل فرینڈ ہے۔ اسے یہ ٹرک ڈرائیور اغوا کر کے لے آیا ہے۔“

لڑکی ٹرک ڈرائیور کا سن کر خوف زدہ ہو گئی۔ پھر اس نے منہ کھولا اور ایسی آواز نکالی جیسے گونگے نکالتے ہیں۔ میتھیوز نے اس کا منہ دیکھا، اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ لڑکی کی زبان آگے سے کٹی ہوئی تھی اور اس کا زخم ابھی بھرا نہیں تھا۔ لڑکی بول نہیں سکتی تھی لیکن اس کے آنسو اس پر گزرنے والے ظلم کی داستان سنا رہے تھے۔ اس ظالم شخص نے اس لڑکی کی زبان کاٹ دی تھی۔

”میرے خدا!“ میتھیوز لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ اس کا اندازہ درست نکلا... یہ ڈرائیور کسی بہت گھناؤنے کام میں ملوث تھا۔ اس کا ثبوت اس لڑکی کی اس جانوروں کے پنجرے میں موجودگی تھی اور اس کی کٹی زبان تھی۔ ایلین بھی یہیں کہیں قید تھی۔ میتھیوز نے اشارے سے لڑکی کو چپ رہنے کو کہا اور آگے جا کر دوسرے پنجروں میں دیکھنے لگا۔ اسے آگے دو لڑکیاں اور نظر آئیں۔ یہ کم عمر اور حسین تھیں لیکن ان میں ایلین نہیں تھی۔ کل دس پنجرے تھے مگر ان میں ایلین نہیں تھی۔ وہ ہمت کر کے مکان کے اس حصے میں آیا جہاں سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس حصے میں واش روم تھا۔

ٹرک ڈرائیور کے کپڑے باہر پڑے تھے اور وہ شاور تلے نہا رہا تھا۔ اس جگہ بھی ایلین نہیں تھی۔ اچانک اس کے کپڑوں میں رکھے موبائل فون کی بیل سنائی دی۔ میتھیوز اچھل پڑا۔ اس سے پہلے کہ ٹرک ڈرائیور باہر آتا، وہ پاس رکھی میز کی چادر اٹھا کر نیچے گھس گیا۔ اسی لمحے ڈرائیور باتھ روم کا سرکنے والا دروازہ ہٹا کر باہر آیا اور جھک کر اپنی جیکٹ کی جیب سے موبائل نکالا۔ ”ہیلو۔“ اس نے کہا اور پھر دوسری طرف سے کہی جانے والی بات سنتا رہا۔ آخر میں اس نے بنا کچھ کہے موبائل بند کر کے اس میز پر رکھ دیا جس کے نیچے میتھیوز تھا۔ وہ دوبارہ باتھ روم میں گھس گیا۔

میتھیوز میز کے نیچے سے نکلا اور باہر کی طرف جانے لگا تو اس کی نظر موبائل پر پڑی۔ اسے خیال آیا کہ وہ اس کی مدد سے پولیس کو کال کر سکتا ہے کیونکہ اس کے اپنے موبائل پر یہاں سگنل نہیں آ رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ٹرک ڈرائیور کے پاس کسی مقامی کمپنی کا موبائل تھا جس کے سگنل اس علاقے میں بھی موجود تھے۔ اس نے موبائل اٹھایا اور باہر کی طرف لپکا۔ اس سے پہلے کہ وہ نہا کر باہر آتا اور موبائل کو غائب پا کر اس کی تلاش شروع کرتا، وہ کال کر کے پولیس کو اطلاع کر دینا چاہتا تھا۔ یہاں ایلین نہیں تھی۔ اس نے نہ جانے اسے کہاں رکھا تھا۔ ایک بار پولیس آ جاتی تو وہ اس سے خود اگلوا لیتی کہ ایلین کہاں ہے۔ وہ اسی پنجرے کے پاس سے گزرنے لگا جس میں زبان کٹی لڑکی تھی۔ اس نے آواز نکال کر میتھیوز کو متوجہ کیا۔ وہ رکا اور سرگوشی میں بولا۔ ”تم فکر مت کرو... میں پولیس کو کال کرنے جا رہا ہوں۔“

لڑکی بے چاری اسے آوازوں کی مدد سے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ اسے اس پنجرے سے نکال دے لیکن یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ پنجروں کے باہر تالے لگے تھے۔ وہ باہر جانے لگا... تو لڑکی نے دوبارہ التجا آمیز آواز نکالی۔ میتھیوز رک گیا۔ لڑکی کے انداز میں اتنی مظلومیت تھی کہ وہ جا نہیں سکا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ پلٹا اور باتھ روم تک آیا جہاں ٹرک ڈرائیور کے کپڑے پڑے تھے۔ اس نے اس کی جیکٹ کی جیبیں ٹٹولیں تو اسے ایک جیب سے چابیوں کا گچھا مل گیا۔ وہ اسے مٹھی میں دبا کر واپس آیا اور پنجرے کے تالے میں چابیاں لگا کر اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ چابیاں میچ نہیں کر رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ بھی لرز رہے تھے۔

اچانک ہی پانی گرنے کی آواز آنی بند ہو گئی۔ اس نے لڑکی سے کہا۔ ”وہ آ رہا ہے... میں پھر آؤں گا، تم حوصلہ رکھنا۔“

لڑکی نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن اب رکنے کا مطلب پھنسنا تھا۔ وہ کیبن کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور ہر ممکن تیزی سے ملبے کا رخ کیا۔ یہاں وہ کچھ دیر ڈرائیور کی نظروں سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ اس نے ایک جگہ بیٹھ کر موبائل پر ایمرجنسی کا نمبر ملایا۔ فوراً ہی اس کا رابطہ ہو گیا۔ آپریٹر نے پولش زبان میں کچھ کہا۔ اس نے جواب دیا۔

”مجھے پولش نہیں آتی... پلیز! انگلش میں بات کرو۔“

آپریٹر نے کچھ کہا اور اس بار ایک آدمی نے انگریزی میں پوچھا۔ ”تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟“

میتھیوز نے اپنا تعارف کرایا اور اپنی پہلی کال کا حوالہ دیا۔ ”میں نے پہلے بھی پولیس کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میرے موبائل کے سگنل غائب ہو گئے تھے۔ ایک ٹرک ڈرائیور نے میری گرل فرینڈ کو اغوا کر لیا۔ میں اس کا تعاقب کرتا ہوا ایک جگہ آیا ہوں اور یہاں اس کے مکان میں میں نے کئی لڑکیوں کو جانوروں والے پنجروں میں بند دیکھا ہے۔ ان میں سے ایک لڑکی کی زبان... کاٹ دی گئی ہے۔“

”تم کس جگہ پر ہو؟“

”میں نہیں جانتا کیونکہ میں یہاں پہلی بار آیا ہوں لیکن میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں نے چیک ری پبلک سے آنے والی ہائی وے پر ایک گیس اسٹیشن پر پیٹرول ڈلوایا تھا۔ میں ٹرک کا تعاقب کر رہا تھا اس لیے جلدی میں خود پیٹرول ڈالا تھا اور پھر وہاں سے بھاگ نکلا۔ گیس اسٹیشن والے نے یقیناً میرے خلاف رپورٹ کی ہوگی۔ اس کے بعد میں ایک ڈرائی پورٹ تک پہنچا جہاں بہت سارے کارخانے تھے۔ وہاں اس ڈرائیور نے میرے سامنے گارڈ کو مارا۔ پتا نہیں وہ زندہ ہے یا نہیں۔ اس کے بعد وہ ٹرک لے کر نکلا اور کوئی دو کلو میٹر بعد اس نے ٹرک بائیں طرف کچے میں اتار دیا۔ یہاں میری گاڑی ریڈی ایٹر خالی ہو جانے سے بے کار ہو گئی اور میں نے پیدل ہی تعاقب جاری رکھا۔ ٹرک برابر میں ایک اور ہائی وے پر آیا اور دائیں طرف مڑ گیا۔ اس سڑک پر کوئی تین کلو میٹر کے بعد بائیں طرف فرلانگ بھر دور ایک احاطہ ہے جس میں کباڑ بھرا ہے۔ اس کا ٹرک بھی یہیں کھڑا ہے۔“

”تم نے بہت اچھا گائیڈ کیا ہے۔“ پولیس آپریٹر نے کہا۔ ”ہم اس علاقے میں پولیس کو خبردار کر رہے ہیں۔ جلد تمہیں تلاش کر لیا جائے گا۔ تم خود کو اس سے بچائے رکھو۔“

”تمہارا شکریہ۔“ میتھیوز نے کہا اور کال منقطع کر دی۔ وہ مکان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ڈرائیور کو جلد یا کچھ دیر سے اپنے موبائل کی گمشدگی کا احساس ہو جائے گا اور وہ اسے تلاش کرنے باہر آئے گا۔ اسے ایلین کا خیال آیا۔ وہ مکان میں نہیں تھی اور نہ ہی برابر والی عمارت میں تھی پھر ٹرک ڈرائیور اسے کہاں لے گیا اور اسے کہاں رکھا تھا؟ میتھیوز کو ٹرک کا خیال آیا۔ اس کا پچھلا حصہ بند تھا اور عین ممکن ہے اس نے ایلین کو وہیں بند کر رکھا ہو اور ابھی تک اسے وہاں سے نکالا نہیں ہو۔ ایلین کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے باقی لڑکیوں کا خیال آیا۔ اس نے ان کو کتنے غیر انسانی انداز میں رکھا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ٹرک ڈرائیور انسانیت سے عاری شخص ہے یا اسے ان معصوم لڑکیوں کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کر کے مزہ آتا ہے۔ وہ ملبے کی آڑ میں ٹرک کی طرف بڑھا۔ وہ میدان سے گزرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ اس کا پاؤں کسی چھپے تار پر پڑ جاتا تو وہ پکڑا جاتا۔

ٹرک کے کنٹینر کا دروازہ اوپر کی طرف اٹھانے والا تھا۔ یہ بھاری بھرکم دروازہ ایک میکنزم کے تحت اٹھتا تھا اور بند ہوتا تھا لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ ٹرک کا انجن چلایا جائے۔ انجن سے اس ہائیڈرولک سسٹم کو طاقت ملتی جو دروازہ اٹھاتا اور بند کرتا تھا۔ ٹرک کی چابی ڈرائیور کے پاس تھی۔ میتھیوز نے تختے کی نچلی درز میں انگلیاں پھنسا کر اسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ بہت وزنی تھا اور میکنزم کی وجہ سے تقریباً جام ہو رہا تھا۔ پھر اس نے جھک کر اس باریک خلا میں جھانکا۔ اندر تاریکی تھی۔

”ایلین! کیا تم اندر ہو؟ میں میتھیوز ہوں۔ ایلین! تم میری آواز سن رہی ہو؟“

لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ایلین اگر اندر تھی، تب بھی وہ جواب دینے کے قابل نہیں تھی۔ اچانک کیبن کا دروازہ کھلا اور اس سے ٹرک ڈرائیور باہر آیا۔ میتھیوز جلدی سے ٹرک کے نیچے گھس گیا۔ ڈرائیور کچھ دیر کھڑا جیسے سن گن لیتا رہا پھر واپس اندر گیا۔ اس کے جاتے ہی میتھیوز تیزی سے ٹرک کے نیچے سے نکل کر احاطے میں بکھری مشینوں کے درمیان گھس گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے یہاں سے نکل کر سڑک تک جانا چاہیے تاکہ پولیس آجائے تو وہ اس کی راہنمائی کر سکے۔ اگر اس سے پہلے ڈرائیور اسے پالیتا تو یقیناً قتل کر دیتا۔

لیکن پہلے وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ڈرائیور کیا کرتا ہے۔ کچھ دیر بعد کیبن کا دروازہ پھر کھلا اور ٹرک ڈرائیور ایک لڑکی کو لے کر باہر نکلا۔ وہ اسے دھکے دیتا ہوا ٹرک کی طرف لا رہا تھا۔ لڑکی بے چاری لڑکھڑا رہی تھی اور کراہ رہی تھی۔ میتھیوز نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جس کی زبان کاٹ دی گئی تھی۔ ڈرائیور نے اسے زبردستی ٹرک کے کیبن میں سوار کرایا اور پھر خود بھی سوار ہو گیا۔ وہ کہیں جا رہا تھا لیکن کچھ دیر بعد وہ اترا اور کیبن کی طرف جانے لگا۔ میتھیوز کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیبن کی طرف کیوں گیا ہے۔ اچانک اسے چابیوں کے اس گچھے کا خیال آیا جو اس نے ڈرائیور کے لباس سے نکالا تھا۔ ٹرک کی چابی بھی یقیناً اسی میں تھی اور ڈرائیور چابی لینے ہی اندر گیا تھا۔ گویا اسے ابھی تک چابی اور موبائل کی گمشدگی کا احساس نہیں ہوا تھا۔

میتھیوز کو ایک خیال آیا اور وہ ٹرک کی طرف بھاگا۔ اس نے ٹرک کا دروازہ کھولا اور اندر گھس گیا۔ لڑکی پہلے ڈری پھر اسے دیکھ کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ میتھیوز نے جلدی سے اگنیشن میں چابیاں لگا کر چیک کرنا شروع کیں مگر جلد اسے پتا چل گیا کہ ان چابیوں میں ٹرک کی چابیاں نہیں ہیں۔ یہ چابیاں پنجرے کے تالے میں بھی نہیں لگی تھیں یعنی اس کے لیے بے کار تھیں۔ یہ شاید کہیں اور کی چابیاں تھیں۔ میتھیوز نے لڑکی سے کہا۔ ”میں نے پولیس کو اطلاع کر دی ہے۔ وہ آتی ہوگی۔ تم حوصلہ رکھنا، تم سب کو آزاد کرا لیا جائے گا۔“

اس نے ٹرک سے اترنا چاہا۔ اسی لمحے ٹرک ڈرائیور کیبن سے نکلتا نظر آیا۔ میتھیوز جلدی سے نیچے ہو گیا۔ پھر اسی طرح جھکے جھکے دوسرے دروازے کی طرف کھسکا۔ اسے لڑکی کے اوپر سے گزرنا پڑا تھا۔ وہ دروازہ کھولتے ہوئے دوسری طرف اتر گیا اور پھر دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔ اس نے جھک کر دیکھا، ڈرائیور کی ٹانگیں ٹرک کے پاس نظر آرہی تھیں۔ اس طرف میدان تھا اور وہ بھاگتا تو ڈرائیور کی نظر میں آسکتا تھا۔ وہ جلدی سے ٹرک کے نیچے گھسا اور رینگتا ہوا پیچھے کی طرف جانے لگا۔ ڈرائیور ٹرک میں چڑھا۔ میتھیوز کا خیال تھا کہ وہ ٹرک اسٹارٹ کرے گا اور یہاں سے نکل جائے گا مگر کچھ دیر بعد وہ دوبارہ اترا اور کیبن کی طرف جانے لگا۔ اس بار وہ یقیناً موبائل لینے جا رہا تھا۔

موقع غنیمت جان کر میتھیوز ٹرک کے نیچے سے نکلا اور بھاگ کر مشینوں کے درمیان گھس گیا۔ وہ ایک بلڈوزر کے بلیڈ سے ٹک کر ہانپنے لگا۔ اچانک ہی وہ اچھل پڑا۔ اس کے لباس سے ایک آواز آئی۔ اصل میں موبائل فون کی بیل بجی تھی۔ اس نے جلدی سے موبائل نکالا، اس پر کال آرہی تھی۔ اس نے عادت کے مطابق بے ساختہ کال ریسیو کر لی اور موبائل کان سے لگایا۔

”تم کون ہو؟“ دوسری طرف سے کسی نے کھردری آواز میں کہا۔ ”تم نے موبائل کیسے لیا؟“

میتھیوز کانپ اٹھا۔ یہ ٹرک ڈرائیور ہی تھا اور اسے کسی دوسرے موبائل سے کال کر رہا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ یہاں کوئی ہے جس نے اس کا موبائل چرایا ہے۔ اس نے جلدی سے کال منقطع کر دی اور پھر موبائل بند کر دیا۔ اگر وہ پھر کال کرتا تو موبائل کی بیل سن کر اس تک پہنچ جاتا۔ اسی لمحے کیبن کا دروازہ کھلا اور ٹرک ڈرائیور باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں شاٹ گن تھی۔ اسے دیکھتے ہی میتھیوز ملبے میں پیچھے سرکنے لگا۔ یہاں ملبا خاصا تھا لیکن اس میں چھپنے کی گنجائش کم تھی اور وہ کوشش کرتا تو پکڑا جاتا۔ ڈرائیور سب سے پہلے انہی جگہوں کا معائنہ کرتا۔ اس کی عافیت اسی میں تھی کہ وہ اس سے دور رہے اور احاطے سے نکلنے کی کوشش کرے۔ وہ پیچھے سرکنے لگا لیکن اگر وہ باہر جانا چاہتا تو اسے لازمی طور پر گیٹ کا رخ کرنا پڑتا اور ڈرائیور اسے گیٹ کی طرف جانے نہیں دیتا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ وہ خاردار تاروں کی پروا کیے بغیر ان پر چڑھ کر دوسری طرف کود جائے۔ مگر ایک تو تار اسے بری طرح زخمی کر سکتے تھے، دوسرے تاروں پر چڑھنے کے دوران میں وہ ڈرائیور کے لیے آسان نشانہ بن جاتا۔ وہ اسے گولی مار دیتا۔ وہ بڑی مشکل میں پڑ گیا تھا اگر وہ کال ریسیو کرنے کے بجائے موبائل احاطے سے دور کہیں پھینک دیتا تو ڈرائیور کو شاید یہ شک نہ ہوتا کہ کوئی یہاں موجود ہے۔

ڈرائیور ملبے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میتھیوز اس سے دور رہنے کے لیے بڑی آہستگی سے حرکت کر رہا تھا کہ کوئی آہٹ نہ ہو۔ ٹرک ڈرائیور کے کان کسی آہٹ پر بھی لگے ہوں گے۔ وہ ملبے میں داخل ہوا اور اس نے انگریزی میں کہا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ تم یہاں ہو اور میں تمہیں جلد تلاش کر لوں گا۔“

پہلے میتھیوز کو حیرت ہوئی کہ اسے کیسے معلوم ہوا کہ وہ

www.pkdigest.com

انگریز ہے جو وہ اس سے انگریزی میں بات کر رہا ہے۔ پھر اسے احساس ہوا کہ بولنے والا انگریز ہی ہے، یعنی یہ اس کی مادری زبان تھی اور ہنگامی حالات میں ہر شخص مادری زبان ہی استعمال کرنے لگتا ہے۔ کتنا عجیب اتفاق تھا کہ وطن سے ہزاروں میل دور وہ اپنے ایک ہم نسل کے ہاتھوں مشکل سے دوچار تھا اور وہ اس کے ہاتھ آجاتا تو وہ اس کے ہم زبان ہونے کا قطعی لحاظ نہیں کرتا اور اسے قتل کر دیتا۔

میتھیوز پیچھے ہٹتا جا رہا تھا جبکہ ٹرک ڈرائیور ملبے میں اس کا کھوج لگا رہا تھا۔ اچانک ہی وہ میتھیوز کی نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ اسے خطرے کا احساس ہوا۔ ٹرک ڈرائیور اب چھپ کر اسے تلاش کر رہا تھا اور وہ اچانک ہی کسی طرف سے نمودار ہو سکتا تھا۔ میتھیوز نے محسوس کیا کہ اسے جان بچانے کے لیے کچھ کرنا پڑے گا۔ اس نے ایک پتھر لیا اور اسے احاطے میں جلنے والے واحد بلب پر دے مارا۔ اس کا نشانہ خطا گیا اور پتھر کہیں نرم مٹی پر گرا اس لیے آواز نہیں آئی۔ البتہ دوسرا پتھر بڑے زور سے کسی لوہے کی چیز سے لگا اور آہنی جھنکار سے پورا احاطہ گونج اٹھا۔ فوراً ہی ٹرک ڈرائیور کی طرف سے ردِعمل ہوا اور وہ ایک جگہ سے نکل کر اس طرف لپکا۔ میتھیوز دبک گیا۔ پھر ٹرک ڈرائیور کو بھی احساس ہو گیا کہ اسے بے وقوف بنایا گیا ہے۔ اس کی پشت میتھیوز کی طرف تھی۔ اس نے ہمت کر کے ایک کوشش اور کی اور پتھر بلب پر دے مارا۔ خوش قسمتی سے اس بار نشانہ درست لگا اور ایک دھماکے سے بلب پھٹ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ٹرک ڈرائیور نے پلٹ کر پیچھے کی طرف فائر کیا۔ میتھیوز اس سے پہلے ہی زمین پر گر گیا۔ پھٹ جانے والے بلب سے پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں، وہ بجھیں تو احاطے میں تقریباً تاریکی چھا گئی۔

اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر میتھیوز دوبارہ ملبے میں گھس گیا۔ ٹرک ڈرائیور غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے گالیاں دیتے ہوئے میتھیوز کو دھمکی دی کہ وہ اسے دیکھتے ہی قتل کر دے گا۔ وہ اس احاطے میں اس کی نظروں سے زیادہ دیر اوجھل نہیں رہ سکے گا۔ وہ ٹرک کی طرف گیا۔ اس بار میتھیوز کو اس سے اتنا خوف محسوس نہیں ہوا۔ اس کامیابی نے اس کا حوصلہ بڑھا دیا تھا۔ وہ کسی اور ترکیب پر غور کر رہا تھا جس کی مدد سے اس پر قابو پا سکے۔ وہ ملبے میں ذرا دور گیا اور اس نے موبائل نکال کر اسے آن کیا اور اس نمبر پر کال کی جس سے ڈرائیور نے اسے کال کی تھی۔ جیسے ہی بیل گئی، اسے رنگ ٹون کی آواز آئی اور اس نے پھرتی سے موبائل بند کر دیا۔ ڈرائیور ٹرک سے ٹارچ لے کر آیا۔ اب وہ اسے اس کی روشنی میں تلاش کرتا۔ میتھیوز اس کی حرکت کو مدِنظر رکھ کر خود بھی حرکت کر رہا تھا۔ بلب ٹوٹنے سے اسے یہ آسانی ہو گئی تھی کہ اب ڈرائیور اس کی نظر سے اوجھل نہیں ہو سکتا تھا۔ ٹارچ کی روشنی اس کی نقل و حرکت کا پتا دے رہی تھی۔ روشنی کے بغیر وہ اسے تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ میتھیوز سوچتے ہوئے حرکت کرتا رہا۔ اس کی کوشش تھی کہ ٹرک ڈرائیور سے زیادہ سے زیادہ دور رہے۔ لوہے کا زنگ خوردہ پائپ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے اسے دیکھا اور سوچا کہ کیا وہ اس کی مدد سے ایک مسلح بدمعاش کا مقابلہ کر سکے گا؟

ٹرک ڈرائیور اس وقت ملبے کے درمیان کہیں حرکت کر رہا تھا۔ اچانک ہی اس کے موبائل پر پھر کال آئی، اس نے موبائل نکال کر دیکھا۔ کال کٹ گئی اور اس نے جوابی کال ملائی۔ فوراً ہی بیل جانے لگی۔ وہ مسکرایا کیونکہ ملبے میں سے ہی بیل کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اس طرف بڑھا۔ آواز ایک بلڈوزر کے اندر سے آ رہی تھی۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں رائفل سامنے کر کے اس طرف بڑھا۔ وہ فائر کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ پاس آتے ہی وہ تیزی سے گھوما تو اس نے بلڈوزر کی سیٹ پر اپنا موبائل دیکھا۔ اس کی بیل بج رہی تھی اور وہاں کوئی نہیں تھا۔

میتھیوز مخالف سمت میں تھا۔ وہ ایک بڑے سے بکس کی آڑ میں تھا اور بالکل تیار بیٹھا تھا۔ جیسے ہی ٹرک ڈرائیور بلڈوزر کے سامنے آیا، اس نے پشت سے اس کے سر پر وار کیا۔ ڈرائیور کراہا اور نیچے جھکا۔ میتھیوز نے جوش میں دوسرا وار کیا تو... اس بار ڈرائیور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ میتھیوز نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ایک عدد وار اور کر دیا۔ پھر اس نے جھپٹ کر نیچے گری ہوئی رائفل اور ٹارچ اٹھائی۔ روشنی میں ٹرک ڈرائیور کو دیکھا تو اس کا سر خون آلود ہو رہا تھا۔ اس نے وار خاصی قوت سے کیے تھے۔ ایک تو اسے غصہ تھا اور دوسرے اسے ٹرک ڈرائیور کی طاقت کا احساس تھا۔ وہ اسے یقینی طور پر بے ہوش کرنا چاہتا تھا۔ اس کے سر سے خون نکلتے دیکھ کر اسے خدشہ ہوا کہ وہ مر ہی نہ جائے۔ صرف وہی بتا سکتا تھا کہ ایلن کہاں ہے۔

میتھیوز نے موبائل اٹھایا اور کال کاٹ کر ایمرجنسی کا نمبر ملایا۔ رابطہ ہونے پر جیسے ہی اس نے انگریزی میں بات کی، وہی آپریٹر لائن پر آ گیا۔ "تم نے موبائل کیوں بند کیا ہے؟"

"میں اس وقت اس شخص سے لڑ رہا تھا۔" میتھیوز نے اسے بتایا۔ "اب میں نے اس پر قابو پا لیا ہے۔ پولیس کہاں ہے؟"

"ہماری پٹرول ٹیم اس علاقے میں پہنچ گئی ہے۔"

"پولیس کے ساتھ ایمبولینس بھی بھیجو، یہ زخمی ہے... کہیں مر نہ جائے۔ میری گرل فرینڈ کے بارے میں صرف اسے ہی پتا ہے۔"

"کیا تم کسی طریقے سے اس جگہ تک پولیس کی راہنمائی کر سکتے ہو؟" پولیس آپریٹر نے پوچھا۔

"میرے پاس ایک شاٹ گن ہے۔ کیا میں اس سے فائر کر کے پولیس کی راہنمائی کروں؟" اس نے اجازت طلب کی۔

"بالکل... فائر کرو پھر میں تصدیق کرتا ہوں۔"

میتھیوز نے رائفل بلند کر کے فائر کیا تو کچھ دیر بعد آپریٹر نے تصدیق کی۔ "پولیس نے فائر سن لیا ہے... وہ اسی طرف آ رہی ہے۔"

میتھیوز نے ٹرک ڈرائیور کا جائزہ لیا۔ اس جدوجہد نے اس کی ساری توانائی جیسے نچوڑ لی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پر لیٹ جائے اور پولیس کے آنے کا انتظار کرے۔ لیکن ابھی اسے ان مظلوم لڑکیوں کو پنجروں سے نکالنا تھا۔ اس نے ڈرائیور کے ہاتھ پیر ایک تار کی مدد سے کس کر باندھ دیے تاکہ وہ ہوش میں... آ بھی جائے تب بھی آزاد نہ رہے۔ تار اسے وہیں پڑا مل گیا تھا۔ اس کے بعد وہ ٹرک تک آیا۔ اس نے اندر موجود لڑکی کو سہارا دے کر اتارا اور بولا۔

"فکر مت کرو... میں نے اس پر قابو پا لیا ہے اور پولیس بھی آنے والی ہے۔"

لڑکی مارے خوشی کے رونے لگی۔ میتھیوز اسے لے کر کیبن میں آیا اور اس نے باقی دو لڑکیوں کو بھی پنجروں سے نکالا۔ اس کے لیے اسے تالے توڑنا پڑے تھے۔ ان میں سے ایک لڑکی فرانسیسی تھی اور دوسری اسپینش۔ انہیں انگریزی نہیں آتی تھی۔ گونگی لڑکی کو انگریزی سمجھ میں آتی تھی لیکن وہ بول نہیں سکتی تھی۔ میتھیوز نے ایک بار پھر ان سے ایلن کے بارے میں پوچھا۔ دوسری لڑکیوں سے اشارے کی زبان میں پوچھا۔ مگر ان میں سے کسی کو ایلن کے بارے میں نہیں معلوم تھا۔ گونگی لڑکی نے اشارے سے بتایا کہ ٹرک ڈرائیور اکیلا آیا تھا، اس کے ساتھ کوئی لڑکی نہیں تھی۔ میتھیوز کے خدشات بڑھ گئے۔ ٹرک ڈرائیور نے نہ جانے ایلن کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر برابر والا کیبن روشن کر کے دیکھا۔ پھر وہ باہر آیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ بے ہوش ڈرائیور کا سر اڑا دے۔ لیکن وہ ایک قانون پسند شخص تھا اور قانون اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا تھا۔ دوسرے ایلن کے بارے میں صرف وہی بتا سکتا تھا۔

کچھ دیر میں پولیس آ گئی اور اس نے سارے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ جب میتھیوز اور لڑکیوں کو مقامی پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچایا گیا تو صبح ہو چکی تھی۔ تھکن سے میتھیوز کا برا حال تھا لیکن ابھی اسے بیان دینا تھا۔ مرہم پٹی کے بعد ٹرک ڈرائیور بھی پولیس اسٹیشن آ گیا تھا۔ میتھیوز نے اس کے سامنے ہی بیان دیا۔ پھر اس نے الزام لگایا کہ ڈرائیور نے ایلن کو اغوا کیا ہے لیکن ڈرائیور نے اس الزام سے انکار کر دیا۔ "بکواس کرتا ہے یہ... میں نے کسی لڑکی کو اغوا نہیں کیا جس کا یہ ذکر کر رہا ہے۔"

اس کی بات سن کر میتھیوز چلّا اٹھا۔ "یہ بکواس کرتا ہے... اسی نے ایلن کو اغوا کیا ہے اور نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔"

"یہ غلط ہے، میں نے تمہاری گرل فرینڈ کو چھیڑا ضرور تھا لیکن اسے اغوا نہیں کیا۔" ڈرائیور سکون سے بولا۔

"بکتے ہو تم... اسے قتل کر دیا ہے تم نے..." میتھیوز اس کی طرف جھپٹا لیکن فوراً ہی دو پولیس والوں نے اسے قابو کر لیا۔ میتھیوز رونے والا ہو رہا تھا۔ اسی لمحے اسے ایلن کی آواز سنائی دی۔

"میتھیوز! میرے خدا، تم یہاں ہو۔"

میتھیوز چونکا اور ایلن کو صحیح سالم کھڑے دیکھ کر پہلے تو خوشی سے دنگ رہ گیا پھر اس کی طرف جھپٹا۔ "میرے خدا! تم زندہ ہو؟"

"ہاں، میں زندہ ہوں۔" ایلن نے زہریلے لہجے میں کہا اور اچانک ہی اسے تھپڑ مارا۔ "تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے، میں تمہیں آوازیں دیتی رہ گئی۔"

میتھیوز ایک بار پھر دنگ رہ گیا۔ "چھوڑ کر... لیکن کہاں؟"

"کیفے میں اور کہاں؟" ایلن غصے میں تھی۔ "تم چابی لینے گئے تو میری طبیعت اچانک خراب ہوئی اور مجھے الٹی آنے لگی۔ میں کار سے اترنے لگی تو عجلت میں میرا ہار بھی پھنس کر ٹوٹ گیا۔ میں واش روم چلی گئی اور جب واپس آئی تو تم جا رہے تھے۔ میں نے آواز بھی دی لیکن تم نے سنا نہیں۔ پہلے میں سمجھتی رہی کہ تم مذاق کر رہے ہو لیکن تم تو پلٹ کر واپس ہی نہیں آئے۔ آخر تم کہاں چلے گئے تھے؟"

"میں..." میتھیوز نے بمشکل کہا۔ "میں تو سمجھ رہا تھا کہ یہ تمہیں اغوا کر کے لے گیا ہے۔" اس نے ٹرک ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا۔

ایلن نے اسے دیکھا اور چونکی پھر اس نے میتھیوز کا معائنہ کیا۔ اس کا حلیہ خراب ہو رہا تھا اور وہ زخمی بھی تھا۔ ایلن پریشانی سے بولی۔ "یہ کیا چکر ہے؟"

www.pkdigest.com

''ادھر آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں لیکن یہ بتاؤ کہ تمہیں کس نے بتایا کہ میں اس پولیس اسٹیشن میں ہوں؟'' میتھیوز اسے ایک بنچ کی طرف لے جاتے ہوئے بولا۔

''کسی نے نہیں۔ میں نے کینٹے سے پولیس کو کال کی تھی اور یہ ضروری کارروائی کے لیے مجھے یہاں لائے تھے۔ برٹش سفارت خانے کو اطلاع کر دی گئی ہے اور ان کا آدمی بھی آنے والا ہوگا۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' میتھیوز نے کہا۔ پھر وہ اسے ساری کہانی سنانے لگا کہ اس نے ایک غلط فہمی کی بنا پر کس طرح اپنی جان داؤ پر لگا دی تا کہ اپنے طور پر ایلین کو اس کے قبضے سے چھڑا سکے۔ ایلین دم بخود سی اس کی کہانی سن رہی تھی پھر اس نے بات مکمل کی تو ایلین مارے جوش کے اس سے لپٹ گئی۔

''میں بہت شرمندہ ہوں میں تمہیں غلط سمجھ رہی تھی اور تم مجھ سے اتنی محبت کرتے ہو کہ میرے لیے جان کی بازی لگانے سے دریغ نہیں کیا۔''

''ہاں، غلط فہمی میں سہی۔'' میتھیوز ہنسا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تمہیں اس نے اغوا نہیں کیا لیکن اس نے دوسری کئی لڑکیوں کو اغوا ضرور کیا ہے۔ اس نے ایک آدمی کو قتل بھی کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اسے لمبی سزا ملے گی۔''

ایلین خوف زدہ ہو گئی۔ اس نے جھرجھری لی۔ ''شکر ہے ایسا نہیں ہوا ورنہ یہ مجھے کچھ نہ بھی کہتا، تب بھی میں شاید خوف سے ہی مر جاتی۔''

دونوں کا تھکن سے برا حال تھا اور فی الحال وہ یہاں سے جا بھی نہیں سکتے تھے۔ اس لیے پولیس نے انہیں ایک ہوٹل میں ٹھہرا دیا۔ میتھیوز کی کار تلاش کر لی گئی تھی اور اسے پولیس اسٹیشن لایا جا رہا تھا۔ ہوٹل کے کمرے میں انہیں گرم بستر ملے تو وہ ایسا سوئے کہ پھر ایک پولیس آفیسر نے آکر انہیں جگایا۔ وہ ان کی کار اور دوسرا سامان لے کر آیا تھا۔ اس نے اس سارے کیس کے بارے میں میتھیوز کا حتمی بیان لیا اور اسے بتایا کہ ممکن ہے اسے ایک بار عدالت میں پیش ہونا پڑے۔

''لیکن ہم تو آگے جائیں گے۔'' میتھیوز نے پریشان ہو کر کہا۔

''تم فکر مت کرو، تمہارا بیان کل صبح لے لیا جائے گا اور اس کے بعد تم جا سکو گے۔ تمہاری مدد سے ہم نے ایک بہت خطرناک گروہ کا پتا چلا لیا ہے اور ابھی اس ٹرک ڈرائیور کے دوسرے ساتھیوں کو تلاش کرنے کے لیے چھاپے مارے جا رہے ہیں۔''

''میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس شخص نے ان بے چاری لڑکیوں کو اس طرح پنجروں میں کیوں بند کر رکھا تھا اور ایک لڑکی کی تو زبان بھی کاٹ دی تھی۔''

''ہم نے سب معلوم کر لیا ہے۔'' پولیس آفیسر نے کہا۔ ''یہ ایک گروہ ہے جو یورپ بھر سے لڑکیاں اغوا کر کے انہیں مشرقی یورپ کے راستے رشین فیڈریشن اسمگل کرتا ہے اور وہاں ان لڑکیوں کو غلام کے طور پر دولت مند افراد اور قحبہ خانوں کا کاروبار کرنے والوں کو بیچ دیا جاتا ہے۔ یہ کام یہ لوگ جانوروں کی نقل و حرکت کی آڑ میں کرتے ہیں۔ یہ کنٹینرز میں سامنے کی طرف تو جانوروں کے پنجرے رکھتے ہیں لیکن ان کے عقب میں پنجروں میں لڑکیاں بند ہوتی ہیں۔ انہیں عام طور سے ہاتھ پاؤں اور منہ بند کر کے اسمگل کیا جاتا ہے۔ پچھلے دنوں مشرقی یورپ کے کچھ ملکوں میں ہائی ویز کے ساتھ نوجوان لڑکیوں کی ایسی لاشیں ملی ہیں جو دم گھٹنے سے مری تھیں۔ انہیں بھی شاید یہی لوگ لے جا رہے تھے۔''

ایلین کانپ گئی۔ ''میرے خدا! اتنی درندگی... میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ آج کے دور میں بھی یہ وحشیانہ کام ہوتا ہے۔''

''دولت کے لالچ میں انسان سب کرتا ہے۔ فی الحال تو ہمارے پاس یہ ٹرک ڈرائیور ہے اور اس نے لڑکیوں کی اسمگلنگ اور ڈرائی پورٹ پر گارڈ کے قتل کا اعتراف کر لیا ہے۔ مگر مجھے امید ہے کہ جلد ہم اس کے سارے گروہ کو سلاخوں کے پیچھے پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

''اس بے چاری لڑکی کی زبان کیوں کاٹ دی گئی؟'' میتھیوز نے سوال کیا۔

''یہ کام بھی اسی ٹرک ڈرائیور نے کیا ہے۔ وہ اسے جرمنی سے لایا ہے اور راستے میں لڑکی نے ایک جگہ خود کو آزاد کرا کے شور مچایا تھا اس لیے اس نے سزا کے طور پر اس کی زبان ہی کاٹ دی۔''

''ایسے وحشیوں کو سخت سے سخت سزا ملنی چاہیے۔'' میتھیوز بولا۔

''تم فکر مت کرو، انسانوں کے خلاف جرائم کی پولینڈ میں بہت سخت سزائیں ہیں۔ کم سے کم اس ٹرک ڈرائیور کو ساری عمر جیل سے باہر آنے کا موقع نہیں ملے گا۔'' پولیس آفیسر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''میرے ساتھ چل کر اپنی گاڑی اور سامان چیک کر لو۔'' پولیس آفیسر کے ساتھ جاتے ہوئے میتھیوز خوش تھا کہ اس نے انجانے میں سہی لیکن ایک خطرناک گروہ کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ چند دن میں وہ ہیرو بن جائے گا۔

☆

انتقام

تنویر ریاض

سراغ رسانی... تفتیش و تحقیق دماغ سوزی کا نچوڑ ہے... بسا اوقات تمام ثبوت و حقائق کھلی کتاب کی مانند عیاں ہوتے ہیں... اس کے باوجود قاتل نظروں سے اوجھل رہتا ہے... کواکب کچھ اور ہی کتھا سنا رہے ہوتے ہیں

ایک انوکھے طریقہ واردات سے تعلق رکھنے والی کچا انتقام کہانی

دور سے دیکھنے میں وہ ایک کشتی ہی لگ رہی تھی لیکن یہ اس کی آنکھوں کا دھوکا بھی ہو سکتا تھا۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں اس نے اپنی نظریں اسی نکتے پر مرکوز کر دیں پھر روشنی معدوم ہو گئی۔ اسے اپنی دادی اماں کی یاد آ گئی جو کہا کرتی تھیں کہ پانی میں روشنی نظر آئے تو سمجھو وہ جل پری ہے۔ جیویئر کا تجسس بڑھ گیا اور اس کے قدم آگے کی طرف بڑھنے لگے۔ سمندر میں طوفان کی سی کیفیت تھی اور بپھری ہوئی لہریں کشتی کو ایک کھلونے کی طرح اچھال رہی تھیں۔ جیویئر نے اپنے وزنی جسم کے ذریعے توازن قائم کرنے کی کوشش کی۔ اچانک ہی تیز ہوا کا جھونکا آیا اور اس کا چہرہ سمندر کے نمکین پانی سے تر ہو گیا۔ اس نے چپو پر اپنی گرفت مضبوط کی اور کنارے کی طرف بڑھنے لگا۔

اسے ساحل کی سیر کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن صبح ہوتے ہی ریویرا نے اس کے دروازے پر دستک دی اور اسے مطلع کیا۔ جیویئر نے ناشتا چھوڑا..... اور جلدی جلدی یونیفارم چڑھا کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ راستے میں ایک جگہ رک کر کافی اور رول لیے۔ دس منٹ بعد وہ اس جگہ پہنچ چکے تھے جہاں کشتی کھڑی تھی۔ اس کا اگلا سرا ریت میں دھنسا ہوا جبکہ پچھلا حصہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کشتی تقریباً چالیس فٹ طویل تھی جس میں ایک کیبن اور ریلنگ بھی موجود تھی۔ کشتی کا

www.pkdigest.com

بادبان گرادیا گیا تھا اور لکڑی کے گرد لپٹا ہوا تھا۔

ریویرا نے رپورٹ دیتے ہوئے کہا۔ ”اس کشتی کو سب سے پہلے بوڑھے مچھیرے پنٹن نے صبح سات بجے کے قریب دیکھا تھا۔ اس نے کشتی کو کنارے سے باندھا اور دیکھا کہ اندر ایک لڑکی کی لاش پڑی ہے۔ وہ سیدھا پولیس اسٹیشن گیا اور آٹھ بجے تک میرے آنے کا انتظار کرتا رہا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ وہ نشے میں ہے لیکن جب وہ مجھے لے کر یہاں آیا تو میں نے تمہیں اطلاع دینے میں لمحہ بھر کی بھی دیر نہیں لگائی۔ باقی تم خود ہی دیکھ لو۔“

ریویرا نے ایک کمزور سی سیڑھی کشتی کی دیوار کے ساتھ لگائی کیونکہ اس وقت وہی دستیاب تھی اور اسے اچھی طرح جھاڑنے کے بعد مضبوطی سے پکڑ لیا تاکہ جیویئر اس کے ذریعے کشتی تک پہنچ سکے۔ سب سے پہلے اس کی نظر مچھلی پکڑنے کے سامان پر گئی جو بڑی بے پروائی سے وہاں پڑا تھا۔ جیویئر کو اس کی قیمت کا اندازہ تھا جو کسی طرح بھی اس کی سال بھر کی تنخواہ سے کم نہ ہوگی۔ ریویرا بھی اس کے پیچھے پیچھے کشتی پر پہنچ گیا۔ وہ دونوں ڈیک سے ہوتے ہوئے کیبن تک گئے جہاں فرش پر انہیں ایک کھلا ہوا بیگ نظر آیا جس میں کچھ جینز اور ٹی شرٹس وغیرہ رکھی ہوئی تھیں۔ جیویئر نے سامان کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو اس کی نگاہ ایک پاسپورٹ پر گئی جس پر جیفری کیسیڈی کا نام لکھا ہوا تھا۔ عمر چھبیس سال اور جا میامی کا تھا۔

وہ واپس ڈیک پر آئے جہاں شاہ بلوط کے تختے پر انہیں ایک مچھلی کی باقیات نظر آئیں۔ ریلنگ کے ساتھ تقریباً دس فٹ تک قدموں کے نشانات تھے جیسے کوئی لڑکھڑا کر چل رہا ہو۔ جیویئر ان نشانات کی سمت میں آگے بڑھتا گیا۔ تبھی اسے ریویرا کی آواز سنائی دی۔ ”جیویئر! لاش ڈیک کے نیچے ہے۔“

ایک تیز لہر نے کشتی کا رخ موڑ دیا… جیویئر سیڑھیوں کی طرف لپکا اور لاش تک پہنچ گیا جو کیبن کے نیلے قالین پر اوندھی پڑی تھی۔

”واقعی بہت خوب صورت ہے۔“ ریویرا نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

سیاہ لمبے بالوں اور سانولی رنگت والی لڑکی دیکھنے میں ڈومینکین لگ رہی تھی۔ اس کا وزن لگ بھگ 120 پاؤنڈ ہوگا ہرے رنگ کے سویٹر اور گرے پینٹ میں اس کے جسمانی خدوخال پوری طرح نمایاں تھے۔ اس نے ربر کے جوتے پہن رکھے تھے اور ایک پاؤں میں سرخ اور دوسرے میں سیاہ رنگ کا موزہ تھا۔

جیویئر گھٹنوں کے بل جھکا اور عورت کے چہرے سے بال ہٹا کر دیکھنے لگا۔ وہ واقعی بہت خوبصورت تھی اور اس کی عمر بمشکل بیس سال سے کچھ ہی زیادہ ہوگی۔

”تمہارے خیال میں اسے کس طرح قتل کیا ہوگا؟“ ریویرا نے پوچھا۔ ”مجھے تو کوئی نشان یا خون نظر نہیں آرہا۔“

جیویئر نے لاش کا بغور معائنہ کیا پھر آہستہ سے اس کا سر اوپر اٹھایا اور اس کے نچلے حصے کو دیکھنے لگا۔ اسے کوئی نشان نظر نہ آیا۔ البتہ سر کا پچھلا حصہ تھوڑا سا ابھرا ہوا تھا۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”سر کے دائیں جانب چوٹ کا نشان ہے۔ لگتا ہے فرش پر ٹکرانے سے اندرونی چوٹ آئی ہے۔“

عورت کے سر کے پاس ایک تولیا اور چند فٹ کے فاصلے پر شیمپین کی ٹوٹی ہوئی بوتل پڑی تھی جس کی تہ میں تھوڑی سی شراب موجود تھی۔ جیویئر نے سیلون کا بغور جائزہ لیا۔ وہاں ایک میز کے گرد دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں اور کمرے کی لمبائی کے ساتھ ایک بار بنا ہوا تھا۔ وہاں بھی کئی خالی بوتلیں بکھری پڑی تھیں۔ تقریباً نصف درجن گلاس، خالی پلیٹیں اور سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ایش ٹرے بھی وہاں موجود تھی۔

دوسرے کمرے میں انہیں مردانہ اور زنانہ کپڑے نظر آئے۔ مردانہ کپڑوں کا سائز مختلف تھا جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہ دو مردوں کے زیر استعمال رہے ہوں گے۔ جیویئر نے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ اس کشتی میں عورت کے ساتھ دو مرد بھی تھے۔ تم پوری کشتی کو غور سے دیکھو ممکن ہے کہ مزید معلومات حاصل ہوسکیں۔“

جیویئر نے بستر کا جائزہ لیا۔ تکیے کے نیچے سے اسے پچاس ڈالر کا نوٹ ملا۔ اس نے چپکے سے وہ نوٹ اپنی جیب میں ڈال لیا۔ بستر کے ساتھ ہی ایک بڑا تھیلا اور پلاسٹک بیگ بھی رکھا ہوا تھا جس پر ایک بڑے شو اسٹور کا لوگو بنا ہوا تھا۔ اس نے تھیلے کو بغور دیکھا جو عورت کے کپڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ البتہ اس میں کچھ مردانہ قمیصیں بھی تھیں۔ ان کا سائز دوسرے مردانہ کپڑوں کے مقابلے میں چھوٹا تھا۔ اس نے پلاسٹک بیگ کو بستر پر الٹا کر دیا۔ اس میں سے امریکن کرنسی کے ساتھ ٹوٹے ہوئے گلاس کے ٹکڑے بھی برآمد ہوئے۔ وہ سب سو اور پچاس کے نوٹ تھے اور ان کی مالیت تین ہزار ڈالرز تھی۔ ایک ڈرائیونگ لائسنس بھی تھا جو اسپرلڈا ہرنانڈیز کے نام پر جاری ہوا تھا اور اس پر لگی ہوئی تصویر اسی مرنے والی لڑکی کی تھی۔

اس بیگ میں کئی تصویریں بھی تھیں جو گزشتہ ماہ کے دوران سانتو ڈومینگو اور مختلف شمالی ساحلوں پر کھینچی گئی تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر تصویروں میں اسپرلڈا دو مردوں کے ساتھ نظر آرہی تھی۔ ان کی عمریں تیس اور پینتیس کے درمیان تھیں۔ ان میں ایک کا قد دوسرے کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ لمبے آدمی کی تصویر جیفری کیسیڈی سے مل رہی تھی جس کا پاسپورٹ انہیں وہاں ملا تھا۔ دوسرے آدمی کی تصویر بھی جانی پہچانی لگ رہی تھی۔

ریویرا واپس آیا اور کہنے لگا۔ ”میں نے پوری کشتی دیکھ لی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ملا۔“ پھر اس کی نظر بستر پر گئی اور وہ بے اختیار بول اٹھا۔ ”اوہ میرے خدا! اتنے سارے پیسے۔“

جیویئر نے سو ڈالر کا ایک نوٹ اسے دیا اور دوسرا اپنی جیب میں رکھا اور تمام چیزیں دوبارہ پلاسٹک بیگ میں ڈال دیں اور بولا۔ ”تمہیں وہ میچ یاد ہے جس کے آخری گیم میں سامی سوس ہار گیا تھا؟“

”ہاں لیکن مجھے اس کے مدمقابل کا نام یاد نہیں آرہا۔“

جیویئر نے اسے ایک فریم شدہ تصویر پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”جمی کیسیڈی۔“

ریویرا آنکھیں پھاڑے اس تصویر کو دیکھتا رہا۔ جیویئر جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔

☆☆☆

جیویئر نے اس واقعے کی اطلاع ہیڈ آفس کو دی تو وہاں سے اس کی توقع کے مطابق جواب آیا کہ کیپٹن موریلو کی آمد سے پہلے کوئی کارروائی نہ کی جائے، وہی اس واقعے کی تحقیقات کرے گا۔ اس کی آمد ایک گھنٹے بعد متوقع تھی جس کا مطلب تھا کہ جیویئر کو سہ پہر میں اونگھنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔ اسی دوران ریویرا چلاتا ہوا اسٹیشن میں داخل ہوا۔

”جیویئر! ہم نے اسے تلاش کرلیا۔“

جیویئر نے نظریں اٹھا کر دیکھا کہ جو ایک لمبے شخص کے ساتھ اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس شخص نے بلیو جینز پہن رکھی تھی اور اس کی قمیص پر جابجا تیل اور گریس کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ وہ آدمی کچھ پریشان نظر آرہا تھا اور لنگڑا کر چل رہا تھا۔ ریویرا نے جھک کر جیویئر کے کان میں سرگوشی کی اور بولا۔ ”یہ جمی کیسیڈی کا بھائی ہے۔

اوسوالڈو نے اسے ایک گھنٹا پہلے گیس اسٹیشن پر دیکھا تھا۔ وہ نشے میں تھا اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے چل رہا تھا۔ چند منٹ بعد کوچو وہاں کوک پینے کے لیے رکا تو اوسوالڈو نے اسے اس کے بارے میں بتایا کیونکہ وہ اسے کچھ مشتبہ سا لگا تھا۔ کوچو نے اس کا پیچھا کیا اور ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے پکڑ لیا۔ میں کشتی میں اس کا پاسپورٹ دیکھ چکا تھا اس لیے پہچاننے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی… یہ رہا اس کا پرس۔“

جیویئر نے پرس کھول کر دیکھا۔ اس میں جیفری کیسیڈی کا لائسنس، دو سو ڈالرز کے مساوی مقامی کرنسی اور نصف درجن کے قریب کریڈٹ کارڈز تھے جن میں سے صرف ایک اس کے نام پر تھا جبکہ بقیہ اس کے بھائی جمی کے تھے۔ جیویئر کو اتنی انگریزی آتی تھی کہ وہ اپنا کام چلا سکے۔ اس نے جیفری کو دیکھا اور بولا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“

ریویرا اس کے لیے پانی کا گلاس لے کر آیا جسے اس نے تین دفعہ میں حلق سے اتارا پھر اس نے جیویئر کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”میرا بھائی کہاں ہے؟“

”کیا تم نہیں جانتے کہ وہ کہاں ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

خواتین و حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں
انگلش لینگویج کورس
بیوٹی پارلر کورس
آٹو سروسنگ
الیکٹریشن
صحافت
فوٹوگرافی
کمپیوٹر
کوکنگ بیکنگ
لیڈیز ٹیلرنگ
آرٹ پینٹنگ
موٹر سائیکل مرمت
اسلام آباد اکیڈمی
1237

''تمہیں معلوم ہے کہ ایمیرلڈا کی موت کیسے واقع ہوئی؟'' جیو یئر نے پوچھا۔

جیفری اس طرح سیدھا ہو کر بیٹھ گیا جیسے کسی نے اسے تھپڑ مار دیا ہو۔ اس نے ایک بار پھر اپنا سوال دُہرایا۔

''میرا بھائی... میرا بھائی کہاں ہے؟''

''ہم نے اسے نہیں دیکھا۔ تم بتاؤ کیا ہوا تھا؟''

''مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں نے بہت زیادہ پی لی تھی اور اس کے بعد سو گیا تھا۔''

''یہ کب کی بات ہے؟''

''کل دوپہر دو بجے کے قریب۔ اسی وقت اس نے ایک مچھلی پکڑی تھی۔''

جیو یئر نے پوچھا۔ ''کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ کس قسم کی مچھلی تھی؟''

''میں مچھلیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ بینی کا ہی شوق ہے۔ اس کے سر کی رنگت زیتونی مائل سبز تھی جبکہ بقیہ حصہ زرد تھا۔ کافی بڑی مچھلی تھی۔''

''ڈورڈو۔'' جیو یئر نے ایک گہری سانس لی۔ مچھلیوں کے بارے میں اسے خاصی معلومات تھیں۔

''بینی نے اسے صاف کر کے پکایا پھر ہم دونوں نے مل کر وہ مچھلی کھائی۔''

''تم نے اس لڑکی کو کھانے میں شریک نہیں کیا؟''

''اسے بھوک نہیں تھی اور اس کے سر میں بھی درد ہو رہا تھا۔ وہ دھوپ سینکنے کے لیے عرشے پر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد تیز ہوا چلنے لگی تو وہ آرام کی غرض سے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے بہت زیادہ پی لی تھی اس لیے سیلون میں ہی صوفے پر سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ میں ایمیرلڈا کو دیکھنے لگا۔ وہ اسی طرح لیٹی ہوئی تھی۔ پہلے تو میں سمجھا کہ سو رہی ہوگی لیکن جب اسے ہاتھ لگایا تو وہ بالکل سرد تھی۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ مر چکی ہے۔''

''اس کے بعد تم نے کیا کیا؟'' جیو یئر نے پوچھا۔

''میں کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر میرے ہوش و حواس گم ہو گئے تھے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ مر چکی ہے، میں اس کے اٹھنے کا انتظار کرتا رہا پھر اچانک ہی کشتی زور زور سے ہچکولے لینے لگی۔ میں نے بینی کو پکارا لیکن وہ وہاں نہیں تھا۔ اس دوران کشتی خشکی پر چڑھ چکی تھی۔ میں نے خوف زدہ ہو کر کشتی سے چھلانگ لگا دی۔''

''کیا تم اپنے ساتھ کچھ لے گئے تھے؟''

''نہیں۔ صرف میرا پرس ہی پتلون کی جیب میں تھا۔''

''تم نے اپنا پاسپورٹ بھی وہیں چھوڑ دیا؟''

''مجھے اس کا خیال ہی نہیں رہا۔''

''کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے بھائی نے کشتی پر کتنی رقم رکھی ہوئی تھی؟'' جیو یئر نے اسے کریدا۔

جیفری کیسیڈی سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ''یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ چند ہزار ڈالرز تو ہوں گے۔ کیا تم جانتے ہو کہ بینی کہاں ہے؟''

''نہیں۔ تمہارے خیال میں وہ کہاں جا سکتا ہے؟''

''اگر مجھے معلوم ہوتا تو تم سے کیوں پوچھتا؟ کوئی بھی شخص اس طرح اچانک غائب نہیں ہو سکتا۔''

''تمہارے پرس میں اس کے کریڈٹ کارڈز کیوں رکھے ہوئے ہیں؟'' جیو یئر نے ایک اور چبھتا ہوا سوال کیا۔

''بینی نے کبھی پسند نہیں کیا کہ ہوٹل کے کلرکوں اور ویٹریس وغیرہ سے ڈیل کرے لہٰذا اس کی جانب سے یہ معاملات میں ہی طے کرتا تھا۔''

''مسٹر جیفری! تمہاری قمیص پر یہ داغ کیسا ہے؟'' جیو یئر نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''معلوم نہیں۔ لگتا ہے کہ کھاتے وقت چکنائی کا دھبا لگ گیا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ خون کا دھبا ہے۔ ہمیں اس کا معائنہ کروانا ہوگا۔''

جیفری نے غور سے قمیص کو دیکھا اور بولا۔ ''ممکن ہے کہ یہ بینی کا خون ہو۔ کل ہم نے ایک دوسرے کو مکے مارے تھے۔ شاید اس کی انگلی سے خون کا قطرہ گر کر میری قمیص پر لگ گیا ہوگا۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔''

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مکے بازی کی نوبت کیوں آئی؟'' جیو یئر نے ایک اور چبھتا ہوا سوال کیا۔ ''شاید تم دونوں اس لڑکی کے لیے لڑ رہے تھے۔ واقعی وہ بہت خوبصورت تھی۔''

''اس کے لیے ایسی باتیں مت کرو۔'' جیفری بے چینی سے بولا۔ ''وہ کوئی ایسی ویسی عورت نہیں تھی۔''

''تم اسے کیسے جانتے ہو؟ وہ تو شاید تمہارے بھائی کی دوست تھی۔''

''پہلے وہ مجھے ملی تھی۔ ہماری ملاقات ایک گارمنٹ اسٹور میں ہوئی جہاں وہ کام کرتی تھی۔ میں نے یہ قمیص وہیں سے خریدی تھی۔ اس کے بعد ہم دو مرتبہ گھومنے گئے لیکن وہ

میرے بھائی سے بھی ملنا چاہتی تھی۔ سبھی لڑکیاں بینی کو پسند کرتی ہیں۔ وہ ایک کھلاڑی جو ہے۔''

''وہ اس کے ساتھ کمرے میں تھی جبکہ تم باہر اکیلے سو رہے تھے۔ تم نے اپنے بھائی سے رقابت محسوس کی اور اسی پر تم دونوں کا جھگڑا ہو گیا ہوگا۔'' جیو یئر نے اپنے طور پر نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہا۔

''تم غلط سمجھ رہے ہو۔'' جیفری نے کمزور سا احتجاج کیا۔ ''لڑائی کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ ہم لوگ گزشتہ چار روز سے کشتی پر مچھلیاں پکڑ رہے تھے جس سے ہمارے اعصاب کشیدہ ہو گئے اور ہم کسی معمولی سی بات پر الجھ پڑے۔ مجھے یاد نہیں آ رہا کہ کیا قصہ تھا۔ اس نے مجھے بے وقوف کہا تو جواب میں، میں نے بھی اسے کچھ کہہ دیا جس پر اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھا لیا۔ ہمارے درمیان اس طرح کے کھیل تماشے ہوتے رہتے ہیں۔''

''تم اسے کھیل کہہ رہے ہو؟'' جیو یئر نے حیرت سے پوچھا۔

جیفری لمحے بھر کو مسکرایا پھر اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور وہ اپنا پسینا خشک کرتے ہوئے بولا۔ ''ہم دونوں ہی باسکٹ بال کھیلتے تھے لیکن میں گھٹنے کی تکلیف کی وجہ سے زیادہ عرصہ کھیل نہ سکا اور وہ مجھ سے آگے نکل گیا۔''

''آخری بار جب تم نے اپنے بھائی کو دیکھا تو اس نے کس طرح کے جوتے پہن رکھے تھے؟''

''بینی ہمیشہ کشتی پر سینڈل پہنا کرتا تھا لیکن یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

جیو یئر نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''کمرے کا جائزہ لینے سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ لڑکی اپنا سامان پیک کر رہی تھی۔''

''ہاں! ہمارا ارادہ دوسرے دن سانتو ڈومنگو جانے کا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ اس کی تیاری کر رہی ہو۔''

اس کے بعد جیو یئر نے مزید پوچھ گچھ کا ارادہ ملتوی کر دیا اور ریویرا کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

''اسے کچھ کھانے کے لیے دو اور روزی کے اسٹور سے اس کے لیے دوسری قمیص کا بندوبست کرو۔ ہیڈ آفس کو فون کر کے بتا دو کہ ہم نے بینی کے بھائی کو تلاش کر لیا ہے۔''

دو گھنٹے بعد کیپٹن موریلو اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ اس نے جیو یئر سے ان کا تعارف کروایا۔ سب سے طویل قامت شخص ایجنٹ ویل مین کا تعلق ایف بی آئی سے تھا جبکہ دوسرے دو افراد قانونی ماہرین تھے۔ اس کے ساتھ دو معاونین بھی تھے جو لاش کا معائنہ کرنے کے علاوہ دیگر شواہد کا بھی جائزہ لیتے۔

ویل مین نے جیو یئر سے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔'' وہ بہت اچھی طرح ہسپانوی زبان میں بول رہا تھا جس پر جیو یئر کو حیرت ہوئی۔ ''میں میامی میں تعینات ہوں۔ مس ہرنانڈیز کی موت کے بارے میں سنا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس میں دو امریکی ملوث ہیں جن میں بینی کیسیڈی جیسا معروف کھلاڑی بھی شامل ہے۔ اس لیے ہم جلد از جلد اس کیس کی تفتیش مکمل کرنا چاہتے ہیں ورنہ اخبار والے ہمارا جینا حرام کر دیں گے۔''

''جیو یئر کو تفتیش میں شامل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' موریلو نے سرد لہجے میں کہا۔ ''ہمیں فوراً کشتی پر پہنچنا ہے۔'' جیو یئر اپنی گاڑی میں ان دونوں کو جائے وقوعہ تک لے کر آیا جبکہ دوسرے لوگ ریویرا کے ساتھ آئے۔ کیپٹن موریلو نے جیو یئر سے ابتدائی رپورٹ مانگی تو اس نے لاش کے دریافت ہونے سے لے کر کشتی کی تلاشی تک سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔

''تم نے کسی چیز کو ہاتھ تو نہیں لگایا؟'' موریلو نے پوچھا۔ ''تم جانتے ہو کہ ہم اپنے ساتھ ماہرین لے کر آئے ہیں جو یہ کام بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔''

''مجھے سارجنٹ جیو یئر کے پروفیشنل ہونے کا پورا یقین ہے۔'' ویل مین نے کہا۔

موریلو نے بھویں اچکائیں اور بولا۔ ''بینی کے بھائی سے کچھ معلوم ہوا؟''

جیو یئر نے اب تک جیفری کیسیڈی سے جو پوچھ گچھ کی تھی، اس کے بارے میں کیپٹن کو تفصیل سے بتا دیا۔ موریلو نے ایک بار پھر تحکمانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں فون پر بتا دیا گیا تھا کہ ہمارے آنے تک کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ مجھے امید ہے کہ تم نے اسے حوالات میں بند نہیں کیا ہوگا۔''

نیچے پہنچ کر اس نے ریویرا کے ساتھ آنے والوں سے کہا۔ ''تم لوگ یہیں رک کر ہمارا انتظار کرو۔ میں اور ویل مین کشتی کا معائنہ کر کے آتے ہیں۔''

موریلو پہلے بیوی کیبن روم میں گیا اور اس بستر کو دیکھا جس پر جیفری کیسیڈی سویا تھا پھر وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے جانے لگے۔ جب اس نے عورت کا سر گھمایا تو جیو یئر بولا۔

www.pkdigest.com

"جب ہم نے اسے پہلی بار دیکھا تو اس کے بال گیلے تھے اور یہ تولیا بھی۔"

موریلو نے ویل مین سے کہا۔ "اس کے سر کے پچھلے حصے پر گومڑ کا نشان ہے اور شمپین کی ٹوٹی ہوئی بوتل سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی نے عورت کو مارنے کے لیے اسے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے۔"

"ایسا ہو سکتا ہے۔" ویل مین نے اس کے خیال کی تائید کی۔

اس کے بعد انہوں نے بقیہ چیزوں کا معائنہ کیا۔ موریلو ان کے بارے میں جیوییر سے پوچھتا رہا۔ اس دوران ایجنٹ ویل مین بالکل خاموش رہا اور تمام تفصیلات اپنی نوٹ بک میں لکھتا رہا۔

کشتی سے اترنے کے بعد موریلو نے اپنے آدمیوں کو ہدایت کی کہ وہ عورت کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیں اور کشتی سے ملنے والے شواہد اور اشیا کا تجزیہ کریں پھر وہ ویل مین کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "چلو، ذرا مسٹر جیفری کی بھی خبر لے لیں۔"

وہ پولیس اسٹیشن واپس آئے تو جیفری، جیوییر کے کمرے میں بیٹھا بیئر پی رہا تھا جبکہ ایک خالی بوتل میز پر رکھی تھی۔ اس نے ایک سستی سی قمیص پہن رکھی تھی جو ریویرا اس کے لیے خرید کر لایا تھا۔ موریلو اور ویل مین اس کے سامنے بیٹھ گئے جبکہ جیوییر ان کے پیچھے کھڑا رہا۔ موریلو نے اس سے پوچھ گچھ شروع کی لیکن دس کی ساری توجہ بیئر پینے پر رہی۔ وہ مختصر لفظوں میں موریلو کے سوالوں کے جواب دیتا رہا لیکن اس سے کوئی نئی بات معلوم نہ ہو سکی۔

ابھی پوچھ گچھ کا سلسلہ جاری تھا کہ کمرے کے باہر کچھ شور سنائی دیا اور کسی نے دروازے کو زور سے دھکا دیا پھر ایک لحیم شحیم عورت سیاہ کپڑے پہنے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ اس کے بال گھنے اور گھنگریالے تھے اور سانولے چہرے پر گہری سیاہ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ جیوییر نے پہلی نظر میں ہی اندازہ لگا لیا کہ وہ مرنے والی لڑکی کی ماں ہے۔

"تم کون ہو اور اس طرح یہاں کیوں چلی آئی ہو؟" موریلو نے ناگواری سے پوچھا۔

"میری بیٹی کے ساتھ یہ سب کس نے کیا ہے؟" وہ عورت غضب ناک لہجے میں بولی۔

"اگر تم اس لڑکی کی ماں ہو تو میں تم سے اس کی موت پر تعزیت کرتا ہوں لیکن تمہیں اس طرح مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔"

"میں جاننا چاہتی ہوں کہ میری بیٹی کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

جیوییر نے ریویرا کو اشارہ کیا کہ وہ اس عورت کو کمرے سے باہر لے جائے۔ وہ خود بھی اس کے پیچھے پیچھے آیا اور اس کا شانہ تھپتھپانے لگا۔ عورت کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جیوییر اسے لاش کے پاس لے کر آیا جسے پوسٹ مارٹم کے لیے لے جایا جا رہا تھا۔ اس نے امیر لنڈا کے چہرے سے چادر ہٹائی۔ لگتا تھا جیسے وہ گہری نیند سو رہی ہے۔ وہ عورت گھٹنوں کے بل جھکی اور روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔

جیوییر نے لاش کا چہرہ ڈھک دیا اور عورت سے بولا۔ "کیا تم اس کے ساتھ جانا چاہو گی؟"

عورت نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ "نہیں... میں یہ برداشت نہیں کر سکوں گی۔"

جیوییر اسے نزدیکی کافی ہاؤس میں لے گیا اور اس کے لیے کافی منگوائی۔ اس عورت کی ہچکیاں بند ہو گئی تھیں۔ اس نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ "تم دوسرے پولیس والوں سے بہت مختلف ہو۔"

[illegible] نے [illegible] جیوییر نے مختصر لفظوں میں کہا۔ "کیا تم میرے چند سوالوں کے جواب دینا پسند کرو گی؟"

"اگر اس طرح قاتل کو سزا ہو سکتی ہے تو میں تمہارے ہر سوال کا جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔ وہ شخص جو پولیس اسٹیشن میں بیٹھا تھا، وہ کون ہے۔"

"جیفری کیسیڈی۔ وہ بینی کیسیڈی کا بھائی ہے۔"

"اوہ۔ امیر لنڈا اسے غلام کہہ کر پکارتی تھی۔"

"لیکن وہ تو دونوں سے ملتی تھی۔"

"نہیں، بینی نے اس سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔ ان دونوں کی ملاقات ایک ماہ پہلے کسی بار میں ہوئی تھی پھر وہ اس کے ساتھ کشتی پر جانے لگی۔ ایک ہفتہ پہلے اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ شادی کرنے والے ہیں۔"

"تم نے اس کی بات پر یقین کر لیا؟"

اس عورت کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہ بولی۔ "مرد تو ہمیشہ ایسے وعدے کیا کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ سچ بول رہا ہو۔"

"اگر یہ سچ نہ ہو تو وہ کیا کرتی؟" جیوییر نے پوچھا۔

"وہ میری بیٹی تھی۔ تمہارے خیال میں اسے کیا کرنا چاہیے تھا؟"

جیوییر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اسے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ امیر لنڈا نے کس ردعمل کا اظہار کیا ہوگا۔

"جیفری کیسیڈی کا کہنا ہے کہ پہلے وہ تمہاری بیٹی سے ملا تھا لیکن بعد میں اس کا بھائی بیچ میں آ گیا اور وہ امیر لنڈا کو اس سے دور لے گیا۔"

"مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں کہ وہ اسے غلام کہہ کر بلاتی تھی۔ وہ واقعی اپنے بھائی کا غلام تھا اور اس کے سارے کام کرتا تھا۔ وہ اور بینی منہ پر اس کا مذاق اڑاتے تھے اور وہ یہ سب کچھ برداشت کر لیتا تھا۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکی پھر کہنے لگی۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ اسی نے میری بیٹی کو مارا ہوگا؟"

"ہم ابھی اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔"

"جب تمہیں قاتل کا پتا چل جائے تو اسے میرے حوالے کر دینا۔ میں اس کا سینہ چیر کر دل باہر نکال لوں گی۔"

☆☆☆

وہ تینوں شہر کے مضافات میں واقع ایک امریکی ریستوران میں ڈنر کر رہے تھے۔ موریلو نے کھانا ختم کر کے سگار سلگایا اور بولا۔ "وہ بیوقوفی ایک بار پھر [illegible] بینی کا دل اس لڑکی سے بھر گیا تھا۔ اس نے امیر لنڈا سے کہہ دیا کہ وہ اسے اگلے پورٹ پر اتار دے گا۔ وہ روتی ہوئی اپنا سامان پیک کرنے چلی گئی۔ اس موقعے پر بینی کے بھائی نے مداخلت کی جس پر دونوں میں جھگڑا ہو گیا اور بات بڑھ گئی۔ جیفری نے بھائی کو مار دیا اور اس کی لاش سمندر میں پھینک دی۔ وہ خود اس لڑائی کا اعتراف کر چکا ہے۔"

"لیکن ہمیں تو اس لڑکی کی لاش ملی ہے۔ اس کا قاتل کون ہو سکتا ہے؟" ویل مین نے پوچھا۔

"امیر لنڈا کی ماں نے جیوییر کو جو کچھ بتایا ہے، اس سے تو یہی لگتا ہے کہ وہ لڑکی جیفری کو پسند نہیں کرتی تھی اور اکثر...... اس کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ ممکن ہے اس واقعے پر اس نے اپنی نفرت کا اظہار کیا ہو یا پولیس کو بتانے کی دھمکی دی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے جیفری کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی ہو جس پر اس نے امیر لنڈا کو بھی ٹھکانے لگا دیا اور خود وہاں سے فرار ہو گیا۔"

"یہ ممکن ہے۔" ویل مین نے کہا۔ "لیکن جیفری کیسیڈی نے ابھی تک اپنے جرم کا اعتراف نہیں کیا اور ہم اسے ناکافی شواہد کی بنا پر مجرم قرار نہیں دے سکتے۔"

"اگر پرانا زمانہ ہوتا تو ہم اب تک اس سے اعترافِ جرم کروا چکے ہوتے۔" موریلو دانت پیستے ہوئے بولا۔ "لیکن جمہوریت کی برکات کے طفیل اب ایسا ممکن نہیں۔ قمیص پر اس کے بھائی کے خون کا دھبا ہی بہت بڑی شہادت ہے۔ اس کے علاوہ شمپین کی بوتل پر بھی اس کی انگلیوں کے نشانات مل جائیں گے۔ اسے مجرم ثابت کرنے کے لیے یہی کافی ہے۔"

ویل مین کا چہرہ سکڑ گیا اور وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ "جو کچھ تم کہہ رہے ہو، وہ یقیناً ممکن ہے لیکن میں قائل نہیں ہو سکا۔"

موریلو نے سگار کا ایک طویل کش لیا اور دھواں خارج کرتے ہوئے بولا۔ "کیا تمہارے پاس کوئی دوسری تھیوری ہے؟"

"کچھ چیزیں مجھے پریشان کر رہی ہیں۔ مثلاً بینی کا پاسپورٹ کہاں گیا؟ پھر یہ کہ جیفری اپنا پاسپورٹ اور نقد رقم وہاں چھوڑ کر کیوں چلا گیا؟ اسے رقم کی ضرورت پڑ سکتی تھی کیونکہ اتنا تو وہ بھی جانتا ہوگا کہ کریڈٹ کارڈ استعمال کرنے کی صورت میں وہ پکڑا جا سکتا ہے۔"

"میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ لڑکی کو قتل کرنے کے بعد وہ خوف زدہ ہو گیا تھا اور وہاں سے جلد از جلد بھاگنا چاہ رہا تھا۔ اسی لیے گھبراہٹ میں اپنی تمام چیزیں وہیں چھوڑ دیں۔"

ویل مین نے اس انداز میں سر ہلایا جیسے وہ اب بھی اس نظریے سے متفق نہیں ہے۔ اس پر موریلو نے ناگواری سے پوچھا۔ "تمہاری تھیوری کیا کہتی ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ جیفری سچ بول رہا ہے۔ جس وقت یہ قتل ہوا، وہ سو رہا تھا۔ تمہارا کہنا صحیح ہے کہ بینی کا دل اس لڑکی سے بھر گیا تھا اور اس نے اسے چلے جانے کو کہا۔ اس لڑکی نے اپنا سامان تو باندھ لیا لیکن جانے سے پہلے بینی سے فیصلہ کن بات کرنے کی ٹھانی۔ اسی دوران ان دونوں کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی اور بینی نے اس لڑکی کو مار ڈالا۔ وہ اپنا پاسپورٹ اور کچھ رقم لے کر وہاں سے فرار ہو گیا اور اپنے بھائی کو چھوڑ دیا تاکہ وہ قتل کے الزام میں پکڑا جائے۔ میرا خیال ہے کہ جیفری بھی یہ بات جانتا ہوگا کہ یہ واقعہ کس طرح پیش آیا تھا۔"

موریلو اپنے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے۔ ہم اس پہلو پر بھی غور کریں گے۔"

ویل مین نے جیو یز کی طرف دیکھا اور بولا۔ "تم کیا کہتے ہو سارجنٹ؟"

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، موریلو بول پڑا۔ "جیو یز کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کل تک ہمیں قانونی مشیر کی ابتدائی رپورٹ مل جائے گی۔ اگر اس میں بھی وہی کچھ لکھا ہوا جو میں سوچ رہا ہوں تو ہم جیفری کیسیڈی کو مزید پوچھ گچھ کے لیے ہیڈ آفس لے جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ جیل میں بیٹھ کر وہ جلد ہی سچ بولنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ جیو یز! اب تم جاسکتے ہو اور جیسے ہی رپورٹ ملے، مجھے مطلع کر دینا۔"

دوسرے دن سہ پہر کو جیو یز نے رپورٹ وصول کی اور اس کے صفحات پلٹتے ہوئے وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے وہ رپورٹ ریویرا کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ "اسے فوراً کیپٹن موریلو تک پہنچا دو۔ شاید اسے پڑھنے کے بعد اس کا موڈ اچھا ہو جائے اور ہم اس سے جلد ہی چھٹکارا پاسکیں۔"

جیو یز اپنا کام ختم کر کے گھر جانے ہی والا تھا کہ اسے ایف بی آئی ایجنٹ ویل مین کا فون موصول ہوا۔ وہ اس سے ملنا چاہ رہا تھا۔ جیو یز مقررہ مقام پر اس سے ملنے کے لیے پہنچ گیا۔ ویل مین نے اس کے لیے کھانے کا آرڈر دیا اور بولا۔

"کیپٹن موریلو آج شام ہی اس قیدی کو لے کر یہاں سے جانا چاہ رہا تھا لیکن میں نے اسے کل صبح تک انتظار کرنے کے لیے کہا ہے۔"

"کیوں؟" جیو یز نے حیرانی سے پوچھا۔

"کل میں نے تم سے ایک سوال پوچھا تھا لیکن کیپٹن نے تمہیں بولنے کا موقع نہیں دیا۔ میں اب بھی تمہارے جواب کا منتظر ہوں۔"

"میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

ویل مین نے غور سے اسے دیکھا اور بولا۔ "میرا خیال ہے کہ تمہارے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ تم نے یقیناً اس رپورٹ کو بھی پڑھا ہوگا۔ اب تم کیا کہتے ہو؟"

"میں تمہارے سامنے کوئی گستاخی نہیں کرسکتا لیکن جو حکم دیا گیا ہے میں اس کی تعمیل کرنے پر مجبور ہوں۔"

"موریلو کا اندازہ درست نکلا۔ جیفری کیسیڈی کی قمیص پر اس کے بھائی کے خون کا ہی دھبا ہے۔ ایک یا دو ہفتے میں ڈی این اے ٹیسٹ کی رپورٹ سے بھی اس کی تصدیق ہو جائے گی۔"

"جیفری پہلے ہی بھائی کے ساتھ اپنی لڑائی کا اعتراف کر چکا ہے۔" جیو یز نے محتاط انداز میں کہا۔

"پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کے سر پر شدید ضرب لگائی گئی تھی جبکہ شیمپین کی ٹوٹی ہوئی بوتل پر جیفری کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔ لگتا ہے کہ اسی بوتل سے اس کے سر پر ضرب لگائی گئی تھی۔"

"میرا خیال ہے کہ تم نے ایک اہم ثبوت کو نظر انداز کر دیا ہے۔" جیو یز اپنی پلیٹ پر جھکتے ہوئے بولا۔

"وہ کیا؟"

"یہی کہ اس لڑکی نے رات کے کھانے میں کیا کھایا تھا؟"

ویل مین نے فائل کھولی اور رپورٹ کا بغور جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "مچھلی۔"

کھانا ختم کرنے کے بعد وہ ریستوران سے باہر آئے تو ویل مین بولا۔ "کیوں نہ تھوڑی سی چہل قدمی کی جائے؟"

جیو یز نے اثبات میں سر ہلا دیا اور وہ دونوں اس سڑک پر چل دیے جو ساحل کی طرف جاتی تھی۔ جیو یز کو چلتے چلتے کچھ خیال آیا۔ اس نے ویل مین سے پوچھا۔ "کیا تمہیں مچھلیاں پکڑنے کا شوق ہے؟"

"نہیں لیکن سوچ رہا ہوں کہ سیکھ لوں۔ ہماری جاب میں اس طرح کی تفریح بہت ضروری ہے۔" پھر اچانک ہی اس نے موضوع بدل دیا اور بولا۔ "تم بھی سمجھتے ہو کہ اس لڑکی کے بارے میں موریلو کا خیال صحیح ہے؟"

"کیپٹن موریلو کسی امریکن کو گرفتار کرنے نہیں آئے۔ وہ کسی بڑی مچھلی کی تلاش میں ہیں۔"

"تمہارا اشارہ جیفری کیسیڈی کے بھائی بینی کی جانب ہے؟"

جیو یز نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں اس کشتی تک پہنچ گئے۔ اس بار ویل مین پہلے کشتی پر چڑھا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر جیو یز کو بھی اوپر کھینچ لیا۔ جیو یز نے ادھر ادھر دیکھا پھر عرشے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "ان نشانات سے ظاہر ہوتا ہے جیسے کسی چیز کو گھسیٹا گیا ہے۔"

"گویا تمہارے خیال میں موریلو کا اندازہ درست ہے کہ جیفری نے پہلے اپنے بھائی کو قتل کر کے لاش سمندر میں پھینکی اور پھر امیر لڈا کو بھی مار دیا؟"

"ہاں، وہ لاش بینی ہی کی تھی کیونکہ یہ نشانات ربر کے جوتوں کے ہیں جو اس نے پہن رکھے تھے۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ یہ نشانات ایک سیدھ میں نہیں ہیں۔ جیفری مضبوط شخص ہے۔ وہ اپنے بھائی کو سیدھا گھسیٹتا ہوا لے جاتا اور سمندر میں پھینک دیتا۔ اس کے علاوہ امیر لڈا کے سر میں دائیں جانب چوٹ لگی ہے جبکہ جیفری بایاں ہاتھ استعمال کرتا ہے اور اس زاویے سے اس کے لیے امیر لڈا کے سر کو نشانہ بنانا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس نے ان دونوں میں سے کسی کو نہیں مارا۔ وہ وقوعہ کے وقت سو رہا تھا۔"

"تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔ ایک طرف تم کہہ رہے ہو کہ بینی کی لاش کو عرشے پر گھسیٹا گیا ہے اور دوسری جانب تم جیفری کو قاتل نہیں سمجھ رہے... پھر ان دونوں کو کس نے مارا؟"

"جیفری کا کہنا ہے کہ جب وہ دونوں بھائی ڈور پیڈو کھا رہے تھے تو امیر لڈا اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ خود بھی سونے چلا گیا۔ امیر لڈا کے معدے میں چھوٹی مچھلی کی موجودگی یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ بعد میں کسی وقت اٹھی اور بھوک لگنے پر اسٹور میں سے ایک ٹن نکال کر مچھلی کھانے بیٹھ گئی۔ اس دوران اس کی بینی سے جھڑپ ہوئی ہوگی۔ جب بینی نے اسے بتایا ہوگا کہ وہ اس سے شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اس بات پر وہ مشتعل ہو گئی ہوگی اور اس نے بینی پر حملہ کر دیا۔"

[illegible]

"کچن کے سامان میں سے ایک چھری غائب ہے۔" جیو یز نے کٹنگ بورڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ اس نے وہ چھری پوری قوت سے بینی کے جسم میں گھونپ دی ہوگی۔ عرشے پر قدموں کے نشانات بتا رہے ہیں کہ وہ بینی کو گھسیٹتی ہوئی لائی اور اسے چھری سمیت سمندر میں پھینک دیا۔"

"اگر تمہاری بات پر یقین کر لیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے کس نے مارا؟"

جیو یز نے اپنا ایک ہاتھ مستول کے لمبے بانس پر رکھا اور بولا۔ "اس رات سمندر میں طوفان آیا ہوا تھا اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ جیسے ہی اس نے بینی کی لاش سمندر میں پھینکی تو اس کے سر کا پچھلا حصہ اس بانس سے ٹکرا گیا۔ اس کی فوری طور پر تو موت واقع نہیں ہوئی لیکن سر سے خون بہنے لگا جس کے نشانات سیڑھیوں پر موجود تھے پھر اس نے بینی کا پاسپورٹ بھی سمندر میں پھینک دیا تاکہ لوگوں کو یقین آجائے کہ وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اس نے شدید ہیجانی کیفیت میں پیکنگ کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ایک پاؤں میں سرخ اور دوسرے میں سیاہ موزے نظر آرہے تھے پھر اس نے فریج کھولا اور اس میں سے برف نکال کر تولیے میں لپیٹا تاکہ زخم سے بہنے والے خون کو روک سکے۔ ممکن ہے کہ اس نے جیفری کو جگانے کی کوشش کی ہو کہ وہ اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جائے اور ٹھوکر کھا کر سیڑھیوں کے پاس گر گئی ہو... اور خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو گئی ہو۔"

ویل مین بھی بات کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے جیو یز کی تھیوری سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "جب جیفری کی آنکھ کھلی اور اس نے امیر لڈا کو مردہ حالت میں دیکھا تو اس کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا ہوگا کہ اس کا بھائی اسے مصیبت میں ڈال کر بھاگ گیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ دہشت زدہ ہو گیا اور اس نے وہاں سے دوڑ لگا دی۔"

اس نے جیو یز کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ "میں کیپٹن موریلو کو تمہاری تھیوری کے بارے میں ضرور بتاؤں گا۔"

"موریلو کبھی یقین نہیں کرے گا کہ ایک مقامی لڑکی بھی قتل کر سکتی ہے۔ وہ بڑی مچھلی کی تلاش میں ہے۔ وہ کبھی یہ اعتراف نہیں کرے گا کہ مجھ جیسا ایک معمولی سارجنٹ بھی کوئی تھیوری تلاش کر سکتا ہے۔"

"تم اتنے معصوم بھی نہیں ہو۔" ویل مین مسکراتے ہوئے بولا۔ "تم اسے بتانا کہ یہ آئیڈیا تمہارا ہے تاکہ کم از کم وہ اس پر سنجیدگی سے غور کر سکے۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ یہ مناسب ہوگا۔" ویل مین زیر لب بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "اگر تم چاہتے ہو کہ جیفری کے ساتھ انصاف کیا جائے تو تمہیں ایسا ہی کرنا ہوگا ورنہ میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ سے تو تصدیق ہو ہی جائے گی کہ امیر لڈا کی موت آہستہ آہستہ خون بہنے سے واقع ہوئی تھی۔"

جیو یز نے جو سوچا تھا، ویسا ہی ہوا۔ کیپٹن موریلو یہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا کہ امیر لڈا قتل بھی کر سکتی ہے لیکن جیفری کیسیڈی کو بھی ناکافی ثبوت ہونے کی بنا پر جیل میں نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ بینی کیسیڈی کی لاش تلاش کرنے کی بہت کوشش کی گئی لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔ مجبوراً کیس فائل بند کر دی گئی کیونکہ مقتول کے ساتھ ساتھ قاتل بھی اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔

www.pkdigest.com

www.pkdigest.com

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل ..... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

اسما قادری

گرداب

نویں قسط

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے لیکن اس کی باگ ڈور جب بااثر سماج کے روایتی نظام میں پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں۔ بالاتر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے اور یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے..... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے۔ جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کرکے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہوجاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے، زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے... سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے۔ گزرا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ نے جاتا ہے..... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی سلسلہ در سلسلہ۔

وقت گویا تھم سا گیا۔ آفتاب ایک ٹک اپنے قریب کھڑی اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو اس پر اپنی جان تک لٹا دینے کے لیے تیار تھی۔ وہ ہمیشہ اس لڑکی کی شدتوں سے ہارتا آیا تھا لیکن وہ اس سے کس انتہا درجے کی محبت کرتی تھی، اس بات کا حقیقی ادراک وقت کے ان نازک لمحوں میں ہی ہو سکا۔ کسی پر اپنی جان لٹا دینا آسان نہیں ہوتا اور جو محبت میں اس حد کو چھو لے، اس سے بڑھ کر انمول کون ہو سکتا ہے؟ وہ اس انمول لڑکی کے قریب کھڑا باہر موجود لوگوں سے غافل ہو چکا تھا۔ دروازے پر ایک بار پھر دستک دی گئی تو وہ چونکا۔ دستک بہت زور سے نہیں دی گئی تھی لیکن رات کے سناٹے میں زوردار محسوس ہو رہی تھی۔

"پلیز آفتاب! میں آپ سے کہہ رہی ہوں نا کہ آپ کسی طرح یہاں سے نکل جائیں۔" ہراساں و خوف زدہ کشور نے اس کا بازو جھنجوڑتے ہوئے سرگوشی میں اس سے التجا کی مگر اس نے اپنی جگہ سے جنبش کیے بغیر اپنے بازو پر موجود اس کے ہاتھ کو ہولے سے تھپکا اور دروازے کی طرف منہ کرتے ہوئے قدرے بلند آواز میں بولا۔

"پانچ منٹ انتظار کرو منیب! میں بی بی کو ساری صورتِ حال سمجھا دوں پھر تم لوگوں کو اندر بلاتا ہوں۔ پریشان مت ہو، باہر کوئی دشمن نہیں بلکہ میرے دوست ہیں اور میرے بلانے پر ہی یہاں آئے ہیں۔" ابھی ابھی نظروں سے اپنی طرف دیکھتی کشور کو اس نے تسلی دی اور اس کا ہاتھ تھام کر فرش پر بچھی دری کی طرف لے جاتے ہوئے بولا۔

"ادھر چل کر بیٹھیں میں آپ کو سب کچھ سمجھاتا ہوں۔"

اس نے خاموشی سے یہ بات مان لی مگر اس کی سوالیہ نظریں مسلسل آفتاب کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"آپ یقیناً حیران ہو رہی ہیں کہ یہ سب کیا ہے؟" اس کی نظروں کا سوال پڑھتے ہوئے آفتاب نے گفتگو کا آغاز کیا۔ وہ کسی بھی قسم کا ردِعمل ظاہر کیے بغیر ہنوز پہلے والی کیفیت میں اس کی طرف دیکھتی رہی۔ چند لمحوں قبل وہ جس کیفیت سے گزری تھی، اس کے بعد دوسری عجیب و غریب صورتِ حال سمجھنے میں اسے کافی دشواری پیش آ رہی تھی۔ دروازے پر دستک کی آواز سن کر اس پر کیسی قیامت گزری تھی، یہ تو وہ خود ہی جانتی تھی۔ اسے لگا تھا کہ رانی کے سارے واہمے سچ ثابت ہونے والے ہیں۔ وہ ڈر گئی تھی کہ شاید حویلی سے کوئی اس کا تعاقب کرتا ہوا یہاں آ پہنچا ہے۔ اتنی جلدی اپنی محبت کے چھن جانے کے خوف نے اس کے وجود سے ساری توانائیاں نچوڑ لی تھیں اور وہ ابھی تک اس خوف کے زیرِ اثر دھیرے دھیرے کانپ رہی تھی۔

"میں معافی چاہتا ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو تکلیف اٹھانی پڑی۔" آفتاب نے اس کی حالت کو بھانپتے ہوئے معذرت کی۔

"خدارا! مجھے گناہ گار نہ کریں۔" اسے آفتاب کا معافی مانگنا ہرگز بھی گوارا نہ ہو سکا اس لیے خود پر قابو پاتے ہوئے فوراً ہی اسے ٹوکا۔

"اصل میں بات کچھ ایسی تھی کہ میں چاہتا تھا، فون پر کرنے کے بجائے روبرو ہی کروں۔ آپ پر اعتماد تھا کہ آپ میری بات ماننے سے انکار نہیں کریں گی اس لیے باقی کے انتظامات پہلے ہی کر لیے تھے بس ذرا سی ٹائمنگ غلط ہو گئی۔ آپ میرے اندازے کے برخلاف کچھ تاخیر سے یہاں پہنچیں ورنہ یہ صورتِ حال پیش ہی نہیں آتی۔" وہ تمہید باندھنے لگا لیکن اس تمہید سے کشور کے لیے اصل معاملے تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔

"آج ابا جی حویلی میں ہی موجود تھے اس لیے ہم بہت سی احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے بعد یہاں تک آنے کی راہ نکال سکے۔ احتیاط کی وجہ سے ہی دیر بھی زیادہ ہو گئی۔" خود الجھن میں ہونے کے باوجود اس نے فوراً اپنے تاخیر سے آنے کی وضاحت پیش کی۔

"میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ کو یہاں تک آنے کے لیے کتنی دشواریوں سے گزرنا پڑتا ہوگا اسی لیے ہمیشہ آپ کو روکتا رہا لیکن آج کی ملاقات بے حد ضروری تھی اس لیے میں نے آپ کو خطرے میں ڈالنا بھی گوارا کر لیا۔"

"ایسی کیا بات ہے آفتاب! آپ مجھے بتاتے کیوں نہیں؟" اس بار وہ اپنے ہونٹوں پر سوال آنے سے نہ روک سکی۔ کپکپا دینے والے خوف کی گرفت سے آزاد ہونے کے بعد وہ اس کے رویے سے الجھن میں پڑ گئی تھی۔ جواباً آفتاب نے ایک گہرا سانس لیا اور کہنے لگا۔

"ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے اور یہ بات بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ دو چاہنے والوں کو ایک دوسرے کی طلب بھی ہوتی ہے۔ ہماری پچھلی ملاقات میں جو کچھ ہوا، وہ اسی محبت اور طلب کی کارستانی تھی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ لمحے میری زندگی کے سب سے خوب صورت لمحے تھے لیکن آپ سے جدا ہونے کے بعد ایک ایسا سچ میرے سامنے آ کھڑا ہوا کہ میں اس مور کی طرح جو بے خودی میں ناچتے ناچتے اپنے بدصورت پیروں کو دیکھ کر شرمندہ ہو جاتا

www.pkdigest.com

ہے۔" وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا، اس کے لیے سمجھنا مشکل تھا۔ ذہن میں کئی اندیشے کلبلانے لگے جس میں سب سے بڑا خدشہ یہ تھا کہ کہیں آفتاب کی زندگی میں کوئی اور عورت تو نہیں۔ کوئی ایسی عورت جو اس کی ان محبتوں کی حق دار ہو اور وہ اس کا حق کشور پر لٹانے کے بعد شرمندہ ہو رہا ہو۔

"محبت کے ساتھ طلب کا ہونا گناہ نہیں لیکن اس طلب کے ساتھ قانونی اور شرعی رشتے میں بندھے بغیر بہہ جانا اتنا بڑا گناہ ہے کہ پھر محبت، محبت کہلانے کی حق دار نہیں رہتی... ہوس کہلانے لگتی ہے اور مجھے اپنی محبت کے دامن پر یہ داغ گوارا نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ محبت کے دامن پر لگے اس داغ کو دھونے کے لیے ہم نکاح کے بندھن میں بندھ جائیں۔ اگر آپ میری یہ بات ماننے کے لیے راضی ہیں تو میں ابھی منیب اور اپنے دوسرے دوستوں کو اندر بلوا لیتا ہوں ورنہ آپ کے لیے باہر کا راستہ کھلا ہے۔ میں آپ کو یہاں سے جانے سے روکوں گا نہیں مگر پھر کبھی آپ کے بلانے پر آؤں گا بھی نہیں۔" اس کے اندیشوں سے بے نیاز اپنی بات مکمل کرتے ہوئے اس نے آخر میں دوٹوک لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا اور اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ خود بھی اسی کو دیکھ رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کی نظروں میں کوئی سوال نہیں بلکہ بے انتہا عقیدت تھی۔ یہ عقیدت دھیرے دھیرے آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہنے لگی۔

"تھینک یو آفتاب! آپ نے یہ بات کہہ کر مجھے کتنا معتبر کر دیا ہے، میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ میری اندھی محبت میں اتنی بصیرت نہیں تھی کہ میں آپ سے یہ مطالبہ کر سکتی۔ اب آپ نے کہا ہے تو احساس ہو رہا ہے کہ میں کتنی بڑی غلطی میں مبتلا تھی۔ محبت کرنے والے مرد و عورت کے درمیان اگر نکاح کے دو بول نہ ہوں تو وہ سب کچھ پانے کے بعد بھی ہمیشہ سچی خوشی سے محروم رہتے ہیں۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے یہ سچی خوشی عنایت کرنے کا سوچا۔" رندھی ہوئی آواز میں اس نے آفتاب کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"او کے! آپ ٹھیک سے چادر اوڑھ کر بیٹھ جائیں۔ میں ان لوگوں کو اندر بلواتا ہوں۔" اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کشور کے بہتے ہوئے اشکوں کو اپنی انگلی کی پوروں پر چن لے لیکن باہر کھڑے منیب اور دوسرے لوگوں کا خیال تھا۔ باہر وہ لوگ نکاح پڑھوانے کے منتظر کھڑے تھے اور جن کا نکاح ہونا تھا، وہ ایک بند کمرے میں تنہا مذاکرات میں مصروف تھے تو یہ اچھی خاصی معیوب صورتِ حال تھی... چنانچہ کشور کا عندیہ پاتے ہی فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف لپکا۔ دروازہ کھول کر اس نے منیب، شہر سے آئے اپنے دوستوں اور نکاح خواں کو اندر بلایا۔ نکاح خواں کو علم تھا کہ نکاح کس صورتِ حال میں پڑھایا جا رہا ہے۔ اسے لانے والے آفتاب کے دوستوں نے پہلے ہی سوائے اس بات کے کہ دلہن گاؤں کے مالک چودھری افتخار عالم شاہ کی بیٹی ہے، سب کچھ بتا دیا تھا۔ لاہور کے رہائشی اس نکاح خواں کو نہ تو اس دور دراز گاؤں کے چودھری کے نام کا علم تھا اور نہ ہی دولہا دلہن کی اصلیت جاننے سے دلچسپی۔ وہ فقط اس رقم کی کشش میں یہاں آیا تھا جو اسے آفتاب کے دوستوں نے دی تھی اور جو نکاح کی عام فیس کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ تھی۔ بعد میں کوئی مشکل پڑتی بھی تو اسے یہی کہنا تھا کہ مجھے کیا معلوم لڑکی کس گاؤں کی رہنے والی ہے۔ میں تو لاہور میں رہتا ہوں اور میرے پاس لڑکا لڑکی مع گواہان خود چل کر نکاح کے لیے آئے تھے، سو میں نے یہ نیک کام کر دیا۔ نیکی کا بدلہ روزِ جزا پر اٹھا کر رکھنے کے بجائے اس نے کڑک کڑک نوٹوں کی صورت میں وصول کر لیا تھا۔ یہ بات ظاہر ہے، وہ کسی کو نہیں بتاتا۔

آفتاب نے کشور کی سہولت کے لیے رانی کو بھی اندر بلوا لیا تھا اور اب وہ خوف اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں اپنی مالکن کے نکاح میں شریک تھی۔ ایجاب و قبول کے مراحل طے ہونے کے بعد نکاح خواں نے مختصر دعا کروائی پھر منیب نے اپنے ساتھ لایا ہوا مٹھائی کا ڈبا کھول کر سب کا منہ میٹھا کروایا۔

"بھابی! ابھی تو ہم نے آپ لوگوں کی مجبوری کو سمجھتے ہوئے اس مٹھائی پر گزارہ کر لیا ہے لیکن یہ بات کان کھول کر سن لیں کہ ولیمے کی دعوت آپ لوگوں پر ڈیو ہے اور وہ آپ نے ہمیں ضرور کھلانی ہے۔ وقت کی طرف سے ہمیں کوئی فکر نہیں۔ اگر آپ ہمیں اتنی لیٹ دعوتِ ولیمہ کھلائیں کہ اس دعوت میں ہمارا کوئی بھتیجا یا بھتیجی بھی شرکت کے لیے دنیا میں آ پہنچے تو بھی ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" مٹھائی کھاتے ہوئے آفتاب کے ایک دوست نے شوخ لہجے میں براہِ راست، گھونگھٹ کی آڑ میں بیٹھی کشور سے مطالبہ کیا تو اس کے ہونٹوں پر محجوب سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اسے آفتاب کے دوست کا خود کو بھابی کہہ کر مخاطب کرنا بہت اچھا لگا تھا۔ نکاح کے دو بولوں نے اس کی اور آفتاب کی محبت کو ہی مضبوط نہیں کیا تھا بلکہ وہ رشتے بھی اس کی جھولی میں لا ڈالے تھے جن کے بارے میں وہ کبھی سوچ ہی نہیں سکتی تھی کہ اسے کبھی مل پائیں گے۔

"وقت کافی زیادہ ہو گیا ہے۔ اب آپ لوگوں کو یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔" آفتاب جسے یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا مگر گزرتے وقت کا خیال کر کے اور خود پر جبر کرتا ہوا کشور سے بولا تو وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور گھونگھٹ کے طور پر لی گئی چادر کو نقاب کے انداز میں چہرے پر سیٹ کرنے لگی۔

"کتنا بے چارہ دولہا ہے۔ بجائے دلہن رخصت کروا کر اپنے ساتھ لے جانے کے اسے رخصت کرنے جا رہا ہے۔" وہ لوگ دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے جب آفتاب کے دوست نے ایک آہ بھرتے ہوئے پیچھے سے یہ کمنٹس دیے۔ وہ اَن سنی کرتا ہوا کشور کے ساتھ باہر نکل گیا۔ باہر نکلنے کے بعد ان دونوں کے ہی قدم خود بخود رک گئے جبکہ رانی بے خیالی میں یا پھر شاید جان بوجھ کر انہیں تنہائی فراہم کرنے کے خیال سے تانگے کی طرف بڑھ گئی۔

"کہتے تو سچ ہی ہیں میرے دوست... واقعی میں کتنا بے چارہ سا دولہا ہوں جو اپنی دلہن کو روک بھی نہیں سکتا۔ نہ سرخ جوڑے میں سجے اس کے حسن کو سراہ سکتا ہوں۔ ویسے سچ بتائیں، یہ سرخ جوڑا محض اتفاق تھا یا آپ کے دل کو خبر ہو گئی تھی کہ آج کچھ خاص ہونے جا رہا ہے؟" اس نے کشور کو چھیڑا۔

"میرے لیے تو یہ بھی خاص بات تھی کہ آج پہلی بار آپ نے خود مجھے بلایا تھا۔ آج کی رات مجھے اتنا معتبر کرنے والی ہے، یہ معلوم ہوتا تو جانے کتنا اہتمام کرتی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اہتمام اہتمام میں ہی سارا وقت گزر جاتا اور آپ نکاح خواں اور گواہان کے ساتھ یہاں بیٹھے میرا راستہ ہی تکتے رہ جاتے۔" جذباتی لہجے میں اپنی دلی کیفیات کا اظہار کرتے ہوئے آخر میں وہ یک دم شوخ ہوئی تو آفتاب ہنس پڑا۔

"چلیں، آج نہ سہی پھر بھی آپ کو یہ موقع مل جائے گا۔ اب تو آپ جب بھی مجھ سے ملنے آئیں گی مسز آفتاب احمد کی حیثیت سے ہی آئیں گی، پھر دیکھیں گے کہ ہماری بیگم صاحبہ ہمیں زیر کرنے کے لیے کن کن کیل کانٹوں سے لیس ہو کر آتی ہیں... پر دھیان رکھیے گا اب آپ کے جملہ حقوق ہمارے نام محفوظ ہو چکے ہیں۔ اب جو ملاقات ہو گی اس میں ہمارا کوئی اور ہی رنگ دیکھنے کو ملے گا آپ کو۔" اس نے دھیرے سے کشور کا ہاتھ دبایا۔ وہ اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا کر کھلکھلا کر ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ آگے کچھ فاصلے پر وہ تانگا کھڑا تھا جس میں بیٹھ کر اسے واپس حویلی جانا تھا۔ تانگے کی طرف بڑھتے اس کے قدموں کے برخلاف اس کا شریر دل ہمک ہمک کر پیچھے کی طرف لپک رہا تھا مگر مجبوری تھی کہ اس وقت وہ دل کی بات ماننے کی پوزیشن میں نہیں تھی چنانچہ آگے بڑھتی چلی گئی۔ تانگے پر چڑھنے سے پہلے البتہ اس نے پیچھے مڑ کر ضرور دیکھا۔ آفتاب اپنی جگہ کھڑا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ لہرا کر اسے الوداع کہا تو جواب میں اس کا ہاتھ بھی الوداعی انداز میں اٹھ گیا۔ البتہ یہ تو دونوں ہی جانتے تھے کہ الوداع کا استعارہ بنے یہ ہاتھ وصل کے لمحوں کے لیے کس شدت سے منتظر ہیں۔

☆☆☆

لکڑیوں کا چولہا جلا کر اس نے توا رکھا اور پرات میں گوندھے ہوئے آٹے کا پیڑا بنا کر روٹی بیلنے لگی۔ مشابرم خان کے گھر پہنچنے کے بعد دوسرے دن سے ہی اس نے گھر کی سازی ذمے داریاں سنبھال لی تھیں۔ اس کی بوڑھی ماں نے جو اٹک اٹک کر اردو بولتی تھی، ابتدا میں اسے روکنا چاہا پھر اس کی ضد کے آگے ہار مان لی۔ اب وہ گھر کے تقریباً سارے ہی کام کرتی تھی پھر بھی دن مشکل سے گزرتا تھا۔ ہزار افراد سے بھی کم آبادی پر مشتمل اس گاؤں میں زندگی بہت محدود تھی اور مشابرم خان کے گھر میں تو محدود ترین۔ اس کا بھائی اکرم خان اسے یہاں اپنی ماں کے پاس چھوڑنے کے بعد ... چلا گیا تھا اور اسے بھی ... لیکن ... کے ساتھ ... سمجھ نہیں پائی کس طرح وقت گزارے؟ بس گھر کے کام کاج میں کچھ وقت اچھا گزر جاتا تھا ورنہ سارا دن وہ ہوتی تھی اور وہ اَن پر سوار کرب اور پریشانیاں۔ کبھی بے نے اور ابا کی موت کا غم رلاتا تو کبھی اپنے مستقبل کا سوچ کر طبیعت گھبرانے لگتی۔ اس وقت بھی وہ انہی سوچوں میں گم روٹی پکا رہی تھی۔ پہلی روٹی توے سے اتری تو سیاہی مائل رنگت دیکھ کر طبیعت کچھ اور مکدر سی ہو گئی۔

"کیا ذوق! تازی گندم کے آٹے کی روٹیاں ایسی ہی پکتی تھیں۔ ان روٹیوں کو پکاتے اور کھاتے ہوئے اسے وہ سنہری مائل روٹیاں یاد آ جاتیں جنہیں وہ ساری زندگی کھاتی رہی تھی اور جنہیں کھاتے ہوئے اسے کبھی گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ ایک دن وہ اپنے شہر سے بہت دور کا ندے نامی اس بستی میں بیٹھی ہو گی۔

سست روی سے دوسری روٹی بیل کر توے پر ڈالتے ہوئے اسے بیرونی دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ پھر ذرا دیر بعد ایک مردانہ آواز سنائی دینے لگی۔ وہ یقیناً اکرم خان تھا جو اپنے گھر آیا تھا۔ اس کی آواز سن کر اس نے جلدی جلدی ہاتھ چلانے شروع کیے اور اس کے حصے کی روٹیاں بھی پکا ڈالیں۔ روٹی پکانے کے بعد وہ کھانے کے برتن وغیرہ لے کر اندر کمرے میں گئی۔ اکرم خان اپنی ماں کے پاس بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ خوش ہو گیا۔

"جیو ہمارا بہن! ہم ہمیشہ سوچتا تھا کہ ہمارا کوئی بہن ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ آج تم کو دیکھ کر لگ رہا ہے کہ اللہ نے ہمارا تمنا پورا کر دیا۔" اسے کھانا لگاتا دیکھ کر وہ اپنی خوشی کا اظہار کرنے لگا۔ اسے اس طرح خوش ہوتا دیکھ کر وہ مسکرانے لگی۔

"تمہارے لیے شہریار صاحب نے کچھ سامان بھجوایا ہے۔ یہ اِدھر رکھا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد تم دیکھ لینا اور ان کو کوئی خط شط لکھنا ہو تو وہ بھی بعد میں لکھ لینا۔ ابھی ہم ایک ٹیم کے ساتھ ہوٹے تک جاتا ہے۔ وہ لوگ اِدھر رکا تھا تو ہم تھوڑی دیر کے لیے گھر آ گیا تھا۔ ٹیم کو ہوٹے میں چھوڑ کر واپس آئے گا، تب بھی تھوڑی دیر رک کر واپس اسکردو جائے گا۔" اس کی اطلاع پر ماہ بانو کی نظر ایک طرف رکھے گتے کے بڑے سے کارٹن پر پڑی۔ وہ کھانا کھانے کے بجائے فوراً اٹھ کر اس کارٹن کے قریب پہنچی۔ اس پر چپکی سفید رنگ کی چٹ پر جلی حروف میں لکھا تھا "اکرم خان پورٹر۔ گاؤں کا ندے ڈاک خانہ ... تحصیل مشابرم ... ضلع گھانچے۔ اسکردو بلتستان۔ پاکستان۔"

"اس پر تو آپ کا نام لکھا ہے اکرم بھائی!"

"وہ تو اس لیے لکھا ہے کہ اِدھر سب ہم کو جانتا ہے۔ پر صاحب نے اُدھر کے ہوٹل میں ہم کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ ماہ بانو بی بی کے لیے سامان بھجوا رہا ہوں۔ ویسے بھی وہ ہمیں کیوں کچھ بھجوائے گا؟ آپ کو ہی بھیجا ہے یہ سب۔" اکرم خان نے ہنستے ہوئے اسے یقین دلایا تو اسے قائل ہونا پڑا۔ پھر اس تجسس نے کہ اس کارٹن میں کیا ہے، اسے فوراً ہی کارٹن کھولنے پر مجبور کر دیا۔ سامان کے اوپر ہی ایک سفید رنگ کا لفافہ رکھا تھا جس پر اس کا نام موجود تھا۔ اس نے... بیتابی سے لفافہ کھولا۔

"امید ہے کہ تم خیریت سے ہو گی۔ لاہور سے عجلت میں روانہ ہونے کی وجہ سے تمہاری ضرورت کا سامان نہیں لیا جا سکا تھا۔ اپنے اندازے کے مطابق کچھ چیزیں بھجوا رہا ہوں۔ اگر ان کے علاوہ بھی کسی اور شے کی ضرورت ہو تو اکرم خان کو لکھ کر دے دینا۔ میں اس سے فون پر معلوم کر لوں گا۔" نہایت مختصر پیغام پر مشتمل اس خط کے علاوہ لفافے میں کچھ رقم بھی موجود تھی۔ وہ لفافہ بند کر کے کارٹن میں موجود سامان کا

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاء اللہ اولاد ہو گی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپ کے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061

0547-521787

فون اوقات

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں
دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

www.pkdigest.com

جائزہ لینے لگی۔ گرم ملبوسات، اس کے کورس کی کتابیں، موسم سرما میں استعمال ہونے والے لوشنز کے علاوہ کچھ تفریحی رسائل وغیرہ بھی موجود تھے۔ اس نے بے حد خیال سے اس کی ضرورت کی تمام اشیا بھیجی تھیں اور فی الحال اسے اس سامان میں کسی شے کی کمی محسوس نہیں ہو رہی تھی پھر بھی دل کچھ اداس سا ہوگیا۔ دل میں خواہش سی مچلی کہ کاش اس سارے سامان کے بجائے وہ خود اس کی خیریت معلوم کرنے یہاں تک آگیا ہوتا لیکن پھر وہ خود ہی اپنی اس خواہش پر اپنے آپ کو سرزنش کرنے لگی کہ اسے کیا شہریار عادل جیسے اونچی حیثیت والے شخص کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ اس جیسی معمولی لڑکی سے ملنے اس دور دراز گاؤں تک آتا۔ اس نے انسانیت کے ناتے اسے یہ سب چیزیں بھجوادی تھیں تو یہ بھی اس کا بہت بڑا احسان تھا۔

"اماں کہہ رہی تھی کہ تم صبح سے روٹی نہیں کھاتا ہے۔ ہم اس بار آئے گا تو ساتھ میں دوسرا آٹا لے کر آئے گا۔ یہ گیہوں کا روٹی کھانا واقعی بڑا مشکل ہوتا ہے، پر کیا کرے... جب سے ادھر سیلاب نے تباہی مچایا ہے، بڑا مشکل پڑ گیا ہے۔ کتنا لوگ نے تو ادھر سے دور کیندا اس جھنگ میں جا کر بستی آباد کرلیا ہے حالانکہ اُدھر ان کو پانی کا بڑا پریشانی ہے۔ خیر، ہم آئے گا تو اسکردو سے اچھا والا گندم کا آٹا لے کر آئے گا۔" وہ اپنے خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی اس لیے معلوم ہی نہیں ہوسکا کہ کب اکرم کھانے سے فارغ ہوا اور اماں برتن اٹھا کر باہر نکل گئی۔ اکرم خان بولا تو وہ چونکی پھر شرمندہ سی ہو کر بولی۔

"ایسی کوئی بات نہیں بھائی اکرم! بس ابھی عادت نہیں ہے اس لیے مشکل ہو رہی ہے۔ آہستہ آہستہ عادت پڑ جائے گی۔ تم بتاؤ مشابرم خان کا کیا حال ہے؟ اے سی صاحب نے اس کی خیریت کے بارے میں کچھ بتایا ہے کہ نہیں۔"

"وہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ اس کا نام ہمارے باپ نے مشابرم کی چوٹی سے واپس آنے کے بعد مشابرم خان رکھا تھا۔ ہمارا بھائی کسی پہاڑ کی طرح ہی مضبوط اور طاقتور ہے۔ چھوٹا موٹا زخم اسے کچھ نہیں کہتا۔ وہ مرد کا بچہ ہے، ہر تکلیف بہادری سے سہہ سکتا ہے۔ اگر اماں کی دی قسموں کا خیال نہ ہوتا تو وہ شیر جوان گورا لوگ کے ساتھ بڑی بڑی چوٹیاں سر کرنے جاتا۔ نگل ممی (نانگا پربت) تو اس کو بہت اچھا لگتا تھا، پر اماں نے ہم دونوں بھائیوں کو قسم دیا کہ ہم اُدھر جانے کا سوچے گا بھی نہیں تو بس پھر وہ شہر چلا گیا۔ کہتا تھا کہ ادھر رہوں گا تو پہاڑوں سے دور نہیں رہ سکوں گا اور ماں کی دی قسم توڑ دوں، یہ بھی گوارا نہیں۔"

"مگر اماں نے ایسی قسم دی ہی کیوں؟" اکرم خان کی بات سن کر اس نے حیرت سے پوچھا۔

"اماں اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ اصل میں ہمارا باپ ہماری پیدائش کے تھوڑے عرصے بعد ہی ایک ٹیم کے ساتھ کلائمنگ کے لیے گیا تھا تو اُدھر ایوالانچ میں دب کر مر گیا۔ باپ پر اماں نے صبر کرلیا لیکن جب ہمارا سب سے بڑا بھائی اجمل خان براڈ ووریا میں گر کر مرا تو اماں نے ہم دونوں سے وعدہ لیا کہ ہم خود کو ایسے خطرے میں نہیں ڈالیں گے۔ بس پھر مشابرم خان اُدھر چلا گیا اور ہم اِدھر رہتا ہے لیکن اسکردو سے لے کر بس ہوشے تک کا ہی سفر کرتا ہے۔ آگے پہاڑوں کا سفر نہیں کرتا۔ پیسا کم بنتا ہے، پر پروا نہیں... ماں تو خوش ہے۔"
اکرم خان نے اداس لہجے میں بتایا اور پھر یک دم ہی عجلت کا مظاہرہ کرتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

"اب ہم چلتا ہے، بہت دیر ہوگیا ہے۔ اُدھر صاحب لوگ ناراض ہو رہا ہوگا کہ پورٹر کدھر چلا گیا ہے۔" اپنی بات کہنے کے بعد دوسرے بغیر باہر نکل گیا۔ ماہ بانو عقیدت سے ان لوگوں کے بارے میں سوچتی رہی جو پہاڑوں کے باسی تھے اور پہاڑ جیسا ہی ظرف رکھتے تھے۔ اکرم خان نے ایک بار بھی تو اسے نہیں جتایا تھا کہ اس کا بھائی جسے ماں نے اس کی سلامتی کے خیال سے پہاڑوں کے سفر سے روک دیا تھا، اس کی خاطر شدید زخمی ہو کر اسپتال میں پڑا تھا۔ بس اس نے یہاں آتے ہوئے اتنی گزارش کی تھی کہ ماں کو مشابرم خان کے زخمی ہونے کے بارے میں نہ بتانا۔ اس کے بعد جیسے وہ سب کچھ بھول گیا تھا اور کچھ یاد تھا تو صرف اتنا کہ وہ اس کے گھر مہمان ہے جس کا اس نے ہر ممکن خیال رکھنا ہے۔ بقا کی جدوجہد میں بھٹکتی وہ کچھ اور لوگوں کے خلوص کی مقروض ہوگئی اور جانے ابھی یہ سلسلہ کب تک جاری رہنا تھا۔

☆☆☆

صبح صبح کا وقت تھا۔ کشور اپنے کمرے سے نکلی اور اوپری منزل کی طرف جانے والی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ حویلی کے مکینوں میں سے وہی تھی جو اکثر و بیشتر وہاں جاتی رہتی تھی۔ جانے کا مقصد اپنے سوتیلے بھائی چودھری بہزاد کی خیر و عافیت سے آگاہ رہنا ہوتا تھا۔ چودھری بہزاد کی مری ہوئی ماں نے اسے علم کی روشنی عطا کرنے کا جو احسان کیا تھا۔ وہ اس احسان کا بدلہ اس کے ایب نارمل بیٹے کی وقتاً فوقتاً خبر گیری کے ذریعے اتارنے کی کوشش کرتی تھی لیکن آج

سیڑھیاں طے کر کے اوپری منزل تک پہنچنے کا مقصد کچھ اور تھا۔ وہ اس لڑکی سے ملنا چاہتی تھی جو کل رات چودھری بہزاد کی دلہن بن کر حویلی میں آئی تھی۔ حویلی کی خواتین کو یہ تو معلوم تھا کہ چودھری بہزاد کی شادی نور پور کے زمیندار چودھری بختیار کی بہن سے ہو رہی ہے لیکن یہ بات کسی کے پلے نہیں پڑی تھی کہ چودھری بختیار نے اپنی بہن کی شادی ایک ایب نارمل لڑکے سے کرنا کیسے منظور کرلیا۔ تاجور اور منور نے خیال ظاہر کیا تھا کہ ہو نہ ہو، لڑکی میں ضرور کوئی عیب تھا جب ہی یہ بیاہ ممکن ہوسکا۔ وڈی چودھرائن کے خیال میں لڑکی خود بھی پگلی ہی تھی۔ کشور کی ماں ناہید کا خیال تھا کہ چودھری بختیار، چودھری افتخار کا مقروض تھا اور اس نے قرض معاف کروانے کے لیے بہن کو بلی چڑھا دیا۔ غرض ہر فرد نے ہی اپنے اپنے طور پر اس شادی کے بارے میں کوئی نہ کوئی خیال آرائی ضرور کی تھی۔ حقیقت کا کسی کو علم نہیں تھا۔ یہاں تک کہ برات کے ساتھ بھی حویلی کی کسی عورت کو نہیں لے جایا گیا تھا۔ چودھری کے ساتھ اس کے چند خاص ملازمین، آس پاس کے دیہاتوں کے ایک دو زمیندار اور چودھری بہزاد کے ذاتی کاموں کے لیے مختص ملازمہ نے ہی برات میں شرکت کی تھی۔ اسی ملازمہ نے دلہن کو رخصت کرکے لانے کے بعد اوپری منزل پر اس کے کمرے تک پہنچانے کا فرض بھی ادا کیا تھا۔ جب تک چودھری افتخار کی اجازت نہیں ملتی، کسی کی مجال نہیں تھی کہ خود سے چند سیڑھیوں کا فاصلہ طے کر کے اوپری منزل تک چلا جاتا لیکن کشور کے تجسس نے اسے زیادہ صبر نہیں کرنے دیا اور وہ صبح ہی صبح جبکہ ابھی سارے لوگ سوئے ہوئے تھے، اوپری منزل پر جا پہنچی۔ اس وقت وہاں بھی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس نے سب سے پہلے چودھری بہزاد کے کمرے کا رخ کیا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ اس نے ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اس نے کھلے دروازے سے اندر جھانک کر دیکھا تو اسے بہزاد اپنے پلنگ پر گہری نیند میں ڈوبا نظر آیا۔ بستر پر اس کے ساتھ اس کا چہیتا بھالو بھی موجود تھا اور وہ اس بڑے سے بھالو کی گردن میں اپنی بانہیں ڈالے دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔ نیچے قالین پر اس کی ملازمہ خاص بھی گہری نیند سو رہی تھی۔ کمرے میں دلہن کا کوئی نام و نشان نہیں تھا اور نہ ہی ایسا کوئی اہتمام نظر آتا تھا جو کسی نئی نویلی دلہن کے استقبال کا پتا دیتا۔ نہ کوئی سجاوٹ تھی اور نہ ہی پھول پتیوں کا وجود۔ وہ الجھی ہوئی سی وہاں سے ہٹ گئی۔ یہ تو سوچا نہیں جاسکتا تھا کہ دلہن وہاں لائی ہی نہیں گئی۔ تجسس کی ماری وہ رات گئے تک برات کے واپس لوٹنے کے انتظار میں جاگتی رہی تھی اور اس نے خود اپنے کمرے کی کھڑکی سے بڑی سی چادر میں لپٹی دلہن کو حویلی میں اترتے دیکھا تھا لیکن وہ جس کی دلہن بنا کر لائی گئی تھی، اس کے کمرے میں موجود نہیں تھی۔ اب یہی سوچا جاسکتا تھا کہ وہ کسی اور کمرے میں ہے۔ اس خیال کے ذہن میں آنے پر وہ تیزی سے دوسرے کمروں کے دروازے کھول کر جھانکنے لگی۔ کمرے حسب معمول خالی تھے۔ اوپری منزل چودھری بہزاد کے سوا کسی کے استعمال میں نہیں رہتی تھی اور ان کمروں کے استعمال کی نوبت صرف اسی وقت آتی تھی جب حویلی میں بے تحاشا مہمان ہوتے تھے۔ عموماً ایسا سالانہ عرس کے موقعے پر ہی ہوتا تھا۔

کشور ایک ایک کمرے کو دیکھتی چوتھے کمرے میں پہنچی تو اسے بستر پر ایک سرخ رنگ کی گٹھڑی سی پڑی نظر آئی۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ سرخ عروسی جوڑے میں ملبوس ایک لڑکی ہے جو گھٹنے پیٹ سے لگائے بے حس و حرکت پڑی ہوئی ہے۔ وہ جلدی سے اس لڑکی کے قریب پہنچی۔ قریب سے جائزہ لینے پر اسے اور بھی بہت کچھ دیکھنے کو ملا۔ بستر پر پڑے مسلے ہوئے پھول، ٹوٹی ہوئی کانچ کی چوڑیاں اور مزید کچھ نشانیاں ایسی تھیں جو گزری رات کا افسانہ سنا رہی تھیں۔ اسے حیرت سی ہوئی کہ اپنے کمرے میں بھالو کی گردن میں بانہیں ڈال کر سونے والے اس پگلے چودھری بہزاد نے یہ افسانہ کیسے رقم کیا ہوگا؟ حیرت میں ڈوبے ڈوبے ہی اس نے لڑکی کا چہرہ دیکھنے کے لیے اس کے چہرے پر پڑا اس کا آنچل سرکایا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ لڑکی کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں حالانکہ وہ یوں بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی کہ اسے لمحے بھر کو گمان گزرا تھا کہ کہیں وہ بے ہوش تو نہیں ہے۔ اب جو آنکھوں کے حرکت کرتے ہوئے ڈیلے دیکھے تو یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ ہوش میں ہے۔

"میں کشور ہوں۔ چودھری بہزاد شاہ کی بہن۔" اپنا تعارف کرواتے ہوئے اس نے لڑکی کے چہرے پر موجود آنسوؤں کے نشانات کا بھی جائزہ لیا۔ لگتا تھا کہ وہ کئی گھنٹوں تک روتی رہی ہے۔

"میرا تماشا دیکھنے آئی ہو؟" اس کا تعارف سن کر وہ قہر آلود لہجے میں بولی تو پہلی بار کشور کی نظر اس کے نچلے ہونٹ پر موجود زخم پر پڑی۔ اسے شدت سے کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا۔ اس کے سامنے موجود لڑکی بے شک عروسی لباس میں تھی لیکن سہاگن والی ذرا سی بھی رمق اس کے وجود میں نہیں جھلک رہی تھی۔ وہ تو کوئی لٹی پٹی، برباد ہوجانے والی عورت نظر آرہی تھی۔ اگر اسے آفتاب کی قربت کا تجربہ نہ ہوا

www.pkdigest.com

ہوتا تو وہ اتنی باریک بینی سے اس لڑکی کا جائزہ لے کر کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتی تھی۔ آفتاب کو پانے کے بعد اس نے جب بھی آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تھا، اسے وہاں عجیب سی چمک نظر آئی تھی... لیکن یہ لڑکی تو ایسا لگتا تھا کہ قبر سے نکلا ہوا کوئی مردہ ہو۔ شاید اس کا یہ حال اس لیے تھا کہ اسے رفیقِ حیات کے طور پر چودھری بہزاد کا ساتھ ملا تھا اور یقینی طور پر یہ ساتھ کسی بھی ہوش مند لڑکی کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے شدت سے لڑکی کے لیے اپنے دل میں ہمدردی محسوس کی اور اس کے سرہانے بیٹھ کر اپنے ہاتھ سے اس کے بکھرے ہوئے بال سنوارتے ہوئے بولی۔

''مجھے معلوم ہے کہ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ بہزاد کسی طور تمہارے لائق نہیں تھا۔ اباجی کو تمہارے ساتھ ایسا ظلم نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''تمہیں کیا خبر کہ تمہارے باپ نے میرے ساتھ کتنا بڑا ظلم کیا ہے؟ اس ظلم کا بدلہ ایک دن اسے کیا اس کے پورے خاندان کو چکانا پڑے گا۔'' نہایت تلخی سے کہتے ہوئے اس نے کشور کا ہاتھ جھٹکا اور اپنی جگہ پر اٹھ بیٹھی۔

''قصور صرف اباجی کا تو نہیں۔ تمہارے گھر والوں نے بھی تو جانتے بوجھتے تمہیں بہزاد سے بیاہا ہے۔ تمہیں بددعا دینی ہے تو انہیں بھی دو۔'' اسے اپنے خاندان کو بددعا دینا برا لگا تھا اس لیے اسے ٹوک بیٹھی۔

''جانتے بوجھتے نہیں، مجبوری میں اپنی عزت بچانے کے لیے انہیں یہ فیصلہ کرنا پڑا... ورنہ میرے بھائی تو سخت ناپسند کرتے ہیں تمہارے اباجی کو۔ عام حالات میں تمہارے اس پاگل بھائی کے بجائے اگر ولایت سے ڈگری لانے والے بھائی کا پیغام بھی آتا تو میرے بھائی صاف انکار کر دیتے، پر ابھی تو وہ مجبور ہو گئے تھے۔''

''وہ کیسے؟'' کشور نے حیرت سے پوچھا۔

''میرے نصیب کی خرابی ان کی مجبوری بن گئی۔'' اس نے اداسی سے جواب دیا۔

''میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھی۔ تم اس طرح پہیلیاں بجھوانے کے بجائے ذرا کھل کر تفصیل سے سب کچھ نہیں بتا سکتیں؟'' وہ تھوڑا سا جھنجلائی۔

''پر میں تمہیں کچھ بتاؤں ہی کیوں؟ تم کون لگتی ہو میری؟'' وہ بھی اکڑنے لگی۔

''لگنے لگانے کو چھوڑو۔ اگر تم چاہو تو ہم ایک دوسرے کی سہیلیاں بن سکتے ہیں۔ سمجھو میں بھی تمہاری طرح اس حویلی میں تنہا ہوں اور تمہاری طرح میرے بھی بہت سے حقوق پامال کرتے ہوئے زندگی کی حقیقی خوشیوں سے دور رکھنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔'' اس کی گُلی کا بُرا مانے بغیر وہ نرمی سے بولی تو وہ کچھ دیر تو اسے جانچنے والی نظروں سے دیکھتی رہی پھر بولی۔

''تم کہتی ہو تو میں تمہاری گل کا یقین کر لیتی ہوں۔ اگر تمہارا کہا جھوٹ بھی نکلا تو میرا کیا بگڑے گا۔ میرا تو جو نقصان ہونا تھا، وہ ہو چکا۔''

کشور نے اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا، بس منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ آخر کار اس نے بتانا شروع کیا۔

''میں فریدہ ہوں۔ نور پور کے چودھری بختیار کی چھوٹی اور اکلوتی بہن۔ میں اپنے چچازاد قربان سے محبت کرتی تھی۔ قربان ساتھ والے پنڈ میں ہی رہتا تھا لیکن رشتے داری کے باوجود کچھ دشمنیوں کی وجہ سے ہمارا آپس میں ملنا جلنا نہیں تھا۔ اتفاق سے میں اور قربان ایک ویاہ پر ایک دوجے سے ملے تو فیر ایک دوجے کی محبت میں مبتلا ہو گئے اور دشمنی کے باوجود آپس میں چھپ چھپ کر ملنے لگے۔ قربان سے بڑے بھائی سبحان کو یہ گل پتا چلی تو وہ ہمارے پیچھے پڑ گیا اور قربان کو مجبور کرنے لگا کہ وہ مجھ سے ناتا توڑ لے۔ قربان نہ مانا تو وہ پہلے دھمکیوں پر اتر آیا فیر ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے لگا۔ ہم نے فیر بھی ایک دوجے سے ملنا نہیں چھوڑا۔ کچھ دن گزرے، میں اور قربان ایک دوجے کے ساتھ تھے کہ سبحان نے ہمیں گھیر لیا۔ اس روز قربان اپنی گھوڑی پر بیٹھ کر مجھ سے ملنے آیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ سبحان پر خون سوار ہے تو اس نے مجھے اپنے ساتھ گھوڑی پر بٹھایا اور گھوڑی دوڑا دی، پر ہم جاتے کہاں؟ دونوں میں سے کسی کے بھی گھر والے ہمارے ساتھ کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ ایسے میں قربان کے ذہن میں آیا کہ پیر آپاد چلتے ہیں اور وہاں پیر سرکار کے مزار میں پناہ لے لیتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ ہم نے مزار میں پناہ لے لی تو پھر چودھری افتخار بھی ہمارا ساتھ ضرور دے گا۔ علاقے کے سب سے وڈے چودھری کی حمایت مل جاتی تو کسی میں مخالفت کی جرأت نہیں رہتی، پر چودھری نے تو ہمارے ساتھ عجیب ہی چال چلی۔ اس نے قربان کے گھر والوں کو بلا کر اسے ان کے حوالے کیا اور مجھے اپنے ڈیرے پر قید کرنے کے بعد میرے بھائی کو پیغام بھجوا دیا کہ اگر اپنی پگ بچانا چاہتے ہو تو اپنی بہن کا نکاح میرے چھوٹے پتر سے پڑھانے کو تیار ہو جاؤ ورنہ لڑکی تو ہمارے ہی قبضے میں ہے، ہم جو چاہیں گے اس کے ساتھ وہ سلوک کریں گے اور

www.pkdigest.com

پھر تماشا بھی لگائیں گے۔ بھائی وچارے اس دھمکی کو سن کر ڈر گئے۔ مجھے بچانا تو ان کے لیے کسی صورت ممکن نہیں تھا، سو انہوں نے یہی بہتر سمجھا کہ اپنی پگ بچا لیں۔ میں نے بھی ان کی خاطر ہتھیار ڈال دیے ورنہ سچ یہ ہے کہ تمہارے اباجی کا کوئی فیصلہ ماننا تو دور کی گل ہے، میں تو اس شخص پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی۔'' اس کے لہجے میں شدید نفرت تھی اور کشور کے خیال میں وہ اس نفرت کے لیے حق بجانب بھی تھی۔ جس سے اس کی محبت چھین کر اس کا وجود کسی ایب نارمل انسان کے حوالے کر دیا گیا ہو، اس لڑکی کے پاس خود سے زیادتی کرنے والے کے لیے نفرت کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔

''میں شرمندہ ہوں فریدہ کہ میرے اباجی نے تمہارے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کیا لیکن میں شرمندہ ہونے کے سوا اور کر بھی کیا سکتی ہوں؟ میں تو خود روایتوں اور پابندیوں میں جکڑی ایک کمزور لڑکی ہوں جسے خود ہر پل کسی ایسے روزن کی تلاش رہتی ہے جہاں سے کچھ تازہ ہوا اور روشنی اندر آ سکے۔''

''میں جانتی ہوں، تب ہی تو تمہیں تمہارے باپ کا وہ روپ نہیں دکھایا جسے دیکھنے کے بعد تم شرم سے زندہ زمین میں دفن ہو جانے کی خواہش کرنے لگو گی۔'' اپنی بات کے جواب میں کہی گئی فریدہ کی بات نے اسے بُری طرح چونکا دیا۔

''کیا مطلب ہے؟''

''مطلب رہنے دو۔ میں نہا کر آتی ہوں۔ تم اتنی دیر میں میرے لیے ناشتے پانی کا تو انتظام کرواؤ۔ ملازمہ سے کہنا کہ اسے رات کو آنکھیں بند کر کے رکھنے کا حکم ہے، اب دن میں تو آنکھیں کھول لے اور کچھ ہاتھ پیر چلائے۔'' اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی اور انداز بھی یکسر بدلا ہوا تھا۔ وہ جو تھوڑی دیر پہلے ایک لٹی پٹی سی عورت دکھائی دیتی تھی، اب کوئی چوٹ کھائی ہوئی ناگن لگ رہی تھی جس کا بس نہیں چلتا کہ کس طرح خود کو چوٹ لگانے والے سے انتقام لے۔ اس سے یہ سب کہہ کر وہ غسل خانے میں گھس گئی لیکن کشور کچھ بھی نہ سمجھنے والے انداز میں اس الجھی پہیلی کے حل کے لیے وہیں بیٹھی، کوئی سرا کھوجتی رہ گئی۔

☆☆☆

ولیمے کی تقریب میں شریک شہریار مختلف لوگوں سے ملاقات کرتے ہوئے اردگرد کا بھی جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ تقریب میں بہت زیادہ لوگ شریک نہیں تھے۔ صرف مقامی افسران، زمینداروں اور رشتے داروں کو ہی مدعو کیا گیا تھا۔ ایسا یقیناً وقت کی قلت اور دولہا کی ذہنی معذوری کی وجہ سے ہوا تھا ورنہ چودھری افتخار جیسا بندہ تو موقعے کی تلاش میں رہتا تھا کہ کس طرح اہم شخصیات سے تعلقات اور رسم و راہ بڑھا سکے مگر آج کی اس تقریب کا رنگ پھیکا تھا۔ یہاں تک کہ دلہن کا بھائی چودھری بختیار بھی دعوت میں شریک نہیں تھا۔ اسے موقع نہیں مل سکا تھا کہ چودھری بختیار سے ملاقات کے لیے جاتا اور اس بے جوڑ شادی کے بارے میں استفسار کرتا۔ خود چودھری بختیار کی طرف سے بھی شادی کا دعوت نامہ نہیں ملا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ولیمے کی تقریب میں ملاقات ہوگی تو وہ چودھری سے اس ظلم کی بابت دریافت کرے گا لیکن یہ بھی ممکن نہیں ہو سکا۔ چودھری بختیار نے اپنی معذوری اور بیماری کا عذر پیش کر کے تقریب میں شرکت سے انکار کہلا دیا تھا۔

شہریار کے گرد سے لوگوں کا ہجوم چھٹا تو اس کی نظر آفتاب پر پڑی۔ وہ بھی اس تقریب میں شریک تھا۔ ایک ملازم سے کہہ کر اس نے اسے اپنی ٹیبل پر بلوا لیا۔

''کیا حال ہے آفتاب؟ مجھے امید نہیں تھی کہ تم سے یہاں ملاقات ہو سکے گی۔'' آفتاب کے قریب آنے پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے اس سے کہا۔

''جی ہاں، امید تو مجھے بھی نہیں تھی کہ حویلی کی کسی تقریب میں مجھے مدعو کیا جائے گا لیکن شاید وزیروں، سفیروں کی کمی کی وجہ سے ہماری گنجائش نکل آئی۔'' اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''وزیروں، سفیروں کو بلا کر چودھری افتخار کو اپنے لیے مصیبت بلوانی تھی؟ وزیر، سفیر آتے تو ساتھ میڈیا والے بھی آتے اور یہ بات خوب اچھلتی کہ چودھری صاحب نے اپنے ذہنی معذور بیٹے کا نکاح ایک چھوٹے زمیندار کی صحت مند لڑکی سے کیا ہے۔ وہ لوگ اصل اسٹوری بھی کھوجنے کی کوشش کرتے کہ یہ نکاح ہوا کیسے؟ ویسے میرے خیال میں تمہیں تو علم ہوگا اس اسٹوری کا؟'' اس نے بڑے یقین سے آفتاب سے سوال کیا تو وہ انکار نہیں کر سکا اور کشور کی زبانی علم میں آنے والی تمام معلومات فراہم کر دیں۔

''مجھے پہلے ہی شک تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔ چودھری بختیار عرصے سے چودھری افتخار کی آنکھوں میں کھٹک رہا تھا۔ اس نے موقع دیکھ کر اس بے چارے کی مجبوری سے فائدہ اٹھا لیا۔'' ساری تفصیل سن کر اس نے دانت کچکچاتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔ اس وقت وہ اور آفتاب ٹیبل پر تنہا تھے اور گفتگو بھی دھیمی آواز میں ہو رہی تھی اس لیے کسی اور کے کچھ سن لینے کا احتمال نہیں تھا۔

''چودھری کی شقی القلبی کوئی ڈھکی چھپی بات تو نہیں

سر! ہم لوگ تو خود اس کی اس فطرت کا مظاہرہ دیکھ چکے ہیں۔" آفتاب دھیمے لہجے میں بولا۔ اسی وقت ملازمین نے کھانا لگانا شروع کردیا۔ ان کی میز پر کھانا لگ چکا تو چودھری خود لپک کر ان کی طرف آیا۔

"بسم اللہ کیجیے اے سی صاحب! آج اس خوشی کے موقعے پر تکلف بالکل بھی نہیں چلے گا۔" آفتاب کو مکمل طور پر نظرانداز کرتے ہوئے اس نے شہریار سے کہا اور خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ایکسکیوزمی! میرے ساتھی میرا انتظار کررہے ہیں، میں ان کے پاس جاکر بیٹھتا ہوں۔" آفتاب خود ہی معذرت کرتا ہوا وہاں سے اٹھ گیا۔ اس نے چودھری کی ناگواری بھانپ لی تھی کہ اسے ایک معمولی اسکول ٹیچر کا اس جگہ بیٹھنا اچھا نہیں لگا تھا۔

"شروع کیجیے جناب! میں دو چار لقمے آپ کے ساتھ لینے کے بعد باقی مہمانوں کا ساتھ دینے ان کے درمیان جاکر بیٹھوں گا۔ میری ذاتی خواہش تو یہی تھی کہ آپ سب معززین ایک ہی جگہ بیٹھ کر کھانا تناول کرتے لیکن باجوہ صاحب نے خیال ظاہر کیا کہ آپ ان کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کریں گے۔ ایس پی صاحب سے بھی آپ کے تعلقات کچھ زیادہ خوشگوار نہیں اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ آپ حضرات کو ایک میز پر جمع ہونے کی زحمت نہ دی جائے۔ ناگواری کے ساتھ بھلا کیا خاک کچھ کھایا جاتا ہے۔" اسے کھانے کی ترغیب دیتے ہوئے چودھری نے خود بھی اپنے لیے ایک پلیٹ میں تھوڑا سا سالن نکال لیا۔ شہریار نے البتہ چاول لینا پسند کیا۔ یہ چند لقمے چاول بھی وہ بمشکل ہی کھا سکا۔ ایک تو چودھری کی کمائی میں حرام کی آمیزش کا خیال، دوسرے یہ احساس کہ ایک معصوم لڑکی کے ارمانوں کی راکھ پر خوشی کی یہ محفل برپا کی گئی ہے، اسے بری طرح کچوکے لگا رہا تھا۔ دلہن اندر زنان خانے میں تھی لیکن دولہا کے طور پر اِدھر اُدھر پھرتے چودھری بہزاد کو دیکھ کر تو اندازہ لگایا ہی جاسکتا تھا کہ اس شادی سے اس بےچاری پر کیا گزری ہوگی۔

"آپ نے تو کچھ کھایا ہی نہیں۔ ذرا سا چکھ کر ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ کچھ اور بھی لیجیے نا۔" اسے ہاتھ کھینچتے دیکھ کر چودھری نے ٹیبل پر موجود انواع واقسام کی ڈشز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اصرار کیا۔

"بس چودھری صاحب! مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"اچھا تو یہ ذرا سا میٹھا ہی چکھ لیں۔" اس کے انکار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے چودھری نے زبردستی اس کی پلیٹ میں کھیر ڈال دی۔ ناچار اسے دو تین چمچے کھیر کھانی پڑی۔

"مجھے اچھا نہیں لگ رہا آپ کا اس طرح سونگھنے کے انداز میں کھانا کھانا۔ بہرحال، میں آپ سے زبردستی بھی نہیں کرسکتا۔ آپ بیٹھیے، میں ذرا دوسرے مہمانوں کو بھی دیکھ لوں۔" چودھری وہاں سے اٹھ کر اس دوسری میز پر چلا گیا جہاں باجوہ اور تارڑ کے علاوہ کچھ دوسرے مقامی افسران بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک ملازم شہریار کی میز پر سے کھانے کے برتن سمیٹنے لگا۔ ابھی برتن مکمل طور پر سمیٹے بھی نہیں گئے تھے کہ اسے پیٹ میں ہلکی سی تکلیف محسوس ہوئی۔

"لگتا ہے چودھری کا حرام مال مجھے ہضم نہیں ہوا۔" وہ آہستہ سے بڑبڑایا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ فارمیلٹی پوری ہوگئی تھی اور اب مزید یہاں رکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے کھڑا ہوتے دیکھ کر چودھری دیگر مہمانوں کو چھوڑ کر لپک کر اس کی طرف آیا۔

"ارے یہ کیا اے سی صاحب! آپ اتنی جلدی جانے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ ہمارا ارادہ تو آج کی رات آپ کو یہیں روکنے کا تھا۔ دوستوں کی تفریح کے لیے کچھ خاص انتظام کیا تھا ہم نے۔ آپ ہماری درخواست پر رک جائیں تو بڑے لطف اندوز ہوں گے۔" ایک آنکھ دباتے ہوئے اس نے معنی خیز لہجے میں اسے ترغیب دی۔

"میری طرف سے معذرت چودھری صاحب! میرا ابھی کسی تفریح کا موڈ نہیں اور طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔" پیٹ میں اٹھنے والی درد کی شدید لہر کو برداشت کرتے ہوئے اس نے انکار کیا۔

"اگر آپ کی مرضی نہیں تو میں زبردستی نہیں کروں گا۔ آئیے میں آپ کو آپ کی گاڑی تک چھوڑ دوں۔" اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے چودھری نے پیش کش کی اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا لیکن شہریار محسوس کررہا تھا کہ ہر اٹھتے قدم کے ساتھ اس کی تکلیف میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔ اب تکلیف کے ساتھ ساتھ شدید چکر اور متلی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کے قدم لڑکھڑانے سے لگے۔

"آپ کی طبیعت تو زیادہ ہی خراب لگ رہی ہے۔ ایسا کریں آج رات یہیں حویلی میں آرام کرلیں۔ میں ڈاکٹر کو یہیں بلوا لیتا ہوں۔ آرام آجائے تو کل صبح واپس چلے جائیے گا۔" اس کی حالت دیکھتے ہوئے چودھری نے پیش کش کی۔

"نہیں، میں واپس جاؤں گا۔" تکلیف کے باوجود وہ اپنی بات پر اڑا ہوا تھا لیکن پھر زوردار ابکائی آئی اور اسے

قے ہوگئی۔ چودھری فوراً ہی اپنے ملازمین کو آواز دینے لگا۔ ملازمین اس کی آواز سن کر دوڑے چلے آئے۔ مہمان بھی متوجہ ہوگئے۔ متوجہ ہونے والوں میں آفتاب بھی شامل تھا۔

"اے سی صاحب کو اندر لے چلو اور اسپتال سے ڈاکٹر کو لے کر آؤ۔" چودھری نے ہدایات جاری کیں جن پر فوراً عمل درآمد کیا جانے لگا۔ شہریار پر اتنی نقاہت طاری ہوچکی تھی کہ وہ اپنی کوئی رائے دینے کے قابل نہیں رہا تھا اور کسی اور میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ چودھری کی رائے کے سامنے اپنی رائے دے سکتا۔ یوں بھی صورت حال کے مطابق اس نے جو احکامات جاری کیے تھے، وہ مناسب ہی معلوم ہوتے تھے۔ آفتاب البتہ تشویش میں مبتلا تھا کہ اچانک شہریار کی اتنی زیادہ طبیعت کیسے خراب ہوگئی۔ کھانے سے قبل تو وہ اس کے ساتھ بالکل ٹھیک ٹھاک بیٹھا باتیں کررہا تھا۔ کھانا کھانے کے تھوڑی دیر بعد ہی اس کی یہ حالت ہوجانا اسے شک میں مبتلا کررہا تھا کہ کہیں کھانے میں تو کوئی گڑبڑ نہیں تھی... لیکن اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ کھانے میں چودھری خود بھی شہریار کے ساتھ شریک تھا۔ اگر کھانے میں کچھ ملا ہوا تھا تو اس پر بھی اثر ہونا چاہیے تھا جبکہ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک نظر آرہا تھا۔ ملازمین شہریار کو اٹھا کر اندر لے گئے۔ اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ اس قدر نڈھال ہوچکا ہے کہ تقریباً نیم بےہوشی کی حالت میں ہے۔

"آپ یہیں رکو ماسٹر صاحب! سرکار کا حکم ہے کہ کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے۔ بھیڑ بھاڑ سے مریض کو پریشانی ہوگی۔" آفتاب جو بےاختیاری شہریار کو اٹھا کر لے جانے والوں کے پیچھے لپکا تھا، اسے ایک ملازم نے روک کر یہ حکم نامہ سنایا۔ اس حکم کو سن کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ چودھری کی اجازت کے بغیر زبردستی اندر داخل ہونا ممکن نہیں تھا۔ ویسے بھی بات ایک طرح سے معقول ہی تھی۔ مریض کے گرد موجود تیمارداروں کا ہجوم بسا اوقات اس کے لیے باعث تسلی بننے کے بجائے زحمت بن جاتا ہے۔ وہ پریشان سا واپس ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ چودھری کے بندے فوری طور پر مرکز صحت سے ڈاکٹر کو لے کر آگئے۔ یہ ایک لیڈی ڈاکٹر تھی جو دو دن قبل ہی پیرآباد پہنچی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر کے پیچھے چودھری کا ایک ملازم بڑا سا میڈیکل باکس اٹھائے ہوئے چل رہا تھا۔ ڈاکٹر کے پہنچ جانے سے آفتاب کو کچھ تسلی ہوئی اور وہ لوگوں کے درمیان سے نکل کر باہر کھلے حصے میں پہنچ گیا۔ یہاں آنے والے مہمانوں کی گاڑیاں پارک تھیں۔ ان گاڑیوں میں شہریار کی گاڑی شناخت کرنے میں اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ وہ ٹہلتا ہوا اس گاڑی تک چلا گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر شاہرم خان کے بجائے کوئی اور ڈرائیور موجود تھا جو سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے مزے سے سو رہا تھا۔ اس نے کھڑکی کے کھلے شیشے سے ہاتھ اندر ڈال کر ڈرائیور کا شانہ ہلایا۔ وہ ہڑبڑا کر نیند سے جاگا۔

"تمہارے صاحب کی طبیعت خراب ہے اور تم یہاں مزے سے سو رہے ہو۔" ڈرائیور کے آنکھ کھولنے پر اس نے ناراضگی کا اظہار کیا۔

"کیا ہوا صاحب کو؟" وہ پریشانی کے عالم میں گاڑی سے اترا۔

"معلوم نہیں۔ بس کھانا کھا کر باہر نکل رہے تھے کہ اچانک ہی طبیعت بگڑ گئی۔ چودھری صاحب انہیں اپنے بندوں کے ذریعے اندر لے گئے ہیں۔ اسپتال سے ڈاکٹر کو بھی بلوا لیا ہے۔ ڈاکٹر بھی اندر ہی ہے۔ آگے مجھے نہیں معلوم کہ کیا حال ہے؟" اس نے بتایا۔

"میرے خیال میں ہمیں پی اے صاحب کو اس بات کی اطلاع دینی چاہیے۔" ڈرائیور پریشانی سے بولا تو آفتاب کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ پریشانی میں اسے خیال ہی نہیں آیا تھا کہ عبدالمنان کو فون کردے۔ وہی ایک ایسا شخص تھا جو شہریار کا سچا بہی خواہ بھی تھا اور جسے روکنا چودھری کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ وہ اپنا موبائل نکال کر عبدالمنان کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری طرف بیل جارہی تھی لیکن کوئی کال ریسیو نہیں کررہا تھا۔

"پی اے صاحب کال ریسیو نہیں کررہے ہیں۔" اس نے ڈرائیور کو بتایا۔

"آج ان کی سالی کی شادی ہے، وہ ادھر گئے ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے شادی کے ہنگامے میں انہیں فون بجنے کا پتا ہی نہ چلا ہو۔ آپ دوبارہ کوشش کرکے دیکھیں۔" ڈرائیور نے اسے معلومات فراہم کرتے ہوئے مشورہ دیا تو وہ تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دیتے ہوئے ایک بار پھر کوشش کرنے لگا۔ ڈرائیور کی فراہم کردہ اطلاع نے شہریار کی یہاں اکیلے موجودگی پر بھی روشنی ڈال دی تھی، ورنہ عموماً تو عبدالمنان اس کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔

دوسری بار کوشش کرنے پر بھی کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔ آفتاب نے کچھ مایوس ہوتے ہوئے موبائل واپس جیب میں رکھ لیا۔ موبائل جیب میں رکھتے ہی بجنے لگا۔ اس نے نکال کر دیکھا تو اسکرین پر عبدالمنان کا نام جگمگا رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کرلی۔

www.pkdigest.com

''خیریت آفتاب صاحب! آپ اس وقت کیسے کال کررہے تھے؟ میں اصل میں اپنی سسٹر ان لا کی شادی میں آیا ہوا ہوں۔ یہاں رخصتی کا سلسلہ چل رہا تھا اس لیے ہنگامے میں مجھے آپ کی کال ریسیو کرنے کی مہلت نہیں مل سکی۔ فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟'' وہ بہت شائستہ لہجے میں اس سے دریافت کررہا تھا، جواباً اس نے شہریار کی طبیعت کے بارے میں اسے آگاہ کردیا۔

''بہت اچھا ہوا کہ آپ نے مجھے اطلاع دے دی۔ اب میں خود اس معاملے کو ہینڈل کرلوں گا۔'' ساری بات سن کر عبدالمنان نے کہا تو اس کے لہجے میں پریشانی جھلک رہی تھی لیکن بہرحال وہ تجربہ کار آدمی تھا جو ہر طرح کی صورت حال سے نمٹنا جانتا تھا۔ آفتاب اس سے بات کرنے کے بعد قدرے مطمئن ہوگیا اور واپس اندر پنڈال میں چلا گیا۔

مہمانوں کی اکثریت رخصت ہوچکی تھی۔ صرف ایس پی معظم تارڑ اور چند ایک دوسرے افراد ہی نظر آرہے تھے۔ ان افراد کو یقینی طور پر شہریار سے دلچسپی تو نہیں تھی لیکن وہ اپنے ضلع کے اے سی کو یہ باور کروانے کے لیے کہ انہیں اس کی بہت فکر ہے، ابھی تک یہاں رکے ہوئے تھے۔

''کسی فکر نہ کریں جی! اے سی صاحب یہاں بڑے آرام نال ہیں۔ ڈاکٹرنی نے چنگی طرح ان کو دیکھ لیا ہے، کہہ رہی تھی فوڈ پوائزننگ ہوگئی ہے۔ اس نے کچھ انجکشن وغیرہ لگایا ہے۔ اب اے سی صاحب کی حالت سنبھل گئی ہے۔ وہ آرام سے سو رہے ہیں۔ پھر بھی میں نے ڈاکٹرنی کو رات یہیں روک لیا ہے۔ وہ رات بھر یہیں رہ کر اے سی صاحب کی دیکھ بھال کرے گی۔ صبح پھر میں انہیں واپس بھجوانے کا بندوبست کردوں گا۔'' آفتاب ان بڑے لوگوں کی محفل سے کچھ فاصلے پر تھا جب اس نے چودھری افتخار کی آواز سنی۔ یقیناً اس کے موبائل پر عبدالمنان کی کال آئی ہوئی تھی جسے وہ یہ تسلیاں دے رہا تھا۔

''آپ آنا چاہتے ہیں تو شوق سے آئیں۔ میں تو صرف اس لیے منع کررہا تھا کہ کہاں رات کے وقت اتنا لمبا سفر کرکے بے آرام ہوں گے۔ ہم یہاں شہریار صاحب کا خیال رکھ ہی رہے ہیں۔ ہمارے لیے یہ صرف ضلع کے اے سی کا معاملہ تھوڑی ہے، ہمیں تو رانا صاحب کو بھی جواب دینے کی فکر ہے۔ ان کا بھانجا ہمارا مہمان بن کر کسی تکلیف میں مبتلا ہو، ہمارے لیے یہ کوئی اچھی گل تو نہیں ہے نا۔'' وہ اپنی مخصوص چرب زبانی کا مظاہرہ کررہا تھا۔ انداز ایسا تھا جیسے عبدالمنان کو یہاں آنے سے روکنا چاہتا ہو۔

''چلیں، اگر آئے بغیر آپ کی تسلی نہیں ہوسکتی تو پھر تشریف لے آئیں۔ ہم تو جاگ ہی رہے ہیں۔ آپ کے استقبال کے لیے بھی تیار رہیں گے۔'' عبدالمنان نے یقیناً اس کی تجویز ماننے سے انکار کردیا جب ہی اس نے مایوسانہ انداز میں اسے یہ جواب دینے کے بعد فون بند کردیا۔ اسی وقت اس کی نظر آفتاب پر پڑی۔

''اوئے ماسٹر! تو ابھی تک یہیں ہے؟ کیا بات ہے، کیا روٹی شوٹی نہیں ملی تجھے اب تک؟''

''میں اے سی صاحب کی خیریت معلوم کرنے کے لیے رکا ہوا ہوں۔'' چودھری کے توہین آمیز لہجے پر خود پر کڑا ضبط کرتے ہوئے اس نے اسے جواب دیا۔

''یہ بول نا کہ تجھے چمچہ گیری کا اچھا موقع ملا ہے۔ ابھی تیرا کوئی اور مطلب اٹکا ہوا ہوگا اے سی سے، جب ہی ادھر چکرا رہا ہے۔'' چودھری نے ایک اور طنز کیا۔

''میرا کیا مطلب اٹکنا ہے ان سے چودھری صاحب! میں نہ سرکاری افسر ہوں اور نہ ہی کوئی جاگیردار۔ علاقے کے چھوٹے موٹے مسائل کے حل کے لیے ضرور کوشش کرتا ہوں... پر اللہ کا شکر ہے، یہ نئے اے سی صاحب خود ہی بہت اچھے آدمی ہیں۔ کسی کے توجہ دلائے بغیر بھی بہت کچھ کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ اللہ انہیں جا سدوں کے شر سے محفوظ رکھے۔ انشاء اللہ آنے والے وقت میں بہت کچھ بدل کر رہ جائے گا۔'' آفتاب نے بے باکی سے چودھری کو یہ جواب دیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بیرونی راستے کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں مزید رکنا سود مند نہیں تھا۔ شہریار تک وہ لوگ اسے جانے نہیں دیتے اور یہاں رکنے سے فضول میں مزید کوئی بدمزگی ہوجاتی تو یہ کسی بھی اعتبار سے اچھا نہیں ہوتا۔

''بالے! ڈاکٹرنی کو جا کر بول کہ تھوڑی دیر بعد اے سی کا پی اے ادھر آرہا ہے۔ وہ چنگی طرح سب دیکھ بھال لے۔'' باہر نکلتے نکلتے اس کے کانوں میں چودھری کی آواز پڑی۔ اپنے کارندے کو یہ عام سی ہدایت دیتے ہوئے اس کے لہجے میں جو طیش تھا، وہ یقیناً آفتاب کی باتوں کے ردعمل میں پیدا ہوا تھا۔ چودھری کے اس طیش پر وہ مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اصل طیش تو اسے کل کا اخبار پڑھ کر آئے گا۔ مقامی اخبارات اگر اس کے ایب نارمل بیٹے کی شادی پر خاموش تھے تو کیا ہوا؟ کل لاہور کے اخبارات میں تو یہ خبر آنی ہی آنی تھی۔

☆☆☆

''کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟'' اس کے اشارے

تَبٰرَکَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا

آپ کے ستارے کیا کہتے ہیں؟

آپ کیلئے کون سا سال' مہینہ' دن بہتر رہے گا؟ محبت' دولت اور دیگر معاملات میں کب کامیابی ملے گی؟

معروف ماہر فلکیات سید محمد علی قادری سے راہنمائی حاصل کریں۔

اس کے علاوہ قادری صاحب آپکے دنیاوی مسائل کا حل قرآنی آیات اور اسماء الحسنیٰ سے پیش کرتے ہیں۔

☆ شادی کب ہوگی اپنوں یا غیروں میں؟ (ثانیہ' لاہور)

● شادی کا امکان اگلے سال مئی تک نظر آرہا ہے' اپنوں میں زیادہ امکان ہے۔

☆ میں نے بی اے کے پیپر دیئے ہیں' محنت تو بہت کی ہے' کامیاب ہوجاؤں گی؟ (نورین اختر' ایبٹ آباد)

● کامیابی کے امکان نظر آرہے ہیں۔

☆ قادری صاحب! میرا مسئلہ یہ تھا کہ میری منگنی زبردستی ایک ایسے لڑکے کے ساتھ کردی گئی تھی جو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا' قریب تھا کہ میں خودکشی کرلیتی کہ میری ایک دوست نے مجھے آپ کا بتایا' آپ سے فون پر بات کرکے میرے دل کو بہت تسلی ہوئی' آپ نے ایک لوح مبارک اور سعد پتھر منگوانے کا کہا' میں نے یہ سب چیزیں منگوائیں اور وظیفہ شروع کیا' ایک ماہ بعد ہی وہ لڑکا جس سے میری منگنی ہوئی تھی اس نے خود ہی مجھ سے شادی کرنے کے لیے انکار کردیا' عام حالات میں تو یہ بہت برا ہوتا لیکن میرے لیے یہ بہت بڑی خوشی کی بات تھی' ہر وقت آپ کے لیے دعا کرتی ہوں' وظیفہ ابھی جاری رکھنا ہے؟ (تسنیم کوثر' گجرات)

● بٹی! اللہ کا شکر ادا کریں' لوح کو ٹھنڈا کروادیں اور دو نفل شکرانے کے ادا کریں' نماز کی پابندی رکھیں۔

☆ شاہ صاحب! میں نے بڑی مجبوری میں آپ کو فون کیا تھا' میرا شوہر میرا بالکل خیال نہیں رکھتا تھا' نہ ہی اُسے اپنے بچوں کا خیال تھا' نہ ہی مجھے خرچہ دیتا تھا' مانگوں تو مارتا تھا' میں سلائی کرکے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر گھر چلا رہی تھی' پھر آپ کا کسی نے بتایا تو آپ نے کسی عورت کا چکر بتایا تھا' خیر آپ نے مجھے چاندی کا نقش اور مبارک پتھر دیا' میں نے تقریباً دو ماہ وظیفہ پڑھا مگر کچھ نہیں ہوا' میں بہت مایوس ہوگئی تھی مگر آپ نے کہا فکر نہ کرو' وظیفہ 31 دن اور پڑھو' جب دوبارہ پڑھنا شروع کیا تو اُن کے رویے میں کچھ تبدیلی نظر آئی اور پھر تو آہستہ آہستہ وہ بالکل ٹھیک ہوگئے' مجھے سلائی کرنے سے بھی منع کردیا' خود سارے گھر کا خرچہ اٹھاتے ہیں' میرا خیال بھی بہت رکھنے لگے ہیں' بچوں سے بھی بہت شفقت سے پیش آتے ہیں' قادری صاحب آپ کے لیے ہر وقت میرے دل سے دعائیں نکلتی ہیں' آپ نے میرا گھر اجڑنے سے بچالیا' اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا' نقش کا کیا کرنا ہے؟ (نسیم کوثر' لاہور)۔

● بٹی! اللہ کا شکر ادا کریں' بیٹا میں نے تو صرف آپ کی رہنمائی کی' گھر تو آپ کا اللہ نے بچایا' وظیفہ ابھی 21 دن اور پڑھ لیجیے گا' اس کے بعد اُسے ٹھنڈا کروا کر دو نفل شکرانے کے ادا کرلیجیے گا' اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ (آمین)

نوٹ: خط لکھتے وقت اپنا نام' اپنی والدہ کا نام' تاریخ پیدائش اور وقتِ پیدائش ضرور لکھیں۔ براہ راست جواب کے لیے جوابی لفافہ ساتھ بھیجیں۔

رابطے کے لیے:
A-911' سیکٹر 11-B' نارتھ کراچی' نزد ٹیلی فون ایکسچینج' کراچی۔ موبائل: 0333-2105914
E-mail: mashal_e_raah@yahoo.com / mashal_e_raah1@hotmail.com

پر ایک کرسی پر ٹکتے ہوئے آفتاب نے دریافت کیا۔
''بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ اگر عبدالمنان آرام پر اتنا زیادہ اصرار نہ کرتا تو میں آج آفس چلا جاتا۔ معمولی سا فوڈ پوائزن تھا۔ ڈاکٹر ماریا کے ٹریٹمنٹ سے فوراً کنٹرول میں بھی آ گیا۔ کل سارا دن کچھ کمزوری کا احساس ضرور ہوا لیکن آج تو میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
''پھر بھی آرام کرنا مناسب تھا۔ عبدالمنان صاحب نے بالکل ٹھیک مشورہ دیا۔ پرسوں رات آپ کی جو حالت ہوئی تھی، اسے دیکھ کر تو میں ڈر ہی گیا تھا۔''
''مجھے تمہاری پریشانی کا علم ہے۔ تمہاری فون کال پر عبدالمنان کو آدھی رات کو دوڑ لگانی پڑی۔ بے چارہ صبح تک جاگتا رہا پھر مجھے واپس لے کر یہاں آیا۔ یہاں بھی میں اس کی کڑی نگرانی میں ہوں۔ میرے آرام کے خیال سے وہ کسی کو مزاج پرسی تک کے لیے نہیں آنے دے رہا۔ کل چودھری افتخار کو بھی باہر ہی سے ٹال چکا ہے۔ تمہیں تو میری خصوصی سفارش پر اجازت ملی ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے بتایا۔
''جی ہاں، مجھے علم ہے۔ کل میں نے فون پر خیریت معلوم کی تھی، تب ہی انہوں نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ... فی الحال آپ کسی سے ملاقات نہیں کر سکتے اسی لیے تو میں آج آیا ہوں۔'' آفتاب نے مسکراتے لبوں کے ساتھ کہا پھر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ''ویسے آپ کی اس طرح اچانک طبیعت خراب ہو کیسے گئی؟ آپ نے واپس آنے کے بعد کسی اور ڈاکٹر سے چیک اپ کروایا؟''
''یقیناً کھانے پینے میں کوئی بداحتیاطی ہو گئی ہو گی۔ شاید میں نے دوپہر کو جو کھانا کھایا تھا، وہ ٹھیک سے ہضم نہیں ہوا تھا۔ اس پر میں نے دعوت کا کھانا بھی کھا لیا تو معدہ برداشت نہیں کر سکا۔ رہی کسی اور ڈاکٹر سے چیک اپ کروانے کی بات تو اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر ماریا اچھی ڈاکٹر ہے۔ میں اس کی تجویز کردہ میڈیسن لے رہا ہوں اور بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔
''یہ بھی تو ہو سکتا ہے سر کہ گڑبڑ دعوت والے کھانے میں ہی ہو۔ چودھری افتخار جیسے شخص سے کسی بھی بات کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔'' آفتاب نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔
''ارے نہیں، میرے خیال میں وہ اپنے گھر پر میرے ساتھ کوئی ایسی ویسی حرکت کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی مجھے یہ تکلیف پہنچا کر اسے کیا فائدہ مل سکتا تھا؟ ویسے عبدالمنان احتیاطاً اہم معاملات کی چیکنگ کروا چکا ہے۔ ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی کہ جس سے یہ شک گزرے کہ مجھے غافل کر کے ان لوگوں نے علاقے سے مال ادھر ادھر کرنے کی کوشش کی ہو۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب ایک اتفاق ہی تھا۔''
''ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو ورنہ چودھری افتخار پر اعتبار کرنا بہت مشکل ہے۔ میں نے چودھری جیسا موقع پرست آدمی نہیں دیکھا۔ چودھری بہزاد کی شادی کی مثال سامنے ہی ہے۔ چودھری بختیار سے بدلہ لینے اور اس کا سر اپنے آگے جھکائے رکھنے کے لیے اس نے ایک معصوم لڑکی کی زندگی کس طرح داؤ پر لگائی ہے، یہ ہم سب ہی جانتے ہیں۔'' آفتاب اب بھی مشکوک ہی تھا۔
''واقعی یہ معاملہ ہے تو بہت افسوسناک... لیکن ورثا کی موجودگی میں ہونے والے اس نکاح کو چیلنج بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں، اگر لڑکی خود اس سلسلے میں کوئی احتجاج کرے تو ہم اس کی مدد کر سکتے ہیں۔'' اس نے خیال ظاہر کیا۔
''میں کشور کے ذریعے فریدہ کو یہ پیغام بھیجوں گا کہ وہ آپ کے پاس انصاف کے لیے تحریری درخواست بھجوا دے۔ فریدہ نے درخواست بھیجی جاتی تو کشور اس کام میں اس کی بھرپور مدد کریں گی۔ میں تو بہرحال اس ظلم کے خلاف اپنے طور پر [illegible] احتجاج کر سکتا تھا [illegible] نے لاہور [illegible] کل کے اخبارات تو دیکھ [illegible] ہوں گے؟''
''او ہاں، اچھا تو یہ تم تھے جس نے چودھری بہزاد کی تصویر کے ساتھ خبر اخبار کے دفاتر تک پہنچائی تھی۔'' آفتاب کے سوال پر وہ چونک کر بولا۔ دولہا والی تیاری کے ساتھ کسی تین چار سالہ بچے کی طرح روتے مچلتے چودھری بہزاد کی وہ تصویر یقینی طور پر ایسی تھی کہ کئی لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے ہوں گے۔
''جی ہاں، یہ میرا ہی کام تھا۔ میں دعوت میں شرکت کے لیے وہاں پہنچا ہی تھا کہ میری نظر چودھری بہزاد پر پڑی۔ حویلی کے دو تین ملازمین اسے لے کر اپنے ساتھ پنڈال میں داخل ہونے والے تھے کہ وہ اچانک اس بات پر مچل گیا کہ دلہن کو بھی وہاں بلایا جائے۔ ملازم اسے سمجھاتے رہے کہ دلہن زنان خانے میں ہے اور اسے باہر مردوں میں نہیں لے جایا جا سکتا مگر وہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ ضد میں آ کر اس نے نیچے زمین پر لیٹ کر ایڑیاں رگڑنی شروع کر دیں۔ میرے پاس موبائل تو موجود ہی تھا۔ موقعے کا فائدہ اٹھا کر میں نے چودھری بہزاد کی تین چار یادگار

تصویریں کھینچ لیں اور جس اخبار کے لیے لکھتا ہوں، اس کے ایڈیٹر کو تصویریں مع خبر SEND کر دیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ خبر میں چودھری افتخار کا کھل کر نام نہیں لیا گیا۔ صرف یہ لکھا گیا ہے کہ پنجاب کے ایک دور افتادہ گاؤں کے چودھری کے بیٹے کے ولیمے کے موقعے پر لیا گیا دولہا کا خصوصی پوز۔ تفصیل میں بھی اتنا ہی درج ہے کہ ایک بااختیار جاگیردار نے اپنے ایب نارمل بیٹے کی شادی زبردستی ایک صحت مند لڑکی سے کروا دی۔ دولہا ایک صحت مند یا کسی بھی قسم کی لڑکی سے شادی کرنے کا کتنا اہل ہے، اس کا اندازہ اس تصویر کو دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے۔''
آفتاب نے تفصیلات بتائیں تو وہ ہنسنے لگا پھر ایک ذرا سی تشویش سے بولا۔ ''کہیں تمہاری یہ جرأت تمہیں مہنگی نہ پڑ جائے۔ چودھری اخبار کے ایڈیٹر سے یہ جاننے کی کوشش ضرور کرے گا کہ اس کے خلاف یہ خبر کس نے لگوائی ہے؟''
''کر دیکھے کوشش۔ ایڈیٹر سب سے پہلے تو اسے یہ جواب دے گا کہ جناب! ہمیں نہیں معلوم کہ یہ خبر آپ کے خلاف ہے۔ ہمارے ایک فری لانسر صحافی نے ہمیں بغیر کسی حوالے کے یہ خبر بھیجی تھی، سو ہم نے چھاپ دی۔ معلوم ہوتا کہ اس خبر کا تعلق آپ سے ہے تو آپ سے تصدیق کر لیتے۔ ویسے تو خبر [illegible] ثبوت کی [illegible] آپ کے مطابق جھوٹی ہے تو ہم اپنی [illegible] غلطی کی [illegible] کے لیے تیار ہیں۔ آپ ایک عدد تردیدی بیان دے دیں، ہم اسے بھی اپنے اخبار میں چھاپ دیں گے۔''
''اور بے چارہ چودھری یہ کر نہیں سکتا۔ اس کے تردیدی بیان دینے کا مطلب ہو گا کہ جن لوگوں کو علم نہیں انہیں بھی معلوم ہو جائے گا کہ خبر چودھری افتخار کے متعلق ہے۔ بہت خوب... زبردست زک پہنچائی تم نے چودھری کو۔ دیکھنے میں کتنے شریف اور سیدھے سادے لگتے ہو لیکن ہو تا جرنلسٹ... کہیں نہ کہیں اپنی اصلیت دکھا ہی جاتے ہو۔'' وہ بے حد محظوظ ہوا۔
''دوسرے لفظوں میں آپ مجھے چالاک اور چالباز ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ جو حقیقت تھی، میں نے لوگوں کو وہی بتایا۔ دھوکا تو چودھری افتخار جیسے لوگ دیتے ہیں۔ میں نے دیکھا تھا کہ بہزاد چودھری کے بگڑ جانے پر ملازمین اسے واپس لے گئے تھے اور پھر وہ تقریباً تقریب کے اینڈ میں ہی دوبارہ نظر آیا تھا۔ وہ بھی اس حال میں کہ میرا خیال ہے اسے کوئی خاص میڈیسن دی گئی تھی جس کی وجہ سے وہ بالکل گم صم ہو گیا تھا اور چپ چاپ دبی کر

رہا تھا جو اس کے ساتھ ...... موجود ملازم اس کے کان میں کہتا جا رہا تھا۔'' کچھ احتجاجی انداز اختیار کرتے ہوئے اس نے شہریار کی توجہ ایک اہم نکتے کی طرف مبذول کروائی۔
''واقعی یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو... چودھری نے یہ بہانہ تو پہلے ہی بنا دیا تھا کہ دولہا کی طبیعت کچھ ناساز ہے اس لیے جو لوگ حقیقت سے واقف ہیں انہیں چھوڑ کر باقی لوگ یہی سمجھے ہوں گے کہ خرابی طبیعت کی وجہ سے دولہا بے چارہ کچھ سست نظر آ رہا ہے۔'' اس نے داد دینے والے انداز میں آفتاب کے تجزیے سے اتفاق کیا۔
اسی وقت ایک ملازم چائے کی ٹرالی لیے اندر داخل ہوا۔ چائے پیش کرنے کے ساتھ اس نے ایک خاکی لفافہ بھی شہریار کے سامنے رکھا۔ ملازم کی اس حرکت پر وہ چونک گیا۔ کسی ملاقاتی کی موجودگی میں کسی بھی قسم کی ڈاک کا اس طرح پیش کیا جانا معمول کے خلاف تھا۔ وہ لفافہ اٹھائے بغیر نظروں ہی نظروں میں اس کا جائزہ لینے لگا۔ قریبی شہر کے ڈاک خانے کی مہر لگا یہ عام سا لفافہ تھا لیکن اس پر لکھے اس کے نام کے ساتھ موجود پرسنل اور موسٹ ارجنٹ کے الفاظ اسے خاص بنا رہے تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر لفافہ اٹھایا اور الٹ کر دوسری طرف بھیجنے والے کا نام دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہاں کوئی نام موجود نہیں تھا۔ اس نے کسی قدر الجھن محسوس کرتے ہوئے لفافہ چاک کیا اور ہاتھ ڈال کر اس کے اندر سے کارڈ سائز کی ایک تصویر باہر نکالی۔ اگلا لمحہ اس کے لیے بے حد دھماکا خیز تھا۔ وہ اس بری طرح شاکڈ ہوا تھا کہ اپنے چہرے کی بدلتی ہوئی رنگت بھی چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔
''خیریت ہے سر؟ آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔'' آفتاب کی آواز کانوں میں پڑی تو اسے خیال آیا کہ وہ اس جگہ پر تنہا نہیں ہے۔ اس نے چونک کر تصویر سے نظریں ہٹا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ ملازم واپس جا چکا تھا جبکہ آفتاب کرسی پر بیٹھا اسے پرتشویش نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
''ایکسکیوزمی آفتاب! آپ چائے پئیں۔ میں مزید آپ کو وقت نہیں دے سکوں گا۔'' حیران پریشان آفتاب سے کہتا ہوا وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ باہر نکلتے ہوئے وہ خاکی لفافہ اس کے ہاتھ میں تھا، البتہ لفافے سے نکلنے والی تصویر اس نے واپس اندر ڈال دی تھی۔

☆☆☆

''گڈ ایوننگ سر! معاف کیجیے گا مجھے آپ کے پاس آنے میں تھوڑی دیر ہو گئی۔ اصل میں جب آپ کا ڈرائیور

www.pkdigest.com

پیغام لے کر پہنچا تو کافی مریض بیٹھے ہوئے تھے۔ انھیں فارغ کرنے میں کچھ دیر لگ گئی۔ اچھا نہیں لگتا تا کہ کسی بڑے آدمی کی کال پر بے چارے غریبوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے۔ ویسے بھی مجھے تسلی تھی کہ آپ کو کوئی ایمرجنسی نہیں ہو سکتی۔ ایمرجنسی کی صورت میں آپ اتنی دور سے مجھے بلانے کے بجائے یہیں پر کسی ڈاکٹر سے رابطہ کرتے۔ یقیناً آپ نے مجھے صرف اپنی تسلی کے لیے چیک اپ کروانے بلایا ہوگا۔" یہ ڈاکٹر ماریا تھی جسے شہریار کے حکم پر پیر آباد سے بلوایا گیا تھا۔ اس کے پہنچنے تک وہ گویا دہکتے انگاروں پر چلتا رہا تھا اور اب انگاروں جیسی ہی سرخی اس کی آنکھوں میں اتری ہوئی تھی جس سے مکمل طور پر بے خبر ڈاکٹر ماریا اپنے دیر سے آنے کی وضاحت پیش کرتے ہوئے بڑی مگن سی اپنے شولڈر بیگ سے اسٹیتھ اسکوپ نکالنے کے بعد اس کی طرف بڑھی اور ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی کی نبض چیک کرنی چاہی۔

"خبردار! دور رہو مجھ سے اور آرام سے اس کرسی پر جا کر بیٹھو۔" اس کے کلائی پکڑنے سے پہلے ہی شہریار نے بے حد سرد لہجے میں حکم جاری کیا۔

"لے... لیکن سر... میں آپ کا چیک اپ کیسے کروں گی؟" وہ ہکلائی۔

"کیسا چیک اپ؟ کیا ویسا ہی جیسا تم نے پیر آباد میں چودھری افتخار کی حویلی میں کیا تھا؟" شہریار نے طنز سے پوچھا۔

"میں کچھ سمجھی نہیں سر! کیا آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہے؟ میں نے تو اپنی طرف سے آپ کو بہترین ٹریٹمنٹ دیا تھا۔ آپ کی طبیعت چند گھنٹوں میں ہی سنبھل گئی تھی۔ اب بھی آپ مجھے بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہے ہیں پھر آپ کو مجھ سے کیا شکایت ہے؟ کیا آپ کے خیال میں مجھ سے آپ کی خدمت میں کوئی کوتاہی ہوئی ہے؟" وہ اس کے حکم پر کرسی پر ٹک تو گئی لیکن خوفزدہ سے انداز میں اس نے ایک ہی سانس میں کئی وضاحتیں اور سوالات کر ڈالے۔

"میری خدمت..." شہریار کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔ "خدمت تو تم نے چودھری افتخار کی ہے۔ مجھے تو تم اب یہ بتاؤ گی کہ اس خدمت کے صلے میں چودھری نے تمھیں کتنی رقم ادا کی ہے؟"

"میں سمجھی نہیں۔" ڈاکٹر ماریا نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"تو پھر یہ دیکھ لو۔ شاید انھیں دیکھ کر تمھیں بہت کچھ سمجھ آجائے۔" اس نے سائڈ میں رکھے لفافے سے تصویریں نکال کر اس کے سامنے میز پر پھینکیں۔ ان تصویروں کی تعداد

تین تھی۔ اُس وقت اس نے آفتاب کے سامنے محض ایک ہی تصویر نکال کر دیکھی تھی اور وہ تصویر اتنی شرمناک تھی کہ وہ لفافے میں موجود دوسری تصویریں نکالنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ تصویر میں اسے اور ایک لڑکی کو جس شرمناک انداز میں دکھایا گیا تھا، اس کے بعد تو اسے اپنا دماغ ہی بھک سے اڑتا ہوا محسوس ہوا۔ جب ہی اس نے آفتاب کو بھی بے حد سرد مہری کے ساتھ نظر انداز کر دیا تھا۔ کو ایجوکیشن میں پڑھنے، مکس گیدرنگز میں شرکت کرنے اور کئی خواتین سے دوستی ہونے کے باوجود اسے اپنے کردار پر ہمیشہ ناز رہا تھا۔ نہ خود اس نے کبھی حدود پار کی تھیں اور نہ ہی کسی اور کو یہ موقع دیا تھا کہ وہ اس کے شفاف کردار پر بدنما داغ بن سکے لیکن یہ تصویریں کہہ رہی تھیں کہ وہ تصویر میں موجود لڑکی کے ساتھ ہر حد پار کر گیا تھا۔ تصویریں اتنی بے باک اور شرمناک تھیں کہ اس جیسے شفاف کردار کے مالک شخص کے بجائے کوئی کرپٹ آدمی بھی ہوتا تو حواس کھو بیٹھتا کیونکہ بہرحال تصویروں کے حقیقی یا غیر حقیقی ہونے سے قطع نظر انھیں کھینچے جانے کا مقصد صرف ایک ہو سکتا تھا... وہ تھا تصویر میں موجود بندے کو بلیک میل کرنا... اور وہ جانتا تھا کہ اپنے کیریئر کے اس پہلے مرحلے پر ہی وہ کس کے شکنجے میں اٹک گیا تھا؟ اور کون تھا جو اس کو اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر سکتا تھا؟ یہ سب کب اور کیسے ہوا ہوگا، یہ سمجھنا بھی اس کے لیے دو جمع دو چار کی طرح سیدھا سادہ حساب تھا۔ آفتاب نے ٹھیک کہا تھا کہ چودھری کسی صورت بھی اعتبار کے لائق نہیں لہٰذا طبیعت بگڑنے پر بھی امداد کے بہانے اسے حویلی کے اندر لے جایا گیا اور علاج کے لیے لیڈی ڈاکٹر ماریا کو بلایا گیا حالانکہ مرکز صحت میں تو میل ڈاکٹر بھی موجود تھا۔ ڈاکٹر ماریا کے آنے تک وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ بے ہوشی کے اس عالم میں اس کے ساتھ کیا کچھ کیا گیا، اس وقت اسے خبر نہیں ہو سکی لیکن اب تصویریں دیکھ کر سمجھ آ رہا تھا کہ اس کی بے خبری سے فائدہ اٹھا کر دشمن غضب کی چال چل گیا تھا۔ ڈاکٹر ماریا کی صورت میں اس کے سامنے دشمن کا جو اہم تر مہرہ موجود تھا، اس نے سب سے پہلے اسی سے نمٹنے کا سوچا تھا اس لیے اب وہ اس کی رہائش گاہ پر اس کے سامنے موجود تھی۔

"یہ کیا ہے؟ آپ یہ بے ہودہ تصویریں مجھے کیوں دکھا رہے ہیں؟" تصویروں پر نظر پڑتے ہی ڈاکٹر ماریا کا چہرہ سفید ہو گیا تھا مگر پھر اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے غصے کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔

"اچھا، تو یہ تصویریں بے ہودہ ہیں؟ کمال ہے، اس

بات کا خیال آپ کو تصویریں اتروانے وقت کیوں نہ آیا۔"

"آپ مجھ پر کس قسم کی الزام تراشی کر رہے ہیں۔ میں آپ کی یہ فضول الزام تراشیاں سننے کے لیے کسی صورت بھی یہاں نہیں رک سکتی۔" اس کے طنز پر وہ تنتناتی ہوئی اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

"آرام سے تشریف رکھیں خاتون! میری اجازت کے بغیر آپ یہاں سے کہیں نہیں جا سکتیں۔" اس نے سرد لہجے میں حکم دیا۔

"آپ کیوں میرے ساتھ زبردستی کر رہے ہیں؟ میرا ان تصویروں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" وہ بے بسی سے دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی اور اس سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔

"لیکن مجھے یقین ہے کہ ان تصویروں میں جو لڑکی نظر آ رہی ہے، وہ آپ ہی ہیں۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

"یہ آپ کس بنیاد پر کہہ رہے ہیں؟ ان تینوں میں سے کسی بھی تصویر میں لڑکی کا چہرہ نظر نہیں آ رہا۔ صرف آپ کا چہرہ واضح ہے۔" اس نے اپنی طرف سے ایک مضبوط دلیل پیش کی لیکن لہجے کا کھوکھلا پن اس دلیل کو کمزور ثابت کر رہا تھا۔

"میرے یقین کے پیچھے دو ٹھوس وجوہات ہیں۔ نمبر ایک، مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ تصاویر دو دن پہلے اس وقت چودھری افتخار کی حویلی میں کھینچی گئیں جب میں بے ہوش تھا۔ نمبر دو یہ کہ تصویر میں آپ کی شکل نہ سہی مگر شانوں تک کٹے ہوئے براؤن اور گولڈن بال صاف نظر آ رہے ہیں۔ اس ہیئر اسٹائل اور ہیئر کلرز والی کوئی دوسری خاتون میں نے ان چند دنوں میں اپنے آس پاس بالکل نہیں دیکھی۔" اس نے اپنے دلائل پیش کیے تو وہ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے سر جھکا کر آہستہ سے بولی۔

"آپ بہت ذہین ہیں۔"

"تعریف کے لیے شکریہ لیکن بہرحال میں نے آپ سے یہ تعریفی کلمات سننے کے لیے آپ کو زحمت نہیں دی۔ میں جاننا چاہتا ہوں بلکہ جانتا تو ہوں مگر یوں سمجھیے کہ آپ کی زبان سے سننا چاہتا ہوں کہ آپ نے کس کی ایما پر یہ کام کیا اور اس کے لیے کیا قیمت وصول کی؟ یقیناً اس کام کی قیمت تو اس سیلری کے مقابلے میں اور بھی زیادہ اچھی ہوگی جس کے لالچ میں آپ نے شہری زندگی چھوڑ کر ایک گاؤں میں آ کر رہنا اور جاب کرنا منظور کر لیا۔" وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولتے ہوئے خود کو بہت قابو میں رکھے ہوئے تھا لیکن

درحقیقت اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مسیحا کے روپ میں اس کرپٹ لڑکی کے ساتھ کس بُری طرح پیش آئے۔ ڈاکٹر ماریا نے اس کی ہر بات خاموشی سے سنی پھر منہ سے کوئی جواب دینے کے بجائے اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"آپ کے سامنے جو حالات ہیں، ان کی روشنی میں آپ جتنا چاہیں مجھے بُرا بھلا کہہ سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے بھی آپ کی طرح ٹریپ کیا گیا ہے۔ میں اپنی خوشی سے اس مکروہ کام کے لیے راضی نہیں ہوئی۔" ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان اس نے یہ چند جملے کہے تو شہریار چونکا۔

"کیا مطلب؟"

"میں ایک مڈل کلاس گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرے والد میرے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ میری ممی نے خود جاب کر کے بڑی جدوجہد سے مجھے پڑھا لکھا کر ڈاکٹر بنایا۔ مجھے پریکٹس شروع کیے صرف تین سال گزرے ہیں۔ اپنی ملازمت کے بعد میں نے ممی سے جاب چھڑوا دی تھی۔ ہم دونوں ماں بیٹی بہت مطمئن زندگی گزار رہے تھے کہ اچانک مصیبت نے ہمارے گھر کا راستہ دیکھ لیا۔ ایک روز میں اپنی جاب سے واپس آ رہی تھی کہ ایک آدمی نے مجھے روک کر ضروری بات کے لیے قریبی ریسٹورنٹ چلنے کا کہا۔ میں نے اس کی بات مان لی۔ ہم ریسٹورنٹ پہنچے تو اس نے چائے پینے کے دوران مجھے پیر آباد کے مرکز صحت میں رہائش اور اچھی سیلری کے ساتھ جاب کی آفر کی۔ اس شخص کی پیش کش پُرکشش تھی لیکن میں شہر چھوڑ کر گاؤں نہیں جانا چاہتی تھی۔ میں جس پرائیویٹ اسپتال میں جاب کر رہی تھی، وہ بہت نامور تھا اور وہاں بڑے بڑے ڈاکٹروں کے ساتھ بہت کچھ سیکھنے کو ملتا تھا۔ اپنی وہ جاب چھوڑ کر میں پیر آباد آ جاتی تو تجربہ کار ڈاکٹرز کی راہنمائی سے محروم ہو جاتی۔ اس کے علاوہ دوسرا مسئلہ میری ممی کا تھا۔ ساری زندگی ملازمت کرنے کی وجہ سے ممی بہت سوشل تھیں۔ جاب چھوڑنے کے باوجود ان کا دوستوں میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ میں پیر آباد آتی تو انھیں بھی یہاں آنا پڑتا اور یقینی بات ہے کہ گاؤں کی محدود زندگی میں وہ بور ہو جاتیں۔ ان وجوہات کی بنا پر میں نے اس شخص کی بہت اچھی آفر کے باوجود اس ملازمت کے لیے انکار کر دیا۔" اس نے بہت تیزی سے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا اور اب اپنے متعلق تفصیلات سے آگاہ کر رہی تھی۔

"میرے انکار کے باوجود وہ شخص مسلسل میرے پیچھے

www.pkdigest.com

پڑا رہا۔ سیلری کی آفر بھی ڈبل کر دی لیکن مجھے اس کے اس طرح پیچھے پڑنے سے کچھ چڑ ہو گئی اس لیے میں نے پھر انکار کر دیا۔ آہستہ آہستہ اس کا اصرار دھمکیوں میں تبدیل ہو گیا۔ جب میں ان دھمکیوں کو بھی خاطر میں نہ لائی تو میرے ساتھ وہ گھٹیا چال چلی گئی جس کے بعد میں ان کی بات ماننے پر مجبور ہو گئی۔

"کیسی چال؟" وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہو کر اپنی ہتھیلی کی لکیروں کو گھورنے لگی تو شہریار کو اسے ٹوکنا پڑا۔

"ایک دن اسپتال جاتے ہوئے مجھے راستے میں اغوا کر لیا گیا۔ اغوا کرنے والے کون تھے، مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں چند گھنٹے بے ہوشی کی حالت میں ان کے قبضے میں رہی پھر ہوش میں آنے کے بعد مجھے واپس میرے گھر پہنچا دیا گیا۔ چونکہ یہ سب چند گھنٹوں میں میرے ڈیوٹی آورز میں ہوا تھا، اس لیے ممی کو کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ خود میں نے بھی کچھ نہیں بتایا کہ میرے اندازے کے مطابق کڈنیپرز نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا لیکن اگلے ہی دن ڈاک سے موصول ہونے والی اپنی شرمناک تصویروں نے مجھے بتایا کہ مجھے کس طرح ٹریپ کیا گیا ہے۔ اس واقعے کے بعد میں پیرآباد آنے سے انکار کر ہی نہیں سکتی تھی۔ خود کو بدنامی سے بچانے کے لیے مجھے یہ مطالبہ ماننا پڑا۔"

"اور شاید اسی بلیک میلنگ سے ڈر کر آپ نے میرے خلاف کھیلے جانے والے ڈرامے کا حصہ بننا بھی منظور کر لیا؟" شہریار نے نتیجہ اخذ کیا۔

"جی ہاں۔" اس کا سر جھک گیا۔ "میں واقعی مجبور ہو گئی تھی۔ بدنامی کے خوف سے میں نے وہ دوا فراہم کر دی جس کو کھا کر آپ کی حالت بگڑ گئی اور آپ بے ہوش ہو گئے۔ پھر آپ کی بے ہوشی کے دوران ہی یہ شرمناک تصویریں بھی کھینچ لی گئیں۔ میں نے اپنے طور پر احتجاج ضرور کیا لیکن میری اپنی تصویروں نے مجھے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ ان لوگوں نے مجھے تسلی دی کہ آپ کے ساتھ کھینچی جانے والی تصویروں میں میرا چہرہ دکھائی نہیں دے گا اس لیے مجھے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ یہ وعدہ پورا بھی کیا گیا لیکن آپ اپنی ذہانت کی وجہ سے حقیقت سمجھ گئے۔"

"ذہانت کی بات نہیں، یہ بالکل سیدھا سادہ معاملہ ہے جو ذرا سا غور کرنے پر کسی بھی شخص کی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ لیکن آپ بتائیں کہ آپ نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟ اتنا لمبا کھڑاگ ان لوگوں نے صرف مجھے ٹریپ کرنے کے لیے تو کھڑا نہیں کیا ہوگا۔ حالات سے ظاہر ہے کہ وہ آئندہ بھی آپ کو اس قسم کے کاموں کے لیے استعمال کرتے رہیں گے۔ آپ چند تصویروں کی وجہ سے کب تک ان کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنی رہیں گی؟"

"میری خود سمجھ نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟" اس کے پوچھنے پر وہ اپنی انگلیاں مروڑتے ہوئے بے بسی سے بولی۔

"تھوڑی سی ہمت کریں۔ آپ ہمت کر کے بیان ریکارڈ کروانے پر راضی ہو جائیں تو ہم دونوں مل کر چودھری کے خلاف لڑ سکتے ہیں۔"

"یہ کسی صورت ممکن نہیں۔ جو کچھ میں نے آپ کو بتایا ہے، وہ کسی ریکارڈ پر لانا تو دور کی بات میں چودھری کے سامنے بھی اسے نہیں دہرا سکتی۔" ڈاکٹر ماریہ نے صاف انکار کیا۔

"لیکن کیوں؟"

"وہ اس لیے کہ اب تصویروں سے بھی بڑھ کر میری ایک کمزوری اس کے ہاتھ میں ہے۔ میں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میں پیرآباد آتے ہوئے اپنی ممی کو ساتھ نہیں لائی تھی۔ مجھے یہاں ارجنٹ آنا پڑا تھا جبکہ ممی کی خواہش تھی کہ وہ اپنے تمام احباب سے الوداعی ملاقات کر کے اور گھر کا ضروری سامان سمیٹ کر یہاں آئیں لیکن وہ نہیں پہنچیں۔ آج صبح میں نے ان سے فون پر رابطہ کرنا چاہا تو دوسری طرف سے کسی اجنبی نے میری کال ریسیو کی اور مجھے بتایا کہ میری ممی ان کے قبضے میں ہیں۔ اگر میں نے کسی بھی معاملے میں زبان کھولی تو میری ممی کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ میں نے جو کچھ آپ کو بتایا ہے، وہ انسانیت کے ناتے صرف یہ سوچ کر بتایا ہے کہ آپ اپنے تحفظ کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں وہ کر لیں۔ میں بہرحال، آپ سے اس کے سوا مزید کوئی تعاون نہیں کر سکتی۔" وہ یک دم ہی رو دی تو وہ سوچ میں پڑ گیا پھر نرمی سے بولا۔

"ٹھیک ہے، آپ کھل کر میرے ساتھ تعاون نہیں کر سکتیں لیکن کچھ سوالات کے جواب تو دے سکتی ہیں؟"

"کیسے سوالات؟ آپ پوچھ کر دیکھیں۔ اگر مجھے لگا کہ ان سوالات کے جواب دینا میرے اور میری ممی کے لیے نقصان دہ نہیں ہے تو میں آپ سے تعاون کروں گی۔" اس نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

"آپ تسلی رکھیں، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" شہریار نے اسے یقین دلایا پھر اگلے پندرہ منٹ ان دونوں کے درمیان سوال جواب کا سلسلہ جاری رہا جس کے دوران وہ اپنے سامنے رکھے نوٹ پیڈ پر کچھ ضروری نوٹس لیتا رہا۔ پندرہ منٹ

بعد اس نے مطمئن ہوتے ہوئے ڈاکٹر ماریا کو وہاں سے جانے کی اجازت دے دی اور خود فون پر مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

"آئی جی صاحب! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ آپ کا محکمہ آخر کیا کرتا پھر رہا ہے؟"

"میں سمجھا نہیں جناب کہ آپ کس بارے میں ارشاد فرما رہے ہیں؟" وزیراعلیٰ کے نہایت غصے کے ساتھ پوچھے گئے سوالات کے جواب میں اس نے ٹھنڈے لہجے میں بے نیازی کا تاثر دیتے ہوئے پوچھا۔

"خواجہ سراؤں کی گرفتاری کے بارے میں بات کر رہا ہوں میں۔ کیا محکمۂ پولیس کے پاس کرنے کے لیے کوئی دوسرا کام نہیں رہا ہے جو آپ لوگ ان مظلوم افراد کے پیچھے لگ گئے ہیں؟" وزیراعلیٰ کو یقیناً اس کی یہ بے نیازی ناگوار گزری تھی چنانچہ اس کا لہجہ کچھ اور خراب ہو گیا۔

"یہ ایک ٹاپ سیکرٹ معاملہ ہے سر! جس پر محکمۂ پولیس پوری جاں فشانی سے کام کر رہا ہے۔" اس بار آئی جی مختار مراد نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ٹاپ سیکرٹ معاملہ..." وزیراعلیٰ نے ایک استہزائیہ سا ہنکارا بھرا۔ "آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ یہ ایک نجی معاملہ ہے جس کے پیچھے آپ محکمۂ پولیس کو استعمال کر رہے ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ جو کچھ آپ کے داماد نے پریس اور پبلک کو بتایا ہے، مجھے بھی بس اتنا ہی معلوم ہے؟"

"مجھے ایسی کوئی غلط فہمی نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میرے محکمے میں ایسے کئی لوگ ہیں جو ملازمت تو پولیس کی کرتے ہیں لیکن خدمت سیاست دانوں کی انجام دیتے ہیں۔ آپ کو بھی آپ کے کسی نمک خوار نے بہت کچھ بتا دیا ہوگا لیکن میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے، وہ ملکی مفادات میں ہی ہو رہا ہے۔" مختار مراد نے سپاٹ سے لہجے میں وضاحت دی۔

"سیاست داں ہونے کا طعنہ نہ دیں آئی جی صاحب! سیاست داں تو آپ کے سمدھی صاحب بھی ہیں اور شاید اسی وجہ سے آپ کے داماد من مانی کرتے پھر رہے ہیں۔ انہیں تو دوطرفہ سپورٹ مل گئی ہے لیکن یاد رکھیں کہ سجاد رانا کا یہ پاگل پن اسے بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اگر اس کی بیٹی کے اغوا اور موت کے پیچھے خواجہ سراؤں کا کوئی گروپ تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ شہر بھر کے خواجہ سراؤں کا جینا دوبھر کر دے۔ پریس نے پہلے ہی اس سلسلے میں اچھا خاصا طوفان اٹھایا ہوا ہے۔ خواجہ سرا الماس کے پولیس کسٹڈی میں مارے جانے کا میڈیا نے بڑی شدت سے نوٹس لیا ہے۔"

"ایکسکیوزمی سر! خواجہ سرا الماس کو پولیس کسٹڈی میں مارا نہیں گیا بلکہ اس نے خودکشی کی تھی۔" مختار مراد نے فوراً دخل دے کر انہیں ٹوکا۔

"یہ تو آپ کا موقف ہے نا جس پر پبلک یقین نہیں کرتی۔ پولیس کسٹڈی میں ملزمان پر کیے جانے والے غیر انسانی تشدد کے نتیجے میں ان کی جان چلی جانا اور اس واقعے کو خودکشی قرار دے دینا آپ کے محکمے کی بہت پرانی روایت ہے جس سے اب سب ہی واقف ہو چکے ہیں۔"

"میں آپ کے اس الزام کے جواب میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ الماس کی موت واقعی خودکشی کے نتیجے میں ہوئی تھی ورنہ ہم اس سے جو معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے، ان کے حصول کے لیے اس کا زندہ رہنا بہت ضروری تھا۔ اب آپ کی مرضی کہ آپ میرے اس بیان پر یقین کریں یا نہ کریں۔ بہرحال، میں آپ سے یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ اس وقت آپ کے کال کرنے کا کیا سبب ہے؟ ظاہر ہے آپ نے ان گزرے ہوئے واقعات پر گفتگو کے لیے تو اتنی زحمت نہیں کی ہوگی۔" مختار مراد نے چبا چبا کر بولتے ہوئے دریافت کیا۔ وزیراعلیٰ کے اختیارات اور پہنچ اپنی جگہ لیکن بہرحال وہ خود بھی کوئی ایسا معمولی آدمی نہیں تھا کہ ایک ایسا شخص جو اپنی پارٹی کے حکومت میں ہونے یا نہ ہونے کی بنیاد پر عروج و زوال کے دور سے گزرتا رہتا ہو، اس پر مکمل طور پر حاوی ہو سکتا۔

"میرے پی آر او نے مجھے اطلاع دی ہے کہ لاہور کے سارے خواجہ سرا کل وزیراعلیٰ ہاؤس کے سامنے احتجاجی مظاہرہ کرنے والے ہیں کیونکہ کل رات پولیس نے پھر کسی خواجہ سرا کو گرفتار کیا ہے اور ویسے بھی پولیس مسلسل ان لوگوں کو تنگ کر رہی ہے۔ تفتیش کے نام پر ان لوگوں کو کئی کئی گھنٹے تھانوں میں بٹھا کر رکھا جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کا کام دھندا متاثر ہوتا ہے۔"

"اور شاید وہ لوگ بھی جو ان کی خدمات سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔" مختار مراد نے یہ بات صرف دل میں سوچی مگر کہی نہیں۔ پچھلے عرصے کی تحقیقات کے نتیجے میں ایسے چند افراد کے نام سامنے آئے تھے جو سرکاری طور پر بڑی اہمیت کے حامل تھے اور ان افراد کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ جس دوسری قسم کا شوق رکھتے ہیں اس کی تسکین کے لیے انہیں اس قسم کے افراد کی ہی حاجت ہوتی ہے۔ ان کے محکمے کو ثبوت تو نہیں ملے تھے لیکن انہیں شک سا تھا کہ

www.pkdigest.com

خواجہ سراؤں میں سے کچھ ایسے افراد بھی تھے جو پڑوسی ملک کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دے رہے تھے اور ان شوقین افراد کا دل بہلانے کے عوض قیمتی معلومات حاصل کر کے پڑوسی ملک تک منتقل کر رہے تھے۔ سندر رام کی ٹیکسٹائل مل میں تیار کردہ کپڑے کے چند مخصوص تھانوں کا انڈین آرمی کے ہاتھ ہی فروخت کیا جانا ایک بہت ہی قابل غور بات تھی۔ یقیناً کپڑے کے یہ تھان معلومات کی خفیہ ترسیل کا ذریعہ بنے رہے تھے۔ سندر رام کی موت کے بعد چونکہ یہ سلسلہ ختم ہو گیا تھا اس لیے اس سلسلے میں حتمی ثبوت تو کوئی نہیں تھا، بس واقعات کی ترتیب کو سامنے رکھ کر ہی قیاس آرائی کی جا سکتی تھی۔

"میں چاہتا ہوں کہ محکمۂ پولیس کی طرف سے آپ مجھے اس سلسلے میں یقین دہانی کروائیں کہ اب شہر کے کسی خواجہ سرا کو تنگ نہیں کیا جائے گا تاکہ میں احتجاج کے لیے آنے والوں کو مطمئن کر سکوں... ورنہ یاد رکھیے کہ آپ کا محکمہ میڈیا کی زبردست تنقید کی زد میں آ جائے گا۔" اس کی سوچ اور پریشانیوں سے بے خبر وزیراعلیٰ اپنی ہی کہے جا رہے تھے۔

"ٹھیک ہے۔ آپ کرلیں وعدہ۔" مختار مراد نے جان چھڑائی۔

"آپ نے اور آپ کی پارٹی نے اس سے پہلے کب عوام سے کیا ہوا کوئی وعدہ وفا کیا ہے جو اس ایک وعدے کے پورا نہ ہونے پر کسی کو حیرت ہوگی۔" یہ اس کے ذہن میں ابھرنے والی وہ سوچ تھی جس کا اس نے وزیراعلیٰ کے سامنے اظہار نہیں کیا اور گفتگو کا سلسلہ ختم ہو جانے کو غنیمت جانتے ہوئے ریسیور واپس رکھ کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ ابھی مشکل سے پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ فون ایک بار پھر بج اٹھا۔ ریسیور اٹھانے پر اسے دوسری طرف سے ڈی آئی جی سجاد رانا کے آن لائن ہونے کی اطلاع ملی۔

"ٹھیک ہے، بات کرواؤ۔" اس نے مصروف سے انداز میں اجازت دی۔

"ایک بیڈ نیوز ہے انکل!" اس کی ہیلو کے جواب میں سجاد رانا کی کچھ پریشان سی آواز سنائی دی۔

"کیا؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"کل رات جس خواجہ سرا کو گرفتار کیا گیا تھا، وہ پولیس کسٹڈی میں مر گیا ہے۔"

"کیسے؟" اس اطلاع پر وہ بھونچکے رہ گئے۔

"حتمی طور پر تو پوسٹ مارٹم کے بعد ہی کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن لاش کی ظاہری حالت دیکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ موت کا سبب زہر خورانی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ گرفتاری کے بعد اس شخص کی مکمل تلاشی لی گئی تھی... اور اس کے پاس موجود معمولی سے معمولی شے بھی قبضے میں لے لی گئی تھی اس لیے یہ نہیں سوچا جا سکتا کہ اس نے اپنے پاس زہر رکھا ہوا تھا جسے کھا کر خودکشی کرلی۔ یقیناً اس کی موت کا سبب بننے والا زہر باہر سے ہی آیا تھا اور یہ بات ہمارے محکمے کے لیے بدنامی کا سبب بن سکتی ہے۔"

"یہ تو تم نے بہت تشویشناک بات بتائی ہے۔ اس ایشو کو لے کر تو میڈیا بہت طوفان برپا کرے گا۔ پہلے ہی ہم پر مسلسل تنقید ہو رہی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میری وزیراعلیٰ سے بات ہوئی ہے۔ وہ بُری طرح برہم ہو رہے تھے کہ ہمارا محکمہ کیوں ہاتھ دھو کر خواجہ سراؤں کے پیچھے پڑ گیا ہے۔" وہ سجاد رانا کو وزیراعلیٰ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں آگاہ کرنے لگا۔

"یہ تو واقعی بہت بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔ شینا کی ڈیتھ کے بعد ڈیڈی خود کو سنبھالنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے ہیں۔ ان کی صحت فی الحال اس لائق نہیں کہ کسی سیاسی محاذ آرائی میں الجھ سکیں۔ ان حالات میں اگر وزیراعلیٰ بھی میڈیا کے ساتھ مل گئے تو ہمیں بہت مشکل ہو جائے گی۔" ساری بات سن کر سجاد رانا نے تشویش کا اظہار کیا۔

"اگر کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ وزیراعلیٰ ہر حال میں میڈیا کے ساتھ ہی کھڑے ہوں گے۔ میں اس شخص کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ سستی شہرت حاصل کرنے کا کوئی بھی موقع ضائع کرنے والا آدمی نہیں ہے وہ۔ بہرحال، تم فی الحال سب سے پہلے تو ملزم کی موت کے وقت ڈیوٹی پر موجود عملے کی معطلی کے احکامات جاری کرواؤ تاکہ پبلک کو یہ یقین دلایا جا سکے کہ غفلت کے مرتکب ہونے والے افراد کے خلاف انکوائری کی جا رہی ہے۔ ساتھ ہی کوشش کرنا کہ وہ بندہ پکڑا جائے جس کے ذریعے زہر دیا گیا۔ یقیناً یہ نچلے عملے میں سے ہی کوئی فرد ہوگا۔ میں اس دوران اوپر بات کرتا ہوں۔ ہم اپنے طور پر جو کوششیں کر سکتے تھے وہ کرلیں، اب انٹیلی جنس کے افراد کو اس معاملے میں اعتماد میں لینا ناگزیر ہو گیا ہے۔" مختار مراد نے ہدایات جاری کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا اگلا پروگرام بھی بتایا جس کی سجاد رانا موجودہ حالات میں مخالفت نہیں کر سکتا تھا ورنہ اس کی دلی خواہش تھی کہ اپنی بیٹی کے قتل میں ملوث ایک ایک فرد کو اپنے ہاتھوں کیفر کردار تک پہنچائے۔

☆☆☆

"اور سنایئے چودھری صاحب! اپنے اے سی صاحب کے کیا حال ہیں؟ کچھ دماغ ٹھکانے آیا محترم کا یا نہیں؟" صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر دونوں ٹانگیں خوب پھیلا کر بیٹھتے ہوئے معظم تارڑ نے پوچھا۔

"حال تو پتلا ہے بے چارے اے سی کا۔ کل بلایا تھا اس نے ڈاکٹر ماریا کو پوچھ گچھ کے لیے۔" تارڑ کی بات کا جواب دے کر چودھری نے حقے کی نے منہ سے لگائی اور بے حد لطف اندوز ہونے والے انداز میں ایک نیا کش لگایا۔

"پھر کیا بتایا اسے ڈاکٹر ماریا نے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے ہم پریشانی میں پڑ جائیں۔ ان عورتوں کا کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کب بندے کو پھنسا دیں۔" ایس پی نے تشویش کا اظہار کیا۔

"ارے نہیں تارڑ صاحب! تسی فکر نہ کرو۔ ڈاکٹرنی پوری طرح ہمارے ہاتھ میں ہے۔ وہ ایسی کوئی غلطی نہیں کرے گی کہ ہمیں مشکل پڑ جائے۔ آپ تو بس اب اطمینان سے اس دن کا انتظار کرو جب اے سی ہمارے سامنے ناک سے لکیریں نکالے گا۔ اس واری ایسا وار کیا ہے ہم نے کہ اس کا بچ نکلنا ممکن ہی نہیں۔ بڑے نام والے خاندان کا سپوت ہے۔ ہم سے اڑی لگا کر اپنے خاندان کی عزت رولنے کا خطرہ نہیں مول لے سکے گا۔" چودھری بے حد مطمئن تھا۔

"بات تو آپ کی بھی ٹھیک ہے۔ اب یہ بتائیں کہ کب اس سلسلے میں اے سی سے مذاکرات شروع کریں گے؟"

"دو چار دن گزرنے دیں پھر بات بھی کرلیں گے۔ ایسی جلدی کیا ہے؟ ابھی تو ہم چند دن اس اے سی کے بچے کے تڑپنے کا تماشا دیکھنا چاہتے ہیں۔ وڈی نیندیں اڑائی ہیں اس نے ہماری، اب کچھ دن وہ بھی تو رت جگا منائے۔ ابھی تو بے چارہ اس الجھن میں پھنسا ہوگا کہ تصویریں ہم نے بھجوائی ہیں یا کسی اور نے؟ اس کی بے بسی کا تماشا دیکھنے کے لیے ہی تو میں نے ان تصویروں کے ساتھ کوئی خط پتر نہیں بھیجا تھا۔ شک بے شک اسے ہم پر ہی ہے لیکن خود سے گل چھیڑنے کی ہمت تو نہیں کر سکتا۔" چودھری کی خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ شہریار جس کے ہاتھوں اس نے ہمیشہ زک اٹھائی تھی، اب اپنے داؤ میں پھنسا نظر آ رہا تھا تو یہ کوئی معمولی بات تو نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ ان تصویروں کے ذریعے شہریار کو بلیک میل کر کے اس سے اپنے کئی مطالبات پورے کروائے جا سکتے ہیں۔

"اصل میں بات یہ ہے چودھری صاحب!" ایس پی سیدھا ہو کر بیٹھتا ہوا ذرا سا کھنکھارا۔ "اپنے باجوہ صاحب کچھ پریشان ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جلد از جلد اس معاملے کو نمٹا لیا جائے تاکہ ان کی بھی بحالی ہو سکے۔"

"ایک تو باجوہ نے بڑا پریشان کر رکھا ہے۔ ذرا حوصلہ نہیں اس آدمی میں۔ مجھے بھی بار بار فون کر کے میرے کان کھاتا رہتا ہے۔ اب آپ کو سفارشی بنا کر بھیج دیا ہے۔ میں تو سوچ رہا ہوں جان چھڑاؤں اس بندے سے۔ ویسے بھی سالا سب کی نظروں میں آ گیا ہے۔ بحال ہوگا تو بھی پریشانی ہی رہے گی ہمیں۔" چودھری نے ناگواری سے کہا۔

"باجوہ کا بھی خیال ہے کہ آپ اس سے جان چھڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھ سے شکایت کر رہا تھا کہ چودھری صاحب کا رویہ کچھ بدلا بدلا سا ہے۔ مجھ سے ڈھنگ سے بات نہیں کرتے کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھے اس سارے سیٹ اپ سے الگ کرنے کے چکر میں ہوں؟"

"تو آپ اسے بتا دیں کہ اس کا خیال ٹھیک ہے۔ فاریسٹ آفیسر کا کیا ہے، اس کی جگہ جو نیا بندہ آئے گا ہم اسے پارٹنر بنا لیں گے۔ خوامخواہ ایک شک کی زد میں آئے بندے کو اپنے ساتھ نتھی رکھنے کی کیا ضرورت ہے ہمیں۔ بہت کمائی اس نے ہمارے ساتھ رہ کر... اب کسی اور کو موقع دے۔"

"یہ اتنا آسان بھی ثابت نہیں ہوگا چودھری صاحب! باجوہ بھڑک جائے گا۔ ہو سکتا ہے غصے میں آ کر وہ کوئی ایسا قدم اٹھا لے جس کے بعد ہمارے نام بھی سامنے آ جائیں۔ ابھی تو جو کچھ ہے صرف شک کی حد تک ہے۔ باجوہ نے کوئی اقبالی بیان دے دیا تو ہم بُری طرح پھنس جائیں گے۔" تارڑ نے اسے معاملے کی نزاکت کا احساس دلایا۔

"میرے خیال میں آپ یہ گل اپنی طرف سے نہیں کر رہے ہیں۔ باجوہ نے اپنی تشویش کے ساتھ یہ دھمکی بھی آپ کے کانوں تک پہنچائی ہے۔" چودھری نے غصے سے بولتے ہوئے تارڑ کی شکل دیکھی تو وہ نظریں چرا گیا۔ یہ ایک طرح سے اس کی طرف سے اعتراف تھا کہ واقعی باجوہ نے ایسی کوئی دھمکی دی ہے۔

"تسی یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دو ایس پی صاحب! میں آپ باجوہ سے نمٹ لوں گا۔ تسی ریلیکس کرو۔" چودھری نے یک دم ہی موڈ بدل لیا اور نرم لہجے میں اسے تسلی دینے کے بعد ایک ملازم کو پکارا۔

"او شیدے! ایس پی صاحب کے لیے کھانا شانا لگوا۔ بڑے دن گزر گئے ہم نے اپنے جگر کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا۔" اس کے انداز سے تارڑ نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اب مزید اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرے گا اور واقعی اس

www.pkdigest.com

کمرے سے اٹھ کر ڈائننگ روم تک جانے اور کھانا کھانے کے دوران چودھری اِدھر اُدھر کے موضوعات پر ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہا لیکن باجوہ والا معاملہ دوبارہ نہیں چھیڑا۔ ایس پی بھی انجان بن گیا اور خوشگوار ماحول میں شان دار کھانا تناول کر کے خاموشی سے رخصت ہو گیا۔ اس کے رخصت ہونے کے بعد چودھری نے بالے کو بلوایا۔

"حکم چودھری صاحب!" وہ فوراً ہی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

"سنا ہے اپنے باجوہ صاحب کی زبان بڑی کھجلا رہی ہے۔ ان کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے ہیں۔ بس نہیں چل رہا کہ جو کچھ اندر ہے، باہر نکال دیں۔ اور تو جانتا ہے کہ ہم ایسی حرکتوں کو پسند نہیں کرتے۔"

"آپ حکم کریں چودھری صاحب! باجوہ کا علاج ہو جائے گا۔ اگر لاعلاج ہوا تو اسے وہاں بھی پہنچایا جا سکتا ہے جہاں ہر لاعلاج مریض کو پہنچنا ہوتا ہے۔" بالے کو گویا اس کا من پسند مشغلہ ہاتھ لگنے والا تھا جس کے بارے میں سن کر اس کی چھوٹی چھوٹی سرد آنکھیں چمکنے لگیں۔

"ابھی تو ایسا کر کہ اس پر نظر رکھ۔ آگے کیا کرنا ہے، میں تجھے بعد میں بتاؤں گا۔" کوئی بھی انتہائی حکم صادر کرنے کے بجائے اس نے بالے کو صرف نگرانی کا کام سونپا۔ عین وقت پر اسے خیال آ گیا کہ باجوہ کو کوئی نقصان پہنچا تو ایس پی کھٹک جائے گا کہ یہ اسی کا کام ہے اور فی الحال وہ ایس پی کی پارٹنرشپ سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ باجوہ کے مقابلے میں وہ اب بھی اس کے لیے کارآمد تھا پھر وزیرِاعلیٰ سے اس کی رشتے داری کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی احتیاط کرنی پڑتی تھی۔ باجوہ کو کچھ ہوتا تو اس کے آگے پیچھے کوئی ایسا بڑا آدمی نہیں تھا جو چودھری کے گلے پڑتا لیکن ایس پی اسے پھنسوا سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے چودھری صاحب! جیسا آپ کا حکم۔" بالے کو کچھ مایوسی ہوئی لیکن ظاہر ہے وہ چودھری کے سامنے اس کے فیصلے پر اعتراض تو نہیں کر سکتا تھا اس لیے فرماں برداری سے بولا۔

"ایک کام اور کرنا۔ ڈاکٹر ماریا سے کہنا کہ تیار رہے۔ آج رات ہم اسے اپنے ڈیرے پر دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے چودھری صاحب! میں خود اسے رات کو آپ کی خدمت میں لے آؤں گا۔" بالے نے جواب دیا اور پھر اس کا اشارہ پا کر باہر نکل گیا۔ چودھری مسرور سا آنے والی رات کے تصور میں کھو گیا جو اسے اپنی کسی موٹی بھدی بیوی یا بازاری عورت کے بجائے ڈاکٹر ماریا جیسی بھرپور عورت کی قربت میں گزارنی تھی۔

☆☆☆

خوف سے تھر تھر کانپتے اس شخص پر سجاد رانا نے ایک قہر آلود نظر ڈالی۔ وہ کل رات ڈیوٹی پر موجود سپاہیوں میں سے ایک تھا۔ پولیس کسٹڈی میں زہر خورانی کے نتیجے میں ہلاک ہونے والے خواجہ سرا کی ہلاکت کے بارے میں یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ اس کی موت کا سبب کھانے میں شامل زہر تھا، فوری طور پر ڈیوٹی پر موجود اہلکاروں کی طرف ہی دھیان گیا تھا۔ خواجہ سرا کی موت کا انکشاف صبح اس وقت ہوا جب رات والا عملہ واپس جا چکا تھا اور صبح اس کی جگہ نئے عملے نے لی تھی۔ تحقیقات کرنے والوں نے فوری طور پر رات والے عملے کو کال کر لیا۔ سارا عملہ حاضر ہو گیا مگر تنویر احمد نامی یہ سپاہی نہیں آیا۔ حاضر افراد سے تفتیش شروع کرنے کے ساتھ ہی دو سپاہی تنویر احمد کے گھر کی طرف روانہ کیے گئے جہاں اس کی بیوی نے بتایا کہ تنویر گھر پر نہیں ہے۔ وہ صبح ڈیوٹی سے واپس آتے ہی اپنے چند جوڑے کپڑے لے کر گھر سے نکل گیا تھا کہ کسی ضروری کام سے جا رہا ہے۔ سپاہیوں نے اس بات کی اطلاع ایس پی کو دی۔ تنویر احمد کے بلاوے پر حاضر نہ ہونے پر پہلے ہی اس کی طرف سے کھٹکا ہو گیا تھا۔ اب جو اس کے گھر سے غائب ہونے کی اطلاع ملی تو یقین ہو گیا کہ خواجہ سرا کے قتل کے پیچھے اسی شخص کا ہاتھ ہے۔ برق رفتاری سے ہر طرف بندے دوڑائے گئے۔ تنویر احمد کے گھر سے کپڑے وغیرہ لے کر نکلنے سے یہی اندازہ ہوا تھا کہ وہ شہر سے باہر کہیں جانے کا ارادہ رکھتا ہے چنانچہ اسی رخ پر تحقیق کی گئی۔ اس کی بیوی کو ڈرا دھمکا کر اس سے ان کے بیرونِ شہر مقیم رشتے داروں کے نام پتے معلوم کیے گئے۔ تنویر احمد کے گھر سے اس کی چند تصویریں بھی مل گئیں۔ سپاہی تصویروں سمیت ریلوے اسٹیشن اور بسوں کے اڈے کی طرف دوڑے۔ بالآخر اس بھاگ دوڑ کے نتیجے میں بس اڈے سے معلوم ہو گیا کہ اس حلیے اور شکل و صورت کا آدمی فلاں روٹ کی بس میں بیٹھ کر فلاں وقت روانہ ہوا ہے۔ بس جس شہر کی طرف گئی تھی، وہاں تنویر احمد کی بیوی کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق اس کی بہن رہتی تھی۔ اب پولیس کے پاس یہی حل تھا کہ یا تو یہاں سے کسی کو تنویر احمد کے تعاقب میں روانہ کرے یا وہاں کی مقامی پولیس کو ذمے داری سونپے کہ جیسے ہی تنویر احمد پہنچے، اسے گرفتار کر کے واپس لاہور بھیجا جائے۔ لیکن سجاد رانا کی ذاتی دلچسپی اور سخت ہدایات کے باعث پولیس والوں نے کچھ غیر معمولی مستعدی دکھائی۔ ٹرانسپورٹ کمپنی سے یہ معلوم

کرنے کے بعد کہ وقت کے اس دورانیے میں ان کی کمپنی کی بس کہاں تک پہنچی ہوگی، اس علاقے کے تھانہ انچارج کو حکم دیا گیا کہ راستے میں ہی بس رکوا کر فلاں شخص کو گرفتار کرو اور فوری طور پر لاہور روانہ کرو۔ نتیجتاً اس وقت تنویر احمد "ابھی اڑنے بھی نہ پائے تھے کہ گرفتار ہو گئے" کے مصداق ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنے وہاں موجود تھا۔ سجاد رانا یہ معاملہ کسی اور پر چھوڑنے کے بجائے خود اس سے پوچھ گچھ کے لیے آ پہنچا تھا اور اب اس شخص کو قہر آلود نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"کس کے کہنے پر تم نے اس شخص کو زہر دیا؟" چند لمحوں تک اسے گھورنے کے بعد اس نے سرد لہجے میں سوال کیا۔

"اللہ پاک کی قسم سر! میں نے کسی کو زہر نہیں دیا۔" اپنی شہ رگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے کانپتی آواز میں جواب دیا۔

"تو پھر بھاگ کیوں رہے تھے شہر سے؟" اس نے کچھ اور کاٹ دار لہجے میں پوچھا۔

"میں بھاگ نہیں رہا تھا سر! میری بہن کا فون آیا تھا کہ اس کے گھر والے کی طبیعت خراب ہے اس لیے میں ایمرجنسی میں اپنی بہن کے گھر جا رہا تھا۔ راستے میں پولیس والوں نے مجھے گرفتار کر لیا۔ میں نے بہت پوچھا مگر کسی نے نہیں بتایا کہ مجھے کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے۔ یہاں آ کر مجھے معلوم ہوا کہ مجھ پر لاک اپ میں بند خواجہ سرا کو زہر دینے کا الزام ہے۔" وہ اب کسی حد تک خود کو سنبھال چکا تھا اور شاید وہ سب کہہ رہا تھا جو اس دوران اس نے اپنی صفائی میں کہنے کے لیے سوچا تھا۔

"آپ خود سوچیے سر! میری بھلا اس خواجہ سرا سے کیا دشمنی تھی جو میں اسے زہر دے کر مارتا؟" سجاد رانا کو براہِ راست مخاطب کر کے یہ جواب دیتے ہوئے اس نے پہلے تھوک نگل کر اپنے خشک ہوتے حلق کو تر کرنے کی کوشش کی تھی۔ خود کو ہزار سنبھال لینے کے باوجود بہرحال ایک معمولی سپاہی کا ڈی آئی جی سے بات کرتے ہوئے پتا پانی ہو رہا تھا۔

"میرے خیال میں ہاشمی صاحب... یہ شخص شرافت کی زبان نہیں سمجھے گا۔ بہتر ہے کہ اسے اس کے ساتھیوں کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ لوگ خود ہی اس سے سارا سچ جھوٹ اگلوا لیں گے۔" اس کے بیان کو خاطر میں لائے بغیر سجاد رانا نے ایس پی کو مخاطب کرتے ہوئے سپاٹ سے لہجے میں حکم دیا تو تنویر احمد کا جسم ایک بار پھر کانپنے لگا۔ اس نے پولیس کی ملازمت میں پانچ سال گزارے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے ساتھی اس سے سچ اگلوانے کے لیے کون کون سے طریقے استعمال کریں گے۔ ان طریقوں کو مجرموں پر آزمانا مختلف بات تھی، خود پر سہنا اور بات۔ وہ فوراً ہی ڈھے گیا۔

"میں سچ بتاتا ہوں سر! میں آپ کو سب کچھ سچ سچ بتاتا ہوں۔" اس سے قبل کہ ایس پی کے اشارے پر اسے وہاں سے لے جایا جاتا، وہ فوراً ہی بول پڑا اور دونوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑ دیے۔

"بولو... لیکن یاد رکھنا کہ ایک لفظ بھی جھوٹ کہا تو تمہارے حق میں بہت برا ہوگا۔" سجاد رانا نے اسے دھمکایا۔

"میں اپنے بچوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو کچھ کہوں گا، سچ کہوں گا۔" اس نے یقین دہانی کروائی پھر ذرا سا توقف کرتے ہوئے بولنا شروع کیا۔

"میں رات کے کھانے سے پہلے باہر پان والے کے کھوکھے سے سگریٹ لینے گیا تھا۔ سگریٹ لے کر واپس آیا تو ایک عورت نے آواز دے کر روک لیا۔ بے چاری اچھی خاصی بوڑھی عورت تھی۔ اس کے ہاتھ میں سٹور کا ایک ٹفن تھا۔ مجھ سے کہنے لگی کہ پولیس نے میرے بے گناہ بچے کو پکڑ لیا ہے۔ وہ بے چارہ پہلے ہی قسمت کا مارا ہے کہ نہ تو مکمل طور پر عورت ہے نہ ہی مرد۔ بہن بھائی اس ناکردہ گناہ کے جرم میں بے چارے کے ساتھ حقارت سے پیش آتے ہیں۔ باپ ناراض رہتا ہے کہ اس کی وجہ سے سر جھک گیا۔ ایک لے دے کر میں اکیلی ماں ہی ہوں جو اپنے لختِ جگر کا دکھ سمجھتی ہوں۔ اب بھی پولیس نے اسے گرفتار کیا ہے تو بہن بھائیوں اور باپ کو کوئی فکر نہیں۔ میں ہی ماری ماری پھر کر اس کے یہاں موجود ہونے کا معلوم کرنے کے بعد یہاں آئی ہوں۔ پہلے کوشش کی تھی کہ اپنے بچے سے ملاقات کر لوں لیکن جواب ملا کہ بڑے صاحب کی اجازت نہیں۔ مجھ ممتا کی ماری کو اور کچھ سمجھ نہیں آیا تو گھر جا کر اپنے بچے کے لیے کھانا پکا کر لے آئی۔ اب جب سے یہاں انتظار میں کھڑی ہوں کہ کوئی رحم دل شخص نظر آئے تو اس کے ذریعے اپنے بچے کو کھانا بھجواؤں۔ تم تھانے سے نکلے تھے، تب ہی تمہاری شکل دیکھ کر میں نے سمجھ لیا تھا کہ تم کسی نیک ماں باپ کی نیک اولاد ہو۔ بیٹا! اللہ کے واسطے مجھ دکھیاری کی مدد کرو۔ میرے بچے تک یہ کھانا پہنچا دو۔ اس کا پیٹ بھر جائے گا تو میرے کلیجے میں بھی ٹھنڈ پڑ جائے گی۔ میں دکھوں کی ماری ماں اس بھلائی کے بدلے میں تمہیں ڈھیر ساری دعائیں اور یہ پانچ سو روپے دوں گی۔ بس جناب! میں اس عورت کی باتوں میں آ گیا۔ کچھ میرا دل پسیجا، کچھ پانچ سو کے لالچ نے کام دکھایا۔ میں

www.pkdigest.com

نے کھانے کا ٹفن عورت سے لیا اور قیدی کو پہنچا دیا۔ صبح کے قریب میں نے چکر لگایا تو دیکھا کہ وہ مر چکا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو کھانے میں کوئی گڑبڑ تھی۔ بوڑھی عورت باتیں بنا کر مجھے بے وقوف بنا گئی ہے۔ گھبراہٹ میں میری اور تو کچھ سمجھ نہیں آیا، ڈیوٹی کا ٹائم ختم ہوتے ہی میں گھر گیا اور پھر وہاں سے چند جوڑے لے کر بس اڈے چلا گیا۔ خیال تھا کہ کچھ دن بہن کے گھر چھپ کر رہوں گا اور دیکھوں گا کہ معاملات کیا رخ اختیار کرتے ہیں لیکن راستے میں ہی دھر لیا گیا۔"

اس نے ایک سانس میں ہی سب کچھ کہہ ڈالا۔ سجاد رانا کی تجربہ کار نگاہیں کسی پولی گراف مشین کی طرح اس کے کہے ہوئے ایک ایک لفظ کو جانچتی رہیں۔ ان کا تجربہ کہہ رہا تھا کہ اس نے جھوٹ نہیں کہا۔ واقعات اسی ترتیب سے پیش آئے ہیں جیسے اس نے بتایا ہے لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس کی حماقت اور لالچ کی وجہ سے نہ صرف وہ پھنس گئے تھے بلکہ ایک اہم کلیو بھی ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ان کے مخبروں نے کئی دن کی محنت کے بعد جسم فروشی کے دھندے میں ملوث اس خواجہ سرا کا پتا لگایا تھا۔ تحقیق سے معلوم ہوا تھا کہ یہ خواجہ سرا کچھ بڑے عہدے داروں تک بھی رسائی رکھتا ہے اور اسی بنیاد پر اسے مشکوک قرار دیتے ہوئے گرفتار کیا گیا تھا کہ ممکن ہے یہ شخص جاسوسی کا کام انجام دے رہا ہو۔ اگر وہ لوگ اس کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو جاتے تو اس شخص تک رسائی ممکن ہو سکتی تھی جس کی نگرانی میں یہ سب ہو رہا تھا مگر اس کی ہلاکت سے سارا منصوبہ ہی دھرا رہ گیا، البتہ اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ واقعی وہ دشمنوں کا ایک اہم مہرہ تھا جس کے ہاتھوں اپنے پھنسنے سے قبل ہی انہوں نے خود ہی اسے چھڑا دیا تھا۔

"لے جاؤ اسے اور چیک کرو کہ جو کچھ اس نے کہا ہے ٹھیک ہے یا نہیں۔" وہ جانتا تھا کہ اس کا یہ حکم بے معنی ہی ہے لیکن تنویر احمد پر جو غصہ تھا، وہ کسی صورت تو نکلنا ہی تھا۔

☆☆☆

"میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"بالکل سیدھی سادی تو بات ہے۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ تم اپنی اس زبردستی کی بے جوڑ شادی کے خلاف قانونی مدد حاصل کرنے کے لیے درخواست دو۔ درخواست میں لکھ دوں گی، تم صرف دستخط کر دو۔ تمہاری درخواست کو آگے پہنچانا میری ذمے داری ہے۔" فریدہ کے حیرت بھرے لہجے میں کی گئی بات کا جواب نہایت رسان سے دیتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اسے ساری بات سمجھائی۔

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ کیوں؟ آخر تمہیں مجھ سے کیا ہمدردی ہے کہ تم اپنے ہی گھر والوں کے خلاف مجھے اکسا رہی ہو؟" وہ عمر میں کشور سے کافی چھوٹی تھی پھر دونوں کے درمیان حیثیت کا بھی واضح فرق تھا، اس کے باوجود وہ اسے مخاطب کرنے کے لیے "تم" کا صیغہ استعمال کرتی تھی۔

"میں تمہیں اپنے گھر والوں کے خلاف نہیں، ظلم کے خلاف اکسا رہی ہوں۔ ایک عاقل و بالغ لڑکی کا کسی ذہنی طور پر پسماندہ شخص سے نکاح اس کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانے میں تمہارا ساتھ دوں۔"

"مگر تم یہ سب کرو گی کیسے؟ تم بھی تو میری طرح اس حویلی سے بنا اجازت باہر نہیں جا سکتیں۔ چلو مان لیا کہ تمہاری کوئی ملازمہ میری درخواست کو کسی سرکاری دفتر تک پہنچا دے گی لیکن درخواست پر غور کون کرے گا؟ سارے افسر اور قانون وڈے چودھری کی مٹھی میں ہیں۔ کسی کی ہمت ہی نہیں ہو گی کہ انہیں کچھ کہہ سکیں۔" فریدہ مایوسی سے بولی۔

"اس بات کی تم فکر مت کرو۔ جو کچھ کر سکتے ہیں انہوں نے ہی مجھے تم تک یہ پیغام پہنچانے کے لیے کہا ہے۔" کشور مسکرائی۔

"کون؟ کون ہے وہ؟"

"اس بات کو رہنے دو۔ تم صرف درخواست بھجوانے کی بات کرو اور پھر انتظار کرو کہ کب تمہیں یہاں سے نجات ملتی ہے۔" کشور نے اسے ٹالا۔

"یہاں سے نجات مل بھی گئی تو کیا فائدہ ہو گا؟ میرا جو نقصان ہونا تھا، وہ تو ہو ہی چکا۔ اس حرکت کے بدلے میں الٹا میرے بھائی بھی پھنس جائیں گے۔ میں نے پہلے ہی انہیں وڈا دکھ دیا ہے، اب ہور ان کی عزت خراب نہیں کر سکتی۔ اب جو بھی کرنا ہو گا، میں آپ ہی کروں گی۔"

"بے وقوف مت ہو۔ تم کچھ نہیں کر سکتیں۔ یہاں عورت کسی جانور کی طرح بے بس ہے۔" اس کے انکار پر کشور جھنجلا کر بولی۔

"تم نے وہ گل تو سنی ہو گی نا کہ وقت آنے پر چیونٹی بھی ہاتھی کو کاٹ سکتی ہے... بس میں بھی وقت کے انتظار میں ہوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے، مت مانو میری بات۔ ایسا کرو کہ مجھے اپنے اس کزن قربان کا پتا بتا دو۔ کم از کم میں اس بے چارے کو تو تمہاری کوئی خیر خبر دے دوں۔" اس کی ضد دیکھتے ہوئے کشور نے بات کا رخ موڑ دیا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ قربان کا نام سنتے ہی فریدہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس بار اس نے بنا کسی حیل و حجت کے اس کے سوال کا جواب دے دیا پھر یک دم ہی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے کشور نے بھی اسے مزید چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور واپسی کے لیے اٹھ گئی۔ بہزاد شاہ کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کی نظر کھلے دروازے سے اندر گئی تو اس نے وہاں فریدہ کو اس کے ساتھ ربر کی بڑی سی گیند سے کھیلتے ہوئے دیکھا۔ بہزاد شاہ دلہن کو اپنے ساتھ کھیلتے پا کر بہت خوش تھا اور اس خوشی کا اظہار تالیاں بجا بجا کر کر رہا تھا۔ فریدہ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ تھی لیکن یہ مسکراہٹ خود پر کتنا جبر کرنے کے بعد اس نے اپنے ہونٹوں پر سجائی ہو گی، کشور سمجھ سکتی تھی۔ دل میں گہرا تاسف لیے وہ اوپری منزل سے اتر آئی۔ سیڑھیاں اترتے ہی اس کا بڑی چودھرائن سے سامنا ہو گیا۔

"وڈے لاڈ ہو رہے ہیں نوی بھاوج کے۔ جب دیکھو تب اوپر جاتی آتی نظر آتی ہے۔ وڈے چودھری صاحب نے منع بھی کیا ہے کہ اس سے زیادہ میل ملاپ کی ضرورت نہیں ہے، پر تیری سمجھ میں کچھ آتا ہی نہیں ہے... جو جی میں آتا ہے وہی کرتی پھرتی ہے۔" اسے سیڑھیاں اترتے دیکھ کر اس نے فوراً تنقید کی۔

"زیادہ کہاں جاتی ہوں اماں! بس پورے دن میں ایک ہی چکر تو لگتا ہے اوپر کا... اور وہ تو میں بہزاد شاہ کے لیے پہلے بھی لگاتی تھی۔" وڈی چودھرائن سے بگاڑنا مناسب نہیں، یہ بات وہ بھی سمجھتی تھی چنانچہ نرمی سے ذرا لاڈ بھرے لہجے میں بولی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور الماری میں کپڑوں کی تہ کے درمیان چھپا کر رکھا گیا موبائل نکال کر آن کیا۔ ذرا دیر میں وہ آفتاب کو آج فریدہ سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتا رہی تھی۔

"آپ اسے سمجھانے کی کوشش کریں۔ اس طرح چپ رہ کر تو وہ اپنے ساتھ مزید ظلم کر رہی ہے۔"

"میرے خیال میں یہ کام میرے مقابلے میں قربان زیادہ بہتر طریقے سے کر سکتا ہے۔ میں نے فریدہ سے اس کا پتا معلوم کر لیا ہے۔ آپ اس پتے پر جا کر قربان سے ملیں۔ کسی دن موقع دیکھ کر ہم ان دونوں کی موبائل پر بات کروا دیں گے۔ قربان سمجھائے گا تو وہ سارے ڈر خوف بھول کر ہماری بات ماننے پر راضی ہو جائے گی۔" اس نے آفتاب کو قربان کا پتا بتاتے ہوئے امید ظاہر کی۔

"جو حکم بیگم صاحبہ! بندہ آپ کے حکم کا غلام ہے۔ آپ جیسا کہیں گی ویسا ہی کرے گا۔ ویسے کیا بات ہے، آج کل آپ کی طرف سے ملاقات کا حکم ملنا بند ہو گیا ہے؟ اب ہم منتظر ہیں ایسے کسی پیغام کے تو آپ کی طرف سے خاموشی ہے۔" سنجیدگی سے بات کرتے کرتے وہ اچانک ہی شوخی پر اتر آیا اور کشور کو چھیڑا۔

"اب اس کھنڈر سے انڈسٹریل ہوم میں ملنے کا جی نہیں چاہتا۔ اب کبھی ملیں گے تو ایسے ماحول میں جو ہمارے رشتے کے شایانِ شان ہو۔ جب سے میرے نام کے ساتھ آپ کا نام جڑا ہے، اپنا آپ اتنا معتبر لگتا ہے کہ کسی عام سی جگہ پر آپ سے ملنے کے لیے آنے کا جی ہی نہیں چاہتا۔" اس نے شرمیلے لہجے میں جواب دیا۔

"بہت خوب! یعنی اب ملنے کے لیے لمبا انتظار کرنا ہو گا۔" آفتاب نے ایک مصنوعی سرد آہ بھری۔

"کوئی حرج نہیں۔ ویسے بھی سیانے کہتے ہیں کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔" اپنے لیے اس کی بے قراری محسوس کر کے اس کے دل میں فخر کا احساس جاگا اور وہ کھلکھلا کر شوخی سے بولی۔ جواباً آفتاب اس سے کچھ کہتا، اس سے قبل ہی کمرے کے دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔ کشور نے جلدی سے لائن کاٹ کر موبائل ایک دراز میں ڈالا اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے چھمی کھڑی تھی۔

"کیا بات ہے؟" چھمی کی پھیلی ہوئی باچھوں پر اندر ہی اندر جز بز ہوتے ہوئے اس نے سختی سے پوچھا۔

"آپ کے کمرے کی صفائی کرنے کے لیے آئی تھی بی بی۔" اس کے لہجے کی سختی کو خاطر میں لائے بغیر اس نے ہنوز پھیلی ہوئی باچھوں کے ساتھ بتایا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ معلوم تو ہے تجھے کہ میرے سارے کام رانی کرتی ہے پھر کس لیے منہ اٹھا کر چلی آئی ہے؟" اس نے کچھ اور سختی سے اسے جھڑکا۔

"جیسی تہاڈی مرضی بی بی۔ میں تو وڈی چودھرائن کے کہنے پر آئی تھی۔" وہ عجیب سے لہجے میں کہہ کر لہراتی بل کھاتی وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ کشور دروازے پر ہی کھڑی پرسوچ انداز میں اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ بڑی چودھرائن اس کے ساتھ چوہے بلی کا کوئی کھیل، کھیل رہی ہے۔ وہ کھل کر کبھی کچھ کہتی نہیں تھی لیکن آنے بہانے اسے جتاتی ضرور تھی کہ وہ اس کی نگرانی

کی طرف سے غافل نہیں ہے۔ دل ہی دل میں خود کو مزید محتاط رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کشور، بچھی کے نظروں سے غائب ہونے پر دروازے سے پلٹ کر واپس اپنے بیڈ پر آکر لیٹ گئی اور سرہانے رکھی ایک کتاب اٹھا کر پڑھنے لگی لیکن یہ پریشانی ایسی نہیں تھی کہ کتاب سے خود کو بہلا کر نظر انداز کی جا سکتی۔

☆☆☆

"ڈاکٹر ماریا کے متعلق آپ کی مطلوبہ معلومات حاصل ہو گئی ہیں سر! آپ نے جو ایڈریس نوٹ کروایا تھا، وہ لاہور کے اسی گھر میں رہتی تھیں۔ محلے والوں کے مطابق وہ اور ان کی والدہ سنتھیا تقریباً تین سال سے اس گھر میں رہ رہی ہیں۔ محلے والوں سے ان لوگوں کا زیادہ ملنا جلنا نہیں البتہ سنتھیا آتے جاتے آس پڑوس والوں سے تھوڑی بہت بات کر لیتی تھی۔ مجموعی طور پر محلے والوں کے مطابق دونوں ماں بیٹی شریف اور بے ضرر خواتین ہیں۔ ڈاکٹر ماریا کے پیر آباد آنے کے بارے میں سنتھیا نے ایک دو محلے داروں کو بتایا تھا اور یہ ارادہ ظاہر کیا تھا کہ چند دن بعد وہ خود بھی بیٹی کے پاس چلی جائے گی۔ سنتھیا نظر نہیں آئی تو ان لوگوں نے یہی خیال کیا کہ وہ پیر آباد چلی گئی ہے۔ جن لوگوں کے ذمے میں نے معلومات جمع کرنے کا کام لگایا تھا، انہوں نے ڈاکٹر ماریا کے گھر کا جائزہ لیا ہے۔ گھر کا کافی سامان بندھا پڑا ہے جس سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ کہیں نہ کہیں جانے کی تیاری میں تھے۔ ڈاکٹر ماریا جس اسپتال میں جاب کرتی تھیں، وہاں سے بھی یہی اطلاع ملی ہے کہ وہ بہت ایمرجنسی میں جاب چھوڑ کر گئی تھیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے اسپتال سے اپنے واجبات بھی وصول نہیں کیے۔" عبدالمنان نے جو رپورٹ پیش کی، وہ ڈاکٹر ماریا کی اپنے بارے میں مہیا کردہ معلومات کی تصدیق کر رہی تھی۔ اس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگایا اور دھیمی آواز میں بولا۔

"ٹھیک ہے عبدالمنان! مجھے امید تھی کہ تم یہ کام ذمے داری سے انجام دو گے اسی لیے میں نے اسے تمہارے سپرد کیا تھا۔"

"مجھے آپ کے اس اعتماد پر خوشی ہے سر! اللہ نے چاہا تو میں آئندہ بھی آپ کے اعتماد پر پورا اتروں گا۔" اس نے مؤدبانہ جواب دیا پھر ذرا توقف کے بعد بولا۔ "کیا بات ہے سر! آپ مجھے کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟ کیا آپ کو ڈاکٹر ماریا پر کسی قسم کا کوئی شک ہے؟"

"نہیں... اصل میں، میں ان کی والدہ کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔ ڈاکٹر ماریا کے مطابق انہیں کسی نے حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے اور اس بنیاد پر انہیں بلیک میل کر رہا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ ان کی کسی قسم کی مدد کرنے سے قبل پہلے تصدیق کروا لوں جب ہی کوئی اسٹیپ لوں گا۔" تصویروں والا معاملہ اتنا نازک تھا کہ وہ اسے فی الحال عبدالمنان سے بھی شیئر کرنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا اس لیے صرف اتنی سی بات بتا کر اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"اوہ! آئی سی۔" عبدالمنان نے ہونٹ سکیڑے پھر پوچھنے لگا۔ "کیا ڈاکٹر ماریہ نے کسی پر شک ظاہر کیا ہے؟"

"بہت صاف لفظوں میں تو نہیں لیکن مجھے ان کی باتوں سے ایسا لگا تھا کہ شاید چودھری افتخار کی طرف سے انہیں پریشان کیا جا رہا ہے۔" اس نے ایک بار پھر گریز کی راہ اپناتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

"پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟ اس سلسلے میں ہمارا کیا لائحہ عمل ہونا چاہیے؟" عبدالمنان فوراً مستعد نظر آنے لگا۔

"فی الحال تو ہم خاموش رہیں گے۔ اگر ڈاکٹر ماریا کی والدہ دو تین دن میں خود ہی واپس آجاتی ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ پھر کوئی کارروائی کریں گے۔" اس کا یہ جواب اس کی فطرت کے خلاف تھا جسے عبدالمنان نے محسوس تو کیا لیکن مزید کوئی سوال کیے بغیر اس سے اجازت لے کر باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد بھی شہریار کافی دیر تک سوچ میں ڈوبا بیٹھا رہا۔ تصویروں والا یہ معاملہ کتنا بڑا اسکینڈل بن سکتا ہے، وہ جانتا تھا۔ اس اسکینڈل کے سامنے آنے پر ان کے خاندان کی ساکھ داؤ پر لگ جاتی مگر مسئلہ یہ تھا کہ اسے صرف تصویریں بھیجی گئی تھیں۔ بھیجنے والے نے نہ تو اپنا تعارف کروایا تھا اور نہ ہی کوئی ڈیمانڈ سامنے رکھی تھی۔ ان حالات میں وہ چودھری افتخار سے براہِ راست اس موضوع پر کوئی بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ وہ صاف مکر جاتا کہ یہ میرا کام نہیں۔ وہ بہزاد شاہ کے ڈیرے پر اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کا حوالہ بھی دیتا تو بے کار جاتا۔ جو تصویریں اسے بھیجی گئی تھیں، ان میں نہ تو ڈاکٹر ماریا کا چہرہ نظر آ رہا تھا، نہ ہی کوئی اور ایسی شے دکھائی دے رہی تھی جس سے ثابت کیا جا سکتا کہ تصویریں حویلی کے اندر کھینچی گئی ہیں۔ وہ عجیب مشکل میں پڑ گیا تھا۔ ہر لحظہ یہی فکر رہتی تھی کہ جانے ان تصویروں کی بنیاد پر کون سا مطالبہ کر دیا جائے۔ فی الحال تو وہ ایسی صورتِ حال میں پھنس گیا تھا کہ انکار کر نہیں سکتا تھا اور اقرار کرنے کا مطلب دشمن کے سامنے پسپائی اختیار کرنا تھا۔

"ڈاکٹر ماریا آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں سر!" ٹیلی فون کی گھنٹی پر اس نے چونک کر ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے اسے اطلاع دی گئی۔

"ٹھیک ہے۔ بات کروائیں۔" ڈاکٹر ماریا کا نام سن کر اس نے اجازت دی۔

"ہیلو ایس پی صاحب! کیسے مزاج ہیں آپ کے؟" رابطہ ملنے پر دوسری طرف سے ڈاکٹر ماریا نے اس سے پوچھا۔ پھر اس کی طرف سے کوئی جواب دیے جانے سے قبل ہی بولی۔ "ظاہر ہے آپ پریشان ہوں گے۔ میں نے آپ کی پریشانی کا سوچ کر ہی آپ کو فون کیا ہے۔"

"ٹھیک ہی سوچا۔" وہ فی الحال یہی کہہ سکتا تھا ورنہ ڈاکٹر ماریا کے فون کرنے یا نہ کرنے سے اسے کیا فرق پڑتا تھا۔ اپنی مجبوری بتا کر وہ کسی بھی قسم کے تعاون سے پہلے ہی صاف انکار کر چکی تھی۔

"ٹھیک ہی تو جب کہیے گا جب میں آپ کو اپنے پاس موجود ایک زبردست خبر دوں گی۔"

"کیسی خبر؟" اس کے لہجے میں موجود جوش کو محسوس کر کے وہ اپنی کرسی پر بالکل سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"آپ کا فون تو محفوظ ہے نا؟ یہ نہ ہو کہ آپریٹر یا کوئی اور بھی [illegible] کے بجائے محتاط لہجے میں پوچھا۔

"اگر ایسی بات ہے تو آپ میرے موبائل پر کال کر لیں۔" اس نے اپنا موبائل نمبر نوٹ کروایا۔

"ٹھیک ہے، میں ابھی کال کرتی ہوں۔" اس نے کہا اور فوراً رابطہ منقطع کر دیا۔ چند سیکنڈز ہی گزرے ہوں گے کہ اس کا موبائل کال آنے کی نشان دہی کرنے لگا۔ اس نے جھپٹ کر کال ریسیو کی۔

"آپ کی خاطر میں نے ایک اہم کام تو کر ڈالا ہے لیکن ڈر رہی تھی کہ کہیں کسی اور کو اس بات کا علم ہو گیا تو خود میں مشکل میں نہ پڑ جاؤں، اس لیے احتیاط ضروری سمجھی۔" دوسری طرف وہی تھی اور اس کی "ہیلو" سننے کے بعد وضاحت پیش کر رہی تھی۔

"میں سمجھتا ہوں۔ آپ پلیز وہ بات بتائیں جس کے لیے آپ نے مجھے کال کی ہے۔ میرا موبائل بالکل محفوظ ہے۔ آپ اس بات کا اطمینان رکھیں کہ آپ جو کچھ کہیں گی، وہ میرے سوا کسی اور شخص کے علم میں نہیں آئے گا۔" اپنے ہیجان کو قابو میں رکھتے ہوئے اس نے ڈاکٹر ماریا کو تسلی دی۔

"مجھے اس جگہ کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے جہاں چودھری نے آپ کی تصویریں اور ان کے نیگیٹوز چھپا کر رکھے ہوئے ہیں۔ چودھری کے ڈیرے میں موجود تہ خانے کے ایک کمرے میں خفیہ تجوری ہے۔ اس تجوری میں وہ اپنے خاص خاص کاغذات اور دوسری قیمتی اشیا رکھتا ہے۔ آپ کی تصویریں بھی اسی تجوری میں رکھی گئی ہیں۔"

"آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟" ڈاکٹر ماریا کی پُرجوش لہجے میں فراہم کردہ معلومات کو سن کر اس نے حیرت سے پوچھا۔

"کل رات میں چودھری کے ڈیرے پر اس کے ساتھ ہی موجود تھی۔ شراب کے نشے میں چور جب وہ میرے ساتھ اپنی من مانیاں کر رہا تھا، میں نے موقع دیکھ کر اس کے ساتھ یہ موضوع چھیڑ دیا۔ میں نے کہا... چودھری صاحب! آپ نے ایس پی شہریار کو جو تصویریں بھیجی ہیں، ان کو دیکھ کر اس کا سارا شک تو آپ پر جائے گا۔ وہ بااختیار آدمی ہے، کچھ معلوم نہیں کہ آپ کی حویلی وغیرہ کی تلاشی لینے پر اتر آئے۔ جواب میں وہ بولا کہ اول تو ایسا ممکن ہی نہیں پھر بھی اگر کسی طرح یہ ممکن ہو جاتا ہے تو اسے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ میں نے وہ تصویریں بڑی حفاظت سے اپنی خفیہ تجوری میں رکھی ہیں جس تک پہنچنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں۔ بس پھر میں نے اس کو اس طرح اپنی باتوں میں الجھایا کہ اس نے خود ہی اپنی خفیہ تجوری کے بارے میں ساری تفصیل اگل دی... مگر خبیث ہے بڑا چالاک۔ آپ کے بارے میں تو زبان کھول دی لیکن میری ماں کے متعلق کچھ نہیں اگلا۔ اب کوشش کروں گی کہ اگلی بار میں اس کی زبان کھلوا سکوں۔" ماریا نے اسے بتایا۔

"اس کا مطلب ہے آپ کا مستقل چودھری کی خلوت میں آنا جانا ہے؟"

"ظاہر ہے، میں مجبور ہوں۔ میری کمزوریاں اس کے ہاتھ میں ہیں اس لیے مجھے اس کا مطالبہ بھی ماننا پڑتا ہے اور آئندہ بھی اس وقت تک ماننا پڑے گا جب تک میں خود کو ان کمزوریوں سے چھٹکارا نہ دلوا لوں۔"

"میں کوشش کروں گا کہ آپ کی اس سلسلے میں کوئی مدد کر سکوں۔"

"بہت شکریہ۔ فی الحال تو آپ خود کو بچانے کی کوئی تدبیر کریں۔ مجھے جو کچھ معلوم ہوا ہے... اس کے مطابق پیر آباد میں عنقریب جو سالانہ میلہ لگنے والا ہے، اس کے حوالے سے آپ کو بلیک میل کیا جا سکتا ہے۔ چودھری کا پروگرام ہے کہ میلے سے پہلے آپ کو پیغام بھیجا جائے گا کہ

www.pkdigest.com

آپ اس کے راستے سے ہٹ جائیں۔ مزاحمت نہ کرنے کی صورت میں آپ کی تصویریں بھی منظر پر نہیں آئیں گی اور آپ کو انعام و اکرام سے بھی نوازا جائے گا۔ اگر آپ انکار کرتے ہیں تو میلے میں دوسرے تماشوں کے ساتھ اپنی تصویریں بھی دیکھنے کے لیے تیار رہیے گا۔ ویسے بھی اس بار بہت بڑے پیمانے پر میلے کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ کئی سیاسی اور سماجی شخصیات مدعو کی جائیں گی۔ میڈیا کوریج تو لازمی ہے۔ سمجھیں، آپ بُری طرح پھنس جائیں گے اس لیے بہتر ہے کہ جو کچھ کرنا ہے ابھی کر گزریں... بعد میں آپ کے پاس بچاؤ کی کوئی صورت نہیں رہے گی۔'' وہ بہت خلوص سے مشورہ دے رہی تھی۔ اس کی باتیں سن کر شہریار کے رگ وپے میں سنسناہٹ دوڑنے لگی۔

اس بار چودھری نے اس پر بہت کاری وار کیا تھا۔ سب کچھ اگر اسی ترتیب سے پیش آجاتا جس طرح ڈاکٹر ماریا کے مطابق چودھری نے پلان کر رکھا تھا تو وہ بُری طرح پھنس جاتا۔ چودھری کے سامنے ہتھیار ڈال دینے یا اپنے خاندان کے ناموس کو داؤ پر لگا دینے کے سوا اس کے پاس کوئی راستہ نہ رہتا اور ان دو آپشنز میں سے کسی ایک کا بھی انتخاب کرنا اس کے لیے ناقابلِ قبول تھا۔ اس وقت تو ڈاکٹر ماریا کی صورت میں ایک طرح سے اس کی غیبی امداد ہوئی تھی۔ وہ چودھری کے بچھائے ہوئے جال میں خود کو پھنسنے سے بچانے کے لیے ہاتھ پیر مار سکتا تھا۔

''آپ مجھ سے جتنا کوآپریٹ کررہی ہیں اس کے لیے بہت بہت شکریہ ڈاکٹر ماریا... پلیز! آپ مجھے چودھری کی خفیہ تجوری کے متعلق تفصیلات سے آگاہ کر دیں۔'' اس نے بے حد ممنونیت سے کہتے ہوئے درخواست کی۔ جواب میں ڈاکٹر ماریا اسے مطلوبہ معلومات فراہم کرنے لگی۔

☆☆☆

کرسی پر بیٹھی ادھیڑ عمر عورت کی نظریں وال کلاک پر جمی ہوئی تھیں۔ تین بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ اسے صرف پانچ منٹ ہی انتظار میں گزارنے تھے۔ پانچ منٹ بعد اس کی معاون لڑکیاں وہاں پہنچ جاتیں۔ ندا اور حنا نامی وہ دونوں لڑکیاں وقت کی بے حد پابند تھیں۔ انہیں اس شادی دفتر میں اس کے زیرِ نگرانی کام کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا لیکن وہ یہ بات بہرحال جانچ چکی تھی کہ دونوں لڑکیاں وقت کی پابندی کے معاملے میں بے حد ذمے دار تھیں۔ انہیں ہر روز شام چھ بجے ڈیوٹی پر پہنچنا ہوتا تھا اور انہوں نے کبھی اس سلسلے میں کوتاہی نہیں برتی تھی۔ آج بھی انہیں معمول سے تین گھنٹے قبل پہنچنے کا حکم دینے کے باوجود وہ مطمئن تھی کہ دونوں اپنی عادت اور تربیت کے مطابق ٹھیک وقت پر پہنچ جائیں گی۔ یہ یقین بے بنیاد نہیں تھا۔ وہ سب ٹیم جن لوگوں کے لیے اور جس ٹاسک پر کام کررہی تھیں، اس میں ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ ذرا سی کوتاہی اور غفلت کا انجام ناکامی اور تذلیل کے ساتھ ساتھ بسا اوقات موت بھی ہو سکتا تھا اس لیے وہ سب بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ اب بھی انتظار کے چار منٹ مزید گزرے تو اس نے سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آواز سنی۔ پھر بیرونی حصے میں جو کہ بیک وقت انتظار گاہ اور استقبالیہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا، دونوں لڑکیوں کے چلنے پھرنے اور باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایک منٹ کا مختصر دورانیہ جیسے ہی گزرا اور گھڑی نے تین بجنے کا اعلان کیا، اس کے آفس کے دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔

''یس... کم اِن۔'' اس نے پُروقار انداز میں اجازت دی۔ فوراً ہی دروازہ کھلا اور دو نوجوان لڑکیاں اندر داخل ہوئیں۔ دونوں لڑکیوں نے جدید تراش خراش کے شلوار قمیص زیبِ تن کر رکھے تھے۔ ان کی شکلیں آپس میں کافی ملتی جلتی تھیں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ آپس میں بہنیں ہیں۔

''ہیو آ سیٹ۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں ان دونوں سے کہا۔

''تھینک یو میڈم۔'' وہ دونوں کرسیاں کھسکا کر ان پر بیٹھ گئیں اور بنا سوال کیے منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ اس طرح بے وقت اپنے بلائے جانے پر وہ اندرونی طور پر بے حد الرٹ تھیں۔ انہیں اندازہ تھا کہ معمول سے ہٹ کر دفتر بلائے جانے کا مطلب تھا کہ کوئی خاص بات ہے۔

''تم دونوں ہماری بہت اچھی ورکر ہو۔ اب تک تمہیں جو بھی کام سونپا گیا، تم دونوں نے ہی اسے بہت اچھے طریقے سے انجام دیا لیکن آج جو ذمے داری تمہیں سونپی جارہی ہے، وہ نہ صرف مختلف ہے بلکہ بے حد نازک بھی ہے۔ اس کام کو کرنے میں تمہیں بے حد ہوشیاری اور ہوش مندی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ ناکامی کا نتیجہ صرف ایک صورت میں نکلے گا اور وہ ہے موت۔'' اس نے اپنے سپاٹ اور سرد لہجے میں گفتگو کے لیے تمہید باندھی۔

''ہم ہر ممکن طریقے سے اپنے کام کو پرفیکشن کے ساتھ انجام دینے کی کوشش کریں گے۔ ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن اگر ایسا ہو ہی گیا تو اوپر سے حکم آنے سے پہلے ہم خود اپنے لیے موت کا انتخاب کرلیں گے۔ ہمارا جیون

ہمارے دلیش کی امانت ہے۔ ہمارے پتا نے بھی فرض کو نبھایا تھا، ہم سے بھی کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔" ندا نامی لڑکی نے جواب دینے کا فریضہ انجام دیتے ہوئے یقین دہانی کروائی۔

"گڈ! مجھے تم سے یہی امید تھی۔" اس کا لہجہ ذرا سا نرم ہوا پھر وہ ان دونوں کو ان کا کام سمجھانے لگی۔ وہ دونوں پوری توجہ سے اس کی بات سنتی رہیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ کام کی نوعیت سچ مچ بڑی حساس ہے۔ اس سے قبل انہوں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ بہرحال، انہیں اس نئے کام کو کرنے میں بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔

"تم لوگ میری بات سمجھ گئی ہو؟"

"یس میڈم! آپ فکر نہ کریں۔ سب کچھ آپ کی ہدایات کے مطابق ہی ہوگا۔" ندا نے جواب دیا۔ اگرچہ دیکھنے پر دونوں بہنوں میں چھوٹی بڑی کا اندازہ لگانا مشکل تھا لیکن وہ جس طرح ہر سوال کا جواب دینے کی ذمے داری خود انجام دیتی تھی، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی تھی کہ وہ ہی بڑی بہن ہے۔

"ٹھیک ہے پھر تم دونوں روانہ ہو جاؤ۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ چھ بجے تمہیں یہاں اپنی ڈیوٹی پر دوبارہ موجود ہونا چاہیے۔" اس نے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا تو وہ دونوں خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گئیں۔ استقبالیہ پر ان کی مطلوبہ اشیا موجود تھیں۔ حنا نے ایک تھیلا کھول کر اس میں موجود اشیا باہر نکالیں۔ یہ ایک سیاہ رنگ کا برقع، ایک بڑی سی چادر اور دو عدد سن گلاسز تھے۔ برقع اس نے ندا کو تھمایا اور خود چادر اوڑھنے لگی۔ اس کے چادر اوڑھ کر ایک پلو کو نقاب کے انداز میں چہرے پر پھیلا کر، سن گلاسز لگانے تک ندا نے بھی برقع اوڑھ کر سن گلاسز لگا لیے۔ ان دونوں کو دیکھ کر اب کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ وہی لڑکیاں ہیں جو کچھ دیر قبل اس دفتر میں پہنچی تھیں۔

اس تیاری سے مطمئن ہونے کے بعد انہوں نے ایک دوسرے کو "اوکے" کا اشارہ دیا اور ندا نے وہاں رکھا دوسرا بیگ اٹھا لیا۔ کینوس کا یہ بیگ اچھا خاصا بھاری تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس بیگ کو اٹھانے میں نخرے دکھاتی لیکن اسے مستقل ورزش اور یوگا کی عادت کی وجہ سے کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ اس کے بیگ اٹھا کر باہر کی طرف قدم بڑھاتے ہی حنا نے بھی اس کی پیروی کرتے ہوئے اپنے قدموں کو حرکت دی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ہینڈ بیگ تھا۔ اپنے ذاتی پرس ان دونوں نے پہلے ہی ایک دراز کھول کر اس میں رکھ دیے تھے۔ دفتر سے نکل کر وہ آرام سے سیڑھیاں طے کرتی ہوئی نیچے کی طرف جانے لگیں۔ اس چار منزلہ عمارت میں مختلف نوعیت کے کئی دفاتر تھے۔ سیڑھیاں اترتے وقت کسی نے انہیں دیکھا بھی ہوگا تو زیادہ نوٹس نہیں لیا ہوگا اور یہی سمجھا ہوگا کہ دونوں خواتین کسی شادی دفتر میں اندراج کے لیے یا پھر کسی عامل یا پروفیسر کے پاس اپنے کسی رکے ہوئے کام کی تکمیل کے لیے یہاں آئی ہوں گی۔ اس عمارت میں اس قسم کے دفاتر کی بھرمار کی وجہ سے اس طرح کے حلیے والی خواتین کا مسلسل آنا جانا لگا رہتا تھا اور کوئی بھی ان کے آنے جانے کا نوٹس لینے کی زحمت نہیں کرتا تھا۔

عمارت سے باہر نکل کر وہ دونوں پیدل چلتی ہوئی قریبی بس اسٹاپ کی طرف بڑھیں اور اسٹاپ پر آنے والی پہلی بس میں سوار ہو گئیں۔ حنا نے کنڈیکٹر کو کرایہ ادا کیا۔ دو اسٹاپ گزرتے ہی وہ دونوں بس سے اتر گئیں۔ یہاں سے وہ پھر ایک بس میں سوار ہوئیں۔ اس بس میں انہوں نے صرف ایک اسٹاپ کا فاصلہ طے کیا اور پھر ایک رکشے میں بیٹھ کر اسے ایک معروف مارکیٹ کی طرف چلنے کا حکم دیا۔ وہ اپنے دفتر کے نیچے سے براہ راست رکشے میں بیٹھ کر مارکیٹ تک جا سکتی تھیں لیکن وہ جو کام انجام دینے جا رہی تھیں، اس کے لیے احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ کوئی رسک نہ لیا جائے۔ اب اگر کسی طرح وہ کسی کی نظروں میں آ بھی جاتیں تو کھوجنے والا بعد میں ان کے دفتر کی نشان دہی نہیں کر سکتا تھا۔

مارکیٹ تک کا فاصلہ انہوں نے خاموشی سے گزارا۔ مارکیٹ میں داخل ہوتے ہی انہوں نے دو دکانوں سے خریداری کی اور بنا کسی حیل و حجت کے دکان دار کو اس کی مطلوبہ قیمت ادا کر کے آگے بڑھ گئیں۔ اب ندا کے ہاتھ میں کینوس بیگ کے علاوہ مزید دو شاپنگ بیگ اور نظر آ رہے تھے۔ حنا نے بھی ایک بڑا سا شاپنگ بیگ اٹھا رکھا تھا۔ انہیں دیکھ کر یہ لگتا تھا کہ وہ کافی دیر سے مارکیٹ میں ہیں اور بہت سی خریداری کرنے کے باوجود ابھی اور بھی بہت کچھ لینے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ دونوں اپنے دائیں بائیں موجود دکانوں کا بغور جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں۔ آخر انہیں ایک ایسی دکان نظر آ گئی جو ان کی مطلوبہ خصوصیات کی حامل تھی۔ یہ ایک کپڑے کی دکان تھی جس میں تخت پر چاندنیاں بچھا کر کپڑے کے تھان ڈالے گئے تھے۔ دیواروں پر بھی کئی کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ دو چار ذرا اچھی کوالٹی کے سوٹ ڈمی پر سجے نظر آ رہے تھے۔ دونوں بہنیں اس دکان میں داخل ہو گئیں۔ دکان کافی تنگ تھی۔ تخت اور گاہکوں کے بیٹھنے کے لیے بچھائی گئی بنچوں کے درمیان فاصلہ اتنا کم تھا کہ گاہک بنچ

www.pkdigest.com

بیٹھتے تو ان کے گھٹنے تخت سے تقریباً ٹکرانے لگتے۔ وہ دونوں، دکان پر موجود تین خواتین کے درمیان سے راستہ بناتی بمشکل اندر داخل ہوئیں اور بنچ پر بیٹھ گئیں۔ بیٹھتے ہوئے انہوں نے اپنے ہاتھوں میں موجود تھیلے نیچے زمین پر قدموں کے قریب رکھ لیے۔ ان تھیلوں میں کینوس کا وہ بھاری بیگ بھی شامل تھا۔

"جی باجی! کیا دکھاؤں آپ کو۔ لان کے بڑے اچھے پرنٹ آئے ہوئے ہیں میرے پاس۔" ایک سیلز مین فوراً ان کی طرف متوجہ ہوا۔

"اچھا تو پھر دکھاؤ۔" حنا نے اسے جواب دیا۔ وہ تھان کھول کھول کر ان کے سامنے پھیلانے لگا۔ ساتھ ہی سیلز مینوں والی مخصوص چرب بیانی کا مظاہرہ بھی کرتا رہا۔

"یہ سوٹ دیکھیں باجی! بالکل نیا پرنٹ آیا ہے اور یہ والا کلر تو آج کل بہت ہی اِن ہے۔" وہ ہر تھان کھولتے ہوئے تقریباً اسی طرح کے جملے ادا کر رہا تھا۔

"اور بھی دکھاؤ۔" اس کے پانچ چھ تھان کھولنے کے بعد ندا نے فرمائش کی۔ دکان پر موجود دوسری گاہک خواتین اپنے لیے کپڑے کا انتخاب کر چکی تھیں اور اب ان کی سیلز مین سے قیمت پر بحث چل رہی تھی۔

"باجی! آپ تو بہت ہی کم قیمت لگا رہی ہیں۔ اتنی تو ہماری خرید بھی نہیں ہے۔ آپ کے لیے میں ایسا کرتا ہوں کہ پچاس روپے کم کروا دیتا ہوں۔ دیکھیں، اب مزید بحث مت کیجیے گا۔" انہیں کپڑے دکھاتے ہوئے سیلز مین نے اپنے ساتھی کی مدد کرتے ہوئے ان کے درمیان ہونے والی بحث میں دخل دیا۔ اسی وقت ندا نے اپنے پیر کے قریب رکھے کینوس بیگ کو چپکے سے تخت کے نیچے دھکیل دیا۔

"یہ والے پرنٹ کا ایک سوٹ پیس نکال دیں اور دوسرا وہ فیروزی والا دے دیں۔" حنا جس نے ندا کی کارروائی دیکھ لی تھی، کام مکمل ہوتے دیکھ کر سیلز مین سے بولی۔ اب مزید یہاں رکنا وقت ضائع کرنا تھا۔ سیلز مین نے فوراً اس کی بات پر عمل کیا۔ البتہ اس کی زبان مسلسل ان دونوں خواتین کو کنوینس کرنے کے لیے مصروف عمل تھی۔ ان دونوں نے بغیر کسی بحث و مباحثے کے اپنے خریدے ہوئے سوٹوں کی قیمت ادا کی اور ان کے ساتھ ساتھ دوسرا خریدا ہوا سامان بھی اپنے پیروں کے پاس سے اٹھا کر دکان سے باہر نکل گئیں۔ اس سامان میں وہ کینوس بیگ شامل نہیں تھا۔ کپڑے کی دکان سے نکلنے کے بعد انہوں نے کسی اور دکان کا رخ نہیں کیا اور مارکیٹ سے نکلتی چلی گئیں۔ یہاں سے انہوں نے پہلے والے طریقے پر ہی عمل کرتے ہوئے واپس اپنے دفتر کا رخ کیا لیکن بس سے اترنے کے بعد وہ دونوں اکٹھی عمارت میں داخل نہیں ہوئیں۔ ڈیڑھ دو گھنٹے قبل ایک ساتھ دوبارہ دکھائی دینے پر وہ کسی کے نوٹس میں آ سکتی تھیں چنانچہ احتیاطاً پانچ منٹ کا وقفہ دے کر اندر گئیں۔

دفتر پہنچ کر انہوں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی چھ نہیں بجے تھے۔ برقعے اور چادر سے نجات حاصل کر کے واپس پہلے والے حلیے میں آنے کے لیے یہ مہلت کافی تھی۔ انہوں نے پھرتی سے یہ کام انجام دیا۔ خریدی ہوئی اشیا اور برقعے وغیرہ کو ایک الماری میں رکھنے کے بعد وہ استقبالیہ پر یوں تروتازہ کھڑی تھیں جیسے ابھی ابھی دفتر آئی ہوں۔ ٹھیک چھ بجے ان کے پاس کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ ان کی باس نے باہر آنے کے بجائے صرف دروازے سے ہی جھانک کر ان کی طرف دیکھا۔ ندا نے انگلیوں کی مدد سے وکٹری کا نشان بناتے ہوئے اسے دیکھا۔ جواباً اس نے مطمئن سے انداز میں اپنا سر ہلایا اور واپس پلٹ گئی۔

حنا اور ندا جو کہ درحقیقت ارمیلا اور گیتا تھیں، اس کی بہت کارآمد ماتحت تھیں۔ اسے ان سے اسی کارکردگی کی امید تھی۔ اگر وہ کامیاب نہ ہوتیں اور پھنس جاتیں تو کبھی لوٹ کر واپس دفتر نہیں آتیں۔ پھنسنے کی صورت میں وہ اپنے دیے ہوئے وچن کے مطابق وہ زہریلا کیپسول نگل لیتیں جو ہمہ وقت ان کے پاس موجود رہتا تھا۔ وہ کوئی عام لڑکیاں نہیں تھیں جو موت کو گلے لگاتے ہوئے ہچکچاتیں۔ ضرورت پڑنے پر جان دینا اور جان لینا انہیں بہت اچھی طرح سکھایا گیا تھا۔ وہ "را" کے مایہ ناز ایجنٹ راجیش شرما کی بیٹیاں تھیں۔ راجیش شرما نے اپنی ساری زندگی پاکستان میں ہی گزاری تھی۔ وہ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوا تھا جو کٹر برہمن تھا۔ اس کے ماتا پتا تقسیم کے وقت پاکستان سے ہجرت کر کے بھارت تو نہیں گئے لیکن انہوں نے تقسیم کے فیصلے کو قطعی غلط قرار دیتے ہوئے ساری ذمے داری مسلمانوں کے سر ڈال دی۔ ان انتہا پسند والدین کے زیر سایہ پلنے والا راجیش بھی انہی جیسی سوچ کا حامل تھا چنانچہ پاکستان میں اپنے دیس کی خدمت انجام دینے والوں کے متلاشی رہنے والوں کی نظر انتخاب اس پر پڑ گئی۔ وہ ان کے لیے کام کرنے پر بہ خوشی راضی ہو گیا لیکن اس کی زندگی نے زیادہ وفا نہیں کی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے آقاؤں نے اس کی بیوی سنیتا سے رابطہ کیا۔ ان کے مشورے پر سنیتا نے اپنی دونوں بیٹیوں سمیت دکھاوے کا اسلام قبول کر لیا۔ اب وہ بچیاں جوان ہو

چکی تھیں۔ لوگ انہیں حنا اور ندا کہہ کر پکارتے تھے لیکن ان کی تربیت جن خطوط پر ہوئی تھی، اس کی وجہ سے وہ اندرونی طور پر اب بھی ارمیلا اور گیتا ہی تھیں۔ بھارت ماتا کی وہ قابل فخر بیٹیاں جن کے لیے جان دینا اور لینا ایک کھیل تھا... شادی دفتر کی آڑ میں انہوں نے اپنے قدم خوب جما رکھے تھے۔ اس دفتر کی انچارج اور ان کی باس ان کی صلاحیتوں کو استعمال کرنا خوب جانتی تھی۔ ان کی کارکردگی کے طفیل اس نے بڑے بڑے افسروں سے کئی قیمتی راز اگلوائے تھے اور اب اپنے موبائل فون پر ریڈیو لگائے مختلف اسٹیشن ٹیون کر رہی تھی۔ آخر ایک اسٹیشن سے نشر ہونے والی نیوز نے اس کے کانوں تک اس کی مطلوبہ خبر پہنچا دی۔ شہر کی معروف مارکیٹ میں ایک کپڑے کی دکان پر ہونے والا بم دھماکا کافی ہلاکت خیز ثابت ہوا تھا۔ دھماکے نے اس دکان کے ساتھ ساتھ اس کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں کی کئی دکانوں کو بھی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ رش کا وقت ہونے کی وجہ سے تمام ہی دکانوں پر اچھے خاصے گاہک موجود تھے چنانچہ بڑی تعداد میں ہلاکتوں کے ساتھ ساتھ کافی لوگ زخمی بھی ہوئے تھے۔

"وزیراعظم نے کہا ہے کہ اس قسم کی پُرتشدد کارروائیاں کرنے والوں کے خلاف سخت ایکشن لیا جائے گا اور کسی کو عوام کی جان و مال سے کھیلنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔" نیوز ریڈر خبریں پڑھتے ہوئے وہی روایتی بیان دہرا رہی تھی جو اس سے قبل بھی ایسے مواقعوں پر دہرایا جاتا رہا تھا۔

"ہمیں کسی کی اجازت کی ضرورت ہے بھی نہیں۔" وہ مسکراتے لبوں کے ساتھ بڑبڑائی۔ اسی وقت دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔

"یس... کم اِن۔" اس نے تیزی سے اپنے چہرے کے تاثرات بدلتے ہوئے اجازت دی۔ ندا کی معیت میں ایک عمر رسیدہ خاتون اندر داخل ہوئیں۔ خاتون شکل اور لباس سے کافی خوش حال لگ رہی تھیں۔ اس کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ کر جب انہوں نے اپنی بیٹی کی تصویر سامنے رکھتے ہوئے اس کے اور اپنے کوائف بتانا شروع کیے تو اس کے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ وہ ان ماؤں میں سے تھیں جن کی بیٹیاں اپنے آئیڈیل جیون ساتھی کے انتظار میں عمر کا قیمتی حصہ گزار دیتی ہیں اور بعد میں مائیں ان کی تصویریں پرس میں ڈالے ان کے لیے کسی مناسب بر کی تلاش میں شادی دفتروں کی خاک چھانتی پھرتی ہیں۔ خاتون کا مسئلہ نہایت ہمدردی سے سنتے ہوئے اس کے چہرے پر اتنی نرمی تھی کہ کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکتا کہ ابھی کچھ دیر قبل یہ عورت

ایک بم بلاسٹ کی خبر سن کر بڑی سفاکی سے مسکراتے ہوئے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

☆☆☆

سیاہ رنگ کی چست پتلون پر سیاہ ہی جرسی پہن کر اس نے ہاتھوں میں دستانے اور پیروں میں کینوس کے سیاہ جوتے چڑھائے اور الماری کھول کر دراز میں سے ریوالور نکال کر اپنی بیلٹ کے ساتھ لٹکتے ہولسٹر میں رکھا اور آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ رات اچھی خاصی گزر چکی تھی چنانچہ ملازم سونے کے لیے جا چکے تھے اور پورے بنگلے میں سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ وہ احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا بنا کوئی آواز پیدا کیے باہر نکل آیا۔ پورٹیکو میں اس کی گاڑی کے ساتھ ہی ایک ہنڈا سی ڈی سیونٹی بائیک کھڑی تھی۔ اس کے ہینڈل کے ساتھ ہی سیاہ رنگ کا ہیلمٹ لٹک رہا تھا۔ اس نے ہیلمٹ اٹھا کر اپنے سر پر پہنا اور پتلون کی جیب ٹٹول کر اس میں سے چابیاں برآمد کیں۔ ان چابیوں میں ایک چابی اس بائیک کی تھی لیکن وہ چابی لگا کر بائیک کا انجن اسٹارٹ کرنے کے بجائے اسے دھکیلتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ گیٹ پر چوکیدار مستعد کھڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس نے بے حد پھرتی مگر خاموشی کے ساتھ گیٹ وا کر دیا۔

"خیال رکھنا کہ کسی کو بھی میرے اس وقت باہر جانے کی خبر نہیں ہونی چاہیے۔" اس نے دھیمی مگر بے حد سخت آواز میں چوکیدار کو حکم دیا۔

"آپ بے فکر رہیں سر! میں کسی کے سامنے کچھ نہیں کہوں گا۔" چوکیدار نے اسے یقین دلایا۔ شہریار نے شام کے بعد ہی اسے آگاہ کر دیا تھا کہ وہ رات کو دیر سے کہیں باہر جانے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن اس کی یہ آمدورفت خفیہ ہوگی اس لیے وہ پوری طرح مستعد رہے تاکہ بنگلے میں موجود کسی اور ملازم کو خبر نہ ہو سکے۔ چوکیدار ظاہر ہے، اس پروگرام کو سن کر حیران ہوا ہوگا لیکن سوال کر کے اپنی اس حیرانی اور تجسس کو دور کرنے کی اس کی حیثیت نہیں تھی۔ اس نے شہریار کی اطلاع کے مطابق کسی بندے کی بنگلے پر پہنچائی جانے والی بائیک بھی خاموشی سے پورٹیکو میں اس کی گاڑی کے پہلو میں کھڑی کر دی تھی۔ اندازہ تو اسے بائیک کو دیکھ کر ہی ہو گیا تھا کہ اس کے صاحب اپنی شان دار گاڑی چھوڑ کر اس بائیک پر کہیں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اب اسے بائیک سمیت باہر کی طرف جاتے دیکھ کر تصدیق بھی ہوگئی۔

"میں چند گھنٹوں تک واپس آجاؤں گا۔ تم ہوشیار رہنا... یہ نہ ہو کہ میرے واپس آنے تک سو جاؤ۔"

سوال ہی نہیں پیدا ہوتا سر۔" اس نے مستعدی سے جواب دیا۔ شہریار مزید کچھ کہے بنا بائیک کو دھکیلتا ہوا بنگلے سے ذرا آگے لے گیا اور پھر یہ اطمینان ہونے کے بعد کہ اس محفوظ فاصلے سے بائیک اسٹارٹ ہونے کی آواز بنگلے کے اندر سوئے ہوئے ملازمین میں سے کسی کے کانوں میں پڑ کر اسے بیدار کرنے کا سبب نہیں بنے گی، اگنیشن میں چابی ڈال کر بائیک اسٹارٹ کی۔ موٹر سائیکل کا انجن غرایا۔ اگلے ہی لمحے وہ اس دو پہیوں والی قطعی غیر افسرانہ سواری پر بیٹھا ہوا ہو چکا تھا۔ حکمرانی کے اصول و قواعد کی مجبوری اپنی جگہ مگر خود اسے ذاتی طور پر یہ سواری بڑی پسند تھی۔ دور طالب علمی میں وہ عموماً موٹر بائیک پر ہی سفر کرنا پسند کرتا تھا اور اسے اس دو پہیوں کی سواری کو چلانے میں خاصی مہارت بھی حاصل تھی اس لیے اس وقت بڑے آرام سے اپنی منزل کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ آج اسے جس مشن پر جانا تھا، وہ قطعی غیر سرکاری نوعیت کا... بلکہ اس کے عہدے کی شان سے متصادم تھا لیکن اس کی رگوں میں دوڑتے جوان اور گرم خون کو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ڈاکٹر ماریا سے ملنے والی معلومات کی روشنی میں اس نے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دے لیا تھا اور اب اس پر عمل پیرا بھی تھا۔ کسی فور وہیل گاڑی کے بجائے بائیک کا انتخاب اسی لیے کیا تھا کہ یہ چھوٹی سی سواری کو کہیں بھی چھپانے میں آسانی رہتی جبکہ گاڑی آسانی سے نظروں میں آجاتی پھر اس کی گاڑی تو سبھی کی جانی پہچانی... اور وہ یہ قطعی نہیں چاہتا تھا کہ کوئی شخص بطور اسسٹنٹ کمشنر اسے شناخت کر سکے۔ نڈر اور بے باک ہونا اپنی جگہ لیکن دشمن کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے سے قبل جو لازمی احتیاط تھی، وہ تو اسے کرنی ہی تھی۔

اپنی آج کی اس مہم پر جاتے ہوئے اسے مشاہرم خان بڑی شدت سے یاد آ رہا تھا۔ اس جیسا نڈر اور جاں نثار شخص اس مہم میں اس کے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ اگر وہ یہاں ہوتا تو وہ اسے اپنے ساتھ ضرور لے کر جاتا لیکن مجبوری یہ تھی کہ ملتان روڈ پر پیش آنے والے خونی تصادم میں مشاہرم خان بری طرح زخمی ہوا تھا۔ خود ذاتی طور پر تو وہ یہی کہتا تھا کہ اب میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن شہریار نے اسے ابھی تک ڈیوٹی پر آنے کی اجازت نہیں دی تھی اور وہ لاہور میں ہی مقیم تھا۔ ان حالات میں وہ اسے ایک ایسے معرکے پر اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کیسے بلا سکتا تھا جہاں کافی اٹھا پٹخ کی امید تھی۔ مشاہرم خان کے بعد جس دوسرے شخص پر اسے اعتبار تھا، وہ عبدالمنان تھا لیکن عبدالمنان ذرا مختلف فطرت کا آدمی

تھا۔ وہ اس سے کہتا تو وہ ساتھ چل پڑنے پر راضی تو ہو جاتا لیکن مار دھاڑ اور اچھل کود اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ پھر اس میں اور مشاہرم خان میں ایک بڑا فرق یہ تھا کہ مشاہرم خان کم تجسس کرنے والا، سیدھا سادہ اور خاموشی سے حکم کی تعمیل کرنے والا آدمی تھا جبکہ عبدالمنان عرصے سے بیوروکریسی کا ایک چھوٹا سا پرزہ ہونے کے باعث بے حد ذہین اور معاملہ فہم تھا۔ اپنی تربیت کے مطابق تجسس اور کھوج کی عادت اس کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ وہ خاموش رہتا اور اس سے کوئی سوال نہ کرتا، تب بھی معاملہ بھانپ جاتا اور شہریار نہیں چاہتا تھا کہ تصویروں والا معاملہ کسی بھی شخص کے علم میں آئے۔ بالا ہی بالا اس معاملے کو نمٹانے کی جو سبیل ڈاکٹر ماریا کے تعاون کی وجہ سے نکلی تھی، وہ اس کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

بائیک کی تیز رفتاری کی وجہ سے اس نے ہیر آباد تک کا فاصلہ عمومی دورانیے سے نصف وقت میں ہی طے کر لیا البتہ ہیر آباد کی حدود میں داخل ہونے کے بعد اسے احتیاط کرنی پڑی۔ ناہموار کچے راستے پر پہلے کے مقابلے میں قدرے کم رفتار میں بائیک دوڑاتا ہوا بالآخر وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں چودھری کا ڈیرا موجود تھا۔ ڈیرے کی عمارت سے کچھ فاصلے پر اس نے بائیک کا انجن بند کر دیا اور اسے گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ ڈیرے کے قریب ایک درخت کی آڑ میں پہنچ کر اس نے بائیک کھڑی کی اور خود دبے قدموں ڈیرے کی عمارت کی عقبی دیوار کی طرف بڑھنے لگا۔ دیوار بہت زیادہ اونچی نہیں تھی۔ یقیناً اپنی ریاست میں واقع اپنے اس خاص ٹھکانے میں کسی کے گھسنے کی جرأت کرنا چودھری کے خیال کے مطابق ناممکن ہوگا اس لیے زیادہ بلند و بالا دیواریں تعمیر کرنے کی زحمت نہیں کی گئی تھی۔ اس بے نیازی کی دوسری وجہ وہ کتے بھی تھے جو اس کے نوکروں کے علاوہ پہرے داری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اگر کوئی شامت کا مارا دیواروں کی کم بلندی دیکھ کر چوری چکاری یا کسی دوسرے مقصد کے لیے ڈیرے میں گھسنے کی کوشش کرتا تو چوکیداری پر مامور یہ کتے اسے چیر پھاڑ کر رکھ دیتے۔ وہ خود ڈاکٹر ماریا کی فراہم کردہ معلومات کی وجہ سے ان کتوں کی موجودگی سے واقف تھا چنانچہ بے خبری میں مارے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

دیوار کی منڈیر پر ہاتھ جما کر اچک کر اس پر چڑھنے کے بعد اس نے دوسری طرف چھلانگ لگانے کی غلطی قطعی نہیں کی اور وہیں بیٹھ کر پہرے دار کتوں کا انتظار کرنے لگا۔

www.pkdigest.com

سائیلنسر لگا ریوالور اس کے ہاتھ میں بالکل تیار تھا۔ انتظار کا یہ دورانیہ چند سیکنڈ سے زیادہ کا ثابت نہیں ہوا۔ اس کی چمک دار ذہین نظروں نے اس طرف نمودار ہونے والے دو جسیم کتوں کو فوراً ہی دیکھ لیا۔ اس نے نہایت پھرتی سے ریوالور کی نال سیدھی کی اور لبلبی دبا دی۔ ریوالور سے گولی نکل کر آگے والے کتے کے سر میں ٹھک سے لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرا کتا اپنے ساتھی کو گرتے دیکھ کر ٹھٹکا اور پھر زور زور سے بھونکنے لگا لیکن اس نے اسے زیادہ بھونکنے کا موقع نہیں دیا۔ اس کے ریوالور سے نکلنے والی گولی اس دوسرے کتے کے بھی سر میں پیوست ہو کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کر گئی۔ دوسرے کتے کے جہانِ فانی سے کوچ کرتے ہی اس نے دیوار پر سے چھلانگ لگائی اور ڈیرے کے احاطے میں کود گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ڈیرے پر رات کے وقت پہرے داری کا فریضہ انجام دینے والے کتوں کی تعداد صرف دو ہی تھی۔ وہ دونوں اپنے اس فرض سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فارغ ہو چکے تھے اور اسے ان کے کسی بھائی بند کی آمد کا خوف بھی نہیں رہا تھا چنانچہ وہ قدرے اطمینان سے مگر محتاط قدموں کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ یہ چودھری کا ڈیرا تھا اور یہاں اس کے گرگوں کا موجود ہونا لازمی تھا۔ محتاط انداز میں آگے بڑھتے ہوئے وہ اس بات کی بھی امید کر رہا تھا کہ کتے کے بھونکنے کی آواز سن کر کوئی نہ کوئی سبب جاننے کے لیے اس طرف کا رخ کرے گا لیکن اس کی توقع کے خلاف کوئی شخص نمودار نہیں ہوا اور وہ بنا کسی ٹکراؤ کے اگلے حصے تک پہنچ گیا۔

"تو بہت کام چور ہے شریف! میں نے تجھ سے کہا تھا کہ کتا بھونکا ہے، ذرا جا کر دیکھ لے کہ کیا مسئلہ ہے... پر تو اپنی جگہ سے ہل کر بھی نہیں دیا۔" کسی کی شکل نظر آنے سے پہلے ہوا کے دوش پر لہراتی یہ آواز اس کے کانوں تک پہنچی۔

"میں کام چور ہوں تو تو جا کر دیکھ لے۔ تیرے پیروں میں مہندی لگی ہے یا تو میرا افسر لگا ہے جو خود چل کر جانے کے بجائے مجھے حکم دے رہا ہے۔" وہ یقیناً شریف نامی شخص تھا جو بگڑے تیوروں کے ساتھ جواب دے رہا تھا۔

"حکم شکم نہیں دے رہا، تجھے احساس دلا رہا ہوں۔ تو ساری ذمے داری مجھ کلے بندے پر ڈال کر خود پڑا اینڈتا رہتا ہے۔ کسی روز میں نے چودھری صاحب کو تیری شکایت لگا دی تو پھر شکوہ نہ کرنا۔"

"چل مٹی پا یار! تو بھی ایویں ناراض ہو جاتا ہے۔ یار نہیں ہے میرا؟ ذرا سا کتے کے بھونکنے پر میرا مزہ کیوں خراب کرتا ہے۔ جناور (جانور) ہی تو ہے، بھونک دیا ہوگا۔ کوئی لفڑا ہوتا تو وہ کوئی ایک واری بھونک کر چپ ہو جاتا؟ اس نے تو آسمان سر پر اٹھا لینا تھا۔" ساتھی کی دھمکی پر شریف نامی آدمی اکڑ چھوڑ کر خوشامدانہ انداز میں اپنے ساتھی کے سامنے دلیلیں پیش کرنے لگا۔ وہ یقیناً کام چور آدمی تھا جو ہاتھ پیر چلانے کے بجائے زبان ہلا کر ہی جہاں تک کام نکل سکتا ہو، نکالنے کا قائل تھا۔

"کہہ تو تو ٹھیک ہی رہا ہے۔ چل چھڈ جانے دے۔ لا میرے پیالے میں تھوڑی ہور ڈال۔" شریف کا ساتھی فوراً ہی نرم پڑ گیا اور جانے کس چیز کی بابت فرمائش کرنے لگا۔ وہ جتنی دیر میں یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ صرف دو ہی آدمی ہیں، آڑ سے نکل کر فوراً سامنے آ گیا۔ وہ دونوں جو پٹیل کی چھوٹی سی گھڑونچی سامنے رکھے اس میں سے بھنگ نکال کر پی رہے تھے، اسے یک دم سامنے پا کر ہکا بکا رہ گئے۔ سیاہ لباس میں، سر پر سیاہ ہی ہیلمٹ پہنے ہوئے... وہ بھی اس انداز میں کہ ہیلمٹ کا شیشہ گہرا ہونے کی وجہ سے اس کی شکل نظر نہیں آ رہی تھی، وہ یقیناً ان لوگوں کو ایک پل کے لیے بھوت ہی لگا ہوگا۔ بھوت بھی ایسا جس نے اپنے دائیں ہاتھ میں ریوالور تھام رکھا تھا۔

"اے! کون ہے تو؟" بالآخر ان میں سے ایک نے خود کو سنبھالا اور [illegible] کر پوچھتے ہوئے اپنے [illegible] جانب رکھی کلاشنکوف اٹھانے کی کوشش کی۔

"خبردار! حرکت مت کرنا ورنہ گولی مار دوں گا۔" اس نے غراتے ہوئے تنبیہ کی۔ کلاشنکوف کی طرف بڑھنے والا ٹھٹک کر رک گیا مگر اس کے ساتھی نے احمقانہ دلیری سے کام لیتے ہوئے جھپٹ کر کلاشنکوف اٹھانے کی کوشش کی۔ ابھی وہ اسے پوری طرح اپنی گرفت میں لے بھی نہیں پایا تھا کہ شہریار کے خاموش ریوالور سے ایک گولی سنسناتی ہوئی نکلی اور اس کے ہاتھ کی پشت پر لگی۔ اس آدمی کے حلق سے چیخ برآمد ہوئی اور اس نے کلاشنکوف چھوڑ دی۔

"میری بات خاموشی سے مان لو گے تو فائدے میں رہو گے ورنہ انجام تم خود بھی سمجھ سکتے ہو۔ ممکن ہے اگلی بار میں ہاتھ یا پیر کو نشانہ بنانے کے بجائے تمہاری کھوپڑی کو نشانہ بناؤں۔" شہریار نے سرد لہجے میں دھمکی دی۔ حقیقتاً وہ یہاں خون خرابا نہیں چاہتا تھا۔ اسے یہاں سے صرف اپنی تصویریں لینی تھیں اور وہ یہ کام کسی انسانی جان کے نقصان کے بغیر کرنا چاہتا تھا... مگر وہ لوگ شاید اس بات پر آمادہ نہیں تھے اور چودھری کا نمک حلال کرنا چاہتے تھے چنانچہ اس کے ہاتھ میں موجود ریوالور کی پروا کیے بغیر اس کی طرف جھپٹے۔ زخمی آدمی

زیادہ ہی بلبلایا ہوا تھا چنانچہ کسی بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا اس کی طرف بڑھا اور اسے ٹکر مارنے کی کوشش کی۔ اس کے حملے میں ایسی پھرتی تھی کہ شہریار دوبارہ ریوالور کو استعمال کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں فیصلہ نہ کر سکا۔ بہرحال، عین اس لمحے جب وہ بھینسا اس سے ٹکرانے ہی لگا تھا، اس نے دائیں جانب ہٹتے ہوئے خود کو اس کے حملے سے بچایا اور اڑتا ہوا اس دوسرے آدمی پر جا گرا جو اس پر ہاتھ پیروں سے حملہ کرنے کا ارادہ ملتوی کر کے ایک بار پھر کلاشنکوف کا سہارا لینا چاہتا تھا۔ وہ اس سے ٹکرایا تو جھٹکے سے کلاشنکوف اس کی گرفت سے نکل گئی۔ شہریار نے اسے ایک زوردار لات رسید کی اور ریوالور ہولسٹر میں رکھ کر خود کلاشنکوف پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس دوران زخمی آدمی جو اس کے ایک طرف ہٹ جانے کے باعث اپنے ہی زور میں آگے چلا گیا تھا، سنبھل کر ایک بار پھر حملہ آور ہو چکا تھا۔ اس نے شہریار کو کمر سے تھام لیا اور زمین پر رگیدنے کے چکر میں تھا لیکن اس نے اس کی پیش نہ چلنے دی اور کہنی کی مدد سے اس کے بائیں پہلو میں ایک نپی تلی ضرب لگائی۔ ضرب کی شدت کا اندازہ زخمی آدمی کی چیخ سے لگایا جا سکتا تھا۔ وہ تکلیف سے بلبلا کر اس کی کمر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کی گرفت سے آزاد ہو کر شہریار دوسرے بندے پر جھپٹا۔ وہ ایک بار پھر کلاشنکوف پر قابض ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان دونوں کو ہی احساس تھا کہ کلاشنکوف جس کے قبضے میں ہوگی، اس لڑائی کا پلڑا اس کے حق میں جھک جائے گا چنانچہ وہ اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ مقابل کے مقابلے میں شہریار کی پھرتی قابلِ دید تھی۔ اس کے پاس یہاں سے کامیاب واپس جانے کے سوا دوسرا کوئی آپشن نہیں تھا۔ ایک طرح سے تو اس نے یہاں آ کر ہی حماقت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایک بیورو کریٹ سے اتنے غیر سنجیدہ عمل کی امید کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ یہاں پھنس جاتا تو بہت بڑے اسکینڈل کا سامنا کرنا پڑتا۔ کسی کے سامنے اپنی یہاں موجودگی کا جواز پیش کرنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا چنانچہ اسے ہر حال میں یہاں سے واپس جانا تھا اور اس صورت میں کہ اپنے مقصد میں بھی کامیاب رہتا اور دشمنوں کے ہاتھ اپنی یہاں آمد کا کوئی ثبوت بھی نہ لگنے دیتا۔ اپنی ساری تیاری میں اس نے اس بات کا خصوصی اہتمام کیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے پاس موجود ریوالور بھی وہ تھا جو کسی چور بازار سے اس تک پہنچا تھا... وہ بھی اتنے ہاتھوں سے گزرنے کے بعد کہ تحقیق کرنے والے کوشش کرتے بھی تو ان کے لیے اس تک پہنچنا ممکن نہیں ہوتا۔ ویسے تو اسے معلوم ہی تھا کہ یہاں کی پولیس اتنی باریک بینی سے کسی کیس کی تفتیش و تحقیق کرتی ہی نہیں کہ کسی خاص میک کے ہتھیار سے چلائی گئی گولی کے سہارے اس کے استعمال کرنے والے تک پہنچ سکے۔

اس کے پھرتی کے مظاہرے کے باوجود وہ شخص کلاشنکوف کو گرفت میں لینے میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن بہرحال، فائر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ شہریار نے بے پناہ جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نال کی جانب سے کلاشنکوف کو تھام لیا۔ اب ان دونوں میں اسے اپنے قبضے میں لینے کے لیے زور آوری ہو رہی تھی۔ شہریار نے اگر باقاعدہ ورزش اور جوڈو وغیرہ کی تربیت کے ذریعے خود کو کافی مضبوط بنا رکھا تھا تو وہ بھی دیہاتی ماحول کا پروردہ بھاری ڈیل ڈول کا آدمی تھا۔ دونوں اپنی طرف سے پورا زور لگا رہے تھے کہ کسی طرح کلاشنکوف اپنے قبضے میں لے لیں۔ بالآخر شہریار نے کلاشنکوف کو اپنی طرف کھینچنے کی جدوجہد چھوڑ کر اس کی نال پر دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈالتے ہوئے اپنے جسم کو اٹھایا اور دونوں پیر اپنے مقابل شخص کے پیٹ میں دے مارے۔ اس چوٹ کو کھا کر اس شخص کی کلاشنکوف پر گرفت ختم ہو گئی اور وہ پیٹھ کے بل پیچھے کی طرف گرا۔ شہریار بھی خود کو گرنے سے نہیں بچا سکا اور اسی آدمی کے انداز میں ہی خود بھی پشت کے بل زمین پر گر گیا لیکن اسے یہ برتری حاصل تھی کہ کلاشنکوف اس کے قبضے میں آ چکی تھی۔ اسے نال سے پکڑے پکڑے ہی وہ اچھل کر کھڑا ہوا۔ اس دوران اس کا مقابل بھی بے حد پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا تھا لیکن اس بار شہریار نے اسے حملہ کرنے کی مہلت نہیں دی اور کلاشنکوف کو لاٹھی کی طرح استعمال کرتے ہوئے اس کا بٹ اس کے پہلو میں مارا۔ اس شخص کے حلق سے ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی لیکن وہ پسپائی اختیار کرنے پر تیار نہیں ہوا اور شہریار کے پیٹ میں اپنے سر سے ٹکر مارنے کی کوشش کی۔ اس کا ارادہ بھانپ کر شہریار چند قدم پیچھے ہٹا اور نہایت اطمینان سے کلاشنکوف کے بٹ سے اس کے سر پر ایک نپی تلی ضرب لگائی۔ ضرب کھا کر اس شخص نے منہ سے "ہونغ" کی آواز نکالی اور زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا ساتھی پہلے ہی زمین چاٹ رہا تھا۔ بائیں پہلو میں ایک خاص زاویے سے لگائی گئی شہریار کی کہنی کی ضرب کوئی معمولی نہیں تھی۔ یہ ضرب پسلیوں کے حفاظتی پنجر کو خاطر میں لائے بغیر اس کے دل پر اثر انداز ہوئی تھی جس کے نتیجے میں وہ جو پہلے ہی ہاتھ سے بہتے خون کی وجہ سے نڈھال ہو رہا تھا، نیم بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کے دوبارہ اٹھ کھڑے ہونے کا امکان نہ ہوتے ہوئے بھی شہریار نے مناسب سمجھا کہ اس

www.pkdigest.com

کے تربوز جیسے سر پر بھی کلاشنکوف کے بٹ سے ہلکی سی تھپکی دے دی۔ یہ شفقت بھری تھپکی وصول کرنے کے بعد وہ شخص بالکل ہی انٹاغفیل ہوگیا جبکہ اس کا ساتھی تو پہلے ہی بے ہوشی کے مزے لوٹ رہا تھا۔ ان دونوں کی طرف سے مطمئن ہوتے ہوئے اس نے تہ خانے کا رخ کیا۔ اس ڈیرے پر اس کا پہلی بار آنا ہوا تھا لیکن ڈاکٹر ماریا نے اسے ہر بات اتنی تفصیل سے بتائی تھی کہ اسے بالکل بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اپنے مقابلے پر آنے والے ان دو آدمیوں کو نمٹانے کے بعد اس نے کسی تیسرے کی تلاش میں بھی اس لیے وقت ضائع نہیں کیا تھا کہ ڈاکٹر ماریا کے مطابق چودھری کی عدم موجودگی میں ڈیرے پر اس کے دو تین سے زیادہ آدمی موجود نہیں ہوتے تھے۔ اگر کوئی تیسرا وہاں موجود ہوتا تو اس دھینگا مشتی کے دوران سامنے آچکا ہوتا چنانچہ کسی بھی مداخلت کی طرف سے قطعی مطمئن وہ تہ خانے کی طرف بڑھ گیا۔ سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچنے کے بعد اس نے سب سے آخر میں موجود کمرے کا رخ کیا۔ کمرے کے دروازے میں جدید ساخت کا آٹومیٹک لاک لگا ہوا تھا۔ اس کی اطلاع کے مطابق یہ چودھری کا کمرائے خاص تھا جس کی چابی کسی کارندے کے پاس ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس نے ہاتھ میں موجود کلاشنکوف سیدھی کی اور بلاتکلف لاک پر فائر کھول دیا۔ تہ خانے میں کلاشنکوف چلنے کی آواز بُری طرح گونجی مگر اسے اطمینان تھا کہ یہ آواز باہر کہیں نہیں سنی جا سکے گی۔ ڈیرا گاؤں کی آبادی سے دور ذرا سنسان سے علاقے میں تھا جہاں عموماً چودھری کے آدمیوں کے علاوہ دوسرے لوگ رخ کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

کلاشنکوف سے نکلنے والی گولیوں نے لاک توڑ دیا تھا۔ پیر کی ٹھوکر سے دروازہ کھول کر وہ کمرے میں داخل ہوا۔ کمرا بیڈ روم کے انداز میں سجا ہوا تھا اور یہ سجاوٹ اتنی عمدہ تھی کہ دیکھنے والے کی آنکھیں داد دیے بنا نہ رہ پاتیں لیکن اس کی آنکھوں سے کسی بھی قسم کی تحسین کے بجائے نفرت اور کراہیت برس رہی تھی۔ یہ وہ کمرا تھا جہاں پچھلی ہی رات چودھری نے ڈاکٹر ماریا کی بے بسی اور مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دادِ عیش دی تھی... اور بھی جانے کتنی لڑکیاں اس کمرے میں آتی جاتی رہی تھیں اور چودھری کی ہوس کا نشانہ بنتی رہی تھیں۔

دل میں ٹھاٹھیں مارتے نفرت کے طوفان کو قابو میں رکھتے ہوئے وہ دیوار میں بنے بک شیلف کی طرف بڑھا اور ہاتھ سے دباؤ ڈال کر اسے بائیں طرف کھسکانے کے لیے زور لگایا۔ بک شیلف بائیں طرف موجود دیوار کے خلا میں غائب ہوگیا۔ اب اس کے سامنے ایک اور شیلف موجود تھا جس میں ملکی اور غیر ملکی شراب کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔ ان بوتلوں کو دیکھ کر یہی گمان ہوتا تھا کہ انہیں ہی پوشیدہ رکھنے کے لیے بک شیلف کے پیچھے یہ خفیہ الماری بنائی گئی ہے لیکن درحقیقت یہ بھی ایک ڈاج تھا کہ تلاشی لینے والا ان سے دھوکا کھا کر پلٹ جائے۔ اگر اس کے ساتھ ڈاکٹر ماریا کا تعاون نہ ہوتا تو وہ بھی دھوکا کھا جاتا لیکن اسے حقیقت معلوم تھی کہ اس شراب کی بوتلوں سے بھری الماری کے پیچھے بھی کچھ ہے۔ اس نے اس الماری کو زور لگا کر دائیں طرف دھکیلا۔ بک شیلف کی طرح وہ بھی دیوار کے خلا میں غائب ہوگئی۔ دراصل یہ سارا سیٹ اپ دہری دیواریں بنوا کر ان کے درمیان بنایا گیا تھا۔ سرسری نظر ڈالنے والے کو خیال ہی نہیں گزرتا تھا کہ دو کمروں کی درمیانی دیوار ایک نہیں ہے بلکہ دو الگ الگ دیواریں اٹھا کر درمیان میں یہ خفیہ جگہ بنائی گئی ہے۔ ویسے بھی اس تہ خانے تک دو طرح کے افراد کی ہی رسائی تھی۔ ایک چودھری کے نمک خوار اور دوست تھے تو دوسرے وہ ستم رسیدہ افراد جو پہلے ہی اپنی کسی نہ کسی مجبوری کے سبب چودھری کے ہاتھوں پامال ہو رہے تھے۔ دونوں گروہوں کے افراد کے لیے چودھری کے خلاف کچھ بھی سوچنے اور عمل کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اب تک یہاں جو مظلوم افراد لائے گئے تھے، ان میں شاید ڈاکٹر ماریا ہی وہ ذی شعور ہستی تھی جس نے مجبور ہونے کے باوجود اپنے حواس قائم رکھے تھے اور چودھری کے چند اہم راز جان کر یہاں سے باہر نکلی تھی۔ اس کی اس ہوش مندی نے شہریار کا بڑا بھلا کیا تھا۔ اس وقت وہ دونوں الماریوں کے ہٹ جانے کے بعد وہاں پیدا ہو جانے والے درمیانی خلا میں کھڑا اپنے سامنے موجود تجوری کو دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے سوئچ بورڈ تلاش کر کے وہاں روشنی کر دی تھی۔ وہ روشنی یہاں تک بھی آ رہی تھی۔ روشنی کی مدد سے وہ سامنے موجود تجوری کا جائزہ لے رہا تھا۔ ڈاکٹر ماریا نے اسے صاف بتا دیا تھا کہ وہ تجوری کھولنے کے طریقے سے واقف نہیں۔ نہ ہی چودھری نے اسے براہِ راست تجوری کا دیدار کروایا ہے جو وہ اس میں موجود لاک کی نوعیت سے اسے آگاہ کر سکے۔ خود اس کا اندازہ تھا کہ تجوری میں نمبروں والا تالا ہی موجود ہوگا اور نمبر ظاہر ہے صرف چودھری ہی جانتا ہوگا اس لیے اس نے سوچ لیا تھا کہ کسی زحمت میں پڑے بغیر سیدھے سیدھے ریوالور کی گولی سے لاک توڑ دے گا لیکن اب جو لاک کا جائزہ لیا تو

اندازہ ہوا کہ یہ نمبروں والا لاک نہیں بلکہ اسی کی طرز پر بنایا گیا قدرے مختلف انداز کا لاک ہے۔ تجوری پر نظر آتے ڈائل پر نمبروں کے بجائے الفابیٹس نظر آ رہے تھے۔ یہ فور کمبی نیشن والا لاک تھا جس کا درست کمبی نیشن جیسے ہی ملایا جاتا، لاک کھل جاتا۔ لاک کو دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ چودھری کی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے اس نے غور کیا کہ اس جیسا بندہ کیا کمبی نیشن سیٹ کر سکتا ہے؟ فوراً ہی اس کے ذہن میں چودھری کا نام ابھرا۔ اس جیسا خود پسند بندہ اپنے نام کے کسی حصے کو ہی سوچ سکتا تھا۔ افتخار عالم شاہ... اس نام میں "عالم" اور "شاہ" دو ایسے حصے تھے جن میں چار چار الفابیٹس آتے تھے۔ اس نے ان دونوں کو ہی باری باری آزمایا لیکن ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس ناکامی پر وہ تھوڑا سا جھنجلا گیا۔ جھنجلاہٹ میں اس نے کلاشنکوف سیدھی کی اور لاک پر فائر کرنے ہی جا رہا تھا کہ ایک اور خیال ذہن میں ابھرا۔ اس خیال کو آزمانے کے لیے اس نے آخری کوشش کے طور پر سی، آئی اے اور ایس کا کمبی نیشن ملایا۔ یہ چودھری افتخار عالم شاہ کے مکمل نام کے ہر حصے کے پہلے حرف والا کمبی نیشن تھا جسے ملاتے ہی لاک کھل گیا۔ لاک کھلتے ہی اس نے تجوری کا پٹ کھولا۔ اس کی آنکھیں خیرہ رہ گئیں۔ وہاں سونے کے بسکٹس کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ غریب مزارعوں کا خون چوس کر اور دوسری بے ایمانیوں سے کمائی گئی حرام دولت کو چودھری نے اپنی اس خفیہ تجوری میں سونے کی شکل میں جمع کر رکھا تھا۔ بہرحال، اسے سونے کے اس ڈھیر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہاں وہ اپنی ان تصویروں کے حصول کے لیے آیا تھا جن کے ذریعے چودھری اور اس کے ساتھی اسے زیر کرنے کا منصوبہ بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے تجوری کے نچلے خانے میں موجود مختلف کاغذات اور بند لفافوں کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ ایک لفافے میں اسے آخرکار اپنی تصاویر مل گئیں۔ تصویروں کے ساتھ ان کے نیگیٹوز بھی موجود تھے۔ اس لفافے کو اپنی بیلٹ میں اڑسنے کے بعد اس نے تجوری کی مزید تلاشی لینا جاری رکھا۔ اسے ڈاکٹر ماریا کی تصویروں کی تلاش تھی۔ وقت کی قلت کے باعث وہ وہاں موجود کاغذات کی نوعیت جاننے میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ اسے صرف تصویروں کی تلاش تھی لیکن اس تلاش میں اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ بالآخر وہ مایوس ہو کر واپس پلٹ گیا۔ واپس پلٹتے ہوئے اس نے تجوری کو بند کرنے یا شیلف کو واپس ان کی جگہ لانے کی کوشش نہیں کی البتہ شراب کی بوتلوں میں سے چند قیمتی شراب کی بوتلیں نکال لیں اور کمرے میں پہنچنے کے بعد انہیں بیڈ کراؤن سے ٹکرا کر توڑ ڈالا۔ قیمتی شراب بوتلوں سے نکل کر بستر پر گرتی گئی اور کمرا الکحل کی بو سے بھر گیا۔ اس نے سائڈ بورڈ پر پڑا سنہری لائٹر اٹھایا۔ یہ لائٹر وہ کمرے میں داخل ہونے کے بعد وہاں کا جائزہ لیتے ہوئے پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ اس کے انگوٹھے کی معمولی سی جنبش سے سنہری لائٹر نے ایک سرخ شعلہ اگلا۔ اس نے کسی خون آشام بلا کی سرخ زبان جیسا شعلہ اگلتے اس لائٹر کو بستر کی طرف اچھال دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بنا پیچھے مڑ کے دیکھے، باہر نکلتا چلا گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ایک شعلے سے وہاں کئی شعلے بھڑک چکے ہوں گے۔ یہ سرخ سرخ شعلے ذرا دیر بعد چودھری کے اس عیش کدے کو خاک میں بدل دیتے مگر اسے کوئی افسوس نہیں تھا۔ چودھری کا لاکھوں کا مال خاک میں تبدیل ہونے کے باوجود ان مظلوم لڑکیوں کے نقصان کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا جن کے وجود یہاں، اس عیش کدے میں پامال کیے گئے تھے۔

اس نے جو کچھ کیا تھا، وہ ظالم اور اس کے ظلم کے خلاف نفرت کا معمولی اظہار تھا۔ اظہار کے اس لمحے میں وہ بھول چکا تھا کہ وہ ایک اونچے خاندان سے تعلق رکھنے والا، ذمے دار اور قانون کا پاسدار اسسٹنٹ کمشنر ہے۔ اس وقت وہ ایک جذباتی اور غصے سے بھرا نوجوان تھا جس کے ذہن میں اقبال کا یہ شعر گونج رہا تھا۔

اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا ڈالو
جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی

اپنے پیچھے جاری شعلوں کے رقص کو چھوڑ کر وہ ڈیرے سے باہر نکل آیا۔ موٹر بائیک اپنی جگہ پر موجود تھی۔ ذرا دیر میں وہ اس پر سوار پیر آباد سے باہر جانے والے راستے پر گامزن تھا۔ واپسی کا سفر اس نے پہلے سے بھی کم وقت میں طے کر لیا۔ چوکیدار نثار اس کی ہدایت کے مطابق مستعد اور چوکنا اس کا منتظر تھا۔

"صبح سے پہلے ہی وہ آدمی، جو یہ بائیک دے کر گیا تھا، یہاں آئے گا۔ تم بائیک اس کے حوالے کر دینا۔" سر پر موجود ہیلمٹ اتار کر اسے پہلے ہی کے انداز میں بائیک کے ہینڈل کے ساتھ لٹکاتے ہوئے اس نے چوکیدار کو حکم دیا۔

"ٹھیک ہے سر!" چوکیدار نے جواب دیا۔

"اور ہاں نثار! تم نے اپنے ٹرانسفر کے لیے جو درخواست دی تھی، وہ میں نے منظور کر لی ہے۔ بہت جلد تم اپنی خواہش کے مطابق اپنے آبائی علاقے میں جا کر وہاں کام کر سکو گے۔" اندر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اس نے چوکیدار سے کہا۔

www.pkdigest.com

''بہت بہت شکریہ سر!'' چوکیدار خوش ہوگیا۔
''شکریے کی کوئی ضرورت نہیں... بس آج کی رات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھول جانا ورنہ نقصان میں رہو گے۔'' اس نے بے حد سرد لہجے میں کہا اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے لہجے کی سنسناہٹ اپنی ریڑھ کی ہڈی میں محسوس کرتا ہوا چوکیدار اپنی ڈیوٹی دینے لگا۔

☆☆☆

''آپ خوب ترسا رہی ہیں مجھے۔ آپ کو نہیں معلوم کہ میں آپ سے ملنے کے لیے کتنا بے قرار ہوں۔''
''کبھی ہم بھی تو ایسے ہی بے قرار رہتے تھے اور آپ پابندیاں لگاتے تھے۔'' وہ اس کی بے قراری کا لطف لیتے ہوئے دھیمے سروں میں ہنسی۔
''تب اور اب میں بڑا فرق ہے محترمہ! پہلے میں جسے روکتا تھا وہ پیر آباد کی ایک چودھرائن تھی لیکن اب جس سے ملنے کی خواہش کر رہا ہوں، وہ میری منکوحہ ہے۔'' آفتاب نے جتایا۔
''یہی فرق تو مجھے روکتا ہے۔ میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا کہ اب اس پہلے والی جگہ پر ملنا مجھے اپنے رشتے کے شایانِ شان نہیں لگتا۔ میں آپ سے ملوں گی لیکن ابھی نہیں۔ ذرا مجھے موقع ملنے دیں پھر میں لاہور چلی جاؤں گی۔ آپ بھی وہیں آجائیے گا۔''
''اس پروگرام پر عمل درآمد ہونے میں کتنا وقت لگے گا؟'' آفتاب نے بے تابی سے پوچھا۔
''کچھ کہہ نہیں سکتی۔ دراصل میں مجھے شک ہے کہ بڑی ماں کو کسی قسم کی بھنک پڑ گئی ہے۔ ان کی چہیتی ملازمائیں میری ٹوہ میں رہنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مجھے آپ سے فون پر بات کرنے کے لیے بھی بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔'' اس نے اپنی مجبوری بتائی تو وہ تشویش میں مبتلا ہوگیا۔
''کہیں آپ کسی مشکل میں نہ پڑ جائیں۔''
''آپ بے فکر رہیں۔ میں پوری طرح ہوشیار رہتی ہوں۔'' کشور نے اسے تسلی دی اور پھر گفتگو کا موضوع بدلنے کی غرض سے بولی۔ ''آپ نے فریدہ والے معاملے میں کچھ کیا؟ میں نے آپ سے قربان کا پتا معلوم کرنے کا کہا تھا۔''
''آپ کے حکم کی تعمیل ہو چکی ہے سرکار! میں نے اپنے ایک شاگرد سے ذکر کیا تھا۔ وہ قربان کو جانتا ہے۔ اگر میں اس سے کہوں گا تو وہ قربان کو میرے پاس لے آئے گا پھر ہم اس کی اور فریدہ کی آپس میں بات کروا دیں گے۔''
''تھینک یو آفتاب! اصل میں فریدہ کے سلسلے میں بڑا بوجھ محسوس کرتی ہوں۔ اس پر ظلم ہوا ہے اور ظلم کرنے والے میرے اپنے ہیں۔ اگر میری مدد سے وہ اس اذیت ناک زندگی سے نجات پانے میں کامیاب ہوگئی تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔'' وہ دردمندی سے بولی۔
''انشاء اللہ آپ کی یہ خواہش ضرور پوری ہوگی۔'' آفتاب نے صدقِ دل سے کہا پھر مزید بولا۔ ''کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ ابھی فریدہ سے میری بات کروا دیں؟ ہوسکتا ہے آپ کی باتوں پر اس نے یقین نہ کیا ہو، میں بات کروں تو وہ قائل ہو جائے کہ واقعی ہم اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ میں اسے یقین دہانی کروانے کی کوشش کروں گا کہ اے سی صاحب بذاتِ خود اس کے کیس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ وہ ذرا سی ہمت کرے اور ہمارا ساتھ دے تو بہت کچھ ہوسکتا ہے۔''
''میں کوشش کرتی ہوں۔ آپ انتظار کریں۔ اگر فریدہ راضی ہوگئی تو میں تھوڑی دیر بعد آپ کو فون کروں گی۔'' اس نے آفتاب سے کہتے ہوئے کال منقطع کر دی اور موبائل کو اپنی اوڑھنی میں چھپاتے ہوئے باہر نکلی۔ اس کے کمرے سے باہر نکلتے ہی رانی لپک کر اس کے قریب آئی۔ کشور کی طرف سے ہچکی اور شادو پر بے پناہ شک کے اظہار کے بعد اس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ جتنی دیر کشور فون پر بات کرے گی، وہ باہر ہی رہے گی تاکہ کوئی اس کے کمرے کے دروازے پر آکر سن گن لینے کی کوشش کرے تو وہ اس کا وقت لے سکے۔
''میں تھوڑی دیر کے لیے اوپر جا رہی ہوں رانی... تم یہاں کا خیال رکھنا۔'' رانی سے آہستگی سے کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئی۔ اوپری منزل کی سیڑھیاں طے کر کے وہ اوپر پہنچی اور سب سے پہلے بہزاد شاہ کے کمرے میں جھانکا۔ وہ اپنے بستر پر پُرسکون نیند سو رہا تھا۔ اس کی ملازمہ بھی کارپٹ پر لیٹی گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کمرے کے سامنے سے گزر کر وہ اس کمرے کی طرف بڑھی جہاں فریدہ کا قیام تھا۔ دروازے کی نچلی درز سے جھانکتی نیلی روشنی نائٹ بلب کے جلنے کا پتا دے رہی تھی جو اس بات کی علامت تھی کہ فریدہ سو رہی ہے۔ اس کی نیند میں مداخلت کے خیال سے وہ تھوڑی سی جھجکی لیکن پھر جانے کیوں اسے احساس ہوا کہ اندر کمرے میں نیند کے بعد والی خاموشی نہیں ہے۔ ایک بار چیک کر لینے کے خیال سے اس نے دروازے کو ہاتھ سے ہلکا سا دھکیل کر کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی اس پر گویا کوئی پہاڑ آگرا۔ کمرے کا منظر جاگتی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ سب کچھ حقیقت ہے۔

حادثات و سانحات کی شکار... پناہ کی تلاش میں سرگرداں
ماہ بانو کی داستانِ حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

تصوراتِ غم اور درد و اذیت کے پہلوؤں کو اجاگر کرتی ایک ماورائی اور تحیر آمیز کہانی

کسی شخص کی زندگی رنگینی و رعنائی کا مجموعہ ہوتی ہے......
اور کسی کی زندگی میں دور تک تاریکی و تیرگی کا راج ہوتا ہے
......اس نفرت گزیدہ راج دھانی میں حسن کی باریکیوں کا مشاہدہ
کرنے کی فرصت نہیں ہوتی

وعدہ

یعقوب جمیل

اچانک کسی نے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر میری کلائی پکڑ لی اور ایک جھٹکے سے مجھے اپنی جانب کھینچ لیا۔ میں نے مڑ کر اس شخص کی طرف دیکھا لیکن اندھیرے میں مجھے اس کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ ''کون ہیں آپ... اور اس وقت یہاں کیوں آئے؟''
''یہ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں؟'' اندھیرے میں کھڑے ہوئے اس سیاہ چہرے والے شخص نے کہا۔ ''یہ سوال تو مجھے آپ سے پوچھنا چاہیے۔ اگر میں وقت پر نہ آجاتا تو آپ اس وقت کسی اور ہی دنیا میں ہوتے۔ جس جگہ آپ کھڑے ہیں یہاں دریا کا پانی بہت گہرا ہے۔ اب آپ مجھے بتائیں کہ خودکشی کا خیال آپ کے ذہن میں کیوں آیا؟''
''آپ نے کیوں مجھے مرنے سے روک لیا؟'' اجنبی شخص کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ ''میں بہت پریشان ہوں، ایک عرصے سے بے روزگار ہوں۔'' میں نے دھیرے دھیرے بتایا۔ ''گھر کی ایک ایک چیز بک گئی ہے اور قرض کا بوجھ الگ سر پر کھڑا ہے۔ ایسی حالت میں مرنے کے سوا میرے پاس کوئی اور چارہ نہیں ہے۔''
میری بات سن کر وہ اجنبی زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی کی آواز نے اندھیری رات کے پُرسکون ماحول میں ایک پُراسراری ہلچل مچا دی اور مجھے اس شخص سے ڈر سا محسوس ہونے لگا۔ ذرا دیر تک تو اس کی پُراسرار ہنسی میرے کانوں میں گونجتی رہی پھر وہ اپنی ہنسی کو روک کر میرے سامنے والے دوسرے پتھر پر بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔ ''آپ کا نام بدری ناتھ ہے... ہے نا؟''
''جی...'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
''میں آپ کو بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔'' اس اجنبی شخص نے کہا۔ ''آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ کی مدد کروں گا لیکن آپ کو ٹھنڈے دل سے میری بات سننا ہوگی۔''
''مگر آپ مجھے کس طرح جانتے ہیں؟ آپ ہیں کون؟ میں تو آپ کو جانتا بھی نہیں ہوں بلکہ کبھی دیکھا بھی نہیں ہے۔'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''میں نے ایک بار کہا نا کہ میں آپ کو جانتا ہوں۔''

www.pkdigest.com

وہ بولا۔

"ٹھیک ہے، آپ جانتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "مگر مجھے یہ تو بتائیں کہ آپ کون ہیں؟ میں نے کبھی آپ کو دیکھا تک نہیں ہے اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔"

"مجھے... آپ پرمود رائے کہہ سکتے ہیں۔" وہ شخص بولا۔ "اتنا ہی کافی ہے کیونکہ سب مجھے اسی نام سے جانتے ہیں۔ خیر، اب آپ مجھے جلدی سے یہ بتا دیں کہ آپ کیوں مرنا چاہتے ہیں؟"

"آپ کو میرے مرنے کی وجہ جاننے کی بہت جلدی ہے؟" میں نے لمبی سیاہ ڈاڑھی اور گھنی مونچھوں والے اس شخص کے سیاہ چہرے کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ بولا۔ "مجھے جلدی ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"کیوں کیا؟" وہ فوراً ہی بولا۔ "ارے بھلے آدمی... میں تو آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اپنی مشکلات کی وجہ سے اپنی زندگی ختم کرنا چاہتے ہیں جبکہ میں آپ کو بچانا چاہتا ہوں۔ آپ مجھ پر بھروسا رکھیں۔ میں آپ کی تمام تکالیف دور کرسکتا ہوں مگر میرے پاس وقت بہت کم ہے اور اگر یہ وقت گزر گیا تو پھر کچھ نہیں ہوگا... دیکھیے، ابھی رات کے دو تو بج ہی رہے ہوں گے۔"

اپنی مدد کے لیے آنے والے اس پُراسرار آدمی کو میں ذرا دیر تک تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا پھر اپنی جیب ٹٹول کر بیڑیوں کا آدھا بچا ہوا بنڈل نکالا اور دوسری جیب سے ماچس کی ڈبیا بھی نکال لی پھر میں نے ایک بیڑی اس کی طرف بڑھا کر دوسری بیڑی اپنے ہونٹوں میں دبالی۔ بیڑی کو اپنے ہاتھ میں دبا کر وہ اجنبی جس نے اپنا نام پرمود رائے بتایا تھا، ہنسنے لگا۔ مجھے اس کی اس بے بات کی ہنسی پر حیرت ہوئی تو میں نے اس سے پوچھ لیا۔

"آپ کس بات پر ہنس رہے ہیں؟"

"ہنسوں نہیں تو اور کیا کروں؟" اندھیرے میں پرمود رائے کی آنکھوں سے ایک عجیب سی نیلی روشنی پھوٹتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی اور وہ ہنستے ہوئے آگے کہہ رہا تھا۔ "آپ اگر سچ مچ ہی جان دینے کے لیے دریا میں کودنا چاہتے تھے تو یہ بیڑی اور ماچس کیوں جیب میں رکھی ہوئی تھی؟ کیا یہ دونوں چیزیں بھیگ نہ جاتیں؟"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور اپنی بیڑی سلگا کر ماچس اس کی جانب بڑھا دی اور پھر جلدی جلدی بیڑی کے کش لینے لگا۔ پرمود رائے نے بھی ماچس کی تیلی جلا کر اپنی بیڑی جلالی اور تب میں نے دیکھا کہ جلتی تیلی کی ذرا دیر کی روشنی بھی آس پاس کے اندھیرے کو دور نہیں کر سکی تھی۔ گھر میں بیوی اور بچوں کو چھوڑ کر میں دوبارہ گھر واپس نہ جانے کا ارادہ کر کے ہی یہاں آیا تھا اور یہ فیصلہ میں نے اپنے اندر کے اندھیرے کی وجہ سے ہی کیا تھا... پرمود رائے کی یقین دہانیاں اور تسلیاں بھی میرے اس اندھیرے کو دور نہیں کرسکی تھیں۔

منہ سے سگریٹ کا دھواں نکالتے ہوئے پرمود رائے نے کہا۔ "ارے بھائی! اب تو بتا دیں کہ آپ کیوں مرنے کے لیے گھر سے نکل آئے تھے؟ آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جلد بازی میں اٹھایا ہوا قدم اکثر نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔"

میں نے سنجیدگی سے پرمود رائے کی بات سنی اور پھر گمبھیر سے لہجے میں بولا۔ "میری چار بیٹیاں ہیں اور تقریباً چاروں ہی شادی کے لائق ہیں۔ ایک کے بعد ایک کی شادی ہوگی جبکہ میرا گھرانا ایک عزت دار اور خاندانی رواجوں اور اصولوں کا پابند گھرانا ہے۔ بند مٹھی رکھ کر ابھی تک تو میں حالات سے لڑتا رہا اور گھر کی گاڑی کھینچتا رہا لیکن اب ایسا وقت آرہا ہے کہ مجھے..."

"اچھا... اچھا تو تمہیں روپوں کی ضرورت ہے؟" پرمود رائے درمیان میں ہی بول پڑا۔

www.pkdigest.com

"ہاں... اور اچھے سارے روپے میرے پاس نہیں ہیں۔" میں نے سر جھکا کر دھیمے لہجے میں کہا۔ "کہ میں اپنی چار بیٹیوں کو اپنی خاندانی روایات کے مطابق رخصت کر سکوں۔ میری حالت بہت ہی خراب ہے..."

"لیکن اگر آپ اس دریا میں ڈوب کر مر گئے ہوتے تو؟ آپ کا گھر بے سہارا ہو جاتا، بیوی بیوہ بن کر لاچاری کی حالت میں پڑ جاتی۔ ایسی حالت میں بیوی اور آپ کی چار بیٹیوں کا کیا ہوتا؟ ان کی شادیاں کون کرتا؟"

"کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتیں سب کی شادیاں۔" میں نے بڑی بجھی ہوئی آواز میں کہا۔ "ویسے میری بیوی بڑی سمجھ دار اور ہمت والی عورت ہے اور پھر میرے نہ ہونے سے میرے عزیز رشتے دار بھی میری بچیوں کی مدد کریں گے۔"

پرمود رائے نے آخری کش لگا کر بیڑی کے ٹکڑے کو دریا کی جانب اچھال دیا۔ "اوہ!" وہ کچھ اس طرح بولا جیسے اسے میری بات سے کچھ دلچسپی ہی نہ ہو۔ "میری تو کچھ میں ہی نہیں آتا کہ آپ کو ایسا خیال کیوں آیا؟ آپ کو کم از کم یہ تو قبول کرنا ہی ہوگا کہ آپ کے بعد تو آپ کی بیوی دوسروں کی... میرا مطلب ہے عزیزوں، رشتے داروں اور دوستوں کی محتاج بن کر رہ جائے گی۔ آپ کی بچیوں کی شادیاں

کرانے کے لیے آپ کی بیوی کو کیا کیا نہیں کرنا پڑے گا؟ یہ ساری باتیں آپ کو سوچنا چاہئیں۔"

"نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔

"جب آپ کے گھر میں کھانے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں تو یہ سب کیوں نہیں ہوگا؟" پرمود رائے نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "آپ کی باتیں میرے گلے سے نیچے نہیں اتر رہی ہیں۔ میں تو صرف اتنا ہی جانتا ہوں کہ جو میدان چھوڑ جائے، وہ کھلاڑی نہیں ہوتا۔ لوگ آپ کو بزدل کہیں گے تو یہ بات کیا آپ کو پسند آئے گی؟"

"آپ کو میری بات بھلے ہی سمجھ میں نہ آئے مگر میں نے بہت سوچنے سمجھنے کے بعد ہی گھر چھوڑا ہے اور دریا میں کود کر اپنی جان دینے کا فیصلہ کیا تھا لیکن آپ نے مجھے روک کر میرے ساتھ اچھا نہیں کیا... مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آج کے بعد بھی میں اپنے فیصلے پر قائم رہوں گا۔"

"یعنی آپ خودکشی کی کوشش دوبارہ کریں گے؟"

"ہاں..." میں نے کہا۔

"لیکن میں آپ کو آئندہ بھی مرنے نہیں دوں گا۔" پرمود رائے نے پُریقین لہجے میں کہا۔ "کیونکہ اب آپ کو اس کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ میں آپ کو ڈھیر سارے روپے دوں گا، چاندی کے چمکتے ہوئے روپے اور نوٹوں کے بنڈل۔"

"مگر کیوں؟ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔ کسی جان پہچان کے بغیر آپ مجھے ڈھیر سارے روپے کیوں دینا چاہتے ہیں؟" میں نے حیرت سے پرمود رائے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آخر مجھ سے آپ کو اتنی ہمدردی کیوں ہے؟"

میری یہ بات سن کر پرمود رائے کے لہجے میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ پہلے جیسے ہی پُرسکون لہجے میں بولا۔ "دیکھیے، میری بات دھیان سے سنیے ذرا۔ میرا بھی کوئی بیٹا نہیں ہے۔ سب لڑکیاں ہی تھیں لیکن میں نے آپ کی طرح غلطی نہیں کی تھی۔"

"کیا مطلب؟" میں چونک پڑا۔

"مطلب یہ کہ میں نے اپنی کمائی بہت سنبھال کر رکھی ہے۔" پرمود رائے نے کہا۔ "میں لڑکیوں کو جمع کرنے اور انہیں پال پوس کر بڑا کرنے اور پھر ان کے پیچھے اپنے آپ کو دکھی اور پریشان کرنا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ آپ میری بات پر یقین نہیں کریں گے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میری بیوی روپا بھی میری ہم خیال تھی۔ ہم دونوں لڑکی کے پیدا ہوتے ہی اسے اسی کے پاس بھیج دیتے تھے جس نے ہمیں لڑکی دی تھی۔ اس لیے ہمیں نہ تو لڑکی کو پال پوس کر جوان کرنا پڑتا تھا اور نہ ہی ان کی شادی کے لیے ہمیں روپے خرچ کرنا پڑتے تھے۔"

میں بڑی حیرت سے پرمود رائے کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ بولتے بولتے ذرا دیر کے لیے رکا پھر آگے بولا۔ "اس طرح ہم نے بہت سارے روپے بچائے ہیں... نقد... چاندی کے چمکتے ہوئے ڈھیر سارے سکے اور کاغذ کے کڑک نوٹوں کے بنڈل... لیکن اب میں وہ ساری دولت آپ کو دے دوں گا۔"

"لیکن کیوں؟" پرمود رائے کے چپ ہوتے ہی میں پوچھ بیٹھا۔ مجھے اب اس بات میں ذرا بھی شک نہیں رہ گیا تھا کہ یہ پُراسرار اجنبی یا تو سنکی ہے یا سچ مچ ہی پاگل ہے۔

"ارے بھئی! آپ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے؟" مجھے خاموش دیکھ کر اس نے کہا۔ "کہ آپ کو روپوں کی ضرورت ہے اور اب مجھے ان کی بہت زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے میں اپنی جمع کی ہوئی تمام دولت آپ کو دے دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ اچانک ہی اس طرح چپ ہو گیا جیسے اسے کوئی بات اچانک ہی یاد آ گئی ہو۔ میں اندھیرے میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔

"کیوں... کیا آپ کو میری بات پر یقین نہیں آرہا ہے؟" اس کی آواز سن کر میں پھر چونک پڑا، وہ کہہ رہا تھا۔ "ارے بھائی! مجھے تو اور بھی روپے مل جائیں گے لیکن اس وقت آپ مجھ سے زیادہ ضرورت مند ہیں۔"

"نہیں... نہیں... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔ "آپ کے روپے... میں کیسے..."

"اب چلیے... اٹھ جائیے۔" پرمود رائے میری بات کو ان سنی کرتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور آگے بولا۔ "مگر آپ کو میرا ایک کام کرنا ہوگا۔"

"کیسا کام؟" میں اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "یہ کام ابھی ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔" پرمود رائے نے جلدی جلدی کہا۔ "کیونکہ وقت بہت ہی کم رہ گیا ہے۔ اب مجھے یہ بتائیں کہ آپ کے پاس گیارہ... اکیس... اکتیس... یا اکتالیس روپے کی رقم ہوگی؟" اس کا یہ سوال سن کر میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اب مجھے پورا یقین ہو گیا کہ یہ شخص ضرور چور لٹیرا ہی ہے۔ اس نے مجھے دریا میں کودنے سے اس لیے روک لیا تھا کہ میری جیب میں جو کچھ ہے، اسے ہتھیا لے۔ میں نے چور نظروں سے اپنے دائیں بائیں نظر ڈالی لیکن آبادی بہت دور تھی اور دریا کے اس سنسان کنارے پر اس وقت کوئی اور نہیں تھا جو میری مدد کرسکتا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس شخص کو یہ معلوم ہوگا کہ میری جیب

میں دو چار بچی ہوئی بیڑیوں اور ماچس کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے تو یہ غصے میں آکر مجھے دریا کے پانی میں دھکیل دے گا۔ میں اپنے جس گھر کو چھوڑ کر مرنے کے لیے یہاں آیا تھا، اب وہی گھر میری آنکھوں کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ مجھے اپنی بیٹیاں یاد آرہی تھیں۔ اپنی بیوی شانتی یاد آرہی تھی۔ اب میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ کم از کم پرمود رائے جیسے آدمی کے ہاتھوں تو ہرگز نہیں۔

زندگی کی سب سے کٹھن اور سنسنی خیز گھڑی میرے سامنے کھڑی تھی اور میں ذہنی طور پر پرمود رائے کی طرف سے ہونے والے کسی خطرناک حملے سے خود کو بچانے کی تیاری کررہا تھا کہ اچانک وہ بول پڑا۔ ”آپ کس سوچ میں ڈوب گئے؟ اگر آپ کے پاس اکتیس، اکتیس یا اکیس روپے نہیں ہیں تو کوئی بات نہیں۔ میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا۔“ یہ کہہ کر اس نے ہاتھ اٹھا کر ایک جانب اشارہ کیا اور آگے بولا۔ ”وہ دیکھیے، تاڑ کے اس لمبے درخت کے ساتھ ایک لال اینٹوں کی عمارت نظر آرہی ہے... ہے نا؟“

”ہاں۔“ میں اس طرف دیکھ کر بولا۔ ”اس کے اوپر پیلے رنگ کا ایک بلب بھی جل رہا ہے؟“

”ہاں، وہ ایک اسکول ہے... لال اسکول۔“ پرمود رائے نے کہا۔ ”آپ آئیے میرے ساتھ، اس اسکول کے گراؤنڈ کے ایک کونے میں دو سو سال پرانا برگد کا ایک بوڑھا پیڑ ہے جس کے نیچے روپوں سے بھری ہوئی میری ایک ٹمن کی پیٹی دفن ہے۔ چلیے... میں آپ کو دکھاتا ہوں۔“

میں ڈرتے ڈرتے اس کے ساتھ چل پڑا۔ اس کے علاوہ میرے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ راستے میں چلتے چلتے ہم دونوں میں سے کوئی بھی کچھ نہیں بولا۔ میرے پاؤں نہیں اٹھ رہے تھے مگر میں پھر بھی کسی طرح خود کو گھسیٹ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اَن جانے میں، میں کسی خوفناک کہانی کا ایک کردار بنتا جارہا ہوں۔ خوف کی ایک تیز لہر تھی جو مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔

”ہم اب ٹھیک جگہ پر پہنچ گئے ہیں۔“ پرمود رائے نے کافی دیر سے چھائی ہوئی خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ ”اب آپ سکون سے میری بات سنیے... دیکھیے، آپ کا کام تو ہو جائے گا مگر میرا ابھی ایک کام ہے جو بے حد ضروری ہے اور میرا وہ کام آپ کو کرنا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے دھیان سے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ ”دیکھیے، اس میں گھبرانے اور ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ کام بہت معمولی ہے لیکن میرے لیے بے حد اہم ہے اور آپ کے سوا آج اور اس وقت کوئی اور شخص میرا یہ کام کر ہی نہیں سکتا... کیونکہ اس اندھیری رات میں جو آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے، میں کسی اور کو کہاں ڈھونڈوں گا؟ اس لیے آپ کو ہی میرے سر کا یہ بوجھ اتارنا ہوگا... ارے ہاں، ایک بیڑی تو دیجیے۔“ بولتے بولتے پرمود رائے نے اچانک بیڑی کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

میں نے جیب سے دو بیڑیاں نکالیں اور کانپتے ہاتھ سے ایک اس کی جانب بڑھا دی اور دوسری بیڑی اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں میں دبا کر ماچس کی تیلی جلا دی۔ ذرا ہی دیر میں دو سلگتی ہوئی بیڑیوں کا دھواں آنکھوں کے سامنے منڈلانے لگا۔

”اس اسکول کی بائیں جانب کی دیوار سے متصل ایک گلی اندر کی طرف جاتی ہے۔“ پرمود رائے نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ اس گلی میں داخل ہوں گے تو داہنی جانب کا پہلا ہی ایک چھوٹا سا ٹوٹا پھوٹا مکان دکھائی دے گا۔ وہی جمنا چاچی کا مکان ہے۔“

”تو وہاں جا کر مجھے کیا کرنا پڑے گا؟“ میں نے گھبرائی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ پرمود رائے جلدی سے بولا۔ ”آپ اس گھر کے دروازے پر دستک دے کر جمنا چاچی کا پوچھیے گا۔ جب وہ آجائے تو میں ابھی جو آپ کو اکتیس روپے دوں گا، وہ آپ اسے دے دیجیے گا۔ جمنا چاچی بہت پیار کرنے والی رحم دل عورت ہے۔ وہ دائی کا کام کرتی ہے۔ آج سے چھ دن پہلے اس نے روپا یعنی میری بیوی کی زچگی کرائی تھی۔ اس وقت میرے پاس اس کو دینے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ بچے کی چھٹی والے دن یعنی چھٹے روز میں اس کے کام کا معاوضہ اسے دے دوں گا اور آج چھٹا روز ہے... اور وعدے کے مطابق جمنا چاچی کے کام کا معاوضہ اسے ملنا ہی چاہیے۔“

اتنا کہہ کر پرمود رائے نے بیڑی کا ایک کش لگایا پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا، میں ہی ڈرتے ڈرتے بول پڑا۔ ”یہ کام تو آپ خود بھی کرسکتے ہیں۔ جمنا چاچی آپ کو جانتی پہچانتی بھی ہے۔ آپ اسے اپنے ہاتھ سے اس کی محنت کے پیسے دیں گے تو اسے خوشی ہوگی۔“

”نہیں، یہ کام میں خود نہیں کرسکتا۔“ پرمود رائے نے گردن ہلا کر کہا۔ ”اگر میں ہی یہ کام کرسکتا تو آپ کو اپنے ڈھیر سارے روپے کیوں دیتا؟ مجھے تو جمنا چاچی سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا ہے اور آپ کو بھی موت کے منہ میں جانے سے بچانا ہے۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور چپ چاپ کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ چند لمحوں بعد وہ بے حد گمبھیر لہجے میں بولا۔ ”میری بیوی روپا کی یہ پانچویں زچگی تھی۔“

”کیا؟“ میرے منہ سے خود بہ خود ہی ایک چیخ سی آواز نکل گئی اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کو دیکھنے لگا مگر وہ میری طرف دیکھے بغیر ہی بولا۔

”اس بار بھی روپا کو لڑکی ہی ہوئی تھی۔“

مجھے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ میں دم سادھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے یہ شخص بدمعاش ہی نہیں بلکہ سو فیصد پاگل لگ رہا تھا۔ اچانک اس نے بیڑی کا ٹکڑا زمین پر پھینک دیا اور پاس کی جھاڑیوں میں گھس کر ایک نکیلا ڈنڈا نکال لایا اور اس نکیلے ڈنڈے سے برگد کے درخت کی جڑوں کے پاس کی مٹی کو جلدی جلدی کھودنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں ڈیڑھ فٹ گڑھا کھود کر اس نے مٹی کا ڈھیر کونے پر لگا دیا۔

میں نے کھڑے ہی کھڑے اس گڑھے کے اندر نظر ڈالی تو مجھے ایک دو فٹ لمبا اور ایک فٹ چوڑا ٹین کے بکس کا ڈھکنا دکھائی دیا۔ پرمود رائے مجھ سے اس بکس کو باہر کھینچ کر نکالنے کو کہہ رہا تھا۔ ذرا ہی دیر میں ہم دونوں نے مل کر ٹین کے اس چھوٹے بکس کو باہر نکال لیا۔ پھر پرمود رائے نے جب اوپر کی مٹی صاف کر کے بکس کا ڈھکنا اٹھایا تو میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بکس کے ایک طرف بڑے بڑے نوٹوں کی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں اور دوسری طرف چاندی کے چمکتے ہوئے سکوں کا ڈھیر تھا۔

اس خزانے کو دیکھ کر اب میں پرمود رائے کے بارے میں نئے سرے سے سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا اور اب مجھے لگ رہا تھا کہ نہ تو یہ شخص بدمعاش ہے اور نہ ہی یہ پاگل ہے۔ تو پھر آخر یہ ہے کون؟ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک وہ اپنی جیب سے ایک لال رنگ کا رومال نکال کر میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا۔ ”اب ذرا بھی تاخیر بہت مہنگی پڑے گی۔ آپ جلدی سے چاندی کے اکتیس سکے نکال کر اس رومال میں لپیٹ لیں اور جس طرح میں نے کہا ہے، پوٹلی کو جمنا چاچی کو دے کر فوراً ہی واپس آجائیں۔ صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے آپ کو یہ بکس لے کر اپنے گھر پہنچنا ہے اور اب میرے بھی جانے کا وقت ہوگیا ہے... اور ہاں، جمنا چاچی سے یہ ضرور کہہ دیجیے گا کہ یہ روپے روپا کی زچگی کرانے کے ہیں۔ ابھی اتنے ہی رکھ لیں، آئندہ زیادہ دیں گے... بس اب آپ جائیں۔“

میں اکتیس روپوں کی لال پوٹلی کو ہاتھ میں دبائے آگے بڑھا۔ میرے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ اب میرے پیروں میں ذرا بھی لڑکھڑاہٹ نہیں تھی۔ چلتے چلتے میں جونہی اسکول کے برابر والی گلی میں مڑنے لگا تو عقب سے پرمود رائے کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”پیچھے پلٹ کر میری طرف مت دیکھنا اور واپس آکر اس بکس کو اٹھا کر فوراً ہی یہاں سے چلے جانا۔ اپنی بچیوں کی شادیاں کرانا اور اس دولت کو بچیوں کے ماموں کی طرف سے تحفہ سمجھنا۔ جائیے اور پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی کوشش مت کیجیے گا۔“

میں نے وہیں رک کر پرمود رائے کی بات سنی... اور پیچھے مڑ کر ایک بار بھی اس کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ چلتے چلتے مجھے لگ رہا تھا کہ کچھ اور 'انہونی' ابھی ہونے والی ہے۔

گلی میں داخل ہو کر داہنی جانب ایک چھوٹا سا ٹوٹا پھوٹا مکان تھا۔ میں نے اس کے برآمدے پر چڑھ کر لکڑی کے بند دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ چند لمحوں بعد ہی اندر سے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ ”کون ہے؟ کیا کام ہے اس وقت؟“

”جی... مجھے جمنا چاچی سے کام ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں ہوں جمنا۔“ دروازہ کھل گیا اور ایک ادھیڑ عمر عورت نے آگے آکر کہا۔ ”بولو، کیا کام ہے؟ میں ہی جمنا ہوں۔“

”دیکھیے، مجھے پرمود رائے نے بھیجا ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے...... پوٹلی اس کی طرف بڑھا دی۔ ”یہ اکتیس روپے ہیں مگر آئندہ وہ اس سے زیادہ رقم دیں گے۔ چھ دن قبل آپ نے ان کی بیوی روپا کی زچگی کرائی تھی، یہ اسی کے روپے ہیں۔“ یہ کہہ کر میں نے روپوں کی پوٹلی اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ ٹھیک اسی وقت جمنا چاچی کبوتر کی طرح پھڑپھڑانے لگی اور پھر اچانک ہی چکرا کر فرش پر گر پڑی۔ اس کے ہاتھ سے روپوں کی پوٹلی چھوٹ گئی اور اس میں سے سکے اچھل کر ادھر ادھر فرش پر گول گول گھومنے لگے۔ جمنا چاچی کے گرنے اور چاندی کے سکوں کی 'چھن چھنا چھن' کی آواز سن کر اندر سوئے لوگ جاگ کر وہاں آگئے اور انہوں نے بے ہوش پڑی ہوئی جمنا چاچی کو اٹھا کر چارپائی پر ڈال دیا۔ میں ابھی تک کھلے ہوئے دروازے کے درمیان میں ہی کھڑا تھا مگر ایک اور بوڑھی سی عورت نے آگے بڑھ کر مجھ سے کچھ کہے سنے بغیر ہی مجھے باہر دھکیل کر دروازہ زور سے بند کردیا۔

میں تو حیران سا دروازے کے باہر ہی کھڑا رہ گیا۔ میری تو سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ اچانک ایسا کیا ہوگیا ہے؟ جمنا چاچی روپوں کی پوٹلی ہاتھ میں لیتے ہی فرش پر گر کر بے ہوش کیوں ہوگئی؟

طرح طرح کے سوالات میرے ذہن میں اٹھ رہے تھے مگر ان کے جواب دینے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر جمنا چاچی کی تھی کہ آخر اسے ہوا کیا ہے؟ بس یہی سوچ کر میں نے ایک بار پھر بند دروازے پر دستک دی لیکن میری کوشش بے کار گئی۔ دروازہ نہیں کھلا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر گھر والوں کو میری بات سننے میں کیا تکلیف ہو رہی ہے؟

برآمدے کے ایک کونے میں لکڑی کے پتلے پتلے تختوں سے بنی ہوئی تین چار پیٹیاں پڑی تھیں۔ میں نے قریب جا کر دیکھا تو ایک پیٹی میں کوئلے بھرے ہوئے تھے اور دو تین پیٹیاں اوپر نیچے دیوار سے لگی ہوئی تھیں جن پر مکڑی کے جالے سجے ہوئے تھے اور پاس ہی ایک جھاڑو پڑی تھی۔

اچانک پیچھے سے کسی بوڑھی عورت کی تھرتھراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”بھائی! تم جو کوئی بھی ہو، ابھی یہاں سے چلے جاؤ۔“ میں نے پلٹ کر دیکھا مگر مجھے کوئی دکھائی نہیں دیا البتہ دروازے کے برابر والی کھڑکی کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا پھر اس میں... مجھے اسی بوڑھی عورت کا چہرہ دکھائی دے گیا... جس نے مجھے باہر دھکیل کر دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔

”میں تو جا رہا ہوں۔“ میں نے کھڑکی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”مگر جمنا چاچی...“

”جمنا نے چھ روز پہلے جو زچگی کرائی تھی، وہ جوڑا انسانوں کا جوڑا نہیں تھا۔“ بوڑھی عورت نے میری پوری بات سنے بغیر اسی کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”وہ کوئی آسیب کا جوڑا تھا۔ جمنا نے جیسے ہی بچی کا جنم کرایا تو فوراً ہی دونوں ماں باپ نے مل کر نوزائیدہ بچی کو چیر پھاڑ کر کھا لیا۔ یہ بھیانک منظر جمنا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اسی وقت سے وہ بے چاری اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی ہے۔ بس اب تم چلے جاؤ یہاں سے۔“ اتنا کہہ کر بڑھیا نے کھڑکی کا پٹ بند کر دیا۔

اور تب یکایک ہی مجھے لگا کہ اکتیس روپے کی پوٹلی ہاتھ میں لے کر جمنا چاچی کے گھر آتے وقت مجھے ٹانگوں میں جو طاقت محسوس ہوئی تھی، وہ یکایک ہی سلب ہو گئی ہے اور میری دونوں ٹانگیں بہ مشکل ہی میرے جسم کا بوجھ اٹھا پا رہی ہیں۔ اب مجھے احساس ہوا کہ دریا کنارے میری ملاقات پرمود رائے نامی کسی انسان سے نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ کوئی آسیب ہی تھا جو آدھی رات کو انسان کے بھیس میں آ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ اچانک میرے کانوں میں اس کی کہی ہوئی باتیں گونجنے لگیں۔ اس نے شروع شروع میں ایک بار کہا تھا۔ ”میرا ابھی کوئی بیٹا نہیں ہے۔ سب لڑکیاں ہی پیدا ہوئی تھیں۔ میری بیوی روپا بھی میری ہم خیال تھی۔ ہم دونوں لڑکی کے پیدا ہوتے ہی اسے اسی کے پاس بھیج دیتے تھے جس نے ہمیں لڑکی دی تھی۔“ اس کے بعد پرمود رائے نے برگد کے پاس کھڑے ہو کر ایک بڑی عجیب بات کہی تھی۔ ”میری بیوی روپا کی یہ انچاسویں زچگی تھی۔ اس بار بھی لڑکی ہی ہوئی تھی۔“

میں اس کی یہ بات سن کر چونک پڑا تھا مگر اس وقت میں نے اس کی بات پر زیادہ توجہ نہیں دی بلکہ یہ یقین کر بیٹھا تھا کہ یہ شخص سو فیصد پاگل ہی ہے۔

لیکن اب جمنا چاچی کی حالت دیکھ کر اور اس بوڑھی عورت کی باتیں سن کر میں سمجھ گیا کہ پرمود رائے کوئی پاگل نہیں تھا۔ وہ تو آدمی ہی نہیں تھا... آسیب تھا... آسیب... میرے دل کی دھڑکن لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ رات کا اندھیرا آس پاس کے ماحول کو اور بھی بھیانک بنا رہا تھا۔ میں نے گردن گھما کر ادھر اُدھر دیکھا اور ہمت کر کے دوڑ پڑا۔ اندھیرے کو چیرتے ہوئے میرے پاؤں برگد کے اس پرانے درخت کے پاس ہی آ کر رکے۔ میں نے ہانپتے ہوئے تازہ کھدے ہوئے گڑھے کی طرف دیکھا۔ روپوں سے بھری ہوئی ٹین کی پیٹی وہیں پڑی تھی جیسے اسے میرا ہی انتظار ہو۔

آج اس بات کو تین برس ہو چکے ہیں۔ میری چاروں بیٹیوں کی شادیاں خاندانی روایات کے مطابق بہت دھوم دھام سے ہو چکی ہیں۔ میری بیوی شانتی نے ان کی شادیوں پر اپنے سارے ارمان پورے کر لیے ہیں۔ میں نے ایک جنرل اسٹور کھول لیا ہے اور دونوں میاں بیوی خوش حال زندگی گزار رہے ہیں۔ میری چاروں بیٹیاں بھی اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں۔

اس دن کے بعد سے پرمود رائے نامی پراسرار اجنبی سے پھر کبھی میری ملاقات نہیں ہوئی اور میں چاہتا بھی یہی ہوں کہ آئندہ کبھی اس سے ملاقات ہی نہ ہو۔ لیکن کچھ بھی ہو، اس نے میرے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کیا تھا۔ اگر دیکھا جائے تو اس نے سچ مچ... مجھے ایک نئی زندگی دی ہے... اور ہاں، بے چاری جمنا چاچی اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اس واقعے کے چند روز بعد ہی اس کا دیہانت ہو گیا تھا۔

چوہے دان

مریم کے خان

ہر شکاری اپنے مطلوبہ شکار کو ہر صورت گرفت میں چاہتا ہے ...... چاہے اس کے لیے کسی بھی قسم کا پھندا استعمال کرنا پڑے ...... ایک ایسے ہی شکاری کا ماجرا جو اپنے شکار کے لیے سنہرا جال تیار کرتا تھا۔

مغرب سے درآمد ایک انوکھی دلچسپ اور یاد رہ جانے والی تحریر

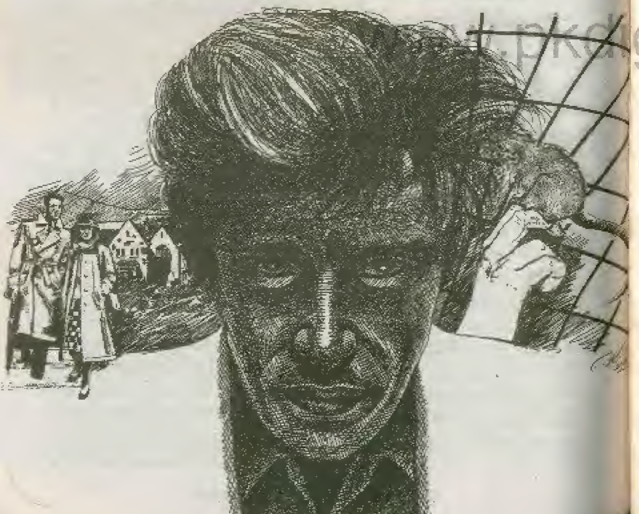

کارل نے بار میں جھانکا تو اسے وہاں جیفسن نظر آ گیا۔ اس کی باچھیں کھل گئیں جبکہ جیفسن نے اسے دیکھتے ہی برا سا منہ بنایا اور جلدی سے اپنی برانڈی کی بوتل اپنے پاس کر لی... جیسے اسے خطرہ ہو کہ کارل اس کی شراب میں حصہ بٹانے آیا ہے۔ کارل نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں پینے نہیں آیا۔“

جیفسن نے خفگی سے اسے دیکھا۔ ”تو پھر کس لیے آئے ہو؟“

کارل بہت پُرجوش ہو رہا تھا اور اس کا جوش چھپائے نہیں چھپ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا اسے کوئی بہت خاص بات معلوم ہو گئی ہو اور وہ اسے کسی کو بتانے کے لیے بے چین ہو۔ اس نے اضطراری انداز میں کہا۔ ”ایک چانس ہے۔“

”جیل جانے کا۔“ جیفسن نے طنز کیا۔

”نہیں، اس میں امکان کم ہے لیکن اگر ہم کامیاب رہے تو وہاں سے اتنا کچھ مل جائے گا کہ سال بھر آرام سے بیٹھ کر کھا سکیں گے۔“

”وہ تو ناکامی کی صورت میں سال بھر سے زیادہ ہی بیٹھ کر کھا سکیں گے۔“ جیفسن کا طنزیہ لہجہ برقرار تھا۔ ”جیل میں آدمی بیٹھ کر ہی کھاتا ہے۔“

”میرے دوست! میری بات کا یقین کرو۔“

"میں کوشش کر رہا ہوں۔" ہیلسن نے اب جلدی جلدی اپنی بوتل ختم کرنا شروع کر دی کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ ابھی کوئی آفت آجائے گی اور اسے اپنی بوتل ختم کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ کارل کا شمار کچھ ایسے ہی سبز قدم لوگوں میں ہوتا تھا... وہ جہاں جاتے تھے، وہاں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ جب ہیلسن نے اپنی بوتل ختم کر لی تو اسے اطمینان ہوا کہ آج کارل اتنا سبز قدم ثابت نہیں ہوا تھا۔

"اچھا دوست! اب میں گھر جاؤں گا۔" ہیلسن کھڑا ہو گیا۔

"میں بھی چلوں گا۔" کارل بولا۔ ہیلسن کا خیال تھا کہ وہ بھی اپنے گھر کی طرف روانہ ہو رہا ہے لیکن باہر نکل کر بھی وہ اس کے ساتھ ہو لیا۔ ہیلسن نے اعتراض کیا۔

"میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔"

"میں صرف راستے میں تمہارے ساتھ ہوں۔" کارل بولا۔ "میرا تمہارے گھر تک جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

ہیلسن کو اگرچہ اس کی بات کا یقین نہیں آیا لیکن اس نے کچھ اعتراض نہیں کیا اور کارل اس کے ساتھ فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ رات بہت سرد تھی اور بار کی گرم فضا سے نکل کر کچھ زیادہ ہی سرد لگ رہی تھی۔ یہ ایک معمولی درجے کا علاقہ تھا جہاں زیادہ تر نچلے طبقے کے یا جرائم پیشہ لوگ رہتے تھے۔ گھٹیا قسم کے بار تھے جہاں یہ لوگ سستا زہر جسم میں اتارتے تھے۔

کارل اور ہیلسن معمولی درجے کے چور اُچکے تھے۔ ان دونوں میں بس یہ فرق تھا کہ ہیلسن میں کسی قدر عقل تھی اور وہ اسے استعمال بھی کرتا تھا جبکہ کارل ان دونوں چیزوں سے تقریباً عاری تھا۔ جرائم کی دنیا میں اس کی شہرت ایک طفیلیے کی سی تھی۔ وہ کسی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ معمولی ترین کام جس میں ایک آدمی بھی بہت ہوتا ہے، اس میں بھی اسے کسی نہ کسی کی مدد کی ضرورت ہوتی تھی۔

البتہ کارل میں ایک خصوصیت تھی اور وہ یہ کہ کارل کسی بھی نفع بخش موقع کی بو دور سے محسوس کر لیتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اسے معلوم نہیں ہو پاتا تھا کہ وہ خوشبو ہے یا بدبو۔ کارل تقریباً تیس برس کا دبلا پتلا اور چہرے سے مظلوم نظر آنے والا شخص تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دو بار رنگے ہاتھوں پکڑے جانے اور عدالت میں اس کے احمقانہ طرزِ عمل کی وجہ سے اسے معمولی سی سزا ہوئی تھی اور دونوں موقع... پر اسے مجموعی طور پر صرف دس مہینے جیل میں گزارنے پڑے۔ جیل میں بھی اس کے ساتھ خاصی رعایت برتی جاتی۔ اسے سزا میں بھی معافی مل رہی تھی۔

اس کے مقابلے میں ہیلسن صورت سے ہی چھٹا ہوا مجرم اور پیشہ ور چور نظر آتا تھا۔ اگرچہ وہ اتنا چھٹا ہوا بھی نہیں تھا اور اس کا کیریر ریکارڈ کوئی زیادہ تسلی بخش نہیں تھا... بلکہ دیکھا جائے تو کارل سے بہتر نہیں تھا۔ ان کے ایک مشترکہ جاننے والے فادر کا کہنا تھا کہ ان دونوں کا وجود ہی خدا کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

اگرچہ کارل کی وجہ سے ہیلسن کبھی پکڑا نہیں گیا تھا اور نہ ہی اسے کوئی اور نقصان ہوا لیکن اس کی وجہ وہ اپنی ذہانت کو قرار دیتا تھا اور کارل کو اس نے سیکیورٹی رسک سمجھ لیا تھا۔ اس کے خیال میں وہ اس سے جتنا دور رہتا اتنا ہی سکھی اور محفوظ رہتا۔ یہ ساری باتیں اس نے کارل سے تو نہیں کی تھیں لیکن اسے اپنے رویے سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ کارل کے پاس اتنی عقل ہوتی تو وہ کوئی بہتر کام نہ کر رہا ہوتا؟ وہ بدستور ہیلسن کو اپنا بہترین دوست خیال کرتا رہا اور اس کے آس پاس منڈلاتا رہتا۔

ایک جگہ ہیلسن سگریٹ سلگانے کے لیے رکا تو کارل نے موقع پا کر پھر سے اپنی بات شروع کر دی۔ "ہیلسن ایسا موقع سو میں سے ایک بار ملتا ہے۔ تم ایک بار سن تو لو۔"

باہر نکل تھا [illegible] کے بعد ہیلسن کا [illegible] بڑھ گیا تھا اس لیے اس نے سوچا کہ کارل کی بات سننے میں کوئی حرج نہیں... انکار تو وہ اسے کبھی بھی کر سکتا ہے بلکہ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ کارل کی بات سن کر مزے سے سیٹی بجاتے ہوئے اپنے گھر جا سکتا تھا اس لیے اس نے کمال مہربانی سے اسے اجازت دے دی۔

"ٹھیک ہے لیکن کوشش کرنا بات مختصر ہو... مجھے گھر جا کر سونا بھی ہے۔"

کارل نے یوں دانت نکالے جیسے ہیلسن کا گھر جا کر سونا بھی کوئی لطیفہ ہو پھر اس نے کہا۔ "ہیلسن تم نے ساؤتھ پارک کا علاقہ دیکھا ہے؟"

ہیلسن کو پہلے ہی اُمید تھی کہ وہ کوئی احمقانہ بات کرے گا۔ ساؤتھ پارک کا علاقہ کس نے نہیں دیکھا تھا۔ ہیلسن تو اس کے چپے چپے سے واقف تھا۔ اس نے کارل پر طنز کرنے کے بجائے سر ہلایا۔ "ہاں، دیکھا ہے۔"

"اس کی ساتویں اسٹریٹ بھی دیکھی ہے؟"

اس بار ہیلسن کا صبر جواب دے گیا۔ "میں نے اس کی ساتویں اسٹریٹ کے سارے گھر بھی دیکھے ہیں۔ تم کام کی بات بتاؤ۔"

"وہاں ایک مکان ہے بی ایف سیکسٹین۔" کارل نے سرگوشی میں کہا۔ "اس میں ایک اکیلی بوڑھی عورت رہتی ہے۔"

"اس علاقے میں بہت سارے مکان ایسے ہیں جہاں اکیلی بوڑھی عورتیں رہتی ہیں۔"

"ہاں لیکن یہ عورت ایک بہت بڑے مکان میں رہتی ہے اور وہاں بے شمار قیمتی چیزیں ہیں۔"

ہیلسن نے غور کیا۔ "اگر وہ اکیلی رہتی ہے اور اس کے پاس بے شمار قیمتی چیزیں ہیں تو وہ اب تک بچی ہوئی کیسے ہے؟"

"کیونکہ باہر سے مکان کوئی کھنڈر اور کسی غریب کا گھر لگتا ہے۔"

"تب تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہاں کچھ قیمتی اشیا بھی ہیں؟"

اس بار کارل جواب دیتے ہوئے ہچکچایا۔ "میں نے کسی سے سنا تھا۔"

"کس سے؟"

"میں اس کو نہیں جانتا لیکن وہ جم کے بار میں کسی سے بات کر رہا تھا۔ وہ اس عورت اور اس کے گھر کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ عورت کے گھر میں سونے اور چاندی کی کئی چیزیں ہیں اور کوئی خاص حفاظتی انتظامات بھی نہیں بلکہ سرے سے حفاظتی انتظامات ہی نہیں ہیں۔"

"اور تم نے سن کر یقین کر لیا؟" ہیلسن نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"ان لوگوں کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"احمق... اگر ایسا کوئی موقع ہوتا تو وہ اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے وہاں بیٹھ کر اس کے بارے میں بات کر رہے ہوتے؟"

"جو آدمی یہ ساری باتیں دوسرے آدمی کو بتا رہا تھا، وہ اسے اسی طرح قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے میں تمہیں قائل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"دوسرے آدمی کا کیا ردِ عمل تھا؟" ہیلسن نے پوچھا۔

کارل نے سرد آہ بھری اور بولا۔

"وہی جو اس وقت تمہارا ہے۔"

"تب خدا حافظ۔" ہیلسن نے ہاتھ ہلایا اور آگے چل پڑا۔ کارل اس کے پیچھے لپکا۔

"میری بات تو سنو۔"

"میرے دوست! اب تم بھی گھر جا کر آرام کرو۔" ہیلسن رکے بغیر بولا۔ اس نے کارل کی طرف دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی۔

"ہیلسن! دیکھنے میں کیا حرج ہے؟" کارل گھگیائے لہجے میں بولا۔

"کل دیکھیں گے۔" ہیلسن نے ہاتھ لہرایا اور آگے بڑھ گیا۔ کارل کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر واپس چل پڑا۔ ہیلسن نے اس کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا اور سیدھا ہی چلتا رہا لیکن جب اسے یقین ہو گیا کہ کارل اب اس کے پیچھے موجود نہیں ہے اور وہ کارل کی نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے تو اس نے راستہ بدلا اور تیزی سے ساؤتھ پارک کے علاقے کی طرف روانہ ہو گیا۔ مکان نمبر اس کے ذہن میں موجود تھا... بی ایف سکسٹین۔

دس منٹ بعد وہ ساتویں سڑک کے اس مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ کسی زمانے میں یہ علاقہ شرفا کے لیے مخصوص تھا۔ یہاں سڑک کے دونوں جانب بڑے بڑے مکانات

آپ بھی بھرپور طاقت کے مالک بنیے طبی دنیا میں کامیاب اور لاجواب نسخہ

مردحضرات ہی پڑھیں۔

[illegible]

حکیم اینڈ سنٹر
پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

"میں کوشش کر رہا ہوں۔" بینسن نے اب جلدی جلدی اپنی بوتل ختم کرنا شروع کر دی کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ ابھی کوئی آفت آ جائے گی اور اسے اپنی بوتل ختم کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ کارل کا شمار کچھ ایسے ہی سبز قدم لوگوں میں ہوتا تھا... وہ جہاں جاتے تھے، وہاں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ جب بینسن نے اپنی بوتل ختم کر لی تو اسے اطمینان ہوا کہ آج کارل اتنا سبز قدم نہیں تھا۔

"اچھا دوست! اب میں گھر جاؤں گا۔" بینسن کھڑا ہو گیا۔

"میں بھی چلوں گا۔" کارل بولا۔ بینسن کا خیال تھا کہ وہ بھی اپنے گھر کی طرف روانہ ہو رہا ہے لیکن باہر نکل کر بھی وہ اس کے ساتھ ہو لیا۔ بینسن نے اعتراض کیا۔

"میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔"

"میں صرف راستے میں تمہارے ساتھ ہوں۔" کارل بولا۔ "میرا تمہارے گھر تک جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

بینسن کو اگرچہ اس کی بات کا یقین نہیں آیا لیکن اس نے مزید احتجاج نہیں کیا اور کارل اس کے ساتھ فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ رات بہت سرد تھی اور بار کی گرم فضا سے نکل کر کچھ زیادہ ہی سرد لگ رہی تھی۔ یہ ایک معمولی درجے کا علاقہ تھا جہاں زیادہ تر نچلے طبقے کے یا جرائم پیشہ لوگ رہتے تھے۔ گھٹیا قسم کے بار تھے جہاں یہ لوگ سستا زہر جسم میں اتارتے تھے۔ کارل اور بینسن معمولی درجے کے چور اُچکے تھے۔ ان دونوں میں بس یہ فرق تھا کہ بینسن میں کسی قدر عقل تھی اور وہ اسے استعمال بھی کرتا تھا جبکہ کارل ان دونوں چیزوں سے تقریباً عاری تھا۔ جرائم کی دنیا میں اس کی شہرت ایک طفیلیے کی سی تھی۔ وہ کسی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ معمولی ترین کام جس میں ایک آدمی بھی بہت ہوتا ہے، اس میں بھی اسے کسی نہ کسی کی مدد کی ضرورت ہوتی تھی۔

البتہ کارل میں ایک خصوصیت تھی اور وہ یہ کہ کارل کسی بھی نفع بخش موقع کی بو دور سے محسوس کر لیتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اسے معلوم نہیں ہو پاتا تھا کہ وہ خوشبو ہے یا بدبو۔ کارل تقریباً تیس برس کا دبلا پتلا اور چہرے سے مظلوم نظر آنے والا شخص تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دو بار رنگے ہاتھوں پکڑے جانے اور عدالت میں اس کے احمقانہ طرزِ عمل کی وجہ سے اسے معمولی سی سزا ہوئی تھی اور دونوں موقع... پر اسے مجموعی طور پر صرف دس مہینے جیل میں گزارنے پڑے۔ جیل میں بھی اس کے ساتھ خاصی رعایت برتی جاتی۔ اسے سزا میں بھی معافی ملتی رہی تھی۔

اس کے مقابلے میں بینسن صورت سے ہی چھٹا ہوا مجرم اور پیشہ ور چور نظر آتا تھا۔ اگرچہ وہ اتنا چھٹا ہوا بھی نہیں تھا اور اس کا کیریئر ریکارڈ کوئی زیادہ تسلی بخش نہیں تھا... بلکہ دیکھا جائے تو کارل سے بہتر نہیں تھا۔ ان کے ایک مشترک جاننے والے فادر کا کہنا تھا کہ ان دونوں کا وجود ہی خدا کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

اگرچہ کارل کی وجہ سے بینسن کبھی پکڑا نہیں گیا تھا اور نہ ہی اسے کوئی اور نقصان ہوا لیکن اس کی وجہ وہ اپنی ذہانت کو قرار دیتا تھا اور کارل کو اس نے سیکیورٹی رسک سمجھ لیا تھا۔ اس کے خیال میں وہ اس سے جتنا دور رہتا اتنا ہی سکھی اور محفوظ رہتا۔ یہ ساری باتیں اس نے کارل سے تو نہیں کی تھیں لیکن اپنے رویے سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ کارل کے پاس اتنی عقل ہوتی تو وہ کوئی بہتر کام نہ کر رہا ہوتا؟ وہ بدستور بینسن کو اپنا بہترین دوست خیال کرتا رہا اور اس کے آس پاس منڈلاتا رہتا۔

ایک جگہ بینسن سگریٹ سلگانے کے لیے رکا تو کارل نے موقع پا کر پھر سے اپنی بات شروع کر دی۔ "بینسن ایسا موقع سو میں سے ایک بار ملتا ہے۔ تم ایک بار سن تو لو۔"

بار کی فضا سے نکلنے کے بعد بینسن کا غصہ کسی قدر ٹھنڈا ہو گیا تھا اس لیے اس نے سوچا کہ کارل کی بات سننے میں کوئی حرج نہیں... انکار تو وہ اسے بعد میں بھی کر سکتا ہے بلکہ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ کارل کی بات سن کر مزے سے سیٹی بجاتے ہوئے اپنے گھر جا سکتا تھا اس لیے اس نے کمال مہربانی سے اسے اجازت دے دی۔

"ٹھیک ہے لیکن کوشش کرنا بات مختصر ہو... مجھے گھر جا کر سونا بھی ہے۔"

کارل نے یوں دانت نکالے جیسے بینسن کا گھر جا کر سونا بھی کوئی لطیفہ ہو پھر اس نے کہا۔ "بینسن تم نے ساؤتھ پارک کا علاقہ دیکھا ہے؟"

بینسن کو پہلے ہی اُمید تھی کہ وہ کوئی احمقانہ بات کرے گا۔ ساؤتھ پارک کا علاقہ کس نے نہیں دیکھا تھا۔ بینسن تو اس کے چپے چپے سے واقف تھا۔ اس نے کارل پر طنز کرنے کے بجائے سر ہلایا۔ "ہاں، دیکھا ہے۔"

"اس کی ساتویں اسٹریٹ بھی دیکھی ہے؟"

اس بار بینسن کا صبر جواب دے گیا۔ "میں نے اس کی ساتویں اسٹریٹ کے سارے گھر بھی دیکھے ہیں۔ تم کام کی بات بتاؤ۔"

"وہاں ایک مکان ہے بی الیف سیکسٹین۔" کارل نے سرگوشی میں کہا۔ "اس میں ایک اکیلی بوڑھی عورت رہتی ہے۔"

"اس علاقے میں بہت سارے مکان ایسے ہیں جہاں اکیلی بوڑھی عورتیں رہتی ہیں۔"

"ہاں لیکن یہ عورت ایک بہت بڑے مکان میں رہتی ہے اور وہاں بے شمار قیمتی چیزیں ہیں۔"

بینسن نے غور کیا۔ "اگر وہ اکیلی رہتی ہے اور اس کے پاس بے شمار قیمتی چیزیں ہیں تو وہ اب تک بچی ہوئی کیسے ہے؟"

"کیونکہ باہر سے مکان کوئی کھنڈر اور کسی غریب کا گھر لگتا ہے۔"

"تب تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہاں کچھ قیمتی اشیا بھی ہیں؟"

اس بار کارل جواب دیتے ہوئے ہچکچایا۔ "میں نے کسی سے سنا تھا۔"

"کس سے؟"

"میں اس کو نہیں جانتا لیکن وہ جم کے بار میں کسی سے بات کر رہا تھا۔ وہ اس عورت اور اس کے گھر کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھی کو بتا رہا تھا کہ عورت کے گھر میں سونے اور چاندی کی کئی چیزیں ہیں اور کوئی خاص حفاظتی انتظامات بھی نہیں بلکہ سرے سے حفاظتی انتظامات ہی نہیں ہیں۔"

"اور تم نے سن کر یقین کر لیا؟" بینسن نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"ان لوگوں کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"احمق... اگر ایسا کوئی موقع ہوتا تو وہ اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے وہاں بیٹھ کر اس کے بارے میں بات کر رہے ہوتے؟"

"جو آدمی یہ ساری باتیں دوسرے آدمی کو بتا رہا تھا، وہ اسے اسی طرح قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے میں تمہیں قائل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"دوسرے آدمی کا کیا ردِعمل تھا؟" بینسن نے پوچھا۔

کارل نے سرد آہ بھری اور بولا۔

"وہی جو اس وقت تمہارا ہے۔"

"تب خدا حافظ۔" بینسن نے ہاتھ ہلایا اور آگے چل پڑا۔ کارل اس کے پیچھے لپکا۔

"میری بات تو سنو۔"

"میرے دوست! اب تم بھی گھر جا کر آرام کرو۔" بینسن رکے بغیر بولا۔ اس نے کارل کی طرف دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی۔

"بینسن! دیکھنے میں کیا حرج ہے؟" کارل گھگھیائے لہجے میں بولا۔

"کل دیکھیں گے۔" بینسن نے ہاتھ لہرایا اور آگے بڑھ گیا۔ کارل کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر واپس چل پڑا۔ بینسن نے اس کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا اور سیدھا ہی چلتا رہا لیکن جب اسے یقین ہو گیا کہ کارل اب اس کے پیچھے موجود نہیں ہے اور وہ کارل کی نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے تو اس نے راستہ بدلا اور تیزی سے ساؤتھ پارک کے علاقے کی طرف روانہ ہو گیا۔ مکان نمبر اس کے ذہن میں موجود تھا... بی الیف سیکسٹین۔

دس منٹ بعد وہ ساتویں سڑک کے اس مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ کسی زمانے میں یہ علاقہ شرفا کے لیے مخصوص تھا۔ یہاں سڑک کے دونوں جانب بڑے بڑے مکانات

آپ بھی بھرپور طاقت کے مالک بنیے طبی دنیا میں کامیاب اور لاجواب نسخہ

مرد حضرات ہی پڑھیں۔

[illegible]

حکیم اینڈ سنز

پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

www.pkdigest.com

اس نے سوچا کہ یہاں سے نکل بھاگنا چاہیے، اس سے پہلے کہ وہ کسی چکر میں پھنس جائے۔

لیکن لالچ نے اسے روکے رکھا۔ اسے خیال آیا کہ شاید یہاں کوئی سیف ہے جس میں ساری قیمتی چیزیں محفوظ ہیں۔ اگر وہاں واقعی کوئی سیف تھا تو ہینسن کو اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ اسے تجوری کھولنا نہیں آتی تھی۔ معمولی تالے وہ کھول لیا کرتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے سرگرمی سے اپنی تلاش جاری رکھی۔ ایک کمرے میں وہ دوبارہ آیا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کی اور برابر والے کمرے کی دیواروں میں تناسب نہیں ہے۔ باہر سے کمرے بڑے لگ رہے تھے اور اندر سے خاصے چھوٹے تھے۔ کیا دیواروں کے درمیان .... خلا تھا؟ اس نے دیوار کا معائنہ کیا۔ اس طرف صرف ایک ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ اس نے کوشش کی کہ ڈریسنگ ٹیبل سرک جائے لیکن یہ معمولی سی ڈریسنگ ٹیبل سرکنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ زمین میں فکس کر دی گئی ہو لیکن اس کے پائے زمین میں پیوست نہیں تھے۔ البتہ وہ دیوار سے بالکل جڑی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا اور اس بار دوسری طرف سے دھکا دیا تو وہ اپنی جگہ سے سرکتی چلی گئی۔ اس کا دل دھڑک اٹھا کیونکہ دوسری طرف واقعی خلا تھا۔ اس نے اندر ٹارچ سے روشنی ڈالی تو اسے ایک راہداری نظر آئی۔ وہ اندر داخل ہوا۔ یہ راہداری بہت آگے تک جا رہی تھی۔ جیسے ہی اس نے چند قدم آگے بڑھائے، عقب سے ڈریسنگ ٹیبل خلا کے سامنے آگئی اور راستہ بند ہو گیا۔

مارے خوف کے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ واپس لپکا اور اس نے ڈریسنگ ٹیبل کو ہٹانے کی کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ اس بار وہ دونوں طرف سے نہیں سرک رہی تھی۔ اس نے ناکام ہو کر اسے لات مار کر توڑنے کی کوشش کی تو اس کے پاؤں پر سخت چوٹ آئی۔ ڈریسنگ ٹیبل کا عقبی حصہ لوہے کا تھا۔ اسے توڑنا ناممکن تھا۔ اس کے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ یہ کیسی جگہ تھی اور وہ کہاں آکر پھنس گیا تھا؟ اس نے راہداری کے دوسرے سرے کی طرف دیکھا اور آہستگی سے اس طرف بڑھا۔ اس کا دل خوف سے دھڑک رہا تھا اور وہ یوں محتاط تھا جیسے کانچ کے فرش پر چل رہا ہو۔ راہداری کا دوسرا سرا ایک اور دیوار پر آکر بند ہو گیا تھا۔ کیا یہ کوئی قید خانہ تھا اور اسے یہاں قید کر دیا گیا تھا... لیکن کیوں؟ وہ ایک چور تھا اور اس نے اندر گھس کر جرم کیا تھا۔ اسے پولیس کے حوالے کیا جاتا تھا... اس طرح قید کرنے کا کیا جواز بنتا تھا؟ اس نے واپس آکر ڈریسنگ ٹیبل کو اپنی جگہ سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن سارا زور لگانے کے بعد بھی وہ ناکام رہا۔ ایک گھنٹے بعد اس نے ڈریسنگ ٹیبل کی پشت کو پیٹنا اور شور کرنا شروع کر دیا۔ وہ یہاں سے نکلنا چاہتا تھا، بے شک اس کے بعد اسے پولیس کے حوالے کیوں نہ کر دیا جاتا۔

اس ایک گھنٹے میں اس کا خوف سے برا حال ہو گیا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بے رحم انسان کے ہتھے چڑھ گیا ہو جو اسے یہاں قید میں ڈال کر بھوکا پیاسا مارنا چاہتا ہو۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ بھوک پیاس سے انسان کتنی اذیت سے مرتا ہے لیکن اس نے اس بارے میں سن رکھا تھا کہ دنیا میں اس سے زیادہ اذیت ناک موت اور کوئی نہیں ہوتی۔ انسان ایک ایک لمحہ مرتا اور جیتا ہے۔ جب تک موت نہیں آتی، یونہی جیتا مرتا رہتا ہے۔

دو گھنٹے بعد وہ تھک ہار کر نیچے بیٹھ گیا۔ اس کی حالت بری ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے میلوں لمبی دوڑ لگائی ہو یا کسی اونچی پہاڑی پر رکے بغیر چڑھتا رہا ہو۔ اسے پتا نہیں چلا کہ کب اس کے حواس آہستہ آہستہ جواب دے گئے اور پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔ دراصل وہ جس وقت بے دم ہو کر بیٹھا تھا، اس خلا میں کسی طرف سے ایک عجیب سی بو والی گیس داخل ہوئی تھی اور اس کے اثر سے وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ ایک صاف ستھرے کمرے میں ایک صاف ستھرے بستر پر لیٹا تھا اور اس کمرے میں سوائے اس بستر، ایک کموڈ اور اس کے ساتھ واش بیسن کے کچھ نہیں تھا۔ چھت پر ایک لائٹ جل رہی تھی۔ کمرے میں صرف ایک دروازہ تھا جس کے اوپری حصے میں جالی لگی تھی۔ اس سے باہر اور باہر سے اندر دیکھا جا سکتا تھا۔ یہ جالی اتنی چوڑی تھی کہ اس سے دیکھنے کی صورت میں کمرے کا کوئی حصہ باہر سے دیکھنے والے کی نظروں سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر بستر سے اٹھا اور اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ باہر سے بند تھا۔ جالی سے اسے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بے ساختہ دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

"اے! میں کہاں ہوں؟... تم کون ہو؟... کتیا کے بچو، سامنے آؤ... تمہاری تو..."

اس کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ نہ جانے کن لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا اور انہوں نے کس مقصد کے تحت اسے یہاں قید کر دیا تھا۔ پولیس اس طرح کسی کو قید نہیں کرتی اور ملک کی خفیہ ایجنسیوں کو اس سے کیا مطلب ہو سکتا تھا... ورنہ وہ شبہ کرتا کہ اسے کسی خفیہ ایجنسی نے اٹھا لیا ہے۔ اس نے دوبارہ دروازہ پیٹا اور اس وقت تک پیٹتا رہا جب تک کسی نے باہر سے

درشت لہجے میں نہیں کہا۔ "خاموش رہو۔"

ہینسن نے جلدی سے باہر جھانکا۔ سرمئی وردی پہنے ہوئے یہ ایک ہٹا کٹا شخص تھا۔ اس کی بیلٹ سے ایک ہولسٹر اور ایک ڈنڈا لٹک رہا تھا جیسا کہ جیل کے گارڈز کے پاس ہوتا ہے۔ مختصر بالوں اور انداز سے وہ کسی جیل کا گارڈ ہی لگ رہا تھا۔ اس کے ڈانٹنے پر ہینسن چپ ہو گیا پھر اس نے لجاجت سے کہا۔ "پلیز مسٹر! میں بے قصور ہوں... مجھے اس طرح کیوں قید کیا گیا ہے؟"

"واقعی تم بے گناہ ہو؟" اس نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔ "کسی کے گھر میں گھسنا کوئی جرم نہیں ہے؟"

"اگر میں نے ایسا کوئی جرم کیا بھی ہے تو مجھے پولیس کے حوالے کر دو۔" ہینسن چلایا۔ "تم لوگوں کو مجھے اس طرح قید کرنے کا اختیار کس نے دیا ہے؟"

"ہمارے پاس اختیار ہے۔" وہ مسکرایا۔ "جلد تمہیں سب پتا چل جائے گا لیکن اس دوران تمہیں خاموش رہنا ہوگا۔ اگر تم نے دوبارہ اس طرح شور کیا تو تمہیں سزا ملے گی۔"

"کب معلوم ہوگا؟" ہینسن نے پوچھا۔

"بہت جلد۔" اس نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

ہینسن نڈھال ہو کر بستر پر واپس بیٹھ گیا۔ اسے پیاس لگ رہی تھی۔ اس نے واش بیسن سے پانی پیا۔ یہاں کا سیٹ اپ ایسا ہی تھا جیسا کہ جیلوں کا ہوتا ہے، جہاں قیدی کو اس کی کوٹھری میں وہ تمام سہولتیں دی جاتی ہیں جن کے لیے اسے کوٹھری سے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ حد یہ کہ کھانا دینے کے لیے دروازے کے نیچے ایک چھوٹا سا کھلنے والا خانہ تھا۔ اس کا پتا اس وقت چلا جب یہ خانہ کھلا اور اس سے ایک ٹرے سرک کر اندر آئی۔ اس پر ایک پیالے میں دلیا نما کوئی چیز اور ساتھ میں کافی کا کاغذی مگ تھا۔ دلیا کافی مقدار میں تھا اور اسے اتنی بھوک نہیں تھی اس لیے اس نے برائے نام چکھا... البتہ کافی پی لی۔ ٹرے بہت آسانی سے مڑ جانے والے المونیم پر مشتمل تھی جبکہ پیالہ اور چمچ ہلکی سی پلاسٹک کے تھے۔ غالباً ان کا مقصد یہی تھا کہ اندر موجود شخص ان سے ہتھیار کا کام نہ لے سکے۔

کمرے میں کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا جس سے اسے دن یا رات ہونے کا اندازہ ہوتا۔ البتہ جب بلب کی روشنی پھیلتی تو اس کا مطلب ہوتا کہ رات ہو چکی ہے اور وہ چاہے تو سو سکتا ہے۔ وہ خود سے بلب بند یا کھول نہیں سکتا تھا۔ ان سب باتوں کا اندازہ اسے آنے والے چند دنوں میں ہو گیا۔ دو دن اس نے صبر سے کام لیا لیکن تیسرے دن اس کا دماغ خراب ہو گیا اور اس نے کھانے والی ٹرے کا سارا کھانا پھینک دیا اور ٹرے دروازے پر مارنے لگا۔ اس پر کوئی دس منٹ بعد دروازہ کھلا اور دو گنجے گارڈز اندر آئے۔ ان میں وہ گارڈ تھا جس نے پہلے دن اسے دھمکایا تھا۔ ایک نے اسے قابو کیا اور دوسرے نے اسے پنچنگ بیگ سمجھ کر مارنا شروع کر دیا۔ کوئی ایک درجن گھونسے کھانے کے بعد اس کی حالت کسی بہت زیادہ استعمال شدہ پنچنگ بیگ جیسی ہی ہو گئی۔ آخری گھونسے نے اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا۔ جب اسے ہوش آیا تو اس کا کمرا اور لباس صاف ستھرا تھا اور ساری چیزیں غائب تھیں۔ اس کے بستر کی چادر تک بدل دی گئی تھی۔ مارنے والے نے اتنی احتیاط سے مارا تھا کہ اس کی آنکھ اور ناک پر چوٹ نہیں آئی تھی۔ البتہ اس کے رخسار اور ماتھے پر کئی زخم آئے تھے اور ان پر پٹی کر دی گئی تھی۔

مار کھانے کے بعد اس کا دماغ ٹھکانے پر آگیا تھا۔ اس نے پھر شرافت کا مظاہرہ کیا اور کسی شور شرابے سے گریز کیا۔ اس نے تسلیم کر لیا کہ یہاں وہ قطعی بے بس ہے اور اس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے اس لیے اسے وہی کرنا تھا جو یہ لوگ کہتے۔ البتہ اس کا یہ تجسس برقرار تھا کہ اسے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ اگر وہ اس کی جان کے دشمن ہوتے تو اب تک اسے مار کر کہیں پھینک چکے ہوتے اور کوئی ان کے بارے میں نہیں جان پاتا... کیونکہ اسے خود نہیں پتا تھا کہ یہ کون ہیں اور اسے کیوں قید رکھا ہوا ہے۔ پولیس کو بھی اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ اس کی گمشدگی پر اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتی یا اس کی لاش ملتی تو وہ تفتیش کرتی کہ اس کا قاتل کون ہے۔ پولیس تو اپنا بوجھ ہلکا ہونے پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اس کا کیس داخل دفتر کر دیتی۔

دن گزرتے گئے۔ اس کے اندازے کے مطابق اسے یہاں آئے ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔ اس روز وہ ناشتے سے فارغ ہو کر کمرے میں چل پھر رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور باہر موجود دو گارڈز میں سے ایک نے اسے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ باہر آیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس جگہ کو باہر سے دیکھ رہا تھا۔ اسے باہر بلانے والے نے اس کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔

"تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" اس نے فکر مندی سے پوچھا تو جواب میں اسے آگے کی طرف دھکیلا گیا۔ اس راہداری میں دونوں طرف اسی طرح کے کوئی ایک درجن کمرے تھے اور جب اسے وہاں سے لے جایا جا رہا تھا

www.pkdigest.com

تو اس نے کئی کمروں کے دروازوں کی جھریوں سے لوگوں کو جھانکتے دیکھا۔ گویا اس کے علاوہ بھی وہاں کئی قیدی تھے۔ یہاں تو کسی جیل کی طرح قیدی رکھے گئے تھے۔

اسے ایک ایسے کمرے میں لایا گیا جو کسی اسپتال کا آپریشن روم لگ رہا تھا۔ اس کی ہتھکڑیاں کھول کر اسے ایک کرسی پر بٹھا کر اس کے ہاتھ پاؤں بیلٹوں سے باندھ دیے گئے۔ ہیفسن نے دیکھا کہ ایک کونے میں ایک بہت بوڑھی سی عورت سفید کوٹ میں موجود تھی لیکن وہ کچھ کر نہیں رہی تھی۔ اس کے علاوہ بھی ایک سفید کوٹ والا تھا۔ اس نے ایک سرنج کی مدد سے ہیفسن کا خون نکالا اور اسے ایک سلینڈر میں محفوظ کر دیا۔

"تم نے میرا خون کیوں نکالا ہے؟" ہیفسن کسمسا کر بولا۔

اس بار بھی اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ اس کا خون نکالنے کے بعد سفید کوٹ والے شخص نے ایک مشین کے الیکٹروڈ اس کے جسم سے منسلک کیے اور کچھ دیر اپنے کمپیوٹر سے الجھا رہا۔ کوئی نصف گھنٹے بعد اس نے الیکٹروڈ ہٹا دیے اور اسے کھول دیا گیا۔ اس کے بعد اسے دوبارہ ہتھکڑیاں پہنا کر اسے واپس اس کے کمرے میں چھوڑ دیا گیا۔

ہیفسن حیران تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ کیا انہوں نے اس پر کوئی تجربہ کرنا تھا؟ اس کا خون کیوں نکالا گیا تھا؟ اس کے جسم سے مشین کے الیکٹروڈ لگا کر کیا معائنہ کیا گیا تھا؟ ان سوالوں کے بارے میں سوچ سوچ کر اس کا دماغ خراب ہونے لگا۔ اس روز بھی اس نے کھانا نہیں کھایا لیکن کسی ایسے ردِعمل سے گریز کیا جس کی پاداش میں اسے پھر تشدد کا نشانہ بنایا جاتا... لیکن اگلے دن وہ معمول پر آ گیا۔ اس کے ایک ہفتے بعد اسے پھر اسی طرح نکال کر اسی کمرے میں لے جایا گیا اور پہلے کی طرح اس کا خون نکال کر مشین کی مدد سے اس کا جسمانی معائنہ ہوا لیکن اس بار ایک تبدیلی آئی تھی۔ سفید کوٹ والے نے اسے جو انجکشن لگایا تھا، اس وقت تو اسے کچھ محسوس نہیں ہوا لیکن جب اسے واپس اس کے کمرے میں پہنچایا گیا تو اس کے کچھ دیر بعد اس کی طبیعت خراب ہونے لگی۔ اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دل ڈوب رہا ہو۔ اسے خیال آیا کہ کہیں انہوں نے اسے زہر تو نہیں دے دیا اور وہ مرنے والا ہو؟

یہ خیال آتے ہی وہ بوکھلا گیا اور اس نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی وہ چلا رہا تھا۔ "اے! مجھے یہاں سے نکالو... مجھے کچھ ہو رہا ہے، میں مرنے والا ہوں۔"

"خاموش رہو۔" گارڈ نے آ کر اسے پھٹکارا۔ "بیکار میں شور مت کرو۔"

"مجھے کچھ ہو رہا ہے۔" ہیفسن نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "مجھے کوئی انجکشن لگایا گیا تھا۔ میں مرنے والا ہوں۔"

"فکر مت کرو، وہ خطرناک انجکشن نہیں ہے۔ اسے لگنے سے ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ تم لیٹ جاؤ، کچھ دیر میں بہتر محسوس کرنے لگو گے۔" خلافِ توقع گارڈ نے نرمی سے کہا۔ "اب شور مت کرنا، اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ بلاوجہ تمہیں سزا ملے گی۔"

گارڈ چلا گیا۔ ہیفسن کے پاس صبر کرنے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ جا کر بستر پر لیٹ گیا اور کچھ دیر بعد واقعی اس کی طبیعت بہتر ہونے لگی۔ چند گھنٹے بعد وہ پہلے کی طرح چاق و چوبند ہو گیا تھا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ اسے ہر ہفتے اس کے کمرے سے نکال کر آپریشن روم میں لے جایا جاتا۔ وہاں اس کا خون لیا جاتا اور اسے وہی انجکشن دیا جاتا جس سے کچھ دیر کے لیے اس کی طبیعت خراب ہو جاتی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا جا رہا ہے؟ مگر وہ اس معاملے میں ایک طرح سے صبر کر چکا تھا کہ جو ہوگا، سامنے آ ہی جائے گا... لیکن کب سامنے آئے گا، یہ وہ بھی نہیں جانتا تھا۔

وہ دن، ہفتوں اور مہینوں کا حساب بھول گیا تھا۔ ہفتے میں ایک بار اسے نہانے کا موقع ملتا تھا اور مہینے میں ایک بار اس کا شیو اور سر کے بال بنائے جاتے۔ اب تک پانچ بار اس کے بالوں کی کٹنگ کی جا چکی تھی۔ گویا اسے یہاں آئے پانچ مہینے ہو چکے تھے۔ اس نے خود کو مصروف رکھنے کے لیے ورزش شروع کر دی۔ اور شروع میں بڑے جوش و خروش سے اس پر عمل کیا۔ پھر درمیان میں وہ کبھی سست ہو کر بیٹھ جاتا اور کبھی زور و شور سے ورزش کرنے لگتا۔ اس کی خوراک بھی ٹھیک تھی۔ اس کے باوجود اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کمزور ہو رہا ہے۔ جب وہ واش بیسن کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا تو اسے اپنا چہرہ پہلے کے مقابلے میں کمزور نظر آتا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ مسلسل قید کا نتیجہ ہے جو اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی۔ وہ نہ جانے کن لوگوں کے قبضے میں تھا اور وہ اس کے بارے میں نامعلوم عزائم رکھتے تھے۔ یہ سب کسی خوفناک خواب سے کم نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ اس قسم کی صورتِ حال میں کوئی شخص کب تک اپنا حوصلہ اور صحت برقرار رکھ سکتا تھا۔

کئی دن سے اس کی طبیعت خراب تھی۔ اسے عجیب سی کیفیت محسوس ہو رہی تھی اور کچھ کھانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ زیادہ تر بستر پر پڑا رہتا۔ اس روز وہ صبح اٹھا تو اس کا سر چکرا رہا تھا اور اس نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ چکرا کر گر پڑا۔ پھر جب ناشتا لانے والے نے ٹرے اندر کی تو اس نے ہیفسن کو فرش پر پڑے پایا۔ اس کے کچھ دیر بعد اس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اسے لانے لے جانے والے دو گارڈز اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے اس حالت میں بھی اسے ہتھکڑیاں پہنائیں اور بازوؤں سے پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ ہیفسن ان کی گرفت میں جھول رہا تھا۔ انہوں نے اسے لے جا کر آپریشن روم میں کرسی پر بٹھا دیا اور اس کے ہاتھ پیر باندھ دیے۔ اس کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس میں ویسے ہی ہاتھ پاؤں ہلانے کی سکت نہیں رہی تھی۔ وہ چکراتے ذہن کے ساتھ سوچ رہا تھا۔

'میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟'

اسے جب بھی یہاں لایا جاتا تو اس نے اکثر اس بوڑھی عورت کو یہاں دیکھا۔ کبھی کبھی وہ نظر نہیں آتی تھی لیکن جب وہ یہاں موجود ہوتی تو صرف اسے دیکھتی تھی۔ اس نے کبھی کسی کام میں مداخلت نہیں کی تھی اور نہ ہی ہیفسن سے بات کی تھی مگر جب اس روز اسے آپریشن روم میں لایا گیا تو خلافِ توقع اس ڈاکٹر کے بجائے وہ بوڑھی عورت اس کے پاس آئی۔ اس نے ہیفسن کی آنکھ کھول کر اس کا معائنہ کیا اور بولی۔

"تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

"بہت کمزوری ہے۔" ہیفسن نے نقاہت سے کہا۔ "مجھے کیا ہوا ہے؟"

"ایڈز!" عورت نے اطمینان سے کہا۔

اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ "ایڈز؟" اس نے ناقابلِ یقین لہجے میں دہرایا۔ "مجھے... وہ کیسے؟"

"ہم نے تمہیں ایڈز کا وائرس لگایا تھا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ جب تمہیں پہلی بار یہاں ہوش آیا ہوگا تو تمہیں بازو میں انجکشن کی تکلیف محسوس ہوئی ہوگی۔ وہ ایڈز زدہ خون کا انجکشن تھا اور اب تم ایڈز کے مرض میں مبتلا ہو چکے ہو۔" بوڑھی عورت نے اسی اطمینان سے جواب دیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس سے موسم پر تبادلۂ خیال کر رہی ہو۔ ہیفسن کو اس کی بات صحیح سے سمجھنے میں کچھ وقت لگا اور پھر اس کے جسم کا رُواں رُواں کانپنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ ایڈز لاعلاج مرض ہے اور اس کا شکار لازمی موت کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔ علاج سے اس کی مدت میں تو اضافہ ہو جاتا ہے لیکن موت سے مفر ممکن نہیں ہوتا۔ ہیفسن نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

"مگر کیوں؟"

"ہم یہاں ایڈز کے مرض پر تحقیق کر رہے ہیں اور اس کا علاج دریافت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" عورت نے وضاحت کی۔ "اس لیے تمہیں ایڈز کا شکار کیا گیا ہے۔"

ہیفسن کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کا تعلق جرائم کی دنیا سے تھا اور وہ جانتا تھا کہ امریکا میں دنیا کا ہر جرم ہوتا ہے لیکن اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یہاں ایک ادارہ ایسا بھی ہوگا جو کسی کو ایڈز میں مبتلا کر کے پھر اس کی مدد سے ایڈز کا علاج دریافت کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ مگر اب وہ خود اس ادارے میں تھا اور اسے ایڈز کا شکار بنایا جا چکا تھا، اس میں نہ ماننے والی کوئی بات نہیں تھی۔

"کیا اس ملک میں ایڈز کے لاکھوں مریض نہیں ہیں؟" اس نے کہا۔ "تم لوگ ان پر تحقیق کیوں نہیں کرتے؟"

"اس کی ایک وجہ ہے... انسانوں پر تحقیق کی اتنی آسانی سے اجازت نہیں ملتی، اس وجہ سے ہمیں یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا۔" عورت بولی۔

"کیوں... کیا ہم انسان نہیں ہیں؟" ہیفسن نے تلخی سے کہا۔

"نہیں۔" عورت رسان سے بولی۔ "تم لوگ معاشرے کا بیکار حصہ ہو اور کسی پیداواری سرگرمی میں شامل نہیں ہو... بلکہ تم لوگوں کی وجہ سے اس معاشرے کو بہت سارے نقصان ہوتے ہیں اس لیے اگر تم لوگوں کو استعمال کیا جا رہا ہے تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ تم خود سوچو، تمہاری زندگی کا مقصد کیا ہے۔"

"میری زندگی کا کوئی بھی مقصد ہو لیکن تمہیں کس نے یہ حق دیا ہے کہ مجھے یا میرے جیسے دوسرے لوگوں کی زندگی سے کھیلو؟"

"یہ حق تم لوگوں نے خود ہمیں دیا ہے۔" بوڑھی عورت نے اطمینان سے کہا۔ "تم خود بتاؤ کہ کسی کے گھر میں گھس کر چوری کرنے کا حق تمہیں کس نے دیا ہے؟"

ہیفسن چونکا۔ اس نے پہلی بار اس بات پر غور کیا۔ "تو کیا وہ گھر تمہارا ہے؟"

"ہاں، وہ میرا گھر ہے اور تم وہاں چوری کے ارادے سے داخل ہوئے تھے۔"

"میں نے وہاں سے کچھ چرایا نہیں تھا۔" ہیفسن نے دفاعی انداز میں کہا۔ "میں تو وہاں پھنس گیا تھا۔"

"لیکن تم چوری کے ارادے سے اندر آئے تھے اور

فرض کرو، میں وہاں اکیلی ہوتی تو تم مجھے لوٹ کر جا چکے ہوتے... اور اگر میں مزاحمت کرتی تو تم مجھے ہلاک کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔''

''وہ... میں...'' جیفسن ہکلا کر رہ گیا۔

''تم نے اس گھر میں گھس کر ہمیں یہ حق دیا کہ ہم تمہارے ساتھ جو چاہے کریں۔'' بوڑھی عورت کا لہجہ قاتلانہ ہو گیا۔ ''ہم تمہیں تمہارے ہی سکوں میں ادائیگی کر رہے ہیں اس لیے تم اس پر اعتراض نہیں کر سکتے۔''

جیفسن کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ''تم لوگوں نے اس مکان کو ٹریپ بنایا ہوا ہے؟''

عورت نے سر ہلایا۔ ''ہاں، وہاں جو آتا ہے وہ ہمارے ہاتھ آ جاتا ہے... جیسے تم آ گئے۔''

''میرے علاوہ اور بھی ہیں؟''

''ہاں، اس جگہ کم سے کم ایک درجن افراد ہمہ وقت موجود رہتے ہیں۔'' عورت نے اسے بتایا۔ ''ہمیں تجربات کے لیے بہت سارے لوگوں کی ضرورت ہے کیونکہ ایڈز کے لیے بنائی جانے والی تجرباتی دواؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہم ہر آدمی پر مختلف دوا یا طریقۂ علاج کا تجربہ کرتے ہیں تاکہ اس کے حتمی نتائج درست طور پر معلوم ہو سکیں۔''

اس دوران میں کچھ اور افراد وہاں آ گئے اور اس کے ٹیسٹوں کی تیاری کی جانے لگی۔ اسے کچھ انجکشن لگے اور اس کا خون نکالا گیا۔ وہ بے بسی سے یہ سب ہوتے دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے اسے کچھ طاقت کی دوائیں بھی دیں۔ ان سے وہ فوری طور پر اپنے اندر توانائی محسوس کرنے لگا۔ مگر یہ احساس کم جان لیوا نہیں تھا کہ وہ ایڈز کا شکار ہو چکا ہے۔ اب اسے یہاں سے رہائی مل بھی جاتی، تب بھی اس کی باقی ماندہ زندگی کسی اسپتال میں ہی گزرتی۔ اس نے ایک بار اخبار میں اس مرض کے بارے میں مضمون پڑھا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ایڈز کا وائرس انسانی جسم میں کوئی دو تین سال اور بعض اوقات دس پندرہ سال بھی غیر متحرک پڑا رہتا ہے اور اس کے بعد یہ متحرک ہو کر مرض کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ وائرس جسمانی دفاعی نظام کو تباہ کر دیتا ہے اور انسان معمولی امراض میں بھی مر سکتا ہے۔ اس کے متحرک ہونے کے بعد مریض کے پاس دو سے تین سال کی مہلت رہ جاتی ہے اور وہ اس سے زیادہ زندہ نہیں رہ پاتا۔ گویا اس کے پاس اتنی ہی مہلت رہ گئی تھی۔

لیکن ایک بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ اتنی جلدی اس وائرس کا شکار کیسے ہو گیا؟... اور دوسرے اس کی حالت بھی بہت تیزی سے دگرگوں ہوئی تھی۔ تو کیا ان لوگوں نے وائرس کو متحرک کرنے کے لیے کچھ کیا تھا؟ اسے وہ انجکشن یاد آنے لگے جو اسے ابتدائی دنوں میں لگائے جاتے تھے۔ ممکن ہے ان انجکشنوں کی مدد سے اس کے جسمانی نظام کو مزید کمزور کیا جاتا ہو گا تاکہ وہ آسانی سے ایڈز کے مرض میں مبتلا ہو جائے... اور اب جبکہ وہ ایڈز کا شکار ہو چکا تھا تو یہ اس پر مختلف ادویات یا طریقۂ علاج آزماتے۔ اسے یقین ہونے لگا کہ اس کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے۔

آنے والے چھ مہینوں تک وہ مختلف قسم کی دوائیاں کھاتا رہا۔ اسے انواع و اقسام کے انجکشن لگتے رہے اور اسے مشین تھراپی سے بھی گزارا جاتا رہا لیکن اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بوڑھی عورت بھی کبھی اس کے علاج کے دوران وہاں آتی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ کسی قسم کے کام میں حصہ نہیں لیتی لیکن اس کی خاص حیثیت تھی اور سب اس کا بے حد احترام کرتے تھے۔ جیفسن کو اس کے بارے میں تجسس تھا مگر اس پہلی گفتگو کے بعد اس نے دوبارہ جیفسن سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بوڑھی عورت کے چہرے کا تاثر نرم تھا اور وہ کہیں سے بھی اتنے خوف ناک ادارے سے متعلق نظر نہیں آتی تھی جہاں لوگوں کو ایڈز کا مریض بنایا جاتا اور پھر ان کا علاج کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

وہاں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ چار پانچ افراد پر مشتمل عملہ تھا جو علاج اور اس سے پہلے مرض پیدا کرنے کا کام کرتا تھا۔ اتنے ہی گارڈز اور دوسرا عملہ تھا۔ واحد غیر متعلق شخصیت اسی بوڑھی خاتون کی تھی جس کا نام بھی جیفسن کو نہیں معلوم تھا۔ وہ ایک لگے بندھے طریقے کے مطابق کام کرتے تھے اور انہوں نے اب تک کوئی ایسا موقع نہیں دیا تھا کہ جیفسن یہاں سے فرار کا سوچ بھی سکتا۔ اس کی ساری دنیا ایک کمرے اور کبھی کبھی دو راہداریوں سے گزر کر ایک آپریشن روم تک محدود ہو گئی تھی۔

جیفسن کو دوسری باتوں کی طرح یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس پر جو دوائیں اور طریقۂ علاج آزمائے جاتے تھے وہ اصل میں کہاں ایجاد ہوتے تھے۔ ان پر تحقیق کون کرتا تھا اور خرچ کون کرتا تھا۔ اتنا تو اسے بھی معلوم تھا کہ نئی ادویات پر تحقیق ایک مہنگا اور مشکل کام ہے اور یہ صرف حکومت یا بڑے اداروں کے بس کی بات تھی۔

ان تجرباتی دواؤں سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی حالت ہر گزرتے دن کے ساتھ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ بعض اوقات تو وہ کمزوری کی وجہ سے اٹھ بھی نہیں پاتا تھا۔ اس کا پیٹ مستقل خراب رہنے لگا تھا اور اکثر اجابت اس کے کپڑوں کو گندہ کر دیتی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر انہوں نے اس کے لیے اضافی کپڑوں کا انتظام کر دیا تھا۔ لیکن ایسا بھی ہوتا تھا کہ اس میں اٹھ کر خود کو صاف کرنے یا کپڑے بدلنے کی ہمت بھی باقی نہیں رہتی تھی۔ وہ گندگی کے ساتھ گھنٹوں پڑا رہتا تھا۔ اس کے گندے ہو جانے والے کپڑے تو وہ لوگ دھونے کے لیے لے جاتے تھے لیکن اس کی صفائی کرنے کوئی نہیں آتا تھا اور اسے یہ کام خود ہی کرنا پڑتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ان کے پاس اس کام کے لیے کوئی فرد نہیں تھا۔

اب اسے علاج کے لیے وہیل چیئر پر لے جایا جاتا تھا کیونکہ اس میں چلنے کی ہمت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ اسے اب دلچسپی نہیں تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ کون سا طریقۂ علاج آزمایا جا رہا ہے اور دوا اس پر اثر کر رہی ہے یا نہیں؟ کیونکہ وہ خود محسوس کر رہا تھا کہ اس پر آزمائی جانے والی تجرباتی ادویات بے سود ہیں اور اس کا مرض تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ وہ موت کی طرف جا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ ان لوگوں کی طرف دیکھتا جو اس کا علاج کرنے کی کوشش کر رہے تھے تو اسے ان کے چہروں پر مایوسی نظر آتی تھی۔

ایک بار اسے آپریشن روم سے واپس لایا جا رہا تھا کہ اس نے راہداری میں ایک کمرے کا دروازہ کھلتے اور وہاں سے ایک اسٹریچر باہر آتے دیکھا جس پر ایک لاش تھی۔ اسے سر تک سفید چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا اور دو افراد یہ اسٹریچر کھینچ کر لے جا رہے تھے۔ اس کا جسم لرز اٹھا۔ کچھ عرصے بعد اس کا بھی یہی انجام متوقع تھا۔ اس روز وہ ساری رات روتا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ایک لاوارث شخص ہے۔ اگر وہ غائب ہے اور مر بھی گیا تو کسی کو اس کی پروا نہیں ہو گی۔ اس کے جو چند نام نہاد رشتے دار تھے، انہیں بھی اس کی پروا نہیں ہو گی بلکہ اس کے غائب ہونے پر انہوں نے سکون کا سانس لیا ہو گا کیونکہ وہ ان کے لیے صرف بدنامی کا باعث تھا۔ وہ مر جائے گا تو اس کی لاش کہیں لاوارث پھینک دی جائے گی اور اسے لاوارث کی حیثیت سے ہی دفنا دیا جائے گا۔ اس رات اسے رہ رہ کر یہی خیال آتا رہا کہ اس کا آخری وقت آ گیا ہے۔

آنے والے دو تین دن اس کی زندگی کے سب سے اذیت ناک دن تھے۔ وہ نہ کھا پا رہا تھا نہ آرام کر سکتا تھا۔ تکلیف اتنی شدید تھی کہ روکنے کے باوجود اس کی چیخیں نکل جاتی تھیں۔ وہ ماہیٔ بے آب کی طرح اپنے بستر پر تڑپتا تھا۔ اس کے لیے آنے والی کھانے کی ٹرے ایسے ہی واپس چلی جاتی تھی۔ اسے نہ تو بھوک لگ رہی تھی اور اگر بھوک لگ بھی رہی ہوتی تو اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اٹھ کر کھانے کی ٹرے تک جا سکے۔

چوتھے دن جب اس میں چیخنے کی سکت بھی باقی نہیں رہی تو اس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور دو افراد ایک اسٹریچر سمیت اندر آئے۔ وہ سہم گیا... اس نے انہیں بتانے کی کوشش کی کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ وہ مرا نہیں ہے جو وہ اسے لے جانے آ گئے ہیں لیکن وہ بول نہیں سکا۔ اس میں ہمت ہی نہیں تھی۔ انہوں نے اسے اسٹریچر پر ڈالا اور باہر لے آئے۔ انہوں نے اسے ایک کمرے میں پہنچایا جس میں صرف ایک سل تھی۔ شاید یہ مردہ خانہ تھا۔ انہوں نے اسے اٹھا کر سل پر ڈالا اور اس کے کپڑے اتارنے لگے۔ اسے بے لباس کرکے وہ اس کے گندے کپڑوں اور اسٹریچر سمیت رخصت ہو گئے۔ ان کے جاتے ہی اچانک اوپر سے اس پر پانی برسنے لگا۔ پانی میں ملی جراثیم کش دوا کی ہلکی سی بو آ رہی تھی۔ پانی اس کے جسم کی گند اور میل صاف کرنے لگا۔ اسے خود بھی اپنے وجود سے گھن آ رہی تھی اس لیے وہ مل مل کر نہانے لگا۔ آدھے گھنٹے تک شاور کھلا رہا اور اس نے خود کو پوری طرح صاف کر لیا۔

شاور رک گیا اور پھر اسی شاور سے گرم ہوا آنے لگی اور وہ چند منٹ میں بالکل خشک ہو گیا۔ کئی دن بعد اس نے اپنی طبیعت میں تازگی محسوس کی تھی۔ جب وہ خشک ہو گیا تو وہی دو افراد اندر آئے۔ ان میں سے ایک نے اسے بڑے سائز کا ڈائپر باندھا اور دوسرے نے اسے ایک گاؤن نما لباس پہنایا جو بہ مشکل اس کے گھٹنوں تک آ رہا تھا۔ اس بار انہوں نے اسے ایک وہیل چیئر پر بٹھایا اور ایک کمرے میں لے آئے جہاں پہلے ہی تین بستروں پر اسی کی طرح خستہ حال لوگ پڑے تھے... انہوں نے بھی ایسا ہی گاؤن نما لباس پہن رکھا تھا۔ ان میں سے ایک لمبا سا آدمی بولا۔

''چلو... آ گیا ایک اور کل کا مردہ۔''

لانے والوں نے اسے ایک بستر پر منتقل کر دیا اور وہاں سے چلے گئے۔ جیفسن نے تین دن سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا لیکن اسے بھوک نہیں تھی۔ ہاں، کمزوری بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ بستر کے سرہانے ایک جوس کا ڈبا رکھا تھا۔ اس نے اس میں سے چند گھونٹ پیے۔ لمبے آدمی نے پھر کہا۔ ''اب تو تم موت کا جام ہی پیتا۔''

''کیا... مطلب؟'' جیفسن لرزتی آواز میں بولا۔

www.pkdigest.com

لمبا ہنسا۔ ”تم بھولے ہو... کیا تمہیں نہیں معلوم کہ تمہیں یہاں مرنے کے لیے لایا گیا ہے۔ اب تم کچھ کھا نہیں سکتے اور تمہارا مرض لاعلاج ہو چکا ہے... یعنی ان کی تجرباتی دوائیں تم پر بے اثر ہو چکی ہیں۔ یہاں تم بستر پر لیٹ کر سکون سے اپنی موت کا انتظار کر سکتے ہو۔ اب تمہیں کسی علاج سے نہیں گزرنا پڑے گا۔“

ہیفسن کے جسم میں خوف کی لہر سی دوڑ گئی۔ اس نے چلّا کر کہا۔ ”لیکن کیوں... کیوں علاج نہیں کریں گے؟“

”بتایا تو ہے تم پر تمام علاج بیکار ثابت ہوئے ہیں۔“ لمبے آدمی نے کہا۔ ”اب تم چند دن یا چند ہفتے کے مہمان ہو۔“

ہیفسن کچھ دیر کے لیے گم صم ہو گیا پھر وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ دوسرے اسے یوں لاتعلقی سے دیکھ رہے تھے جیسے اس کی تکلیف سے ان کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ اصل میں وہ سب بے حس قسم کے جرائم پیشہ لوگ تھے جن کے لیے صرف اپنی تکلیف کی اہمیت تھی۔ ہیفسن نے خود پر قابو پایا اور بستر پر لیٹ گیا۔ ذرا دیر بات کرنے سے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ اس روز جب ایک آدمی ان کو کھانا دینے آیا تو ہیفسن نے اس سے کہا۔

”سنو... میں اس بوڑھی عورت سے ملنا چاہتا ہوں جو یہاں آتی ہے۔ میں اس کا نام نہیں جانتا۔“

”وہ کسی سے نہیں ملتی۔“ کھانا لانے والے نے نفی میں سر ہلایا۔

”خدا کے لیے... تم اسے ایک مرتے آدمی کی آخری خواہش بھی سمجھ سکتے ہو۔“ ہیفسن نے گھگیا کر کہا تو وہ آدمی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے، میں کوشش کروں گا۔“

وہ ان کے لیے سادہ جو کا دلیا لایا تھا کیونکہ ان کے معدے کسی قسم کی ثقیل غذا کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس میں بھی بہت سارا پانی تھا لیکن ان میں سے کسی نے بھی پورا نہیں کھایا۔ لمبے آدمی کے علاوہ باقی دو ہیفسن کی طرح نڈھال پڑے رہتے تھے اور اس نے اب تک ان کی آواز تک نہیں سنی تھی۔ کھانے کے بعد لمبے آدمی نے کہا۔

”تم اس بوڑھی چڑیل سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟ ہماری اس حالت کی ذمے دار وہی ہے۔“

”تم اسے جانتے ہو؟“

لمبے آدمی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں... اس کا نام مسز جوش ولیم ہے اور اس کا شوہر جوش ولیم ایک مشہور سائنس داں تھا۔ وہ بھی ایڈز کا علاج دریافت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔“

”تم بھی اس کے گھر میں پکڑے گئے تھے؟“

”ہاں، اس نے جان بوجھ کر ٹریپ بنا رکھا ہے۔“ لمبے آدمی کے لہجے میں نفرت آ گئی۔ ”ہم جیسے چور لالچ میں وہاں جاتے ہیں اور پکڑے جاتے ہیں۔“

”تم بھی چور ہو؟“ ہیفسن نے حیرت سے کہا۔

لمبے آدمی نے برا سا منہ بنایا۔ ”تو کیا میں پادری ہوں اور وہاں وعظ دینے گیا تھا۔“

”تو اس طرح یہ لوگ ایڈز کے مرض کی تحقیق کے لیے انسان حاصل کرتے ہیں۔“ ہیفسن تلخ لہجے میں بولا۔ ”ہم پر تجربات کرتے ہوئے ان کا ضمیر بھی ملامت نہیں کرتا۔ ان کے لیے ہم گنی پگ سے زیادہ نہیں ہیں۔“

”ہاں، ایسا ہی ہے اور دوسرے یہ کہ اگر ہم غائب ہو جائیں تو کوئی پولیس میں رپورٹ نہیں کرتا اور اگر رپورٹ کی بھی جائے تو پولیس ہمیں تلاش کرنے کی زحمت نہیں کرتی ہے۔“

”اسی وجہ سے یہ اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس ملک اور اس شہر میں چوروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔“

”تم اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟“

”مجھے خود نہیں معلوم۔“ اس نے کہا۔ ”شاید میں اسے آخری بار دیکھنا چاہتا ہوں۔“

اگلے دن شام کے وقت وہی دونوں افراد آئے جو اسے یہاں لے کر آئے تھے۔ انہوں نے اسے وہیل چیئر پر بٹھایا اور اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دی۔ وہ سمجھ گیا کہ اسے آپریشن روم یا مسز جوش ولیم کے پاس لے جایا جا رہا ہے۔ آپریشن یا علاج والے کمرے میں لے جانا بند کیا جا چکا تھا اس لیے مسز جوش سے ہی ملانے کے لیے لے جایا جا رہا تھا۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ اس روز وہ ہوش و حواس میں تھا۔ ویسے بھی جب سے اس کا علاج بند ہوا تھا، اس کی حالت کسی قدر بہتر ہو گئی تھی۔ اب اسے کم سے کم دواؤں کے سائڈ افیکٹ تو نہیں بھگتنا پڑتے تھے۔ مسز جوش ولیم آپریشن روم کے ساتھ ایک چھوٹے سے دفتر نما کمرے میں اس کی منتظر تھی۔ وہ میز کے دوسری طرف بیٹھی تھی اور اسے ساتھ لانے والوں نے اس کی وہیل چیئر میز کے اس طرف لگا دی۔ ان میں سے ایک باہر چلا گیا اور دوسرا اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ وہ لوگ بہت محتاط تھے اور ان کو ہونا بھی چاہیے تھا... کیونکہ ان کا واسطہ جرائم پیشہ افراد سے پڑتا تھا۔ مسز جوش ولیم

نے اسے سرد نظروں سے دیکھا۔

”تم مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟“

”ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیوں؟“

”پتا نہیں...“ اس نے گڑبڑا کر کہا پھر بولا۔ ”شاید یہ جاننے کے لیے کہ تم یہ سب کیوں کر رہی ہو؟“

”کیا تم واقعی جاننا چاہتے ہو کہ میں یہ کیوں کر رہی ہوں؟“ مسز جوش ولیم نے اسے غور سے دیکھا۔

”ہاں... اگر تم بتا دو تو؟“

مسز جوش ولیم پہلی بار مسکرائی۔ ”میں تمہیں ضرور بتاؤں گی کیونکہ کچھ دن بعد تم اس دنیا سے گزر جاؤ گے اور یہ بات کسی کو نہیں بتا سکو گے۔ تم جانتے ہو کہ میرا شوہر ایک نامور سائنس داں تھا... ولیم جوش۔“

”کل تک تو نہیں جانتا تھا مگر مجھے میرے ساتھ کمرے میں موجود ایک آدمی نے بتایا تھا۔“

”جوش بہت اچھا آدمی تھا۔ وہ انسانیت کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے .... اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اس نے ڈاکٹریٹ کی تھی۔ پھر اس نے مختلف مہلک امراض کا علاج تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اسے کامیابی بھی ملی۔ اس کی شہرت پھیلنا شروع ہو گئی۔ اسے اعزازات اور انعامات سے بھی نوازا گیا۔ پھر اس نے مختلف وائرس پر تحقیق کا اپنا ذاتی ادارہ بنایا۔ اسے بہت سارے لوگوں اور اداروں نے امداد دی اور وہ اس قابل ہو گیا کہ اپنا کام آگے بڑھا سکے۔ پھر اس نے ایڈز پر تحقیق کا فیصلہ کیا۔ یہ آج سے کوئی بیس سال پہلے کی بات ہے۔ جب اس مرض کے بارے میں لوگوں کو زیادہ نہیں پتا تھا۔ اس نے بہت تیزی سے کام کیا اور اس مرض کا علاج دریافت کرنے کے قریب پہنچ گیا۔“

”تمہارے شوہر نے ایڈز کا علاج دریافت کر لیا تھا؟“ ہیفسن نے حیرت سے کہا۔

”تقریباً... اس نے مجھے یہی بتایا تھا۔ اصل میں مجھے اس بارے میں اتنا علم نہیں ہے۔ اس لیے مجھے نہیں معلوم کہ اس نے یہ علاج کیسے دریافت کیا تھا۔“

”تو اس نے اسے ایڈز کے مریضوں کے لیے استعمال کیوں نہیں کیا؟“ ہیفسن نے بے چینی سے پوچھا۔

پہلی بار مسز جوش غصے میں نظر آئی۔ ”کیونکہ اسے اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ اپنے تمام کام سے متعلق کاغذات ایک بریف کیس میں ڈال کر محکمۂ صحت کے اعلیٰ افسران سے ملنے جا رہا تھا کہ راستے میں تمہارے جیسے ایک اچکے نے اس کا بریف کیس یہ سمجھ کر چھیننے کی کوشش کی کہ اس میں رقم یا کوئی قیمتی چیز ہے۔ جوش کے لیے یہ کاغذات دنیا کی ہر چیز سے زیادہ قیمتی تھے۔ اس نے مزاحمت کی کوشش کی تو اس درندے نے میرے شوہر کو چاقو مار دیا اور اس کا بریف کیس چھین کر فرار ہو گیا۔ میرے شوہر نے اسپتال میں دم توڑ دیا اور اس کا وہ بریف کیس پھر کبھی نہیں ملا۔“ مسز جوش مارے غصے کے ہانپنے لگی۔ ”اس درندے نے صرف میرا شوہر ہی نہیں انسانیت کے لیے دریافت کیا جانے والا علاج بھی ختم کر دیا۔“

ہیفسن کا دل یہ سن کر ڈوبنے لگا۔ اس کے کسی ہم پیشہ نے یہ کام کیا اور وہ نہ جانے کہاں تھا لیکن اس کا کیا دھرا وہ بھگت رہے تھے۔ ”تو تم اپنے شوہر کا انتقام لینے کے لیے یہ سب کر رہی ہو؟“

”تم چاہو تو ایسا بھی سمجھ سکتے ہو لیکن میرا اصل مقصد مرنے سے پہلے اپنے شوہر کے اس ادھورے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے۔ اس مقصد کے لیے میں نے یہ طریقہ نکالا کیونکہ کوئی بھی نئی تجرباتی دوا انسانوں سے پہلے جانوروں پر آزمائی پڑتی ہے، تب کہیں جا کر انسانوں کے لیے اس کی اجازت ملتی ہے۔“

”اس لیے تم نے ہم مجرموں کو ہی گنی پگ بنا لیا؟“

”ہاں... میں نے اسی لیے یہ فیصلہ کیا تھا۔ تم لوگ اسی لائق ہو جو اپنے معمولی سے فائدے کے لیے دوسروں کا بڑے سے بڑا نقصان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اب تم لوگوں کی مدد سے انسانوں کو بچانے والی دوا تیار ہو گی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ جو مجرموں کو تمہارے گھر میں قیمتی چیزیں ہونے کے بارے میں بتاتے ہیں، وہ تمہارے ہی ایجنٹ ہیں؟“

”بالکل... اس گھر کو ہم نے چوہے دان بنا رکھا ہے اور اس میں وہی پھنستا ہے جس کے دل میں لالچ آ جاتا ہے۔“ وہ بولی۔ ”تم جان چکے ہو کہ ہم یہ سب کیوں کر رہے ہیں... اس لیے اب تم جا سکتے ہو۔“

واپس جاتے ہوئے ہیفسن سوچ رہا تھا کہ وہ واقعی کسی چوہے کی طرح اس چوہے دان میں آ پھنسا تھا۔ اسے کارل کا خیال آیا، وہ خوش قسمت تھا کہ ہیفسن نے اس کو اس معاملے سے الگ رکھا تھا۔ ہیفسن لالچی چوہا تھا اور لالچی چوہا ہی چوہے دان میں پھنستا ہے۔

www.pkdigest.com

اس قلم کار کی تحریر جس کے ہر لفظ میں جذبات کا رنگ اور محسوسات کے سُر تال بجتے ہیں

طاہر جاوید مغل

للکار

دوسری قسط

زمانۂ قدیم سے عاشق اک غبار خاک ہے جو یہاں وہاں اڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے ...... مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی ...... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے۔ کچھ بھی کہیں ...... عشق کا منظر نامہ بدل گیا ہے ...... کردار میں بھی تبدیلی آئی ہے ...... سر پھرے عاشق نے ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے علاوہ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے ...... ایسے عاشقوں کے گرد گھومتی داستان، محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے ...... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے ...... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمع نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر ...... عقل و شعور اور جذب عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے ...... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیش نظر ہے ...... ایک للکار ہے

www.pkdigest.com

اس عاشق خاص کا احوال جو للکار سننے اور للکارنے کا دھنی تھا

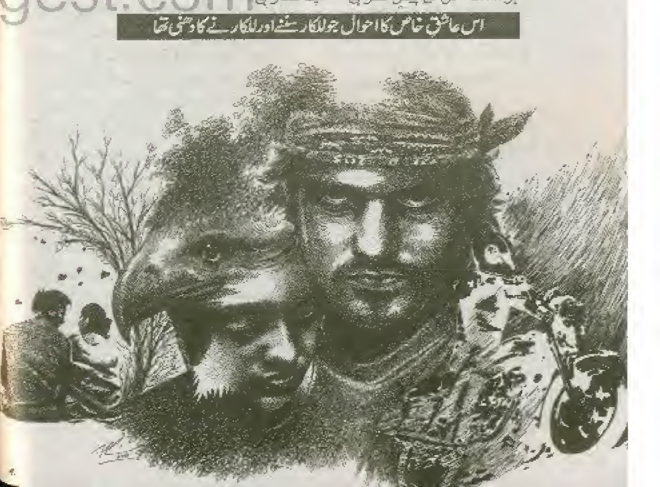

وہ اپنی عجیب الخلقت موٹر سائیکل پر بیٹھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک اور بے خوفی تھی۔ تب وہ ایک بار پھر کنوئیں کے اندر موٹر سائیکل دوڑانے لگا۔ موٹر سائیکل کا شور بے پناہ تھا۔ عمران نے پوری رفتار سے چلتی موٹر سائیکل پر چند اور نہایت خطرناک کرتب دکھائے۔ ہر گھڑی یہی لگ رہا تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ اعتماد کا شکار ہے اور اپنا کوئی نقصان کر بیٹھے گا۔ دیکھنے والوں کے سانس سینے میں اٹکے ہوئے تھے، اس کے ساتھ ساتھ وہ تالیاں بھی پیٹ رہے تھے۔

آخر عمران کا تماشا ختم ہوا اور وہ زبردست تالیوں کے شور میں نیچے آگیا۔ اس کی موٹر سائیکل ملازمین نے سنبھال لی اور وہ تماشائیوں کی طرف ہاتھ لہراتا ہوا، موت کے کنوئیں سے باہر نکل گیا۔ میں بھی بے کٹے سینڈو کے ساتھ واپس شامیانے میں آگیا۔

''کیسا لگا میرا تماشا؟'' اس نے پوچھا۔

''بہت اچھا۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

میں رات دو بجے تک اس شخص کے ساتھ رہنے کا وعدہ کر چکا تھا مگر اب یہ وعدہ نبھانا مجھے مشکل نظر آرہا تھا۔ ایک تو میری جسمانی چوٹیں مجھے مسلسل تکلیف دے رہی تھیں، دوسرے میری ذہنی تکلیف جسمانی تکلیف سے کہیں بڑھ کر تھی۔ اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ کہیں کوئی خاموش جگہ ہو... گہری، تاریک اور بالکل تنہا۔ میں آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤں اور ایک آدھ گھنٹے کے اندر اندر اپنی زندگی کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرلوں۔ فیصلہ کرلوں کہ مجھے زندہ رہنا ہے یا مرنا ہے۔ اگر مرنا ہے تو کس طریقے سے... اور اگر زندہ رہنا ہے تو پھر کس طرف کا رخ کرنا ہے... یہ بات تو میرے تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ میں پھر اپنے گھر کی طرف لوٹوں گا۔ ان سب لوگوں کا سامنا کروں گا جو میری بے مثال ذلت و رسوائی کے شاہد تھے یا اس بارے میں جانتے تھے۔

عمران اپنے معمول کے کام بھی کر رہا تھا اور سائے کی طرح میرے ساتھ بھی لگا ہوا تھا۔ اس نے اپنا کاسٹیوم بدلا اور کچھ ہی دیر بعد مجھے ایک بار پھر سینڈو اور شاہین کے حوالے کر کے اپنی دوسری ''انٹری'' کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کی یہ ''انٹری'' سرکس میں تھی۔ پنڈال کے اندر کافی تعداد میں تماشائی موجود تھے۔ کچھ پورشن تو کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ ویک اینڈ کی شام تھی۔

اس مرتبہ عمران نے جھولوں پر اپنے کمالات دکھائے۔ اس کے ساتھ پانچ چھ مزید بازی گر بھی شامل تھے۔ ان میں تین لڑکیاں تھیں۔ یہاں بھی عمران کا رول اہم رہا۔ اسے اور ایک دوسرے بازی گر سلیمان عرف شہزادے کو خوب داد ملی۔ یہ نہایت پُرخطر آئٹمز تھے۔ بہرحال، جان کے تحفظ کے لیے جھولوں کے نیچے جال وغیرہ موجود تھے۔

ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ شو ختم ہو گیا۔ تماشائی جوق در جوق پنڈال سے نکلنے لگے۔ شو میں حصہ لینے والے انسان اور جانور بھی سبکدوش ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ گئے... سرکس کے اردگرد موجود فالتو روشنیاں بجھائی جانے لگیں۔ لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ ابھی ''کھیل'' مکمل طور پر ختم نہیں ہوا۔ ابھی یہاں کچھ باقی ہے اور جو باقی ہے، وہ اس سارے کھیل سے زیادہ اہم ہے۔ عمران، شہزادے اور اس کے دیگر ساتھیوں نے اسپیشل شامیانے میں پُرتکلف کھانا کھایا اور باداموں والی سبز چائے پی۔ عمران کے بے پناہ اصرار کے باوجود میں نے ایک لقمہ نہیں لیا... لے ہی نہیں سکا۔ میرے خونچکاں سینے میں تو کچھ اور طرح کی جنگ جاری تھی۔

ساڑھے بارہ بجے کے لگ بھگ اِکا دُکا گاڑیاں آکر سرکس کی پارکنگ میں رکنے لگیں۔ یہ سب شاندار گاڑیاں تھیں۔ ہنڈا اکارڈ، ٹویوٹا اور پجارو وغیرہ۔ دوسری طرف اسسٹنٹ منیجر عباس اور انتظامیہ کے دیگر افراد سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے اور خاص انتظامات میں مشغول تھے۔ عمران نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''تابش یار! اب تمہیں ایک خاص تماشا دکھاتے ہیں۔ ویسے تو اس تماشے کا ٹکٹ عام تماشے سے قریباً پندرہ بیس گنا ہے لیکن تمہارے لیے تو یہ پہلے کی طرح مفت ہے۔ ہمارے ساتھ رہو گے تو ایسے ہی مزے کرو گے یار...'' اس نے میرا کندھا تھپکا۔

شاید وہ اور بھی کچھ کہتا لیکن میں نے گھور کر دیکھا تو وہ جلدی سے بات بدل گیا۔ ''بس اب زیادہ دیر نہیں یار... پانچ دس منٹ کا انتظار رہ گیا ہے۔''

دس منٹ بعد ہم ایک بار پھر پنڈال میں تھے۔ اس بار پنڈال تقریباً خالی تھا۔ صرف اسپیشل کلاس میں جہاں قالین بچھے تھے اور صوفے وغیرہ رکھے تھے، تقریباً چالیس عدد تماشائی موجود تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ان کی تعداد پچاس ساٹھ تک پہنچ گئی۔ ان میں سے زیادہ تر نوجوان امیر زادے نظر آتے تھے جو ٹولیوں کی صورت میں آئے تھے۔ کچھ بڑی عمر کے لوگ بھی تھے جو اپنے لباسوں اور چہروں سے بے فکرے باپ کے دولت مند...... لگتے تھے۔ میں اسپیشل کلاس کی تیسری قطار میں بیٹھا تھا۔ سینڈو میری دائیں جانب اور شاہین بائیں جانب تھی۔ پھر میں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ جھولوں کے نیچے سے دونوں حفاظتی جال ہٹا لیے گئے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے شاہین سے پوچھا۔

''آپ دیکھتے رہیں۔'' وہ ہولے سے مسکرائی۔

بازی گر رسّی کی طویل سیڑھی کے ذریعے قریباً پچاس فٹ اوپر جھولوں تک پہنچ رہے تھے۔ ان میں عمران اور شہزادہ سب سے آگے تھے۔ اس مرتبہ بازی گر لڑکیوں کے لباس بھی زیادہ ''بولڈ'' تھے۔ ان کی پوری ٹانگیں عریاں تھیں اور بالائی جسم پر بھی مختصر ترین لباس تھا۔ ہیجان خیز میوزک نے ماحول کو گرمانا شروع کر دیا۔ پنڈال کے اندر عجیب سی سنسنی محسوس ہونے لگی۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آرہی تھی۔ اس سرکس میں چوری چھپے غیر قانونی شو چلایا جا رہا تھا۔ ایک ایسا تماشا جس میں زندگی کا کوئی تحفظ نہیں تھا اور بلندی پر مظاہرہ کرنے والے بازی گر ہر گھڑی موت کے نشانے پر تھے۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ جسم میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔ شاید یہی سنسنی اور ہیجان تھا جس کی خاطر کچھ لوگ بھاری معاوضہ دے کر تماشا دیکھنے کے لیے یہاں موجود تھے۔

تماشا شروع ہوا تو پنڈال میں سناٹا چھا گیا۔ یوں لگتا تھا کہ سوئی بھی گرے گی تو آواز آئے گی۔ بازی گروں کے چہروں پر بھی سخت تناؤ کی کیفیت تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جھولا چھوڑ کر ہوا میں قلابازیاں کھاتے ہوئے اور دوسرا جھولا پکڑتے ہوئے، ذرا سی بھی غلطی ہوئی تو اس کا مطلب ہوگا، بلندی سے زمین پر گرنا اور موت کے قریب تر چلے جانا۔ میں نے دیکھا کہ بازی گروں میں کسی کے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ موجود تھی تو وہ عمران تھا۔ وہ نہ صرف بڑے سکون سے اپنے آئٹم پیش کر رہا تھا بلکہ ساتھیوں کی حوصلہ افزائی بھی کر رہا تھا۔ جب بازی گر کوئی اسٹیپ مکمل کر لیتے تو تماشائیوں کا سکتہ ٹوٹتا، وہ شور مچاتے اور تالیاں پیٹتے۔ ایک خطرناک فارمیشن مکمل کرتے ہوئے عمران کے ساتھی شہزادے کی ''ٹائمنگ'' ذرا سی غلط ہوئی۔ ہوا میں دو قلابازیاں کھا کر اس نے عمران کی ٹانگیں پکڑنا تھیں جو خود بھی جھول رہا تھا۔ شہزادے کے دونوں ہاتھ عمران کی ٹانگوں پر نہیں پڑ سکے۔ ایک ہاتھ پھسل گیا۔ بہرحال، دوسرے ہاتھ کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ وہ خود کو گرنے سے بچانے میں کامیاب رہا۔ اس دو سیکنڈ کی اتھل پتھل نے تماشائیوں کو پنجوں پر کھڑا کر دیا۔ ان کے ہونٹوں سے بے ساختہ ''اوہ'' کی مشترکہ آواز نکلی۔

یہ کھیل تقریباً تیس منٹ کا تھا۔ میری دھڑکنیں زیروزبر ہوتی رہیں اور ہتھیلیوں پر پسینا آگیا۔ ہر لحظہ یہی لگا کہ ابھی کوئی خوفناک حادثہ پیش آجائے گا اور ہم سب خود سے چند میٹر کے فاصلے پر ایک شخص کو مرتے ہوئے دیکھیں گے۔ یہ واقعی زبردست تھا۔

خدا خدا کر کے نہایت سنسنی خیز تماشا ختم ہوا اور تالیوں کی گونج میں بازی گر رسّی کی سیڑھی سے نیچے اترنے لگے۔ مگر ابھی یہ کھیل مکمل طور پر ختم نہیں ہوا تھا، بس اس کا ایک مرحلہ اختتام پذیر ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سرکس کے جوکر ٹائپ ملازمین پنڈال کے وسط میں نمودار ہوئے۔ انہوں نے اپنی الٹی سیدھی حرکتوں سے تماشائی حضرات کے چہروں پر مسکراہٹیں بکھیریں۔ تب وہ چند کرسیاں اٹھا لائے اور انہیں ترتیب سے ایک اسٹیج پر رکھنے لگے۔ کرسیوں کے سامنے ایک میز رکھی گئی اور میز پر لکڑی کا ایک منقش باکس۔

سب سے پہلے شہزادہ اسٹیج پر نمودار ہوا۔ اس نے جھک کر حاضرین کو سلام کیا اور پھر متانت سے چلتا ہوا درمیان والی کرسی پر جا بیٹھا۔ اس نے لکڑی کا باکس کھولا اور اس میں سے ایک سیاہ کولٹ ریوالور نکال لیا۔ باکس میں سے کچھ گولیاں نکال کر اس نے میز پر سجائیں۔ یہ اسٹیج پنڈال کے درمیان نہیں تھا بلکہ حاضرین کے بالکل سامنے تھا۔ بمشکل دس بارہ میٹر کا فاصلہ رہا ہوگا۔ سلیمان عرف شہزادے نے ریوالور کے چیمبر میں ایک عدد گولی ڈالی اور چرخی کو تیزی سے گھما دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہاں ایک اور طرح کا کھیل شروع ہو چکا ہے۔ تماشائیوں میں موجود چند امیر زادے کچھ شرطیں لگا رہے تھے۔ ان شرطوں کا بھاؤ پہلے اوپر نیچے ہوتا رہا پھر ایک جگہ ٹھہر گیا۔ اب یہ ایک کے مقابلے میں چھ تھا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے اپنے پہلو میں بیٹھی شاہین سے پوچھا۔

وہ تو کچھ نہیں بولی تاہم دوسری طرف بیٹھے سینڈو نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ ''یہ پہلی شرط ہے جی۔ ایک کے مقابلے میں چھ۔ شہزادہ صاحب اس ریوالور کی نال اپنے جسم پر رکھ کر گولی چلائیں گے۔ گولی نہ چلی تو شرط لگانے والوں کو پچاس ہزار روپیا دینا ہوگا۔ اس میں سے پچیس ہزار شہزادہ صاحب کو ملیں گے۔ گولی چل گئی تو شرط لگانے والے دو بچے بندوں کو تین لاکھ دینا ہوگا۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ یہ بڑی خطرناک صورت حال

www.pkdigest.com

www.pkdigest.com

تھی۔ اس قسم کے کھیلوں کے بارے میں، میں نے بہت کچھ سنا اور پڑھا تھا لیکن آج میں اپنی آنکھوں کے سامنے ایک جیتا جاگتا منظر دیکھ رہا تھا۔ ایک جیتا جاگتا شخص تھا جو مجھ سے قریباً دس میٹر کی دوری پر اپنے ہاتھ میں ریوالور لیے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کا تناؤ میں اتنی دور سے بھی صاف دیکھ سکتا تھا۔ جب شرط پوری طرح بدل گئی تو شہزادے نے ایک بار پھر ریوالور کی چرخی گھمائی اور اس کی نال اپنے پیٹ پر پہلو کی طرف رکھ لی۔ ایک ریفری نما شخص نے آگے بڑھ کر نال کے مقام اور رخ کو چیک کیا۔ اس کے بعد شہزادے نے آنکھیں بند کیں اور اطمینان سے ٹریگر دبا دیا۔ ”ٹرچ“ کی آواز ابھری اور تماشائیوں میں سے کچھ افراد اٹھ کر تالیاں پیٹنے لگے۔ یقیناً یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے گولی نہ چلنے پر شرط لگائی تھی۔ سلیمان عرف شہزادہ بھی ایک طویل سانس لے کر کھڑا ہو گیا اور اس نے تماشائیوں کی طرف دیکھ کر کورنش بجایا۔ تب وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

اب شرط کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ اس میں ریوالور کے چیمبر میں دو گولیاں ڈالی گئیں۔ ایک بار پھر شرط باندھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ پندرہ بیس نوجوانوں کی دو ٹولیاں تھیں جو آگے بڑھ بڑھ کر بول رہی تھیں۔ ان کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ نئے نہیں ہیں، پہلے بھی اس پُرخطر کھیل کو انجوائے کرتے رہے ہیں۔ اس مرتبہ شرط کا ریٹ سوا ایک اور تین کا تھا۔ جو شرطیں لگی تھیں، ان کے مطابق گولی نہ چلنے کی صورت میں قریباً ایک لاکھ روپے ادا کیے جانا تھے اور چلنے کی صورت میں دو لاکھ چالیس ہزار۔ گولی نہ چلتی تو پھر لاکھ میں سے پچاس ہزار روپے شہزادے کو مل جانے تھے۔ شہزادے نے دونوں گولیاں حاضرین کو دکھانے کے بعد چرخی کے خانوں میں آمنے سامنے ڈالی تھیں اور چرخی کو اچھی طرح گھما دیا تھا۔ سنسنی ایک بار پھر عروج پر پہنچ گئی۔ دھڑکنیں زیر و زبر ہونے لگیں۔ آخری عمل کرنے سے پہلے شہزادے نے حاضرین کی فرمائش پر اپنی قمیص اور بنیان اتار دی۔ اس کا کسرتی جسم ٹیوب لائٹس کی روشنی میں دمکنے لگا۔ تاہم مجھے اس کے پہلو میں ایک گول سیاہ داغ بھی نظر آیا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ وہ اس کھیل کے دوران میں ایک بار پہلے گولی کا شکار ہو چکا ہے۔ حاضرین کی طرف بغور دیکھنے کے بعد شہزادے نے ریوالور کی نال کو اپنے پہلو میں مقررہ مقام پر رکھ دیا۔

”اگر اس کو گولی لگ گئی تو کیا ہوگا؟“ میں نے سرسراتی آواز میں سینڈو سے پوچھا۔

”یہاں ایک ڈاکٹر موجود ہے جی... اور دوا دارو کا سامان بھی۔“ سینڈو نے سرگوشی کی۔

”گولی لگ گئی تو دوا دارو سے کیا ہوگا؟“

سینڈو کے بجائے شاہین بولی۔ ”یہاں اس کو فرسٹ ایڈ دیں گے۔ پھر گاڑی پر قریب کے اسپتال لے جائیں گے۔ سارا انتظام پہلے سے موجود ہوتا ہے۔“

پنڈال میں ایک بار پھر گہری خاموشی تھی۔ شہزادے نے انگلی ٹریگر پر رکھی اور پھر آنکھیں بند کر کے ٹریگر دبا دیا۔ ایک بار پھر ٹرچ کی آواز ابھری اور تالیوں کے شور سے پنڈال گونج گیا۔

ٹریگر دبنے کے فوراً بعد ہی کیش وغیرہ کا تبادلہ کر لیا گیا۔ سلیمان عرف شہزادے کے حصے کی رقم فوراً ہی اس کو دے دی گئی۔

سرکس کا اسسٹنٹ منیجر عباس اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور حاضرین کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے اناؤنسمنٹ کرنے کے انداز میں کہا۔ ”ہمیشہ کی طرح آپ معزز حضرات میں سے بھی کوئی اگر اس کھیل میں حصہ لینا چاہے تو وہ یہاں آ سکتا ہے۔ کھیل کے اصول آپ سب جانتے ہی ہیں۔“

تماشائیوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ قریباً ایک منٹ کی اضطرابی کیفیت کے بعد لمبے بالوں والا ایک نوجوان اسٹیج پر آ گیا۔ اس کے چہرے پر زخموں کے ایک دو پرانے نشان اس کی تُند مزاجی کو ظاہر کرتے تھے۔ اس نے جینز اور سیاہ جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے لباس اور شکل و صورت سے عیاں تھا کہ وہ کھاتے پیتے گھرانے سے ہے۔ وہ اطمینان سے آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اس کی حرکات و سکنات سے پتا چلتا تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی اس کھیل میں حصہ لے چکا ہے۔ یقیناً یہ سب کچھ تھرل اور ڈرامے کے لیے تھا ورنہ ایسے نوجوانوں کو پیسے کی کیا کمی ہو سکتی تھی۔

اس لڑکے نے بھی اپنے لیے دو گولی والا کھیل چنا۔ دو تین منٹ کے اندر ایک بار پھر شرط باندھنے والا عمل ہوا۔ اس مرتبہ بھی ریٹ تقریباً وہی تھا۔ جواریوں نے اپنی اپنی رقوم اسسٹنٹ منیجر عباس کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیں۔

لمبے بالوں والے نوجوان نے چرخی گھما کر ریوالور کی نال قاعدے کے مطابق اپنے پہلو پر رکھی اور ٹریگر دبا دیا۔ ایک دھماکے سے گولی چلی۔ حاضرین چلّا اٹھے۔ لمبے بالوں والے نوجوان کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا اور وہ اوندھے منہ سامنے میز پر گرا۔ اس کی کراہ دور تک سنائی دی تھی۔ ملازمین جو پہلے سے تیار تھے، دوڑ کر زخمی تک پہنچے۔ اسے اسٹریچر پر

ڈالا اور اسٹریچر اٹھا کر ایک اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ زخمی، تکلیف کی شدت سے بل کھا رہا تھا۔ اس کے پہلو سے نکلنے والا خون اسٹیج پر ایک لکیر کی صورت میں دکھائی دینے لگا۔ سب حاضرین اپنی جگہوں سے کھڑے ہو گئے تھے۔

تاہم یہ سارا اضطراب صرف تین چار منٹ کے اندر ختم ہو گیا۔ اسٹیج پر سے خون کے دھبے تیزی سے صاف کر دیے گئے۔ کچھ دیر بعد یوں لگنے لگا جیسے یہاں کبھی کچھ ہوا ہی نہیں۔ اب میں نے دیکھا کہ عمران خود اسٹیج پر نمودار ہوا ہے۔ وہ ابھی تک بازی گری والے کاسٹیوم میں تھا اور دلکش دکھائی دیتا تھا۔ وہ میز کے پیچھے اسی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا جہاں سے تین چار منٹ پہلے خون چکاں نوجوان کو اسٹریچر پر ڈال کر لے جایا گیا تھا۔ کتنی جلدی ہوا تھا وہ سب کچھ۔ صرف آٹھ دس منٹ پہلے وہ لڑکا اپنے ساتھیوں کے ساتھ تالیاں بجا رہا تھا اور ہلا گلا کر رہا تھا اور اب کوئی گاڑی اسے تیز رفتاری کے ساتھ اسپتال کی طرف لے جا رہی تھی... جس کرسی سے وہ اٹھ کر گیا تھا، وہاں اب مسکراتے چہرے والا عمران بیٹھا تھا۔

ایک بار پھر شرطیں باندھنے کا عمل شروع ہوا۔ اب اس عمل میں پہلے سے زیادہ سنسنی خیزی اور جوش پایا جا رہا تھا۔ جلد ہی مجھے اس اضافی جوش کی وجہ معلوم ہو گئی۔ سینڈو کے ذریعے مجھے پتا انکشاف ہوا کہ عمران بھائی ”تین چھ کا کھیل“ کھیلیں گے۔ تین چھ کے کھیل سے مراد یہ تھی کہ تین خانے خالی، تین خانوں میں گولیاں۔ میں نے عمران کے مسکراتے چہرے کو دیکھا اور مجھے لگا کہ میں اسے مزید مسکراتے نہیں دیکھ سکوں گا۔ یہ بے وقوفی کی حد تک دلیری کا مظاہرہ تھا۔ کچھ دیر پہلے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ بھی موت کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے لیکن اس کی تلاش کا انداز ذرا مختلف ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنی موت کا الزام اپنے سر لینے کا خواہش مند بھی نہیں ہے۔ اس نے یہ الفاظ غیر سنجیدگی سے کہے تھے، تاہم اب اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ اتنے غیر سنجیدہ بھی نہیں تھے۔ حساب بالکل صاف تھا۔ عمران کے بچنے کا امکان پچاس فیصد اور گولی لگنے کا امکان بھی پچاس فیصد تھا۔ حاضرین آگے بڑھ بڑھ کر شرطیں لگا رہے تھے۔ ہر چہرہ سنسنی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

ایک لمحے کے لیے میری نظر عمران کی نظر سے ملی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا... بتاؤ، مزہ آ رہا ہے یا نہیں؟

اس کی دلی کیفیت کے بارے میں تو یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تاہم اس کا چہرہ حسب معمول مسکرا رہا تھا۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ ریوالور ہاتھ میں لیے اپنی جگہ پر بیٹھا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک مجھے شک تھا کہ شاید اس کھیل میں کوئی گھپلا وغیرہ کیا گیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ ریوالور میں نقلی گولیاں ہوں یا کھلاڑی نے اپنے لباس کے نیچے کوئی جیکٹ وغیرہ پہن رکھی ہو... مگر یہ دونوں شکوک ابھی تھوڑی دیر پہلے غلط ثابت ہو گئے تھے۔ یہاں پر اصلی گولی چلی تھی اور ابھی تھوڑی دیر پہلے سلیمان عرف شہزادے نے اپنے کھیل میں اپنی قمیص بھی اتار کر دکھا دی تھی۔

شہزادے سے تو لوگوں نے قمیص اتارنے کی فرمائش کی تھی مگر عمران نے بغیر فرمائش کے ہی اپنا بالائی لباس اتار دیا۔ اس کا نہایت مضبوط اور سڈول جسم دعوتِ نظارہ دینے لگا۔ شرطیں باندھنے کی گرما گرمی میں قریباً دس منٹ صرف ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے عباس کے سامنے رکھی ٹیبل پر کرنسی نوٹوں کا چھوٹا سا ڈھیر لگ گیا۔ یہ ساڑھے تین اور ڈھائی کا ریٹ تھا۔ گولی نہ چلنے کی صورت میں قریباً سات لاکھ روپے ادا کیے جانے تھے جس میں سے اندازاً تین لاکھ روپے عمران کی جیب میں جانے تھے۔ گولی نہ چلنے کی صورت میں پانچ لاکھ مخالف گروپ کو ادا کیے جانے تھے۔

قریباً تین لاکھ روپے کی خاطر عمران زندگی اور موت کا کھیل کھیل رہا تھا۔ وہ اپنی جان کو اپنے ہاتھ سے داؤ پر لگا رہا تھا۔ مجھے لگا کہ یہ کچھ اسی طرح کا معاملہ ہے جس طرح لوگ رقوم حاصل کرنے کے لیے اپنے جسمانی اعضا گردے وغیرہ سرجنوں کے حوالے کر دیتے ہیں... لیکن ان معاملوں میں صرف ضرورت پیشِ نظر ہوتی ہے، یہاں تفریح اور سنسنی خیزی کا عمل دخل بھی تھا۔

مجھے لگا کہ میری ہتھیلیاں پسینے میں تر ہو گئی ہیں۔ دل کی دھڑکن بہت تیز ہو چکی تھی۔ ریفری نما شخص نے آگے بڑھ کر معائنہ کیا کہ عمران نے ریوالور کی نال اپنے پہلو میں درست مقام پر رکھی ہے یا نہیں۔ پھر مطمئن انداز میں سر ہلا کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ پنڈال میں موت کا سا سکوت چھا گیا۔ عمران نے انگلی ٹریگر پر رکھی اور آنکھیں بند کر لیں۔ پنڈال میں موجود ہر فرد پتھر کی طرح ساکت تھا۔ ریوالور کے تین خانوں میں گولیاں تھیں اور تین خانے خالی تھے۔ اب ”ہیمر“ کے سامنے کون سا خانہ تھا، یہ آنے والے لمحوں میں معلوم ہونا تھا... ایک زوردار دھماکا یا ٹرچ کی آواز!

اور پھر عمران نے ٹریگر دبا دیا۔ بہت سے لوگ اٹھ کر خوشی سے ناچنے لگے۔ ریوالور سے گولی نہیں چلی تھی۔ کئی افراد اسٹیج پر چڑھ گئے۔ انہوں نے عمران کو گلے لگایا اور اپنے جوش و خروش کا اظہار کیا۔ شرط ہارنے والے افراد بھی کچھ زیادہ مایوس نہیں تھے۔ ان کے لیے بھی شاید پیسے سے زیادہ

سنسنی اور تحیر کا عنصر اہم تھا۔ عمران نے پستول کو چوم کر ہوا میں اچھالا اور ایک ملازم نے اسے دبوچ لیا۔ عمران کے حق میں داؤ لگانے والے اب شدید تناؤ کے بعد خوشی میں مست دکھائی دیتے تھے۔

یہ ہلا گلا ختم ہونے میں پندرہ بیس منٹ لگ گئے۔ اس دوران میں سینڈو سے میری تھوڑی بہت بات بھی ہوئی۔ اس گفتگو سے صرف اتنا پتا چلا کہ یہ تماشا ہر انگریزی مہینے کے پہلے ویک اینڈ پر اس سرکس میں ہوتا ہے۔ میرے کئی سوالوں کے جواب سینڈو اور شاہین گول کر گئے۔ عمران اسٹیج سے اتر چکا تھا تاہم تماشا ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اسسٹنٹ منیجر عباس ایک بار پھر اسٹیج پر آیا اور بولا۔ ”آخر میں حسب دستور، میں ایک بار پھر دعوت دیتا ہوں کہ اگر معزز حاضرین میں سے کوئی اس کھیل میں حصہ لینا چاہے تو اسٹیج پر آسکتا ہے۔ جواں مردی اور دلیری کا یہ کھیل ہم سب کے لیے ہے اور ہم اپنی ذمے داری پر اس میں حصہ لے سکتے ہیں۔“ اس نے چند لمحے توقف کر کے حاضرین کی طرف دیکھا۔ تماشا سب کرنا چاہتے تھے لیکن ”تماشا“ بننے کے لیے جو غیر معمولی ہمت درکار تھی، وہ کوئی نہیں کر پا رہا تھا۔

عباس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”جی حضرات! آپ سب کے لیے موقع موجود ہے۔ ابھی آپ نے دیکھا کہ ہمارے ہردل عزیز ساتھی ہیرو بھائی نے تین چھ کا کھیل کامیابی سے کھیلا ہے۔ پچھلے سے پچھلے ماہ بھی آپ نے دیکھا کہ وہ یہ کھیل کامیابی سے کھیل گئے۔ اگر ”تین چھ“ کھیلا جا سکتا ہے تو ایک چھ اور دو چھ کیوں نہیں کھیلا جا سکتا...“

عباس کی اس تقریر کے نتیجے میں ایک اور نوجوان اسٹیج کی طرف بڑھا لیکن پھر ایک دوسرا شخص جو غالباً اس کا بڑا بھائی یا چچا وغیرہ تھا، اسے کھینچ کر واپس لے گیا۔

اسی دوران میں عمران میرے ساتھ والی نشست پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ اب اس نے چمکیلا کاسٹیوم اتار دیا تھا اور اسی لباس میں تھا جس میں یہاں سرکس پہنچا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا گلاس تھا جس میں یقیناً بیئر تھی۔ اس کے لیے شاہین نے اپنی جگہ خالی کر دی تھی۔ تین چھ کے کھیل کی وجہ سے شاہین کا رنگ ابھی تک زرد تھا اور پیشانی پر ہلکا سا پسینا نظر آرہا تھا۔ وہ شکوہ کناں نظروں سے عمران کو گھور رہی تھی۔

عمران اس کی طرف دیکھنے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”یار تابش! یہ جو گرل فرینڈز اور بیویاں ہوتی ہیں نا... یہی بندے کو اوپر لے جاتی ہیں اور نیچے بھی گراتی ہیں۔ اب تم ذرا سوچو اگر اپنے سکندر اعظم کی بیوی اس کی طرف ایسے دیکھتی جس طرح یہ میری طرف دیکھ رہی ہے تو کیا وہ آدھی دنیا فتح کر سکتا تھا؟ وہ تو مقدونیہ سے بھی باہر نہ نکل پاتا۔ کیوں، میں غلط تو نہیں کہہ رہا... اور وہ اپنا جارج میلوری... جس نے ماؤنٹ ایورسٹ سر کی۔ اس کے بارے میں کیا خیال ہے...“

شاہین نے مسکرا کر بات کاٹی۔ ”اس سے یہی ثابت ہوتا ہے نا کہ سکندر اعظم اور جارج میلوری کی بیویوں کو انہیں روکنا چاہیے تھا۔ سکندر اعظم صرف 33 سال کی عمر میں مر گیا تھا اور میرے خیال میں ایورسٹ جارج نے سر نہیں کی تھی بلکہ سر کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں صرف 38 سال کی عمر میں اس کی جان چلی گئی۔ ہم نے تو کورس کی کتابوں میں یہی پڑھا ہے۔“

”بس تم ہر بات سے اپنے مطلب کی بات ثابت کرلیا کرو۔ اس طرح تو میں بھی تمہاری بات سے ایک بات ثابت کر سکتا ہوں۔“

”وہ کیا؟“

”تم نے خود کو کم از کم میری بیوی یا گرل فرینڈ تو مان لیا۔“ وہ بتیسی نکال کر مسکرایا۔

”تم سے بات کرنا ہی فضول ہے۔“ وہ اپنے تراشیدہ بال جھلاتی ہوئی پچھلی نشستوں پر جا بیٹھی۔

عمران اپنے خاص انداز میں میری طرف جھکا اور میرا کندھا دبا کر بولا۔ ”یہ ساری لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ان کی باتوں پر نہیں جانا چاہیے۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن سارے لڑکے اور نوجوان ایک جیسے نہیں ہوتے۔ جیسے بدولت... یعنی میں۔ میں تمہیں بڑے پتے کی باتیں بتا سکتا ہوں۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔

وہ اسٹیج پر رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”ایک ٹرائی تم بھی کرو۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”دیکھو... گندم کی گولیوں سے تو ہنڈرڈ پرسنٹ اوپر کا ٹکٹ کٹ جاتا ہے۔ اس کھیل میں تو بہت سا چانس ہے۔“ اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”کیا بکواس ہے؟“ میری بیزاری کچھ اور بڑھ گئی۔

”چلو، زیادہ نہیں تو ”ایک چھ“ کھیل لو۔ قسم سے مزہ آجائے گا۔ جیب علیحدہ گرم ہوگی۔ تھوڑی سی ہمت کرو یار۔“ اس نے پھر میرا کندھا دبایا۔

میں اسے کوئی سخت سا جواب دینے جا رہا تھا مگر

یہی اسم ہے بجز اس کے کوئی بھی حافظے میں نہیں

حال ہی میں بھارت میں شائع ہونے والی کتاب ”کالکی اوتار“ نے دنیا بھر میں ہلچل مچا دی ہے۔ اس کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں جس کالکی اوتار کا تذکرہ ہے وہ آخری رسول محمد ﷺ بن عبداللہ ہیں۔

اس کتاب کا مصنف اگر کوئی مسلمان ہوتا تو وہ اب تک جیل میں ہوتا اور اس کتاب پر پابندی لگ چکی ہوتی مگر اس کے مصنف پنڈت وید پرکاش برہمن ہندو ہیں اور الٰہ آباد یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔ وہ سنسکرت کے معروف محقق اور اسکالر ہیں۔ انہوں نے اپنی اس تحقیق کو ملک کے آٹھ مشہور و معروف محققین پنڈتوں کے سامنے پیش کیا ہے جو اپنے شعبے میں مستند گردانے جاتے ہیں۔ ان پنڈتوں نے کتاب کے بغور مطالعے اور تحقیق کے بعد یہ تسلیم کیا ہے کہ کتاب میں پیش کیے گئے حوالہ جات مستند اور درست ہیں۔ انہوں نے اپنی تحقیق کا نام ”کالکی اوتار“ یعنی تمام کائنات کے رہنما رکھا ہے۔

ہندوؤں کی اہم مذہبی کتب میں ایک عظیم رہنما کا ذکر ہے جسے ”کالکی اوتار“ کا نام دیا گیا ہے۔ اس سے مراد حضرت محمد ﷺ ہیں جو مکہ میں پیدا ہوئے۔ چنانچہ تمام ہندو جہاں کہیں بھی ہوں، ان کو کسی کالکی اوتار کا مزید انتظار نہیں کرنا ہے بلکہ محض اسلام قبول کرنا ہے اور آخری رسول ﷺ کے نقش قدم پر چلنا ہے جو بہت پہلے اپنے مشن کی تکمیل کے بعد اس دنیا سے تشریف لے گئے ہیں۔ اپنے اس دعوے کی دلیل میں پنڈت وید پرکاش نے ہندوؤں کی مقدس مذہبی کتاب ”وید“ سے مندرجہ ذیل حوالے دلیل کے ساتھ پیش کیے ہیں۔

۱۔ ”وید“ میں لکھا ہے کہ ”کالکی اوتار“ بھگوان کا آخری اوتار ہوگا جو پوری دنیا کو راستہ دکھائے گا۔ ان کلمات کا حوالہ دینے کے بعد پنڈت وید پرکاش یہ کہتے ہیں کہ یہ صرف محمد ﷺ کے معاملے میں درست ہو سکتا ہے۔

۲۔ ”ہندوستان“ کی پیشگوئی کے مطابق ”کالکی اوتار“ ایک جزیرے میں پیدا ہوں گے اور یہ عرب علاقہ ہے جسے جزیرۃ العرب کہا جاتا ہے۔

۳۔ مقدس کتاب میں لکھا ہے کہ ”کالکی اوتار“ کے والد کا نام ”وشنو بھگت“ اور والدہ کا نام ”سومانب“ ہوگا۔ سنسکرت زبان میں ”وشنو“ اللہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور ”بھگت“ کے معنی غلام اور بندے کے ہیں۔ چنانچہ عربی زبان میں ”وشنو بھگت“ کا مطلب اللہ کا بندہ یعنی عبداللہ ہے۔ سنسکرت میں ”سومانب“ کا مطلب امن ہے جو کہ عربی زبان میں ”آمنہ“ ہوگا اور آخری رسول (محمد ﷺ) کے والد کا نام عبداللہ اور والدہ کا نام آمنہ ہے۔

۴۔ وید کتاب میں لکھا ہے کہ ”کالکی اوتار“ زیتون اور کھجور استعمال کرے گا۔ یہ دونوں پھل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مرغوب تھے۔ وہ اپنے قول میں سچا اور دیانت دار ہوگا۔ مکہ میں محمد ﷺ کے لیے صادق اور امین کے لقب استعمال کیے جاتے تھے۔

۵۔ ”وید“ کے مطابق ”کالکی اوتار“ اپنی سرزمین کے معزز خاندان میں سے ہوگا اور یہ بھی محمد ﷺ کے بارے میں سچ ثابت ہوتا ہے کہ آپ قریش کے معزز قبیلے میں سے تھے جس کی مکہ میں بے حد عزت تھی۔

۶۔ ہماری کتاب کہتی ہے کہ بھگوان ”کالکی اوتار“ کو اپنے خصوصی قاصد کے ذریعے ایک غار میں پڑھائے گا۔ اس معاملے میں یہ بھی درست ہے کہ محمد ﷺ مکہ کی وہ واحد شخصیت تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے غار حرا میں اپنے خاص فرشتے حضرت جبرائیل کے ذریعے تعلیم دی۔

۷۔ ہمارے بنیادی عقیدے کے مطابق بھگوان ”کالکی اوتار“ کو ایک تیز ترین گھوڑا عطا فرمائے گا جس پر سوار ہو کر وہ زمین اور سات آسمانوں کی سیر کر آئے گا۔ محمد ﷺ کا ”براق پر معراج کا سفر“ کیا یہ ثابت نہیں کرتا ہے؟

۸۔ ہمیں یقین ہے کہ بھگوان ”کالکی اوتار“ کی بہت مدد کرے گا اور اسے بہت قوت عطا فرمائے گا۔ ہم جانتے ہیں کہ جنگ بدر میں اللہ نے محمد ﷺ کی فرشتوں سے مدد فرمائی۔

۹۔ ہماری ساری مذہبی کتابوں کے مطابق کالکی اوتار گھڑ سواری، تیر اندازی اور تلوار زنی میں ماہر ہوگا۔

پنڈت وید پرکاش نے اس پر جو تبصرہ کیا ہے وہ اہم اور قابل غور ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ گھوڑوں، تلواروں اور نیزوں کا زمانہ بہت پہلے گزر چکا ہے۔ اب ٹینک، توپ اور میزائل جیسے ہتھیار استعمال میں ہیں۔ لہٰذا یہ عقلمندی نہیں ہے کہ ہم تلواروں، تیروں اور برچھیوں سے مسلح کالکی اوتار کا انتظار کرتے رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری مقدس کتابوں میں ”کالکی اوتار“ کے واضح اشارے حضرت محمد ﷺ کے بارے میں ہیں جو ان تمام حربی فنون میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ ٹینک، توپ اور میزائل کے اس دور میں گھڑ سوار تیغ زن اور تیر انداز کالکی اوتار کا انتظار زری حماقت ہے۔

(ماہ ربیع الاوّل کے حوالے سے کراچی سے اسد عرفان منہاس کا منفرد و دلچسپ انتخاب)

www.pkdigest.com

اچانک میرے اندر پھلجھڑی سی چھوٹ گئی... مجھے آج صبح پیش آنے والے سارے اذیت ناک واقعات یاد آئے اور مجھے لگا کہ میرے لیے عمران کی بات ماننا کچھ زیادہ مشکل بھی نہیں ہے۔ ایک خانے میں گولی... پانچ خانے خالی۔ گولی چلنے کا امکان بہت کم تھا اور... اگر چل بھی جاتی تو... کیا ہوتا؟ اس ساری ناقابلِ برداشت صورت حال سے نجات مل جاتی۔ ساری نارسائیاں، مجبوریاں اور بے چارگیاں میرے ساتھ ہی ایک پُرسکون اندھیرے میں چھپ جاتیں... ایک پُرسکون اندھیرا جو زندگی کی سرحد سے آخری سرے پر مجھے آواز دے رہا تھا۔ ایک دم مجھے لگا کہ یہ کھیل کھیلنا میرے لیے کچھ زیادہ دشوار نہیں ہے۔

عمران بغور میرے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ اس نے میری ہمت بندھائی۔ مجھے اپنے جسم میں عجیب سی توانائی بھری محسوس ہوئی۔ سیٹھ سراج، اس کے کارندوں اور اس کے بیٹے واجی کے مکروہ چہرے میری نگاہوں میں گھومے اور میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ میرے اس فیصلے پر تھوڑی دیر کے لیے عمران بھی حیران ہوا۔ وہ مجھے آمادہ تو کر رہا تھا لیکن حقیقت میں شاید اسے بھی یقین نہیں تھا کہ میں آمادہ ہو جاؤں گا۔ حاضرین میں سے کئی ایک مڑ کر میری طرف دیکھنے لگے۔

کچھ ہی دیر بعد میں ایک عجیب سی کیفیت کے زیرِ اثر، اسٹیج پر موجود تھا۔ روشنی براہِ راست میرے چہرے پر پڑ رہی تھی اور تماشائی نیم تاریکی میں نظر آتے تھے۔ ایک عدد اسپاٹ لائٹ عین میز کے اوپر تھی جہاں سیاہ پستول اور اس کی گولیاں رکھی تھیں۔ سینما ہال کے اندر میں نے جو سکون بخش گولیاں چبائی تھیں، ان کا اثر ابھی تک حواس پر موجود تھا۔ میں ہاتھ پاؤں میں ہلکا سا بھاری پن محسوس کر رہا تھا۔

شرطیں باندھنے کا عمل ایک بار پھر شروع ہوا۔ عباس کے سامنے رکھی میز پر کرنسی نوٹ حرکت کرنے لگے۔ شرط کا ریٹ سب سے پہلی شرط والا یعنی ایک چھ ہی رہا مگر رقم تھوڑی سی بڑھ گئی۔ یعنی گولی نہ چلنے کی صورت میں ساٹھ ہزار کی ادائیگی ہونی تھی جس میں سے دس ہزار سیدھے میری جیب میں آنے تھے۔ گولی چلنے کی صورت میں مخالف پارٹی نے تین لاکھ ساٹھ ہزار روپے دوسری پارٹی کو ادا کرنے تھے۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو چکی تھی تاہم حواس پر عجیب سی دھند چھائی ہوئی تھی۔ میں خود کو اذیت دینے کے لیے تیار تھا، چاہے یہ اذیت مجھے موت کے منہ میں ہی کیوں نہ لے جاتی۔ ایک چھوٹا سا کاغذ لایا گیا جس پر کچھ لکھا تھا اور مجھے دستخط کرنے تھے، تاہم عمران آڑے آیا اور اس نے کاغذ لانے والے کو اپنی ضمانت دے کر واپس بھیج دیا۔

میرا منہ بالکل خشک ہو چکا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ زبان تالو سے چپک رہی ہے۔ ایک لمحے کے لیے دل میں آیا کہ واپس چلا جاؤں مگر جہاں تک پہنچ گیا تھا، وہاں سے واپس جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ میں نے میز پر رکھی ایک گولی اٹھائی اور اسے سب کے سامنے ریوالور کے چیمبر میں رکھ دیا۔ ریوالور کو بند کر کے میں نے اس کی چرخی کو تین چار بار زور سے گھمایا اور پھر اسے پیٹ کی دائیں سائڈ پر رکھ دیا۔ ریفری نے آگے آ کر بیرل کی پوزیشن درست کی اور چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔

تماشا دیکھنا اور بات ہوتی ہے، تماشا بننا اور بات۔ بے شک چیمبر میں صرف ایک گولی تھی، تاہم مجھے یہی لگ رہا تھا کہ یہ گولی "ہیمر" کے سامنے آئے گی اور ایک دھماکے سے میرے پیٹ میں چلی جائے گی۔ میں اس اذیت کو تصور میں لانے کی کوشش کر رہا تھا جو گولی کے پیٹ میں گھسنے سے مجھے محسوس ہونے والی تھی۔

ایک بار پھر میں نے سیٹھ سراج کا منحوس چہرہ اپنی نگاہوں کے سامنے کیا اور ہیجانی انداز میں ٹریگر دبا دیا۔ "ٹرچ" کی فرحت بخش آواز کانوں سے ٹکرائی اور مجھے قرب و جوار گونجتے ہوئے محسوس ہوئے۔ شرط جیتنے والے خوشی سے جھومنے لگے۔ ان میں سے دو چار کے بازوؤں میں کال گرل ٹائپ لڑکیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ یہ لڑکیاں ان کے ساتھ نہیں آئی تھیں بلکہ یہیں سے فراہم کی گئی تھیں۔ جیت کی خوشی میں ایک لڑکے نے اپنی ساتھی لڑکی کو آغوش میں بھینچ کر چٹاچٹ کئی بوسے لیے اور آوازے بلند کرنے لگا۔ اس کے ساتھی نے ڈانس شروع کر دیا اور پھر ڈانس کرتے کرتے اسٹیج پر آ کر مجھے تھپکی دی۔

قریباً دو منٹ کے اندر ہی پورے 30 ہزار روپے کے کرارے نوٹ میری جیب میں پہنچ گئے۔ عمران نے اسٹیج پر آ کر میری پیٹھ تھپکی۔ "ویل ڈن جگر! دیکھو، تم ایک دم کماؤ پوت بن گئے ہو..."

میں خاموش رہا۔ اس نے ایک بار پھر میرا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ "بس... یا اور کھیلو گے؟"

اس کے پوچھنے کا انداز بالکل رسمی تھا۔ یقیناً وہ جانتا تھا کہ میں اور نہیں کھیلوں گا۔ اسی لیے میں نے جو جواب اسے دیا، اس نے عمران کو ششدر کر دیا۔ میں نے کہا۔ "اگر تم چاہتے ہو تو اور کھیل لیتا ہوں۔"

"کیا... ارے کیا کہہ رہے ہو؟"

"وہی جو تم سن رہے ہو۔" میں نے بدستور مدھم لہجے میں کہا۔ "اگر تم چاہتے ہو تو میں ایک بار "دو گولی" کے ساتھ کھیل لیتا ہوں۔"

"زبردست... خوش کر دیا جانِ جگر۔" عمران کا رنگ سرخ ہو گیا۔

اسسٹنٹ منیجر عباس بھی وہاں پہنچ گیا۔ عمران اور عباس کے درمیان چند سرگوشیاں ہوئیں اور پھر اناؤنسمنٹ ہوئی کہ میں ایک بار "دو چھ" کا کھیل کھیلوں گا۔

میرے دل و دماغ میں ایک دھند سی بھر گئی تھی۔ پہلی کامیابی نے میرے حوصلے کو ایک دم زبردست بڑھاوا دے دیا تھا۔ اس حوصلے کو میرے اندر کا غم و غصہ بھی مہمیز کر رہا تھا۔

ایک بار پھر شرطوں کا عمل شروع ہوا۔ ساتھ ساتھ بیئر کے چند گلاس بھی گردش کر رہے تھے۔ سگریٹوں کا دھواں اور الکحل کی بو میرے نتھنوں تک بھی پہنچ رہی تھی۔ میں نے ریوالور کھول کر اس میں ایک اور گولی ڈالی۔ کھیل کے ضابطے کے مطابق یہ گولی دو خانے خالی چھوڑ کر ڈالی گئی۔ یعنی دونوں گولیاں آمنے سامنے تھیں۔ چیمبر کو بند کر کے میں نے لرزتے ہاتھوں سے چرخی کو تین چار بار گھمایا اور تیار ہو گیا۔ اس مرتبہ شرط کی رقم ایک لاکھ پچاس ہزار تک پہنچی تھی۔ گولی نہ چلنے کی صورت میں مجھے اس میں سے قریباً 75 ہزار روپے ملنے تھے۔ مجھے رقم کی کچھ زیادہ پروا نہیں تھی۔ میرا اصل مسئلہ میرے اندر کا وہ شدید اضطراب اور انتشار تھا جس سے میں کسی صورت پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ میری ہتھیلیوں پر پسینا آ رہا تھا اور منہ ایک بار پھر خشک لکڑی کی طرح ہو گیا تھا۔ دل کی رفتار بے حد تیز تھی۔ ریفری نما شخص کی ہدایت پر میں نے ریوالور کی نال کو پیٹ کی مقررہ جگہ پر رکھا اور انگلی ٹریگر پر جما دی۔ میں حیرت سے سوچ رہا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے کس مقام پر پہنچ گیا ہوں۔

یہی وقت تھا جب اسسٹنٹ منیجر عباس مجھے غور سے دیکھتا ہوا اسٹیج پر چڑھ آیا۔ اس نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔ "حضرات! ہم یہاں حسبِ دستور کھیل میں تھوڑی سی مزید دلچسپی پیدا کرتے ہیں۔ تابش صاحب چرخی کو گھما چکے ہیں، اب یہ دوبارہ نہیں گھما سکتے۔ کوئی بھی نہیں گھما سکتا۔ اس شرط میں سے تھوڑی دیر کے لیے باقی سب لوگ نکل جائیں گے۔ صرف کھلاڑی تابش اور عمر حیات صاحب رہ جائیں گے۔ عمر حیات صاحب ریوالور دیکھنے کے بعد تابش کو رضاکارانہ طور پر کچھ رقم آفر کریں گے۔ اس رقم کے بدلے تابش کو کھیل یہیں چھوڑنا ہو گا۔ اگر وہ کھیل نہیں چھوڑنا چاہے گا تو پھر پہلے والی شرط بحال ہو جائے گی۔ تو آئیے جناب عمر حیات صاحب..."

چالیس بیالیس سالہ ایک تومند شخص اسٹیج پر چڑھ آیا۔ وہ کوئی خوش حال فیکٹری اونر ہی لگتا تھا۔ اس نے شلوار قمیص اور واسکٹ زیب تن کر رکھی تھی۔ عباس نے ریوالور میرے ہاتھ سے لیا اور بغیر دیکھے عمر حیات کی طرف بڑھا دیا۔ عمر حیات نے چشمہ لگا کر ریوالور کی چرخی کو چھیڑے بغیر اس کا معائنہ کیا اور عباس کو واپس دے دیا۔ عباس نے اسے میرے پیٹ سے لگایا اور دستہ مجھے تھما دیا۔

عمر حیات کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ تھی جیسے وہ اس صورتِ حال میں انجوائے کر رہا ہو۔ اس کے علاوہ چہرے پر سرخی بھی تھی جو مستی کا نتیجہ تھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "برخوردار! تم نئے آئے ہو اور کافی گھبرائے ہوئے بھی ہو۔ تمہاری جان بچانا میرا فرض ہے اور مجھے ہمیشہ یہ کام کر کے خوشی محسوس ہوتی ہے، حالانکہ پیسے میری اپنی جیب سے جاتے ہیں۔ تو بھائی! میں نے دیکھ لیا ہے۔ ریوالور کی نیت تمہارے بارے میں ایک دم خراب ہے۔ بہتر ہے کہ تم یہ کھیل یہیں پر چھوڑ دو۔ جیتنے کی صورت میں تمہیں 75 ہزار روپے ملنا تھے۔ میں تمہیں اپنی جیب سے دس ہزار روپے آفر کرتا ہوں۔"

میں سمجھ گیا کہ اس طرح میرے اعصاب کو ٹیسٹ کیا جا رہا ہے۔ بے شک عمر حیات نے ریوالور کو دیکھا تھا اور ریوالور کی سائڈ سے چرخی کو بغور دیکھا جائے تو گولیوں کی پوزیشن کا اندازہ ہو جاتا ہے مگر اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ یہ شخص سچ کہہ رہا ہے۔ یہ سب کچھ صرف "تھرل" بڑھانے کے لیے کیا جا رہا تھا۔

میں نے عمران کی طرف دیکھا... پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ "نہیں، میں کھیلنا چاہتا ہوں۔"

"پندرہ ہزار۔" عمر حیات نے رضاکارانہ آفر کی۔

"نہیں۔"

"دیکھو برخوردار! لالچ اچھی چیز نہیں۔ میرا خیال تو یہی ہے کہ میری بات مان کر تم فائدے میں رہو گے۔ جنہوں نے تمہارے حق میں شرط لگائی ہے، وہ بھی تمہیں دعا دیں گے..."

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے بھی ہلا دیا۔

"تمہاری قیمتی جان بچانے کے لیے بیس ہزار۔" عمر

www.pkdigest.com

حیات نے بولی دینے والے انداز میں رقم بڑھائی۔ میں نے پھر نفی میں سر ہلایا۔
"مان جاؤ بچے، مان جاؤ۔ یہ کام تمہیں مہنگا پڑنے والا ہے۔ میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"
جن لوگوں نے میرے حق میں شرط لگا رکھی تھی، وہ کورس کی شکل میں مجھے مشورہ دینے لگے۔ "نہیں... نہیں۔"
عمر حیات مزہ لیتے ہوئے بولا۔ "اچھا تمہاری خوب صورت جوانی کی خاطر پانچ ہزار روپے مزید۔ پچیس ہزار روپے کم رقم نہیں ہے۔ ایک زبردست ڈنر... ایک ولایتی بوتل اور ایک گرما گرم لڑکی۔ سب کچھ آ جائے گا اس میں۔"
مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپ میری زندگی بچانے میں جو دلچسپی لے رہے ہیں اس کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ... لیکن میں اپنی قسمت آزمانا چاہ رہا ہوں۔ پیسوں کی کمی بیشی میرے لیے کچھ زیادہ اہم نہیں ہے۔"
درحقیقت میرا دل گھبرانا شروع ہو گیا تھا۔ اس شخص کا آنا اور اس کا مشتعل بڑھانے کا انداز مجھے بالکل پسند نہیں آ رہا تھا۔
وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "ٹھیک ہے بھئی! اگر تم اپنی زندگی سے کھیلنا ہی چاہتے ہو اور تم نے ارادہ ہی کر رکھا ہے تو میں تمہیں کیسے روک سکتا ہوں۔ بہرحال، اس مصیبت سے بچانے کے لیے میں تمہیں ایک آخری آفر کر دیتا ہوں اور کھیل کے قاعدے کے مطابق میں اس سے زیادہ آفر کر بھی نہیں سکتا... پورے چالیس ہزار روپے۔ اگر تم چاہو تو چالیس ہزار لے کر یہ کھیل یہیں پر چھوڑ سکتے ہو۔ دونوں طرف کے لوگوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"
میں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ خبر نہیں کہ وہ سچ بول رہا تھا یا جھوٹ؟ اس کے چہرے سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اگر وہ سچا نہیں تھا تو پورے یقین کے ساتھ اسے جھوٹا بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو۔ میں نے مدد طلب نظروں سے عمران کو دیکھا۔ ان لمحوں میں وہ بھی ذرا تذبذب میں نظر آیا۔ یہ تذبذب، تحیر اور تجسس تقریباً ہر چہرے پر نظر آ رہا تھا اور شاید یہی کیفیات تھیں جن کے حصول کے لیے یہ من چلے جواری اس سرکس کے ایسے پرائیویٹ شوز میں شرکت کرتے تھے۔
ایکا ایکی مجھے اپنے اندر کی ہیجان خیز توانائی کم ہوتی محسوس ہوئی۔ مجھے لگا کہ ریوالور کے دستے پر میری گرفت کمزور پڑتی جا رہی ہے۔ میں اچانک جیسے ایک دوراہے پر آ گیا۔ یہ شخص بھی شاید یہی چاہتا تھا کہ میں دوراہے پر آ جاؤں۔ میرا تذبذب تماشائیوں کو لطف دے رہا تھا۔ تب میری نظر ایک بار پھر عمران پر پڑی۔ جونہی ہماری نظریں چار ہوئیں، عمران نے سر کے اشارے سے مجھے کھیل چھوڑنے کا عندیہ دیا۔ پتا نہیں کہ اس نے ایسا کیوں کیا لیکن جو کچھ بھی تھا، اس کا یہ اشارہ میرے لیے مددگار ثابت ہوا۔
میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے ریوالور میز پر رکھ دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کئی لوگوں کو کھیل چھوڑنے پر افسوس ہوا۔ کئی ایک نے تالیاں بجائیں۔ عمران نے اسٹیج پر آ کر میرا کندھا تھپکا۔ عمر حیات نے اسی وقت چالیس ہزار روپے کا ایک چیک کاٹ کر مجھے دیا جو میں نے عمران کو تھما دیا... عمر حیات نے اناؤنسمنٹ کرنے والے انداز میں کہا۔ "پیارے ساتھیو! اب ہم دیکھتے ہیں کہ برخوردار نے گھاٹے کا سودا کیا ہے یا فائدے کا۔ اسے 35 ہزار روپے مزید ملتے تھے یا 38 بور کی گولی ملنی تھی۔"
اس کے ساتھ ہی اس نے ریوالور اٹھایا اور اسے اسٹیج کے سامنے کی کچی زمین کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ "ٹرچ" کی آواز کے بجائے ایک دھماکا ہوا اور گولی زمین میں پیوست ہو گئی۔ میں اندر سے لرز کر رہ گیا۔ کچھ افراد نے تالیاں بجا کر اس پر خوشی کا اظہار کیا۔ کچھ منکر بندے جواری افسردہ نظر آئے۔ عمران نے ایک بار پھر جوش سے میری پیٹھ تھپکی۔ اسسٹنٹ منیجر عباس نے ایک بار پھر اعلان کیا کہ حاضرین میں سے کوئی اور اپنی قسمت آزمانا چاہتا ہے؟ لگتا تھا کہ اب کوئی نہیں اٹھے گا۔ ویسے بھی گھڑی کی سوئیاں رات ڈھائی بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ عباس نے یہ محفل برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔
"کیسا لگا یہ سب کچھ؟" عمران نے پوچھا۔
"میں اس پر کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔
"تمہارے ذہن میں ایک سوال تو ضرور ابھر رہا ہوگا۔ فلموں وغیرہ میں جب ہم یہ ریوالور والا کھیل دیکھتے ہیں تو اس میں ریوالور کنپٹی پر رکھا جاتا ہے۔ یہاں پیٹ پر رکھا جاتا ہے، آخری پسلی سے قریباً ایک انچ نیچے... دراصل بات یہ ہے کہ اس طرح ہم نے اس کھیل کو تھوڑا سا کم خطرناک کیا ہے۔ گولی چلنے کے بعد بندے کے بچنے کا امکان موجود رہتا ہے۔ پچھلے چھ مہینے میں صرف تین بندوں کی جان گئی ہے۔ دس پندرہ ایسے ہیں جو گولی چلنے کے باوجود بچ گئے۔ اپنا یہ سلیمان عرف شہزادہ بھی ان میں شامل ہے۔ اسے پانچ مہینے پہلے گولی لگی تھی۔ اب یہ بھلا چنگا ہے اور سرکس میں اپنے سارے آئٹم پورے کر رہا ہے۔"
"تمہارا کیا خیال ہے کہ تین بندوں کی جان چلی جانا معمولی بات ہے؟"
"موت تو ہر جگہ موجود رہتی ہے یار! راہ چلتے ہوئے ٹھوکر لگنے سے بھی موت واقع ہو جاتی ہے۔ ہر جگہ لوگ مر رہے ہیں۔ دہشت گردی سے، ٹریفک حادثوں سے، لڑائی جھگڑوں سے، بیماریوں سے اور... خودکشیوں سے۔"
میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں تھا۔
اسی دوران میں اس کے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ کچھ دیر تک 'ہوں ہاں' میں جواب دیتا رہا پھر فون بند کر دیا۔ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ "لو، آج لاہور شہر میں جو ڈیڑھ دو سو بندہ مختلف طریقوں سے مرنا تھا، ان میں ایک کی کمی واقع ہو گئی ہے۔"
"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔
"وہ لڑکا جو یہاں گولی سے زخمی ہوا تھا، اب خطرے سے باہر ہے۔ امید ہے کہ وہ ایک آدھ دن میں زندگی کی طرف لوٹ آئے گا۔"
"اور اگر وہ نہ لوٹتا تو پھر؟ اس کا خون کس کے سر ہوتا؟"
"اگر مجھے یا تمہیں گولی لگ جاتی تو ہمارا خون کس کے سر پر ہوتا؟ ہمارے اپنے سر پر ہی ہوتا۔ آج صبح یا کل کے اخبار میں چھوٹی سی خبر آتی کہ عمران ہیرو نام کا ایک لڑکا جو فلاں سرکس میں موٹر سائیکل کے کمالات دکھاتا تھا، اپنے ریوالور کی صفائی کرتے ہوئے گولی چلنے سے شدید زخمی ہوا اور فلاں پرائیویٹ اسپتال میں ٹائیں ٹائیں فش ہو گیا۔ بس حادثاتی موت... نہ کوئی ایف آئی آر، نہ مدعی، نہ ملزم..."
"اگر ان تماشائیوں میں سے کوئی مخبری کر دے تو؟ یا ان تماشائیوں میں ہی کوئی اخباری رپورٹر وغیرہ موجود ہو؟"
"تو بھی کچھ نہیں ہوتا۔ یہاں سے بہت سے لوگوں کو منتھلیاں وغیرہ جاتی ہیں یار! اوپر تک سلسلہ ملا ہوتا ہے۔ اب جو جو رقمیں ہم نے جیتی ہیں یا کمائی ہیں، ان میں سے 20 فیصد ہمیں یہاں دینا ہوگا۔ اسپیشل شو کے اسپیشل ٹکٹ سے اکٹھی ہونے والی رقم علیحدہ ہے۔ میری جیب میں اس وقت تین لاکھ روپے آ گئے ہیں۔ پنڈال چھوڑنے سے پہلے ساٹھ ہزار روپے مجھے یہاں جمع کرانے ہیں۔ اسی طرح تمہارے پاس ستر ہزار روپے آئے ہیں۔ اس میں سے چالیس ہزار کا چیک ہے۔ چیک کا حساب بعد میں ہو جائے گا۔ تیس ہزار میں سے چھ ہزار روپے تم ابھی یہاں جمع کرا دو گے۔ یہ سب کچھ سسٹم کے ساتھ چلتا ہے۔"
کچھ ہی دیر بعد ہم پھر موٹر سائیکل پر سوار تھے اور کھلی سنسان سڑک پر جا رہے تھے۔ میں جب اس سرکس میں آیا تھا تو میری جیب میں صرف آٹھ دس روپے تھے۔ اب میری جیب میں تقریباً چوبیس ہزار کے کرنسی نوٹ تھے۔ اس کے علاوہ چالیس ہزار روپے کا اوپن چیک تھا۔ میرے دل و دماغ کی کیفیت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ ابھی قریباً ایک گھنٹا پہلے میں اپنی مرضی کے ساتھ ایک نہایت خطرناک مرحلے سے گزرا ہوں۔ میں نے ایک ریوالور کے ذریعے اپنے جسم پر دو بار گولی چلانے کی کوشش کی ہے۔
عمران نے موٹر سائیکل کو پھر ہوائی جہاز بنا دیا تھا۔ اب تو لاہور کی سڑکیں بھی بالکل خالی تھیں۔ رات کے تین بجے کا عمل تھا۔ ہر دم مچلتا اور شور مچاتا شہر تاریکی کی چادر اوڑھے سو رہا تھا۔ تیز ہوا میری جسمانی چوٹوں کو تکلیف دے رہی تھی مگر پتا نہیں کہ کیا بات تھی، جسمانی اذیت مجھے زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ذہنی اذیت کو کم کرنے کے لیے میں نے موٹر سائیکل پر بیٹھے بیٹھے سکون بخش دوا کی دو گلابی ٹکیاں مزید نگل لیں اور آنکھیں بند کر لیں۔
"ہاں میرے یار! اب کیا پروگرام ہے؟ میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اس کے مطابق اب تم آزاد ہو۔ اگر جانا چاہو تو جہاں جی چاہے اتر جاؤ... لیکن اگر ابھی میرے ساتھ رہنا چاہو تو بسر و چشم۔ میرا گھر اور میرا دل تمہارے لیے حاضر ہیں۔"
ذرا دیر کے لیے تو دل چاہا کہ اسے رکنے کے لیے کہوں اور یہیں گڑھی شاہو کے آس پاس کہیں اتر جاؤں لیکن پھر ذہن میں آیا کہ اتنی رات گئے، ایسی حالت میں کہاں جاؤں گا، کیا کروں گا؟ میں خاموش رہا... وہ چہکا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ خاموشی نیم رضامندی کی ہے۔ زبردست... بڑا اچھا فیصلہ ہے۔ زیادہ نہیں تو کم از کم آج رات کے لیے تو ضرور رکو۔ کل اپنے آئندہ کے پروگرام کے بارے میں اچھی طرح سوچ بچار کر لو۔ بندے نے جتنا بڑا فیصلہ کرنا ہو اس کے لیے اتنا ہی زیادہ وقت بھی استعمال کرنا چاہیے۔"
راوی روڈ کی طرف جاتے جاتے اس نے ایک دم موٹر سائیکل ریلوے اسٹیشن کی طرف گھما دی۔ "ادھر کہاں جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔
"تھوڑا سا بوجھ ہلکا کرنا چاہ رہا ہوں۔" اس نے کہا۔

www.pkdigest.com

میں سمجھا کہ وہ ٹوائلٹ وغیرہ کی بات کر رہا ہے لیکن یہ اندازہ غلط نکلا۔ اس نے اسٹیشن کے پاس اپنی موٹر سائیکل ایک چھوٹے سے دو منزلہ مکان کے سامنے روکی۔ دو تین بار کال بیل بجائی پھر لوہے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک دبلا پتلا ادھیڑ عمر شخص پاجامہ کرتہ پہنے باہر نکلا۔ عمران کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمکیں۔ میں آٹھ دس قدم دور کھڑا تھا۔ ادھیڑ عمر شخص نے مدھم لہجے میں کچھ کہا۔ جواب میں عمران نے اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی۔ یہ یقیناً کچھ کرنسی نوٹ تھے۔ ادھیڑ عمر شخص کو نوٹ دکھائے بغیر عمران نے اس کے کرتے کی جیب میں ڈال دیے۔ ادھیڑ عمر شخص حیران تھا اور بے حد خوش بھی، وہ عمران سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ عمران نے اسے بولنے کا زیادہ موقع نہیں دیا اور اسے خدا حافظ کہہ کر دوبارہ موٹر سائیکل پر آ بیٹھا۔ موٹر سائیکل ایک بار پھر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ قریباً دو، کلومیٹر آگے آنے کے بعد عمران نے ایک اور حرکت کی۔ وہ ایک شاپنگ مارکیٹ کے سامنے رکا۔ مارکیٹ کے برآمدوں میں بہت سے مزدور ٹائپ لوگ میلے کچیلے کمبل اور چادریں وغیرہ اوڑھے سو رہے تھے۔ تاہم یہاں دس پندرہ افراد ایسے بھی تھے جو ایک کونے میں الاؤ روشن کیے بیٹھے تھے۔ یہ مزدور پیشہ لوگ جیسے یہاں عمران ہی کے انتظار میں تھے۔ جونہی عمران کی عجیب الخلقت موٹر سائیکل کی آواز ان کے کانوں تک پہنچی، وہ جوش کے عالم میں اپنی جگہوں سے کھڑے ہو گئے۔ عمران نے موٹر سائیکل ان کے بیچوں بیچ جا روکی۔ ”سلام ہیرو بھائی... سلام بھائی جان... سلام جی۔“ بہت سی ملی جلی آوازیں ابھریں۔

عمران نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ جیکٹ کی جیب میں ڈالا۔ یہ پانچ سو والے نوٹ تھے... وہ بڑی تیزی سے ایک ایک نوٹ ہر شخص کے ہاتھ میں تھماتا چلا گیا۔ شور سن کر کچھ سوئے ہوئے افراد بھی جاگ گئے اور بھاگتے ہوئے موقعے پر پہنچ گئے۔ دو تین منٹ کے اندر عمران نے پانچ سو کے نوٹوں کی شکل میں تیرہ چودہ ہزار روپے تقسیم کر دیے اور پھر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ اب اس کا رخ سیدھا گھر کی طرف تھا۔

”سلطانہ ڈاکو کا نام سنا ہوا ہے تم نے؟“ اس نے موٹر سائیکل چلاتے چلاتے بلند آواز میں پوچھا۔

”کیوں، کیا بات ہے؟“ میں نے کہا۔

”سلطانہ ڈاکو میرے پڑدادا کے چچیرے بھائی کی بہن کا بیٹا تھا۔ اس کے علاوہ وہ میرے پڑنانا کی بہن کا دیور بھی لگتا تھا۔ سلطانہ ڈاکو امیروں سے مال لوٹ کر غریبوں میں بانٹتا تھا۔ میں بھی کبھی کبھی اس سے ملتا جلتا کام کرتا ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ امیروں پر پستول تان کر ان کو لوٹتا تھا، میں خود پر پستول تان کر ان کو لوٹتا ہوں... بلکہ آج تو تم نے بھی اس سے ملتا جلتا کام کیا ہے۔ بھئی واہ... میں بہت خوش ہوا ہوں۔ مجھے بالکل بھی امید نہیں تھی کہ تم ”دو چھ“ کھیلنے کی ہامی بھر لو گے۔ جینا اسی کا نام ہے میری جان...! آگے بڑھ کر جیو... سانس تو سب ہی لیتے ہیں مگر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سانس لینے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔“

وہ بے پر کی اڑا رہا تھا اور اس سے زیادہ رفتار کے ساتھ اس کی موٹر سائیکل اڑ رہی تھی۔ جلد ہی ہم راوی روڈ کی گنجان آبادی میں داخل ہو گئے۔ رات کے اس پہر بازار سنسان پڑا تھا۔ ایک چوکیدار اور دو تین آوارہ کتوں کے سوا کوئی متنفس دکھائی نہیں دیا۔ عمران نے حسب سابق چابی لگا کر گھر کا دروازہ کھولا اور میرے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ بہر حال، اس نے ایک احتیاط یہ کی تھی کہ اپنی شور مچاتی موٹر سائیکل کو بازار میں ہی بند کر دیا تھا۔ غالباً وہ نہیں چاہتا تھا کہ اڑوس پڑوس والے اس شور کو شورِ محشر سمجھتے ہوئے کلمہ پڑھ کر بیدار ہو جائیں۔

کچھ ہی دیر بعد ہم نرم گرم کمرے میں کمبل اوڑھے اپنے اپنے بستر پر لیٹے تھے۔ میں جاگ رہا تھا اور میرے ساتھ عمران بھی جاگ رہا تھا۔ یقیناً وہ میرے بارے میں اور میرے حالات کے بارے میں جاننا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے وہ مجھ پر کسی طرح کا دباؤ ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے جیسے یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ بس ہم کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ رات آخری پہر میری آنکھ لگ گئی۔ دوبارہ بیدار ہوا تو دن چڑھ آیا تھا۔ گھر سے باہر کا مخصوص شور سنائی دے رہا تھا۔ اس چار دیواری سے باہر زندگی ہر طرف رواں دواں تھی۔

نتھنوں سے کھانے کی خوشبو ٹکرائی۔ دیکھا تو سامنے میز پر ایک بھرپور ناشتا چنا ہوا تھا۔ ڈبل روٹی، مکھن، فرائی انڈے، حلوہ پوری چنے اور دودھ وغیرہ۔ عمران میرے سرہانے کھڑا تھا۔ اسی نے میرے شانے کو ہلا جلا کر مجھے جگایا تھا۔ میں اٹھا تو بے ساختہ کراہنے پر مجبور ہو گیا۔ کل جو کچھ میرے ساتھ اور میرے جسم کے ساتھ ہوا تھا، وہ اپنی موجودگی کا پورا پورا احساس دلا رہا تھا۔ ایک ٹانگ تو چوٹ کے سبب بالکل اکڑ گئی تھی۔ میں کل بھی سارا دن لنگڑاتا رہا تھا مگر آج یہ

لنگڑاہٹ ضرورت سے زیادہ تھی۔ تھوڑی کے نیچے والے گہرے کٹ سے بھی خون رستا ہوا تھا۔ یہاں میری اپنی ہی بیلٹ کا آہنی بکل لگا تھا۔ اس بیلٹ نے میرے جسم پر کئی اور جگہ بھی گہرے نشان چھوڑے تھے۔ کل کے سارے واقعات ایک دم ذہن میں آئے اور سینے میں گاڑھا سیاہ دھواں سا بھر گیا... امی کیا سوچ رہی ہوں گی؟ عاطف میری تلاش میں کہاں مارا مارا پھر رہا ہوگا؟ فرح کا تو رو رو کر برا حال ہو گیا ہو گا۔ ان سب کا درد و کرب میرے تصور میں آیا اور دل خون کے آنسو رونے لگا۔

عمران کے بے حد اصرار پر میں نے منہ ہاتھ دھو کر چند لقمے زہر مار کیے اور تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ عمران نے مہربان لہجے میں پوچھا۔

”میرا ایک کام کر دو۔“ میرا لہجہ کھویا کھویا تھا۔

”بس ایک کام؟ یار! تم ایک ہزار کام کہو تو میں ابھی کرنے کو تیار ہوں۔ تم کچھ بولو تو سہی۔“

”میں تمہیں ایک نمبر دیتا ہوں۔ یہ میرے گھر کا نمبر ہے۔ اس پر ایک فون کر دو۔ وہاں سے جو بھی بولے، اسے میرے بارے میں بتا دو کہ میں بالکل خیریت سے ہوں اور ایک دو دن میں ان سے رابطہ کروں گا۔ وہ پریشان نہ ہوں۔ اس کے سوا کچھ نہیں بتانا ہے، یہ اطلاع دے کر فون بند کر دینا۔“

”لیکن یار! یہ کام تم خود کر لو تو زیادہ اچھا نہیں؟“

”اس کا مطلب ہے... کہ تم کرنا نہیں چاہتے؟“

”ارے... نہیں یار! ایک تو تم ناراض فٹافٹ ہو جاتے ہو۔ لو میں کر دیتا ہوں فون۔“

اس نے فوراً موبائل نکالا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اسے گھر کا نمبر بتایا۔ وہ کال ملانے لگا تو میں نے اسے روک دیا۔ ”نہیں... یہاں نہیں... دوسرے کمرے میں جا کر کر لو۔ لیکن ان سے کوئی اور سوال جواب نہیں کرنا۔ جو کچھ پوچھنا ہے... مجھ سے پوچھ لینا۔“

”واقعی؟“ اس نے حیرت آمیز خوشی سے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بات کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ پتا نہیں کیوں میرا حوصلہ ایک دم اتنا ٹوٹ گیا تھا۔ اپنے گھر والوں کا سامنا کرنا یا ان سے بات کرنا تو دور کی بات ہے، مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ عمران میرے سامنے ان کو کال کرے۔

دو تین منٹ بعد عمران واپس آیا۔ اس کے چہرے پر دکھ کا تاثر تھا۔ ”کس نے بات کی؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ تمہاری والدہ تھیں۔ بس روئے جا رہی تھیں۔ خدا رسول کا واسطہ دے رہی تھیں کہ میں تم سے بات کرا دوں۔“

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کتنی ہی دیر میں نے کوئی بات کی نہ عمران نے۔ آخر اس نے انگلیاں چلا کر اپنے بالوں کو پیشانی سے ہٹایا اور بولا۔ ”لگتا ہے کہ بہت دکھی کر کے آئے ہو اپنے گھر والوں کو۔ تم شکل سے تو ایسے نہیں لگتے۔ کیا کوئی بہت بڑا مسئلہ ہو گیا تھا؟“ اس کی آواز میں ہمدردی اور محبت کا ایسا رچاؤ تھا کہ میری آنکھوں میں جمع ہونے والے آنسو ٹپک پڑے۔ میں نے بمشکل خود پر ضبط کیا۔

وہ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”غم بانٹنے سے ہلکا ہوتا ہے۔ اگر مجھے کسی قابل سمجھتے ہو تو مجھے بتاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ میں تمہاری مدد کر سکوں۔“

میں نے پچھلے چوبیس گھنٹے میں عمران سے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی لیکن پتا نہیں کیوں یہ شخص مجھے اپنے بہت قریب لگ رہا تھا۔ کوئی خاص بات تھی اس شخص میں۔ ہمارے درمیان تھوڑی سی گفتگو مزید ہوئی اور پھر میں نے خود کو اس بات پر آمادہ پایا کہ اسے اپنے حالات کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتا دوں۔

جب یہ موضوع شروع ہوا تو پھر باتیں کھلتی چلی گئیں۔ درمیان میں وہ مجھ سے سوالات بھی کرتا رہا۔ اس کا انداز اتنا اخلاص بھرا تھا کہ میں جو گوشے اس سے چھپانا چاہتا تھا وہ بھی چھپا نہیں پا رہا تھا... قریباً دو گھنٹے کی گفتگو کے بعد عمران میرے بیشتر حالات سے آگاہ ہو چکا تھا۔ میں نے اسے اپنی اور ثروت کی محبت کے بارے میں بتایا۔ واجی اور اس کے غنڈا صفت یاروں کے بارے میں بتایا اور پھر ان حالات کے بارے میں بتایا جن کا شکار ہو کر ثروت، اس کے بھائی اور بہن کو آناً فاناً بیرون ملک جانا پڑ گیا تھا۔

عمران میری ان جسمانی چوٹوں کے بارے میں جاننا چاہتا تھا جو چوبیس گھنٹے پہلے میرے جسم پر آئی تھیں اور اس واقعے کے بارے میں جس نے مجھے مرنے کی حد تک مایوس کر دیا تھا... میں نے اسے اس بارے میں بھی بتا دیا۔ اپنے گھر کے قریب واقع پارک میں اچانک سیٹھ سراج سے میری مڈبھیڑ، میرا سیٹھ سراج کو طمانچہ رسید کرنا اور سیٹھ سراج کے کارندوں کا مجھے مار مار کر نیم جان کر دینا... میں نے یہ بھی کچھ عمران کے گوش گزار کر دیا۔ وہ سنتا رہا اور اس کے چہرے پر عجیب سی سختی نمودار ہوتی رہی۔

میری روداد ختم ہوئی تو وہ گہری نظروں سے مجھے دیکھ

www.pkdigest.com

رہا تھا۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس کا ذہن بڑی برق رفتاری سے کچھ سوچ رہا ہے۔ آخر اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔

"یہ سراج جیسے لوگ ہی ہیں جنہوں نے زندگی کو سزا بنا رکھا ہے۔ یہ عام بندے کو جینے دیتے ہیں نہ مرنے دیتے ہیں۔ ان کے سامنے سر جھکاؤ تو یہ جھکے ہوئے سر کو اور جھکاتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ناک زمین پر رگڑنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور اگر ان سے ٹکر لو تو پھر یہ اپنی طاقت استعمال کرتے ہیں۔ ٹکر لینے والے کو دوسروں کے لیے عبرت ناک مثال بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر اوچھا ہتھکنڈا، ہر وحشی حربہ بروئے کار لاتے ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ اس کی گہری نظریں بدستور میرے چہرے پر رہیں۔ کچھ دیر بعد وہ اچانک بولا۔ "کیا چاہتے ہو... ایک بار مزہ چکھا دیا جائے اس سیٹھ کو؟"

"میں سمجھا نہیں۔"

"اینٹ کا جواب پتھر سے بھی دیا جا سکتا ہے لیکن اینٹ کا جواب کم از کم اینٹ سے تو ہم دے ہی سکتے ہیں۔ میرے پاس ایک دو بندے ایسے ہیں جو زہریلے مچھر کی طرح سیٹھ کی ناک میں گھس کر اس کا جینا حرام کر سکتے ہیں۔"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ بڑا خبیث بندہ ہے۔ ہر حد تک جا سکتا ہے... اور میری ماں ہے، بہن بھائی ہیں۔ میں ان کے لیے خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

"اس کی بھی ماں ہوگی۔ ماں نہیں ہوگی گھر والے تو ہوں گے۔ بیوی بچے، بہن بھائی... کیا وہ اکیلا ہی دنیا میں ٹپکا ہوا ہے؟"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میں ایسا نہیں چاہتا۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے اپنی ٹھوڑی کی گیلی پٹی اتارتے ہوئے کہا۔

"یہ تو نہیں ہو سکتا کہ تم کچھ نہ چاہ رہے ہو۔ جو کچھ سیٹھ نے تمہارے اور ثروت وغیرہ کے ساتھ کیا ہے، اس کے بعد تو سیون ایم ایم کی تین چار گولیاں اس کے کھوپڑے میں ٹھونک دی جائیں تو یہ بھی کم ہوگا۔ اگر یہ نہیں تو پھر بھی کچھ نہ کچھ سزا تو اسے ملنی ہی چاہیے۔ تم نہ بھی دو گے تو میں ضرور دوں گا۔"

"کیا مطلب؟"

"سیٹھ کی تھوڑی سی دھلائی، تھوڑی سی کھینچا کھینچی اور چھینا جھپٹی... لیکن گھبراؤ مت، تم اس میں ملوث نہیں ہو گے۔ تم بس کسی محفوظ جگہ پر بیٹھ کر تماشا دیکھنا۔ اس سے تمہیں تھوڑا سا سکون ملے گا اور مجھے بھی۔"

"تم پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔"

"نہیں، میں تو صاف اور سیدھی بات کر رہا ہوں۔ سیٹھ نے جو کچھ کیا اس کی سزا تو کافی سنگین ہونی چاہیے لیکن چلو، شروع میں چھوٹا سا ٹریلر ہی سہی۔ میرا جی چاہ رہا ہے جانِ من... سیٹھ کی اس جگہ درگت بنائی جائے جہاں اس نے تم سے مارا ماری کی ہے۔ وہی لوگ اس کا تماشا بھی دیکھیں جنہوں نے تمہارا تماشا دیکھا تھا۔"

"اگر ایسا ہو بھی گیا تو اس سے کیا ہوگا؟"

"بس میرا کلیجا ذرا ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اور تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ بالکل علیحدہ معاملہ ہوگا۔ اس کو تمہارے معاملے سے بالکل بھی منسلک نہیں کیا جا سکے گا... سمجھو کہ ہم راہ چلتے سیٹھ سے جھگڑا مول لیں گے اور آناً فاناً اس کی درگت بنا دیں گے۔ تم دیکھنا، بڑی کلاسیکل سچویشن بنے گی۔"

"مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"تمہیں کس سے دلچسپی ہے؟ بتاؤ... کس سے دلچسپی ہے؟ دنیا میں کوئی کام ایسا نہیں جسے انسان مضبوط ارادے کے ساتھ کرنا چاہے اور وہ نہ ہو سکے۔ اگر پہاڑ اپنی جگہ سے ہلائے جا سکتے ہیں، دریاؤں کے رخ موڑے جا سکتے ہیں اور چاند پر قدم رکھا جا سکتا ہے تو اور کون سا کام مشکل ہوگا۔ اگر ثروت بی بی کی یاد تمہارے دل کو زخمی کر رہی ہے تو اس کا علاج بھی ممکن ہے۔ اسے بھی ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ نہ صرف ڈھونڈا جا سکتا ہے بلکہ اس سے قبول ہے، قبول ہے بھی کرایا جا سکتا ہے۔ دیکھو، یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ سارے کام ممکن ہیں۔ لیکن شرط یہی ہے کہ پہلے تم اپنے دل و دماغ پر چھائی ہوئی مایوسی کی دھند صاف کرو۔ زندگی کرکٹ کے کھیل کی طرح ہے پیارے، باؤلنگ کتنی بھی سخت ہو، پچ کتنی بھی خراب ہو لیکن وکٹ پر کھڑے رہنا بہرحال، آؤٹ ہونے سے بہتر ہوتا ہے۔ بندہ وکٹ پر کھڑا رہے تو خوشیوں کا تھوڑا تھوڑا اسکور خود ہی بننا شروع ہو جاتا ہے۔ بڑی بڑی ہٹیں نہ بھی لگ سکیں تو کہیں بائی کا اسکور ہو گیا، کہیں نو بال یا وائیڈ بال کا رن مل گیا... اور کچھ نہیں تو وکٹ کیپر نے ہی محبت کا ثبوت دیا اور بال چھوڑ کر پیچھے سے چوکا کرا دیا اور اگر..."

"یار! میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "لیکن فی الحال میں ذرا تنہائی چاہ رہا ہوں۔ کچھ دیر اکیلے میں سوچنا چاہ رہا ہوں۔"

"مگر اکیلے بندے کے ساتھ تو شیطان ہوتا ہے اور

تمہارا شیطان تو ہے بھی ذرا خطرناک قسم کا... گندم میں رکھنے والی گولیوں کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔"

"نہیں، میں اس طرح نہیں سوچوں گا۔" میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

"لیکن یار میرے... سوچنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ پنجابی میں نہیں کہتے کہ سوچیں پیاتے بندہ گیا۔ سوچنے کے بجائے کرنا چاہیے۔ جو لوگ کرتے ہیں، وہی دنیا بدلتے ہیں اور اپنے حالات بھی..."

وہ لسوڑے کی لیس کی طرح مجھ سے چمٹ گیا تھا۔ مسلسل باتیں کر رہا تھا اور واقعی میرے ذہن کو مایوسی اور پریشانی کی طرف جانے نہیں دے رہا تھا۔ اس نے جیسے خود ہی طے کر لیا تھا کہ میں نے کم از کم دو تین دن مزید تو یہاں ضرور رہنا ہے۔ اس حوالے سے اس نے اپنے پڑوسی زاہد بھائی کو بھی بتا دیا تھا اور اسے میری خیر خیریت سے بھی آگاہ کیا تھا۔ زاہد کو یہی پتا تھا کہ میں کل ریلوے اسٹیشن کی نامعقول سیڑھیوں سے پھسل کر گرا ہوں جس کی وجہ سے مجھے چوٹیں آئی ہیں۔ عمران کی طرح اس کے پڑوسی زاہد نے بھی اسٹیشن کی سیڑھیوں اور سیڑھیاں بنانے والوں کو بے نقط سنائی تھیں... بلکہ ریلوے کا محکمہ، ریلوے منسٹر، موجودہ حکومت اور اس سے آگے امریکا تک بھی شدید مذمت کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔

www.pkdigest.com

میری ٹانگ میں رات بھر شدید درد ہوتا رہا۔ اگلے روز کچھ افاقہ ہو گیا۔ بہرحال، سہ پہر کے وقت عمران نے بہ اصرار مجھے ایک مہران گاڑی میں سوار کیا اور ڈاکٹر کو دکھانے لے چلا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کا کوئی دوست آرتھوپیڈک ڈاکٹر ہے۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ چوٹ اتنی شدید ہے کہ ہڈی کے ڈاکٹر سے معائنہ کرایا جائے مگر عمران بضد رہا۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مجھے بہانے سے باہر لے کر آیا تھا۔ بازار سے گزرتے ہوئے ایک بار پھر اس کی سب سے ہیلو ہائے ہوئی۔ ایک تھڑے پر بیٹھے ہوئے چاچے نذیر کے قریب گاڑی روک کر عمران نے پوچھا۔ "ہاں چاچا... ختم ہو گئی چائے کہ ہے؟"

بہرے نذیر نے کان پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "گائے؟ گائے کا دودھ آج کل کہاں ملتا ہے ٹیکے دے کے؟"

"گائے نہیں... چائے... چائے۔" عمران نے زور سے کہا۔ "چائے ختم ہو گئی کہ ہے؟" اس دفعہ نذیر نے جواب دیا کہ ختم ہو گئی۔ عمران نے پچھلی سیٹ پر رکھا ہوا خشک چائے کا بڑا ڈبا اٹھا کر چاچے نذیر کو تھما دیا۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔

وہ دعائیں دینے لگا۔ گاڑی برق رفتاری سے بازار سے نکل کر بڑی سڑک پر آ گئی۔ گاڑی کے شیشے رنگ دار تھے۔ بغور دیکھنے پر ہی باہر سے کچھ نظر آ سکتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے الجھن ہو رہی تھی۔ اگر کوئی شناسا اندر جھانکنے میں کامیاب ہو جاتا تو پھر؟

اس وقت میری بے چینی بڑھ گئی جب میں نے دیکھا کہ عمران کا رخ میرے علاقے کی طرف ہے۔ "یہ کہاں جا رہے ہو؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"تمہیں، تمہارے گھر والوں سے ملانے نہیں لے جا رہا ہوں یار! مجھے پتا ہے کہ تمہیں اختلاج قلب ہو جائے گا۔ ہمارا راستہ ہی یہ ہے..."

دو تین منٹ بعد میری بے قراری عروج پر پہنچ گئی۔ وہ بڑی تیزی سے اس پارک کے قریب پہنچ رہا تھا جہاں دو دن پہلے میری زندگی کا اندوہناک ترین واقعہ پیش آیا تھا۔ میں نے کار کے اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "گاڑی روکو۔" میرا لہجہ غصیلا تھا۔

وہ گاڑی روکتے روکتے بھی قریباً نصف فرلانگ آگے چلا گیا۔ یہاں سے وہ منحوس پارک صاف دکھائی دے رہا تھا جہاں دو دن پہلے سیٹھ سراج اور اس کے کارندوں سے میری خوفناک مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ وہ زیر تعمیر عمارت بھی نظر آ رہی تھی جس کی تعمیر غالباً سیٹھ سراج خود کرا رہا تھا۔ یہ عمارت ایک طرح سے پارک کی زمین پر ہی بنائی جا رہی تھی۔ "یہ تم کیا ڈراما کر رہے ہو؟" میں نے ہراساں ہو کر پوچھا۔

"ڈراما نہیں یار... چھوٹا سا چٹکلا ہے۔"

میں نے اپنی پی کیپ کو چہرے پر کچھ اور بھی جھکا لیا اور نیچے کھسک کر بیٹھ گیا۔ یہ جگہ میرے گھر سے ایک کلومیٹر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اس امر کا پورا اندیشہ موجود تھا کہ میرا کوئی شناسا مجھے یہاں دیکھ لیتا۔ میں نے دل ہی دل میں عمران کو صلواتیں سنائیں۔ میری چھٹی حس نے کہا کہ وہ یہاں کوئی گڑبڑ کرنے والا ہے۔ "کیا ارادے ہیں تمہارے؟" میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"ہمارے ارادے تو کچھ نہیں۔ ہم تو کہیں بیٹھے رہیں گے، بس تھوڑا سا تماشا دیکھیں گے۔"

"کیسا تماشا؟ کیا تم... سیٹھ سراج کے ساتھ کچھ کرنے لگے ہو؟" میرا خوف بڑھتا جا رہا تھا۔

"سیٹھ سراج کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے یار! وہ کوئی چھیل چھبیلی لڑکی تو نہیں ہے۔ اور اگر کچھ تھوڑا بہت ہونا بھی ہے تو وہ ہمیں نہیں کرنا۔ ہمارا کوئی تعلق نہیں اس معاملے سے..."

''تم ایک دم حماقت کی باتیں کرتے ہو۔ میں یہاں رکنا نہیں چاہتا۔'' میرے لہجے میں شدید جھلاہٹ تھی۔

''تو اتر کر چلے جاؤ۔'' وہ مسکرایا۔

وہ جانتا تھا کہ میں یہاں جانے پہچانے لوگوں کے درمیان گاڑی سے اترنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میں نے ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر رکھا مگر دروازہ کھولنے کی ہمت نہیں کر سکا۔

ہماری اس گفتگو کے درمیان میں ہی میں نے عمران کو ذرا چونکتے دیکھا۔ ہماری گاڑی کے پاس سے ایک سوزوکی پک اپ (ہائی روف) گزری۔ مجھے شک ہوا کہ اس میں سیٹھ سراج تھا۔ ویسے تو وہ اپنی سیاہ چمکیلی ہنڈا میں سفر کرتا تھا تاہم اس کے علاوہ بھی وہ ایک دو گاڑیاں استعمال کرتا تھا۔ سفید پک اپ کے پیچھے ہی پیچھے ایک نیلی اسٹیشن ویگن تھی۔ پک اپ کا رخ پارک کی طرف تھا۔ غالباً سیٹھ سراج شام سے پہلے زیر تعمیر عمارت کا کام دیکھنے جا رہا تھا۔ ابھی وہ پارک سے دور ہی تھا کہ زوردار آواز آئی۔ پک اپ نے ہلکی سی بریک لگائی تھی۔ عقب میں آتی ہوئی نیلی اسٹیشن ویگن کے ڈرائیور نے دھماکے سے گاڑی پک اپ میں ٹھونک دی تھی۔

ایک دم بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ دور سے ہی نظر آ رہا تھا کہ نئے ماڈل کی سوزوکی کا پچھلا حصہ پچک کر رہ گیا ہے اور پھر میرا شک یقین میں بدل گیا۔ سوزوکی ہائی روف میں سیٹھ سراج ہی تھا۔ وہ اپنے چوڑے چکلے جسم کو ہچکولے دیتا ہوا سوزوکی کے اگلے بائیں دروازے سے برآمد ہوا۔ نیلی اسٹیشن ویگن میں سے بھی دو تین نوجوان نکل آئے۔ تنازعہ شروع ہو گیا۔ میرا جسم سنسنا رہا تھا۔ عمران نے جو کہا تھا، وہ کر دکھایا تھا۔ جائے حادثہ پر شروع ہونے والا تنازعہ ایک دم ہی لڑائی میں بدل گیا۔ اسٹیشن ویگن میں سے برآمد ہونے والے چار پانچ نوجوان جو یقیناً عمران کے ساتھی ہی تھے، سیٹھ سراج اور اس کے دو کارندوں پر پل پڑے۔ میں نے دیکھا کہ ایک سرخ سپید پٹھان نما شخص کا زوردار تھپڑ کھا کر سیٹھ سراج پشت کے بل پختہ سڑک پر گرا۔ اس کے ایک کارندے نے شاید پک اپ کے اندر سے کوئی ہتھیار وغیرہ نکالنے کی کوشش کی لیکن ایک دوسرے نوجوان نے اسے کمر سے پکڑا اور بے پناہ شدت سے گھما کر ایک الیکٹرک پول سے دے مارا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پٹھان اور اس کا ایک ساتھی سیٹھ سے چمٹ گئے۔ انہوں نے اسے دوبارہ سڑک پر گرایا اور چند سیکنڈ میں روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ اس کے دونوں ہٹے کٹے کارندے بھی اسٹیشن ویگن سے نکلنے والے نوجوانوں کے ہاتھوں بری طرح پٹ رہے تھے۔ یہ سین ذرا قریب سے دیکھنے کے لیے عمران گاڑی سے اترا اور بھاگتا ہوا موقعے پر پہنچ گیا۔ وہ چھڑانے والوں میں شامل ہو گیا۔ تاہم میں نے صاف دیکھا کہ وہ بظاہر تو سیٹھ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اصل میں اپنے ساتھیوں کو مارا ماری کا مزید موقع دے رہا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اسٹیشن ویگن والے نوجوان واپس گاڑی میں بیٹھے... اور آناً فاناً نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ دیکھنے والوں کو یہی لگا تھا کہ شاید وہ گاڑی کو سائڈ پر لگانے لگے ہیں مگر وہ چند سیکنڈ میں اڑن چھو ہو گئے۔ جب تک زیر تعمیر عمارت میں کام کرنے والوں کو اس ''واردات'' کی پوری طرح خبر ہوتی اور وہ دوڑتے ہوئے اپنے آقائے نامدار کی مدد کو پہنچتے، وہاں کچھ نہیں تھا۔ سیٹھ سراج کو سہارا دے کر تباہ حال سوزوکی میں بٹھایا جا رہا تھا۔ اس کا گریبان لہولہان تھا۔ وہ ہاتھ لہرا لہرا کر بلند آواز میں گالیاں بک رہا تھا مگر جن کے لیے یہ گالیاں تھیں، وہ کب کے اس کا تھوبڑا خون آلود کر کے ہوا ہو چکے تھے۔ سیٹھ کے ایک کارندے نے کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مترادف ایک دو ہوائی فائر بھی کیے۔ موٹر سائیکل پر سوار دو ٹریفک پولیس والے بھی وہاں پہنچ گئے مگر اب ان کا آنا بے سود تھا۔

اسی دوران میں عمران دوڑتا ہوا واپس کار میں آ گیا۔ ''بڑا خراب زمانہ آ گیا ہے۔'' اس نے منہ بنا کر کہا۔ ''ذرا سی بات پر لوگ ایک دوسرے کا سر پھاڑنے لگتے ہیں۔ چچ... چچ!''

اس نے گیئر لگا کر کار آگے بڑھائی۔ ہم جائے حادثہ کے پاس سے گزرے۔ وہاں ہجوم کی وجہ سے رفتار خاصی کم تھی۔ میں نے اپنا چہرہ پی کیپ اور ہاتھ کی اوٹ میں چھپایا ہوا تھا۔ میری نظر سیٹھ سراج کی پھٹی ہوئی قمیص اور لہولہان ٹھوڑی پر پڑی۔ سینے میں نفرت آمیز خوشی کی ایک چھوٹی سی لہر دوڑ گئی۔ سیٹھ کے جرم کے مقابلے میں یہ سزا بہت چھوٹی تھی لیکن سزا تو تھی۔ وہ بھناتے ہوئے انداز میں کسی کو موبائل فون سے کال کر رہا تھا۔

سوزوکی پک اپ کا ''پیچھا'' تباہ ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک طرف سے چادر اندر گھس گئی تھی۔ سوزوکی میں تین چار بوریاں لدی ہوئی تھیں۔ ان میں سے دو بوریاں پھٹ گئی تھیں اور بوریوں کے اندر سے چاول وغیرہ باہر نکلے ہوئے تھے۔ کار وہاں سے آگے بڑھ گئی تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔ میں نے عمران سے پوچھا۔ ''اسٹیشن ویگن کا نمبر نوٹ کر لیا گیا تو پھر؟''

''ہمیں کیا۔ اسٹیشن ویگن والے جانیں اور سوزوکی والے۔'' وہ بے پروائی سے بولا مگر میرے چہرے پر غصے کا چڑھ دیکھ کر فوراً بولا۔ ''اصل میں تم نے غور نہیں کیا۔ اسٹیشن ویگن کی نمبر پلیٹ کیچڑ کے چھینٹوں سے بالکل چھپی ہوئی تھی۔ اسے پڑھے جانے کے قابل ہی نہیں چھوڑا گیا تھا...''

''یعنی یہ سب کچھ پوری پلاننگ کے ساتھ ہوا ہے؟'' میں نے کہا۔

''پلاننگ کے بغیر تو پاکستان میں بس حکومت ہی ہو سکتی ہے۔ باقی ہر شے کے لیے تھوڑی بہت پلاننگ تو کرنی پڑتی ہے۔''

ہم ایک ڈیڑھ کلومیٹر آگے گئے تھے کہ عمران کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ایک ہاتھ سے ڈرائیو کرتے ہوئے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف اس کا کوئی ساتھی تھا۔ ''ونڈرفل... سب ٹھیک رہا۔ ایک دم فائیو اسٹار... دو تین دن تو ٹکور چلے گی...'' دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جو عمران نے دھیان سے سنا پھر قدرے سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''ہاں... یہ چیز تو میں نے بھی نوٹ کی ہے۔ میں تم سے بات کرنے ہی والا تھا... ہاں... بالکل... دونوں بوریاں اسی طرح تھیں۔ بڑی نظر ہے بھئی تمہاری بھی... پتا نہیں... مجھے بھی کوئی چکر لگتا ہے... ٹھیک ہے... اوکے۔'' اس نے فون بند کر دیا۔

www.pkdigest.com

مجھے اس کی پیشانی پر سوچ کی سلوٹیں نظر آئیں۔ میں کچھ دیر تو چپ رہا پھر میں نے پوچھا۔ ''بوریوں کی کیا بات کر رہے تھے؟''

''کچھ شک سا پڑا ہے مجھے اور اقبال کو۔'' اس نے اپنے ساتھی کا نام لیا۔

''کیسا شک؟''

''پک اپ میں جو دو بوریاں پھٹی تھیں، ان میں ایک عجیب چیز سامنے آئی ہے۔ بوریوں میں اوپر چاول تھے اور نیچے ساری مٹی بھری ہوئی تھی۔ چاولوں کی تہ مشکل سے دو تین انچ ہو گی۔ گندم میں مٹی کی ملاوٹ تو سنی تھی لیکن چاولوں میں مٹی اور وہ بھی ننانوے فیصد؟'' عمران نے کندھے اچکائے۔

''ہو سکتا ہے کہ وہ مٹی نہ ہو۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

''دیکھنے میں تو مٹی ہی لگتی تھی یار! ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ مٹی کے اندر کچھ اور ہو۔ ویسے یہ سیٹھ سراج جس طرح کا بندہ ہے اس سے کسی بھی قسم کی بری توقع کی جا سکتی ہے۔ واقعی ہو سکتا ہے کہ مٹی کے اندر کچھ اور چھپایا گیا ہو۔ کوئی اسلحہ وغیرہ یا پھر ہیروئن شیروئن... میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ سیٹھ کی تھوڑی سی ''سی آئی ڈی'' کی جائے۔ میرے خیال میں تو ایسے بندے کو کسی مصیبت میں گرفتار کرانا بھی عین ثواب ہے۔''

میں خاموش رہا۔ سیٹھ سراج کو زدوکوب کیے جانے کے مناظر میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ مجھے ہرگز یقین نہیں تھا کہ میں سیٹھ سراج کو اتنی جلدی اپنی ہی طرح کسی کے ہاتھوں سے پٹتے ہوئے دیکھوں گا۔ اس کی گاڑی کا بھی اچھا خاصا نقصان ہوا تھا اور نقصان کے ساتھ وہ پھٹی ہوئی بوریاں۔ سوچنے کی بات تھی کہ وہ یہ بوریاں کہاں لے کر جا رہا تھا جن میں اوپر تھوڑے سے چاول اور نیچے مٹی بھری ہوئی تھی۔ دو بوریوں میں یہ صورت حال تھی تو یقیناً باقی بوریوں میں بھی یہی کچھ ہو گا۔

میں جلد ہی عمران کے ساتھ اس کے گھر واپس پہنچ گیا۔ وہ اپنے اس مشن کی کامیابی پر کافی خوش نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''تمہیں پتا تھا کہ سیٹھ نے اتنے بجے وہاں پہنچنا ہے؟''

''پتا تھا یار! اس کے لیے ہوم ورک کیا تھا باقاعدہ۔''

''اور اگر عمارت میں کام کرنے والی لیبر موقعے پر پہنچ جاتی تو کیا ہوتا؟''

''ہماری اسٹیشن ویگن میں تین چار بندے اور بھی تھے اور ان میں سے ہر ایک، دو تین بندوں پر بھاری ہے۔ اس کے بعد میں خود بھی تو تھا۔ تمہارا یہ یار تمہاری دعا سے پانچ چھ بندوں کو تو بہ آسانی آگے لگا سکتا ہے۔ بھئی، ایسے ہی تو ہیرو کا خطاب نہیں ملا ہوا ہے۔'' اس نے بازو کو موڑ کر قمیص کے اندر سے ہی اپنا مسل دکھایا۔

مجھے اس بات کی تسلی تھی کہ سیٹھ کی ٹھکائی والے معاملے کو کوئی شخص بھی میرے والے معاملے سے منسلک نہیں کر سکے گا۔ ایکسیڈنٹ والا کام بڑی چابک دستی اور پلاننگ سے کیا گیا تھا اور یہ سارا واقعہ بالکل حادثاتی لگتا تھا۔

گھر والوں کی پریشانی کا خیال مجھے ہلکان کر رہا تھا۔ ان سے بات کرنے کو دل چاہتا تھا مگر انہیں فون کرنے کی ہمت مجھ میں ہرگز نہیں تھی۔ خاص طور سے والدہ کا سامنا تو میں کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ عزیزوں، رشتے داروں کا خیال آ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ چچی کی مہربانی سے پوری فیملی میں نہ صرف میری گمشدگی کی اطلاع پھیل چکی ہو گی بلکہ پارک میں میری جو عزت افزائی ہوئی تھی، وہ بھی راز نہیں رہی ہو گی۔ پھر شعلہ بدن آر سہ کا خیال ذہن میں آیا اور سینے میں نفرت کی ایک

بلند لہر محسوس ہوئی۔ یہ آر سہ کی نحوست ہی تھی جو مجھے گھر سے نکال کر پارک میں لائی اور وہاں سیٹھ سراج سے میرا آمنا سامنا ہو گیا۔

میں جب یہ سارے واقعات سوچتا تو خود سے نفرت ہونے لگتی۔ دم گھٹتا محسوس ہوتا اور میں ایک بار پھر خودکشی کے بارے میں سوچنے لگتا۔ بہر حال، حقیقت سے انکار ممکن نہیں تھا اور حقیقت یہی تھی کہ اب میرے اس خیال میں وہ پہلے دن کی سی شدت نہیں رہی تھی۔ اس تبدیلی میں اہم کردار عمران ہی کا تھا۔ وہ کسی لمحے بھی مجھے تنہا نہیں چھوڑتا تھا... یا تو باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتا رہتا یا اپنا کوئی دلچسپ قصہ لے کر بیٹھ جاتا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی ماہر نفسیات کی طرح اپنی انگلیوں سے میرے ذہن کی سطح کو ٹٹولتا ہے اور اسے ہموار کرتا رہتا ہے۔ اس نے ابھی تک اپنے بارے میں مجھے کچھ خاص نہیں بتایا تھا اور نہ میں نے پوچھنے کی کوشش کی تھی۔ صرف اتنا پتا چلا تھا کہ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے اور وہ پچھلے کئی سالوں سے لاہور میں مقیم ہے۔ اسے سرکس کی نوکری کرتے بھی قریباً اتنا ہی عرصہ ہو گیا تھا۔ اپنے اس سرکس کے ساتھ وہ اکثر پنجاب کے مختلف اضلاع میں سفر کرتا رہتا تھا۔

سرِ شام اس نے ایک بار پھر مجھے اپنی مہران کار میں بٹھایا اور سرکس پہنچ گیا۔ آج اس کے ساتھ میں تیسری مرتبہ سرکس آیا تھا۔ پہلے دن کے بعد یہاں کوئی ”اسپیشل شو“ نہیں ہوا تھا۔ اس بارے میں، میں نے عمران سے کچھ تفصیل معلوم کی تھی۔ ایسے شوز ہر مہینے کے پہلے ہفتے کی رات ہوتے تھے۔ عمران نے یہ بتا کر حیران کیا کہ ان اسپیشل شوز کے علاوہ اس سرکس میں کبھی کبھی چار چھ مہینے بعد اسپیشل ترین شو بھی ہوتا ہے۔ اس میں بازی گری کے کچھ انتہائی خطرناک اور خاص الخاص تماشے دکھائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ریوالور والا کھیل بھی ہوتا ہے۔ اس شو میں کھیل کی خاص بات یہ ہوتی ہے کہ کھلاڑی ریوالور کو پیٹ یا جسم کے کسی اور حصے پر رکھنے کے بجائے، سیدھا کنپٹی پر رکھ کر چلاتے ہیں۔ یہ نہایت خطرناک ترین کھیل بس ایک دو کھلاڑی ہی کھیل پاتے ہیں۔ عمران نے مجھے یہ بتا کر مزید حیران کیا کہ وہ خود بھی ایک بار ریوالور کنپٹی پر رکھ کر ”دو چھ“ کا کھیل کھیل چکا ہے۔ یہ کوئی ایک سال پہلے کی بات تھی۔ اس میں اسے ایک باری میں پورے آٹھ لاکھ روپے ملے تھے۔ اس رقم سے اس نے یہ مہران کار خریدی تھی اور اپنے گھر کو ڈیکوریٹ کیا تھا۔

جب ہم سرکس میں پہنچے تو موت کے کنوئیں میں زور و شور سے میوزک بج رہا تھا اور ہلکا پھلکا تماشا شروع ہو چکا تھا۔

ایک گندمی رنگت والا دراز قد شخص عمران کے قریب آیا اور اس کے کان میں کھسر پھسر کی۔ عمران ”ہوں ہاں“ میں جواب دیتا رہا۔ پھر وہ رسٹ واچ دیکھتا ہوا میری طرف آیا اور بولا۔ ”آج ہمیں یہاں سے جلدی نکلنا ہے۔ میں بس کنوئیں والا آئٹم کروں گا، اس کے بعد ہم یہاں سے نکلیں گے۔“

”کہاں جانا ہے؟“

”تمہاری دل لگی کا کچھ سامان ہے یار... تمہارا دل لگا رہے گا تو الٹی پلٹی باتیں نہیں سوچو گے۔“

”میں پوچھ رہا ہوں، جانا کہاں ہے؟“

”زیادہ دور نہیں... بس ساہیوال کے آس پاس۔ ڈھائی تین گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔ وہاں ایک خاص بندے سے ملانا ہے تمہیں۔“

وہ ڈھائی تین گھنٹے کی بات یوں کر رہا تھا جیسے ڈھائی تین منٹ کی بات کر رہا ہو۔ ایک دم میرا دھیان پھر سیٹھ سراج کی طرف چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس بوریوں والے معاملے کی طرف۔ کہیں یہ وہی چکر تو نہیں تھا۔ میں نے اس بارے میں پوچھا لیکن وہ گول مول بات کر گیا۔ رات نو بجے کے قریب موت کے کنوئیں میں اپنا آئٹم ختم کرتے ہی وہ میرے ساتھ کار میں آ بیٹھا اور روانہ ہو گیا۔ وہ کار یا موٹر سائیکل چلاتا نہیں تھا بلکہ اڑاتا تھا اور اڑاتا بھی بہت جانی اسپیڈ سے تھا۔ اتنی ہی اسپیڈ کے ساتھ وہ باتیں بھی کرتا جاتا تھا۔ ”فائیو اسٹار“ اور ”بھوتنی کا“ کے الفاظ وہ تکیہ کلام کے طور پر استعمال کرتا تھا اور خود بھی اپنے ان الفاظ سے محظوظ ہوتا تھا۔ کرکٹ سے اسے خاصی دلچسپی تھی۔ وہ کافی عرصہ کرکٹ کھیلتا بھی رہا تھا۔ اس کی اکثر باتوں میں کرکٹ کے حوالے ملتے تھے۔ بہر حال، اس نے ابھی تک مجھے اپنے ماضی کے بارے میں کچھ خاص نہیں بتایا تھا اور مجھے لگتا تھا کہ اس کے اردگرد کے دیگر لوگ بھی اس کے ماضی کے متعلق کچھ زیادہ نہیں جانتے ہیں۔ اس تھوڑے سے اسرار کے باوجود وہ سب کا دوست تھا اور ہر دل عزیز بھی۔

لاہور سے ساہیوال تک کی سڑک اچھی حالت میں تھی۔ قریباً تین گھنٹے میں ہی ہم ساہیوال پہنچ گئے۔ اس وقت تک رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ہم نے وہاں سے روسٹ چکن اور روغنی نان لیے اور گاڑی کے اندر ہی بیٹھ کر کھائے۔ ساہیوال کا بھرا پُرا شہر رات کے اس پہر قدرے سنسان نظر آ رہا تھا۔ سڑکوں پر ہر طرف کیلے کے چھلکے بکھرے ہوئے تھے۔ ان چھلکوں کو دیکھ کر دو باتوں کا پتا چلتا تھا۔ ایک تو یہ کہ ساہیوال کے علاقے میں کیلے بہت زیادہ ہوتے ہیں اور

دوسرے یہ کہ یہاں کے لوگ چھلکے پھینکنے کے سلسلے میں تھوڑے سے بے پروا بھی ہیں۔ مجموعی طور پر یہ صحت مند اور خوش باش لوگوں کا شہر لگتا تھا۔ رات کے اس پہر بھی چائے خانوں اور چھوٹے موٹے ہوٹلوں پر لوگ موجود تھے اور کیبل پر اسٹیج ڈرامے دیکھ رہے تھے۔ میں ساہیوال پہلی بار دیکھ رہا تھا، تاہم ہماری منزل ساہیوال سے ذرا آگے ہڑپہ کا پرانا شہر تھا۔

میں نے نوالہ لیتے ہوئے کہا۔ ”یار! ایک تو تم ہر وقت بندے کو تجسس میں رکھتے ہو... بتا کیوں نہیں دیتے کہ ہم اتنی رات گئے ہڑپہ میں کس ذات شریف سے ملنے جا رہے ہیں؟“

”یار! اگر ہم کسی مشہور فلمی ایکٹر یا کھلاڑی وغیرہ سے ملنے جا رہے ہوتے تو میں بتا دیتا کہ فلاں بندہ ہے۔ جب تم اس بندے کو جانتے ہی نہیں تو میرے بتانے سے کیا فائدہ ہو گا؟ بہر حال، اتنا جان لو کہ بڑا دلچسپ بندہ ہے اور اس سے مل کر تمہیں خوشی ہوگی۔“

”مجھے اب بھی شک ہے کہ یہ سیٹھ سراج والا چکر ہے۔“

”شک کے معاملے میں تم بالکل کسی بیوی کی طرح ہو۔“ اس نے مرغی کی ٹانگ پر دانت آزماتے ہوئے کہا۔

ہماری گاڑی ایک بار پھر روانہ ہو گئی۔ گاڑی کا ڈیک زور شور سے بج رہا تھا۔ نغمہ گونج رہا تھا۔ ”ہم تمہیں چاہتے ہیں ایسے، مرنے والا کوئی زندگی چاہتا ہو جیسے“

میرے خیالات دور دور تک بھٹکنے لگے۔ میں اپنے ذہن کو اردگرد کے مناظر کی طرف منتقل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ساہیوال سے ہڑپہ جانے والی سڑک بھی شاندار تھی۔ گاڑی بآسانی 125 کلومیٹر کی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔

”بڑی فائیو اسٹار سڑک بنا دی ہے یار انہوں نے۔“ عمران نے کہا۔

مگر اسی دوران میں ایک فائیو اسٹار کھڈا بھی آ گیا اور عمران نے گاڑی کو بمشکل کنٹرول کیا۔ ہڑپہ تک کا سفر قریباً 30 کلومیٹر تھا جو عمران نے پچیس منٹ میں طے کر لیا۔ جلد ہی ہم ایک دو ذیلی سڑکوں پر مڑے اور ہڑپہ کے قدیم شہر میں پہنچ گئے۔ یہ ویسا ہی قصبہ نما شہر تھا جیسا پنجاب کے عام علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ گلیاں، بازار اور چوراہے سو رہے تھے۔ ٹھنڈ نے ہر شے کو جامد کر رکھا تھا اور کھلی جگہوں پر ہلکی ہلکی دھند تھی۔ عمران نے موبائل پر اپنے کسی ساتھی سے رابطہ کر کے اپنی منزل کی درست لوکیشن پوچھی اور پھر گاڑی ایک مکان کے سامنے روک لی۔

جلد ہی ہم ایک نیم گرم کمرے میں دہکتے کوئلوں کی انگیٹھی کے سامنے بیٹھے تھے۔ ہمارے سامنے چائے اور دیگر لوازمات رکھے تھے۔ میزبان واقعی دلچسپ شخص تھا۔ وہ سانولی رنگت کا تھا اور غیر معمولی حد تک فربہ تھا۔ اس کا پیٹ اس کے آگے جیسے ایک بہت بڑے مٹکے کی صورت میں رکھا ہوا تھا۔ وہ ہنستا تھا تو اس کا پیٹ بھی اچھل اچھل کر ساتھ دیتا تھا۔ میزبان کی عمر پینتیس سال کے قریب ہوگی۔ اس کا نام امتیاز تھا اور وہ پانچ مرلے کے اس گھر میں اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ ہڑپہ کا پرانا شہری تھا اور یہاں اس کی دو بکریاں تھیں۔ اپنی گفتگو سے وہ کچھ پڑھا لکھا بھی لگتا تھا۔

امتیاز نے سب سے پہلے میری چوٹوں کے بارے میں پوچھا۔

عمران نے وہی جواب دیا جو وہ اس سے پہلے سو ڈیڑھ سو افراد کو دے چکا تھا۔ ”یہ میرا پرانا جگری یار بشیر ہے بھئی... مجھ سے ملنے کے لیے آیا تھا، لاہور ریلوے اسٹیشن کی لکڑی کی سیڑھیوں سے گر گیا۔ شکر ہے کہ ہڈیاں وغیرہ بچ گئی ہیں۔“

عمران کا ایک ساتھی یہاں پہلے سے موجود تھا۔ یہی وہ ”اقبال“ تھا جس سے موبائل فون پر دو دن پہلے عمران کی بات ہوئی تھی۔ یہ بھی مضبوط ہاتھ پیر کا چوبیس پچیس سالہ شخص تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی عمران نے اسی سے فون پر بات کی تھی۔ اسے یہاں عمران نے ہی کسی کام سے بھیجا ہوا تھا۔ اتفاقاً یہاں اقبال کا یہ دوست امتیاز بھی رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب ہم سب یہاں امتیاز کے نیم گرم گھر میں موجود تھے۔ دو تین منٹ کی رسمی باتوں کے بعد عمران، اقبال اور امتیاز میں رمزیہ گفتگو شروع ہو گئی۔ یہ گفتگو میرے لیے کافی حد تک ناقابل فہم تھی۔ عمران نے اپنے ساتھی اقبال سے پوچھا۔ ”اب کہاں ہے وہ؟“

”گھر کے اندر ہی ہے۔“ اقبال نے دبے دبے جوش سے جواب دیا۔ ”گاڑی باہر گلی میں کھڑی ہے۔“

”کیا اندازہ لگایا ہے تم نے؟“ عمران نے پوچھا۔

”میرا اندازہ تو وہی ہے جو امتیاز بھائی کا ہے... بلکہ یہ تو پکی بات کر رہے ہیں کہ اس میں عورت کا چکر ہے۔ زلیخا نام ہے اس کا۔ خاوند بیمار رہتا ہے بلکہ چارپائی سے لگا ہوا ہے۔ یہ گل چھرے اڑا رہی ہے۔ سنا ہے کہ ایک دو اور یارانے بھی ہیں۔“

”خاوند کیا کرتا ہے؟“ عمران نے پوچھا۔

اقبال کے بجائے ہمارے میزبان امتیاز نے جواب دیا۔ ”بس جی... جو لوگ کچھ نہیں کرتے وہ کمال کرتے ہیں۔ یہ پھیدا بھی کمال کرتا ہے۔ پہلے چاولوں کا کام کیا کرتا تھا،

اب تو جو کچھ بھی کرتی ہے اس کی بیوی زلیخا ہی کرتی ہے۔" اس کے ساتھ ہی وہ ہنسا۔ اس کا پیٹ... پورا جسم بلکہ وہ چارپائی بھی ہلنے لگی جس پر وہ بیٹھا تھا۔ اس کی خوش مزاجی اور ہنسنے کی عادت کا اندازہ اس کے چہرے کی لکیروں سے بھی ہوتا تھا۔

عمران، اقبال اور امتیاز کے درمیان ہونے والی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ ہمارے میزبان کے محلے میں رہنے والی ایک جواں سال عورت زلیخا کا چال چلن ٹھیک نہیں۔ اس کے گھر کسی مرد کا آنا جانا ہے اور وہ مرد اب بھی زلیخا کے یہاں موجود ہے۔ اس کی گاڑی اب بھی زلیخا کے گھر کے باہر کھڑی تھی۔ باتوں کے دوران میں جب مجھے اس گاڑی کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ ایک سوزوکی ڈبا ہے تو ایک دم ذہن میں پھلجڑی سی چھوٹ گئی۔ میرا شک ایکا یکی یقین میں بدلنے لگا۔ شاید یہ وہی سوزوکی ڈبا تھا جو دو تین دن پہلے سرراہ ایکسیڈنٹ کا شکار ہوا تھا اور جس میں سے سیٹھ سراج نے نکل کر زبردست خواری کا سامنا کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں ہڑپہ میں بھی یہ ڈبا سیٹھ سراج کو ہی لے کر آیا تھا۔

عمران بغور میرے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ اس کی عقابی نگاہوں نے بھانپ لیا کہ میں کس رخ پر سوچ رہا ہوں۔ اس کی معاملہ فہمی حیران کن تھی۔ وہ مسکرا کر بولا۔ "مجھے لگتا ہے تابی! تمہارے اس سیٹھ سراج کے ستارے اور سیارے وغیرہ گردش میں آگئے ہیں۔ دیکھو، اب وہ اس دن کی فائیو اسٹار ذلالت کے بعد مزید بے عزت ہونے کے لیے یہاں بھی پہنچ گیا ہے۔ ایک ایسی عورت کے گھر میں گھسا ہوا ہے جو کچھ زیادہ نیک نام نہیں ہے۔" پھر وہ میزبان امتیاز سے مخاطب ہو کر بولا۔ "کیا یہ عورت کچھ زیادہ خوب صورت ہے؟"

"زیادہ کیا جی... کم خوب صورت بھی نہیں ہے۔ بس سمجھیں کہ رعایتی نمبروں سے پاس ہے لیکن عورت، عورت ہی ہوتی ہے جی۔ جب بندے کی "مت" مارنے پر آجائے تو پھر "مت" کے پاس مرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ اب ہماری مثال ہی لیں۔ میرے جیسے ہینڈسم نوجوان کے لیے لڑکیوں کی بھلا کوئی کمی تھی لیکن جب دل آیا تو کس پر آگیا۔"

چق کی دوسری طرف سے فربہ اندام امتیاز کی خوبرو بیوی نے شوخی سے کہا۔ "آہو بھائی جی، ان کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ شادی سے پہلے بارہ بارہ من کی دو تین دھوبنیں ان کے پیچھے پڑی ہوئی تھیں، پر ان کی قسمت میرے ساتھ پھوٹ گئی۔"

"شادی سے پہلے میں اتنا موٹا نہیں تھا جی... اگر کچھ تھا بھی تو اس میں خوب صورتی تھی۔ اس بجلی لوک نے میری مارکیٹ ویلیو ڈاؤن کرنے کے لیے مجھے پراٹھے کھلا کھلا کر اتنا موٹا کیا ہے۔ اب بھگتے خود ہی۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

چق کے آر پار میاں بیوی کی نوک جھوک کچھ دیر مزید چلتی رہی پھر امتیاز کی بیوی روتے بچے کو چپ کرانے کے لیے کسی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ تخلیہ ہوا تو عمران نے دھیمے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "تم سے معافی چاہتا ہوں یار... اگر اس وقت تمہیں بتا دیتا کہ ہم سراج کے لیے یہاں آرہے ہیں تو تم شاید آنے سے انکار کر دیتے۔ تم پریشان نہ ہو۔ ہم سراج کے ساتھ کوئی لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی ہمیں ایسا کرنا ہے۔ بس یہ دیکھنا ہے کہ یہ بندہ دراصل ہے کس چکر میں۔ اگر یہ کوئی غیر قانونی کام کر رہا ہے تو پھر بھی ہمیں اس سے کچھ نہیں کہنا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کریں گے کہ پولیس کو انفارم کر دیں گے... اور وہ بھی سامنے آئے بغیر۔"

میں ٹپٹایا ہوا تھا۔ بہرحال، میں نے عمران سے کچھ کہا نہیں۔ ویسے بھی دیگر لوگوں کے سامنے تلخ کلامی کوئی اچھی بات نہیں تھی۔

عمران نے میزبان امتیاز سے سوال جواب شروع کر دیے۔ "امتیاز بھائی! تم نے بتایا ہے کہ یہ بندہ جسے تم یہاں خواجہ کے نام سے جانتے ہو، ہفتے میں کم از کم دو تین بار ضرور آتا ہے؟"

"بالکل... اور خاص طور سے ہفتے کی شام کو تو ضرور آتا ہے۔"

"ہر دفعہ سوزوکی ہائی روف پر آتا ہے؟"

"میرے خیال میں تو ایسا ہی ہے۔"

"یہاں کے لوگ اس کے بارے میں کیا جانتے ہیں یا... تم بتاؤ کہ تم کیا جانتے ہو؟"

امتیاز نے اپنے بے کراں پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ "مجھے تو یہی معلوم ہے کہ یہ بندہ لاہور کے قریب رائے ونڈ میں کوئی اسٹور چلاتا ہے جہاں تھوک میں آٹا، دالیں اور چاول وغیرہ ملتے ہیں۔ یہاں بظاہر زلیخا کے خاوند سے اور اصل میں خود زلیخا سے اس کی یاری دوستی ہے۔ یہ یہاں سے آج کل چاول وغیرہ بھی لے کر جا رہا ہے۔ شاید اپنے اسٹور پر فروخت کرتا ہے یا پھر کہیں اور بھی دیتا ہے۔"

عمران نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "اور اگر میں یہ کہوں کہ جسے تم خواجہ کہہ رہے ہو، یہ لاہور کا سیٹھ سراج الدین ہے اور یہ رائے ونڈ میں کوئی چھوٹا موٹا اسٹور نہیں چلاتا

www.pkdigest.com

بلکہ لاہور میں ایک بڑے پلازے کا مالک ہے اور ایک دوسرا پلازہ تعمیر کروا رہا ہے...تو؟"

امتیاز بھاڑ جیسا منہ کھول کر حیرت سے عمران کی طرف دیکھنے لگا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اس نے کہا۔

"بالکل ایسے ہی ہے۔" عمران کا ساتھی اقبال بولا۔

"تم نے امتیاز بھائی کو ابھی وہ بوریوں والی بات تو نہیں بتائی؟" عمران نے اقبال سے دریافت کیا۔ اقبال نے نفی میں سر ہلایا۔ عمران نے اپنی جیکٹ درست کرتے ہوئے خود کو کچھ اور بھی انگیٹھی کے قریب سمیٹا اور رازداری کے لہجے میں بولا۔ "امتیاز بھائی! تمہاری یہ بات بالکل درست معلوم ہوتی ہے کہ سراج کا اس زلیخا نام کی عورت سے کوئی ٹانکا ہے لیکن ہمیں لگ رہا ہے کہ بات اس سے کچھ زیادہ بھی ہے... اور یہی وجہ ہے کہ ہم اس بندے کا پیچھا کرتے ہوئے لاہور سے یہاں پہنچے ہیں۔"

امتیاز نے حیرت اور تجسس سے عمران کی طرف دیکھا۔ پھر اقبال کو دیکھنے لگا۔ "آپ کو کس قسم کا شک ہے؟" امتیاز نے پوچھا۔

"ہمیں لگ رہا ہے کہ یہ سیٹھ سراج یہاں کوئی گڑبڑ گھوٹالا کر رہا ہے۔ صرف زلیخا ہی نہیں ہے جس کی خاطر یہ بندہ خواجہ کے روپ میں یہاں پہنچا ہے اور راتیں گزارتا ہے۔ اس شک کی ایک بڑی معقول وجہ ہے جو کچھ ہی دن پہلے ہمارے سامنے آئی ہے... بلکہ دو تین دن پہلے سامنے آئی ہے۔"

"یارو! تم نے تو مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔" امتیاز موٹے نے ایک بار پھر اپنی بے مثال توند کو سہلایا اور سوالیہ نظروں سے عمران کا چہرہ تکنے لگا۔

عمران نے کہا۔ "پہلے مجھے یہ بتاؤ امتیاز بھائی کہ جس جگہ ہم بیٹھے ہوئے ہیں یہ جگہ ہڑپہ شہر میں آتی ہے یا اس کے مضافات میں؟"

"یہ مضافات میں ہی آتی ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ سرکاری زمین ہے۔ اس پر لوگوں نے اپنے گھر بنا رکھے ہیں۔ اب یہاں کے مکینوں کے ساتھ گورنمنٹ کا تنازعہ چل رہا ہے۔ یہ زمین ہڑپہ کے کھنڈرات سے بہت قریب ہے اور گورنمنٹ اسے واپس لینا چاہتی ہے لیکن گورنمنٹ جو معاوضہ دے رہی ہے، وہ یہاں رہنے والوں کو قبول نہیں ہے۔ عدالتی چکر بھی چل رہا ہے۔"

"گورنمنٹ کو اس جگہ میں کیا دلچسپی ہے؟"

"بہت زیادہ دلچسپی ہے جی... اور ہونی بھی چاہیے۔ شاید آپ کو پتا نہ ہو کہ پرانے کھنڈر نکالنے کے لیے ہڑپہ کے جتنے بڑے حصے میں کھدائی ہوئی ہے وہ بہت تھوڑا ہے۔ ابھی تقریباً تقریباً ستر اسی فیصد علاقہ ایسا ہے جس پر کھدائی وغیرہ شروع ہی نہیں کی گئی۔ ماہر لوگوں کا خیال ہے کہ اس سارے علاقے کے نیچے بھی کھنڈر شنڈر موجود ہیں۔"

"تو پھر کھدائی کیوں نہیں کی جاتی؟" میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"اس کا پتا تو صاحب لوگوں کو ہوگا بھائی صاحب! کہا یہ جاتا ہے کہ صحیح طریقے سے کھدائی کرنے کے لیے بہت زیادہ پیسے اور ٹائم کی ضرورت ہے۔ پھر شاید صاحب لوگ یہ بھی سوچتے ہوں گے کہ اگر ان زمینوں کے نیچے سے واقعی کھنڈر وغیرہ نکل آئے تو ان کی حفاظت کا کیا انتظام ہوگا۔ پہلے جو کھنڈر نکلے ہیں ان کی حالت بھی روز بروز خراب ہوتی جارہی ہے۔ بارشیں پڑتی ہیں، آندھیاں آتی ہیں۔ ہر طرح کے موسم اثر ڈالتے ہیں۔ محکمے کے لوگ اور باہر سے آنے والے صاحب لوگ ان کھنڈرات کی حفاظت کے لیے کام شام تو کرتے رہتے ہیں پھر بھی کچھ نہ کچھ تو نقصان ہوتا ہی ہے۔ شاید یہ لوگ سوچتے ہوں کہ جو کچھ ہزاروں سال سے زمین میں دبا ہوا ہے، وہ ابھی دبا ہی رہے تو بہتر ہے۔"

www.pkdigest.com

عمران نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ یہ جتنی بھی آبادیاں اسی سرکاری زمین کے اوپر ہیں جن پر کھدائی وغیرہ ہونی ہے۔ آج نہیں تو کل... اور کل نہیں تو دس پندرہ سال بعد؟"

امتیاز نے اثبات میں سر ہلایا۔ عمران نے کہا۔ "اچھا، ایک بات بتاؤ امتیاز بھائی! یہاں آبادی میں لوگ غیر قانونی طور پر تو کھدائی وغیرہ نہیں کرتے؟"

"نہیں جی، محکمہ اس بارے میں بڑا چوکس ہے اور سختی بھی کرتا ہے۔ محکمے کے چوکیدار اکثر علاقے میں چکر لگاتے رہتے ہیں اور اردگرد کی سن گن رکھتے ہیں لیکن..."

"لیکن کیا؟"

"کبھی کبھار کوئی ایسا واقعہ ہو بھی جاتا ہے۔ کسی بنیاد یا قبر وغیرہ کی کھدائی کرتے ہوئے یا کسی کھیت شیت میں سے کوئی پرانی شے مل بھی جاتی ہے۔ کسی پرانے برتن کا ٹکڑا یا کسی مورتی کا کوئی حصہ وغیرہ۔"

ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ نگاہوں کے سامنے سوزوکی ڈبے کے ایکسیڈنٹ کا منظر آ گیا۔ عمران نے بتایا تھا کہ سوزوکی ڈبے کے اندر موجود بوریوں میں چاولوں کے بجائے مٹی بھری ہوئی تھی۔ تو کیا اس مٹی میں کچھ چھپایا گیا

تھا... یا پھر...

ابھی میری سوچ کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی کہ عمران نے یہی بات امتیاز سے کہہ دی۔ اس نے کہا۔ "امتیاز بھائی! دو تین دن پہلے سراج کی سوزوکی کے ساتھ ہماری اسٹیشن ویگن کی جو ٹکر ہوئی تھی، اس کے بارے میں تو اقبال نے آپ کو بتایا ہی ہے۔ جس وقت ٹکر ہوئی، سراج کی سوزوکی میں چار بڑی بوریاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ ان میں سے دو بوریاں ٹکر کی وجہ سے پھٹ گئیں۔ ان پھٹی ہوئی بوریوں میں جو کچھ تھا، اس نے ہم دونوں کو تھوڑا سا حیرت میں ڈال دیا۔ ان بوریوں کے اوپر تو چاولوں کی دو ڈھائی انچ موٹی تہ تھی لیکن نیچے ساری مٹی بھری ہوئی تھی... اس بات کا پتا میرے علاوہ اقبال کو بھی چلا۔ ہم دونوں شک میں پڑ گئے۔ اس شک کی وجہ سے ہی میں نے اقبال کو سراج کے پیچھے لگایا اور وہ یہاں ہڑپہ تک آ پہنچا۔"

بوری میں چاولوں کے نیچے مٹی والی بات سننے کے بعد امتیاز کا بھاری بھرکم چہرہ متغیر ہو گیا۔ میں نے صاف دیکھا کہ اس نے اس بات میں زبردست دلچسپی محسوس کی ہے۔ اس نے اوپر تلے کئی سوال عمران اور اقبال سے پوچھے اور پھر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس کا کھڑا ہونا ایسے ہی تھا جیسے کسی لیٹے یا بیٹھے ہوئے ہاتھی کا کھڑا ہونا۔ وہ سنسنی خیز لہجے میں بولا۔ "مجھے پہلے ہی اس خواجے کے معاملے میں شک وشبہ لگ رہا تھا۔ اب یہ جو آپ نے بوریوں میں مٹی والی بات بتائی ہے، اس نے میرا شک بڑا پکا کر دیا ہے۔"

وہ لکڑی کی الماری میں سے اپنا موبائل فون اٹھا لایا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" عمران نے پوچھا۔

"سعید کو فون کر رہا ہوں۔"

"یہ سعید کون ہے؟"

"یہاں ہیڈ چوکیدار ہے۔ میرا سالا بھی ہے۔ اس کی ذمے داری ہے کہ اگر یہاں کوئی گڑبڑ ہو تو وہ اسے پکڑے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، کیا گڑبڑ ہو رہی ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"جو کچھ آپ نے بتایا ہے، اسے سن کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہاں زلیخا اور چھیدے کے گھر میں ناجائز طور پر کھدائی ہو رہی ہے۔ دراصل یہاں اگر کوئی چوری چھپے کھدائی کرتا ہے تو اس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ تو یہی ہوتا ہے کہ کھودی ہوئی مٹی کو چھپائے کہاں؟ پچھلے سال بھی یہاں ایک اسی طرح کا واقعہ ہوا تھا۔ وہ ایک عیسائی فیملی تھی۔ انہوں نے گھر کے ایک کمرے میں کھدائی شروع کی اور وہاں سے نکلنے والی مٹی رات کے اندھیرے میں پاس کے جوہڑ میں پھینکنے لگے۔ ایک رات چوکیداروں نے انہیں دیکھ لیا اور وہ پکڑے گئے... مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ بھی کوئی ایسا ہی چکر ہے۔"

"جو لوگ پکڑے گئے تھے، ان سے کچھ برآمد بھی ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"ایک دو مہریں برآمد ہوئی تھیں۔ باقی چیزیں وہ لوگ آگے نکال چکے تھے۔"

"پھر بہتر ہے کہ تم ابھی فون نہ کرو۔" عمران نے مشورہ دیا۔

"کیا مطلب؟" امتیاز نے پوچھا۔

"جلد بازی میں کام بگڑ جائے گا۔ پہلے ہم دیکھیں کہ یہ لوگ کر کیا رہے ہیں اور ان کے ساتھ اور کون سے کھلاڑی شامل ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بس ایک دو لوگوں کا کام ہو اور ہو سکتا ہے کہ اس میں زیادہ لوگ شامل ہوں۔"

اس سلسلے میں ان تینوں کے درمیان تھوڑی سی گفتگو مزید ہوئی پھر عمران نے ایک دلیرانہ بلکہ حیران کن فیصلہ کیا۔ کم از کم میرے لیے تو یہ حیران کن ہی تھا۔ اس نے کہا کہ وہ اور اقبال ابھی دیوار پھاند کر زلیخا اور چھیدے کے گھر میں داخل ہوں گے اور دیکھیں گے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک خطرناک کام تھا۔ اس کے نتیجے میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر تک اس بارے میں مزید تبادلہ خیال ہوا۔ اس میں، میں نے بھی تھوڑا بہت حصہ لیا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ یہ کام کل پر چھوڑ دیا جائے۔ امتیاز کو معلوم تھا کہ سراج بس آج کی رات یہاں ٹھہرے گا اور کل زلیخا کے گھر میں زلیخا اور اس کے بیمار خاوند کے سوا اور کوئی نہیں ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ زلیخا کا ایک بھانجا ہوگا، اس کا کوئی ایسا خاص مسئلہ نہیں تھا۔

ہم نے رات کا باقی حصہ امتیاز کے گھر میں ہی گزارا۔ امتیاز کی بیوی نے ہمارے لیے دو نئے لحاف نکال دیے تھے۔ ہم سوئے تو صبح دس گیارہ بجے سے پہلے آنکھ نہیں کھلی... دھوپ پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ امتیاز کے دونوں بچے صحن میں کھیل کود کر رہے تھے۔ باپ کی طرح وہ بھی خوب فربہ تھے اور ہاتھی کے چھوٹے چھوٹے گول مٹول بچوں کی طرح تھے۔

کچھ دیر بعد ایک گرما گرم دیہاتی ناشتے نے ہمارا استقبال کیا۔ دیسی گھی کے بھاری بھرکم پراٹھے، انڈوں کا آملیٹ، سوجی کا باداموں والا حلوہ اور دودھ پتی چائے۔ ساتھ میں ریڈیو پر پنجابی گانے نشر ہو رہے تھے۔ امتیاز اور اس کی بیوی میں دلچسپ نوک جھونک بھی جاری تھی۔ عمران بھی

گا ہے بگا ہے اپنی قہقہہ بار باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑ رہا تھا۔ اس ماحول میں مجھے اپنی ذاتی تلخیاں کسی حد تک بھولی ہوئی تھیں۔ ویسے بھی میں سکون بخش گولیاں باقاعدگی سے لے رہا تھا۔ ان کے سبب دماغ پر ایک غفلت آمیز دھند چھائی رہتی تھی اور اپنے بے پناہ غم کی دھار مجھے ہلکی محسوس ہوتی تھی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر عمران نے سب سے پہلے موبائل فون پر اپنے سرکس کے اسسٹنٹ منیجر عباس سے رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ وہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں لاہور سے باہر ہے اس لیے آج شو میں حصہ نہیں لے سکے گا۔ اس اطلاع کے بعد وہ کچھ "ایزی" نظر آنے لگا۔ اقبال، امتیاز اور عمران میں ایک بار پھر یہاں کی پُراسرار صورتِ حال کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی۔

امتیاز نے بتایا کہ محکمۂ آثارِ قدیمہ کا دفتر یہاں سے چار پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ موجودہ افسر خاصا ایمان دار اور سخت گیر ہے۔ وہ کسی قسم کی بے قاعدگی برداشت نہیں کرتا۔ اس کی وجہ سے نوادرات کے متلاشی خوف زدہ رہتے ہیں۔ مقامی لوگوں کو اگر ٹیلوں سے کبھی کبھار کوئی چیز مل بھی جاتی ہے تو وہ خود جا کر دفتر میں جمع کرا دیتے ہیں۔

دوپہر کے وقت اقبال باہر کا جائزہ لینے کے لیے چلا گیا۔ وہ تین بجے کے قریب واپس آیا۔ اس نے اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ "لو جناب! سراج واپس جانے کے لیے تیار ہے۔ اس کے ساتھ ایک بندہ بھی ہے۔ گاڑی کو کپڑا وغیرہ مار رہا ہے۔"

"اب بھی کوئی بوری وغیرہ ہے گاڑی میں؟" عمران نے پوچھا۔

"ہاں جی! پانچ بوریاں ہیں۔ میں نے گاڑی کے پاس سے گزرتے ہوئے خود دیکھی ہیں۔"

اسی دوران میں گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی دورافتادہ آواز آئی۔ اندازہ ہوا کہ سراج روانہ ہو رہا ہے۔ دو تین منٹ بعد سراج کا سوزوکی ڈبا گلی میں سے گزرا۔ عمران کی طرح میں نے بھی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ سیٹھ کا ساتھی ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ سیٹھ ساتھ والی نشست پر بیٹھا تھا۔ میں نے اسے صاف پہچانا... تاہم بوریاں وغیرہ نظر نہیں آئیں۔ اندازہ ہوا کہ بوریاں رکھنے کے لیے ڈبے کی پچھلی نشستیں نکال دی گئی ہیں۔ گاڑی کے پچھلے حصے کے ڈینٹ وغیرہ نکلوائے جا چکے تھے، تاہم ابھی اس کی کافی مرمت ہونا باقی تھی۔ سیٹھ کا چہرہ دیکھتے ہی مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اب بھی ایسا ہی ہوا۔ میں کافی دیر بالکل گم صم رہا۔

وہ رات خاصی سنسنی خیز رہی۔ عمران کی کئی صلاحیتیں کھل کر میرے سامنے آئیں... اس کی غیر معمولی بے خوفی تو مجھ پر پہلے ہی ثابت ہو چکی تھی۔ اب اندازہ ہوا کہ وہ کسی بھی خطرناک کام میں فوری طور پر کود پڑنے اور وقت کے مطابق نہایت تیزی سے فیصلے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یقیناً اس کے دوست بھی اس کے مزاج کے مطابق ہی تھے۔

رات قریباً گیارہ بجے کے لگ بھگ مجھے پہلی بار پتا چلا کہ عمران گاڑی میں ایک پسٹل بھی رکھ کر لایا ہے۔ وہ پسٹل، باہر کھڑی گاڑی میں سے نکال کر اندر لے آیا اور اسے اپنی جیکٹ میں رکھ لیا۔ آٹھ دس اضافی گولیاں بھی اس نے اپنی جیب میں ڈال لیں۔ اس کے بعد وہ اور اقبال... زلیخا کے گھر میں داخل ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان دونوں نے اپنے چہرے کپڑے کے ڈھاٹوں میں اس طرح چھپا لیے کہ آنکھوں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ عمران نے اپنے جسم کے گرد ایک گرم چادر بھی لپیٹ لی۔ میں یہ سب کچھ نہیں چاہتا تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ میرے روکنے سے یہ لوگ رکنے والے نہیں ہیں۔ وہ تھرل اور غیر معمولی سنسنی کے متلاشی تھے اور یہ ان کے لیے ایک اچھا موقع تھا۔ عمران میرا کندھا تھپتھپا کر بولا۔ "پریشانی نہ ہو چلو، یہ پستول کسی کو ڈھیر کرنے یا مارنے کے لیے نہیں ہے، بس اپنی حفاظت کے لیے ہے۔"

میں نے بجھے لہجے میں کہا۔ "پستول تو پستول ہی ہوتا ہے۔ بہرحال، ایک بات ذہن میں رکھنا، میں یہاں ہونے والے کسی بھی معاملے کے لیے ذمے دار نہیں ہوں۔ تم مجھے کچھ بھی بتائے بغیر یہاں لائے ہو اور اب ان الٹے سیدھے کاموں میں پڑ گئے ہو۔ مجھے اس میں خطرے کی بو آ رہی ہے۔"

وہ مسکراتی آواز میں بولا۔ "رات کا وقت ہے۔ اسٹامپ پیپر مل نہیں سکتا، ورنہ میں ابھی تمہیں اقرار نامہ لکھ کر دے دیتا کہ تم ہر مسئلے سے بری الذمہ ہو۔"

"ایک اسٹامپ پیپر سے نہیں، دو سے کام چلے گا۔ تم مجھے کیوں بھول رہے ہو؟" امتیاز نے کہا اور پھر ہنسنے لگا۔ جب وہ ہنستا تھا تو اس کا پورا جسم ہنستا تھا اور توند کے اندر تو تہلکہ سا مچ جاتا تھا۔ واقعی ہم اس کے گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے اور اگر یہاں کوئی مسئلہ کھڑا ہو جاتا تو وہ بھی لپیٹ میں آ سکتا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد عمران اور اقبال گھر سے باہر نکل کر تاریکی کا حصہ بن گئے۔ دیہات اور قصبات کی یخ بستہ راتوں میں سردی سے بچنے کے لیے اکثر لوگ اپنے چہرے گرم مفلروں اور ڈھاٹوں وغیرہ میں چھپا لیتے ہیں۔ اس چیز کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی۔

عمران اور اقبال کے جانے کے بعد میں بے چینی کا شکار رہا۔ امتیاز بھی کسی حد تک مضطرب تھا... تاہم وہ اپنا دل، مونگ پھلی اور ریڈیو سے بہلا رہا تھا۔ اس کی بیوی بچے دو گھنٹے پہلے ہی سو چکے تھے... چار دیواری سے باہر سرد ہوا فراٹے بھر رہی تھی۔ کھڑکی میں سے دور ہڑپہ کے ٹیلے دکھائی دیتے تھے۔ ان پر مدھم چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ قریباً ایک گھنٹے بعد دروازے پر دستک ہوئی تو میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ امتیاز ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا اٹھا اور دروازہ کھولا۔ آنے والا عمران ہی تھا۔

وہ تیزی سے اندر آیا۔ اس نے منڈاسا کھولا۔ اس کا چہرہ اندرونی جوش سے تمتما رہا تھا... لگتا تھا کہ بڑے موڈ میں ہے۔ آتے ساتھ ہی اس نے میرا بازو پکڑا اور بولا۔ "آؤ میرے ساتھ تمہیں تماشا دکھاؤں۔ بڑے مزے کا سین ہے۔ ایک دم فائیو اسٹار۔"

"نہیں، مجھے نہیں جانا۔ جو دیکھنا ہے تم خود ہی دیکھو۔" میں نے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

"او ہو یار! کیا عورتوں جیسے بچے ہوئے ہو، وہاں کوئی ڈر والی بات نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو میں تمہیں بلانے ہی نہ آتا۔ چلو اٹھو... حیران رہ جاؤ گے تم۔"

"میں پہلے ہی بہت حیران ہوں۔ تم امتیاز بھائی کو لے جاؤ۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

اس نے میری ایک نہ سنی اور کھینچ کر مجھے اٹھا دیا۔ کسی وقت وہ بالکل ایک تیز سیلابی ریلے کی طرح ہو جاتا تھا۔ اس کے اندر ایک ایسا محبت بھرا بہاؤ پیدا ہوتا تھا جس کے سامنے رکے رہنا ممکن ہی نہیں رہتا تھا۔

قریباً پانچ منٹ بعد میں عمران کے ساتھ باہر نکل رہا تھا۔ سرد ہوا سوئیوں کی طرح جسم کے مختلف حصوں پر لگی۔ عمران نے ایک بڑا مفلر مجھے بھی اس طرح لپیٹ دیا تھا کہ چہرے کا بس ایک چوتھائی حصہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ گلی میں گہری تاریکی تھی۔ آخری راتوں کا چاند کسی بدلی میں چھپا ہوا تھا۔ آوارہ کتوں کی لپیٹ سے بچتے ہم قریباً نصف فرلانگ چلے اور ایک گھر میں داخل ہو گئے۔ یہی چھیدے اور زلیخا کا گھر تھا۔ چھوٹا سا صحن تھا جس میں اینٹیں لگی ہوئی تھیں۔ آگے ایک برآمدہ تھا جس پر سردی سے بچنے کے لیے چقیں ڈال دی گئی تھیں۔ غسل خانے کے ساتھ ایک چھوٹا سا اسٹور نما کمرا تھا جس میں بکری بندھی ہوئی تھی۔ ہم برآمدے میں داخل ہوئے پھر ایک کمرے کا آہنی دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔

اندر بلب کی زرد روشنی تھی۔ اس روشنی میں نظر آنے والے منظر نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ میں کوئی ایسی صورتِ حال دیکھوں گا۔ چھبیس ستائیس سال کی ایک صحت مند عورت چارپائی کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ وہ آسن کی رسّی نے اسے کافی مضبوطی کے ساتھ چارپائی سے جکڑا ہوا تھا۔ عورت کے جسم پر عنابی رنگ کے شنیل کا نیا لباس تھا۔ کانوں میں سونے کے جھمکے چمک رہے تھے۔ وہ گدرائے ہوئے جسم کی تھی اور رنگ سفید تھا۔ یہ سفید رنگ ہی تھا جس کی وجہ سے اس کے ایک گال پر نیلگوں نشان ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ یہ نشان طمانچے کے لگتے تھے۔ اقبال پسٹل ہاتھ میں لیے اس کے سرہانے کھڑا تھا۔ دوسری چارپائی پر تیس پینتیس سال کا ایک کمزور شخص نظر آ رہا تھا۔ اس کے بال بری طرح الجھے ہوئے تھے اور شکل سے ہی نظر آتا تھا کہ وہ عرصے سے بیمار ہے۔ یقیناً یہی چھیدا تھا۔ اسے باندھا نہیں گیا تھا، وہ اتنا سہا ہوا تھا کہ اسے باندھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

عمران نے دادطلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے برا سا منہ بنا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس نے آگے جھک کر بڑی محبت سے عورت کے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور بولا۔ "پتا نہیں تو نیک ہے یا نہیں لیکن شکل سے بد بھی نہیں لگتی۔ میں تجھ سے کسی طرح کی سختی کرنا نہیں چاہتا۔ میں پھر تجھ سے کہتا ہوں کہ کوئی بھی بات چھپا مت۔ اس سے تیرا ہی نقصان ہونا ہے۔"

"میں سچ کہتی ہوں۔ میں کچھ نہیں چھپا رہی۔ مجھے جو پتا تھا، میں نے بتا دیا ہے۔"

"یہی تو مسئلہ ہے کہ تو سب کچھ نہیں بتا رہی۔ بیچ بیچ میں سے چھپا رہی ہے... اور جو کچھ چھپا رہی ہے وہی زیادہ ضروری ہے۔"

"میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں؟ میں کبھی لاہور نہیں گئی۔ نہ ہی اس نے کبھی مجھے لاہور کے بارے میں بتایا ہے۔ وہ یہی کہتا تھا کہ رائے ونڈ میں اس کی تھوک کی دکان ہے جہاں سے آٹے دالے کے دکان دار آٹا، چاول وغیرہ لے کر جاتے ہیں۔"

"تیرا بھانجا آج کہاں ہے؟ سنا ہے وہ تیرے ساتھ ہی یہاں رہتا ہے؟"

"وہ آج اپنے پنڈ گیا ہے۔ دو تین دن تک آئے گا۔"

www.pkdigest.com

”کیا اس کے دماغ میں کبھی یہ نہیں آیا کہ خواجہ (سراج) جھوٹ بول سکتا ہے... یا اس نے سوچا ہو کہ رائے ونڈ جا کر اس کا پتا کرنا چاہیے؟“

”نہیں، وہ اتنے جوگا نہیں ہے۔ وہ تو بس وہی کرتا رہا ہے جو خواجہ اسے کہتا رہا۔“

”اور تم بھی وہی کرتی رہی ہو بلکہ وہی... وہی کرتی رہی ہو۔“ عمران نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

زلیخا کے چہرے پر شرمندگی جھلکی۔ اس کا ہڈیوں کا ڈھانچا خاوند بھی دوسری طرف دیکھنے لگا۔

اقبال نے کہا۔ ”ابھی تو نے بتایا ہے کہ پچھلے چار مہینوں میں تُو نے سراج سے چالیس پچاس ہزار روپیا لیا ہے۔ تیری الماری میں سے یہ ساڑھے تین ہزار نکلا ہے۔ باقی کہاں ہیں؟“

”باقی وہ کل لے گیا ہے نکال کر۔ بائیس ہزار روپیا تھا۔“ وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ”دو چوڑیاں بھی تھیں سونے کی... وہ بھی کھینچ کر لے گیا ہے۔ یہ دیکھو، مرن جوگے نے میری باہیں چھیل دی ہیں۔“ اس نے اپنی سرخ کلائیوں کی طرف اشارہ کیا۔

عمران نے غور سے اس کی کلائیاں دیکھیں اور اثبات میں سر ہلایا۔

اس دوران میں زلیخا کا شوہر چھیدا کمزور آواز میں بولا۔ ”ہمارا کوئی قصور نہیں ہے... خواجے نے جو کچھ کیا ہے، زبردستی کیا ہے۔ اس نے ہماری کوئی پیش نہیں چلنے دی۔ کہتا تھا کہ اگر کسی کو پتا چلا تو سب کو ہتھکڑیاں لگیں گی۔“

عمران بولا۔ ”یہ جو پچاس ہزار روپیا تیری بیوی نے اس سے لیا ہے، یہ بھی اس نے زبردستی دیا تھا؟ اور یہ سونے کے جھمکے... یہ چوڑیاں... اور یہ شنیل کا کامدار جوڑا؟ یہ سب زبردستی تھا؟ تیری بیوی کی کوئی مرضی نہیں تھی اس میں؟“

چھیدا جواب میں کچھ نہیں کہہ سکا، بس بغلیں جھانک کر رہ گیا۔ اقبال بولا۔ ”تم دونوں اس میں برابر کے شریک ہو اور جو کچھ ہوگا، وہ تم سب کے ساتھ ہوگا۔“

عمران نے میرا بازو پکڑا اور مجھے ساتھ والے دروازے کے سامنے لے آیا۔ یہ دوسرے کمرے کا دروازہ تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو میں چکرا کر رہ گیا۔ کمرے میں فرش کی جگہ ایک بڑا کنواں تھا۔ بلب کی میلی سی زرد روشنی اس کنوئیں کی گہرائی تک پہنچتے پہنچتے بہت مدھم ہو جاتی تھی۔ اگر کوئی شخص بے دھیانی میں کمرے کے اندر دو قدم بھی رکھتا تو اس کنوئیں نما گڑھے میں گر جاتا۔

”اوہ خدایا! یہ کیا ہے؟“

”اسی لیے تو کہا تھا جگر... کہ سین دیکھو گے تو مزہ آجائے گا۔“

میں نے آگے بڑھ کر نظر دوڑائی... اس تقریباً آٹھ فٹ قطر کے کنوئیں کے اندر بانس کی ایک طویل سیڑھی لگی تھی۔ کنواں پچیس فٹ سے زیادہ گہرا تھا۔ ذرا غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ کنوئیں کے اندر دائیں اور بائیں طرف دو اور گڑھے بھی نظر آرہے تھے... یا یوں کہا جائے کہ یہ کنوئیں کی دیوار میں دو چھوٹی سرنگیں سی تھیں۔

”یہ سب کیا ہے عمران؟“ میں نے تحیر میں ڈوب کر پوچھا۔

”سمجھو کہ یہ بھی موت کا کنواں ہے لیکن اس کی دیواریں کچی ہیں اس لیے ان میں موٹر سائیکل نہیں چل سکتی... یا شاید سیٹھ سراج کے پاس کوئی ایسی موٹر سائیکل ہو جو اس میں چل سکتی ہو۔“

”تو یہ سب سیٹھ سراج نے کیا ہے؟“

”تو اور کیا میں نے کیا ہے؟ وہ خبیث پچھلے تین چار مہینے سے صرف زلیخا کے لیے یہاں نہیں آرہا، یہ کنواں بھی کھود رہا تھا مگر اندازہ یہی ہوا ہے کہ اس کے لالچ کی موٹر سائیکل ہر بیہ کے اس کچے کنوئیں میں چل نہیں سکی۔ یعنی اسے یہاں سے کچھ ملا نہیں۔ اسی لیے تو وہ بھنایا ہوا یہاں سے رخصت ہو گیا ہے اور جاتے جاتے اپنی زلیخا سے نقدی مقدی بھی چھین کر لے گیا ہے۔“

”پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔“ میں نے کہا۔

”تمہیں اطمینان سے سب کچھ بتاتا ہوں۔ پہلے اس کنوئیں کی سیر تو کر لو... نیچے اترو گے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں، میں یہیں ٹھیک ہوں۔“

”اچھا... تو یہ ٹارچ پکڑو۔ میں دیکھ کر آتا ہوں۔“

میں نے ٹارچ پکڑ لی اور اس کا رخ کنوئیں نما گڑھے میں کر دیا۔ وہ سیڑھی اتر کر نیچے چلا گیا۔ تہ میں لمبے دستے والے دو کھرپے اور دو کدالیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ کنوئیں کے اندر سے ہی آواز دے کر بولا۔ ”یہ دیکھو... یہ لوگ کسّی کے بجائے ان لمبے کھرپوں سے کھدائی کرتے رہے ہیں۔ مقصد یہی تھا کہ کسّی سے کھدائی کریں گے تو آواز پیدا ہوگی۔“

دائیں بائیں نظر آنے والے دونوں خلا افقی رخ پر زیادہ گہرے نہیں تھے۔ یہ مشکل سے دس دس فٹ آگے گئے ہوں گے۔ ان کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ کارآمد چیزوں کی تلاش میں کھدائی کرتے ہوئے دائیں بائیں بھی کوشش کی گئی ہے۔ کچھ دیر بعد عمران سیڑھی کے سہارے باہر نکل آیا۔

www.pkdigest.com

اس کے جو تے نم تھے۔ یوں لگتا تھا کہ کنوئیں کی تہ میں تھوڑا بہت کیچڑ تھا۔

”یہ تو بڑا عجیب چکر لگ رہا ہے۔“ میں نے سرگوشی کی۔

”عجیب اور دلچسپ!“ عمران بھی دھیمی آواز میں بولا۔ ”یہ بڑی غلط کار عورت ثابت ہوئی ہے۔“ اس کا اشارہ زلیخا کی طرف تھا۔

”کیا کرتی رہی ہے؟“

”وہ سب کچھ جو ہم سوچ رہے تھے۔ یہ یہاں سراج کے ساتھ داد عیش بھی دیتی رہی ہے اور ساتھ ساتھ یہ کھدائی والا کام بھی ہوتا رہا ہے۔ اس کے شوہر چھیدے کو بھی سب پتا تھا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔“

”ان لوگوں نے یہاں اسی کمرے میں کھدائی کیوں کی ہے؟ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”یہ ساری باتیں ابھی تھوڑی دیر میں سامنے آجائیں گی... تم دیکھتے رہو۔“

”کیا تم نے زلیخا کے ساتھ مار پیٹ کی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بالکل نہیں۔ بس یہ ذرا اودھم مچا رہی تھی اس لیے اسے چارپائی سے باندھنا پڑا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اقبال نے اس کے منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیا تھا۔ بہرحال، اب یہ کافی حد تک شانت ہو چکی ہے۔“

”لیکن اس کے منہ پر تو نیل سے پڑے ہوئے ہیں۔ لگتا ہے کہ انگلیوں کے نشان ہیں اور اس کا ہونٹ بھی ایک طرف سے زخمی ہے۔“

”یہ مہربانی ہم نے نہیں، اس کے یار سراج نے کی ہے۔ کل ان لوگوں کے درمیان جھگڑا ہوا ہے۔ سیٹھ سراج اور اس کا ساتھی شاید اب یہاں نہیں آئیں گے۔ وہ جاتے جاتے یہاں سے بیس بائیس ہزار روپیا لے گئے ہیں... اس کے علاوہ زلیخا کا کچھ زیور بھی۔ کم از کم زلیخا تو یہی کہہ رہی ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ یہاں کھدائی کے کام میں ان لوگوں کو مایوسی کے سوا کوئی خاص چیز نہیں ملی اور یہی وجہ ہے کہ یہاں جھگڑا وغیرہ بھی ہوا ہے۔“

ہم دونوں واپس پہلے والے کمرے میں آگئے۔ یہاں صورتِ حال جوں کی توں تھی۔ زلیخا ٹسوے بہا رہی تھی۔ عمران نے ایک بار پھر اس سے سوال جواب شروع کیے۔ ”سراج سے تمہاری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی؟“ عمران نے پوچھا۔

”میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ جس کمرے میں کھدائی ہوئی ہے، وہاں سے فرش بیٹھ گیا تھا۔ یہ پچھلی بارشوں کے بعد ہوا تھا۔ ہم نے دوبارہ فرش ڈالنے کے لیے پہلا فرش توڑا۔ ایک طرف چھوٹا سا گڑھا بن گیا تھا۔ اس گڑھے سے ہمیں ایک پرانا بھانڈا (برتن) ملا۔ یہ مٹی کی گڑوی جیسا تھا اور تین ٹوٹوں میں تھا۔ ہم نے اسے سیمنٹ سے جوڑا۔ میرے بھانجے جہانے نے یہ برتن عاشق مسیح کو دیا۔ عاشق مسیح کبھی کبھار ایسی چیزیں لے لیتا ہے۔ اس نے اس برتن کے جہانے کو ڈھائی ہزار روپے دیے۔ جہانا ڈھائی ہزار روپے لے کر بڑا خوش تھا... پر ہمیں پتا تھا کہ یہ برتن ڈھائی ہزار سے کہیں زیادہ رقم کا ہوگا۔ عاشق مسیح ایسی چیزیں لاہور لے جاتا ہے اور زیادہ پیسوں میں بیچ دیتا ہے۔ ہمیں بعد میں پتا چلا کہ وہ یہ چیزیں خواجے کو دیتا ہے جسے تم لوگ سراج بتا رہے ہو۔“

”اس کا اصلی نام سراج ہی ہے۔ تم آگے بتاؤ۔“ عمران نے کہا۔

”عاشق مسیح جب سراج کے پاس برتن لے کر گیا تو اسے دیکھ کر سراج وغیرہ کا شوق ایک دم بڑھ گیا۔ دراصل سراج کے ساتھ جو بندہ کل یہاں آیا تھا، وہ ان برتنوں اور مورتیوں وغیرہ کے بارے میں بڑا کچھ جانتا ہے۔ اس کا نام عارف خان ہے۔ اسے خان خان کہتے ہیں۔ اسے ان پرانی چیزوں کی اصل قیمت کا بھی پتا ہوتا ہے... اور اصل میں یہی عارف خان ہے جس نے خواجے کو لالچ دیا اور بتایا کہ جہاں سے یہ گڑوی ملی ہے، وہاں اور چیزیں بھی ہوں گی۔“

”تو پھر کیا ہوا؟ عارف خود تمہارے پاس آیا یا سراج یہاں پہنچا؟“

”دونوں ہی یہاں آئے تھے۔ ان دنوں چھیدا اسپتال میں تھا۔ گھر میں میرے اور میرے بھانجے جہانے کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ خواجے نے مجھے بتایا کہ وہ لاہور کے قریب رائے ونڈ میں کاروبار کرتا ہے۔ اس نے عارف خان کو اپنا ملازم بتایا۔ اب پتا نہیں کہ خواجے کی طرح عارف خان بھی اصلی نام ہے یا جھوٹا ہے۔ بہرحال، ان دونوں نے کہا کہ جہاں سے گڑوی ملی ہے وہاں اگر اور کھدائی کی جائے تو اور چیزیں مل سکتی ہیں۔ مجھے پتا تھا کہ یہ غلط کام ہے۔ سرکاری بندے ہر وقت یہاں نظر رکھتے ہیں۔ چوکیدار بھی گھومتے رہتے ہیں۔ میں نے انکار کر دیا۔ خواجہ اور عارف خان پہلے لالچ دیتے رہے پھر ڈرانے دھمکانے لگے۔ انہوں نے کہا کہ میرے بھانجے جہانے کو ہتھکڑی لگ سکتی ہے کیونکہ اس نے یہ گڑوی ناجائز طور پر نکالی ہے اور بیچی ہے۔ اس کے

علاوہ بھی بڑا کچھ ہو سکتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ میں ان کی بات مان لوں۔ میں اکیلی عورت ذات تھی اور یہ بات بھی صحیح تھی کہ جہاناں گڑوی بیچ چکا تھا۔ عاشق مسیح نے اس سے ڈھائی ہزار روپے کی وصولی پر انگوٹھا بھی لگوایا تھا۔ مجھے ان کی بات ماننی پڑی۔ اس کے بعد خواجے نے ہمارے گھر آنا جانا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی اس کے ساتھ عارف خاں بھی ہوتا تھا۔ چھیدا اسپتال سے واپس آگیا تھا۔ خواجے نے اس کو بھی ڈرایا دھمکایا اور پھر انہوں نے کھدائی کا کام شروع کر دیا۔"

"کھدائی کون کرتا تھا؟"

"عارف خاں اور جہاناں۔ سب سے بڑا مسئلہ مٹی چھپانے کا تھا۔ پہلے تو خواجہ تھوڑی بہت مٹی چھت پر ڈلواتا رہا اور ویہڑے کی بڑی کیاری میں پھنکواتا رہا۔ پھر اس نے رستہ ڈھونڈ لیا۔ وہ کھدائی سے نکلنے والی مٹی، بوریوں میں بھر کر اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ اب پتا نہیں لاہور لے جاتا تھا یا راستے میں کہیں پھینکتا تھا۔ بہر حال، یہاں سے تو اپنی سفید گاڑی میں بھر کر لے جاتا تھا۔"

"محلے میں یا آڑوس پڑوس میں کسی کو پتا نہیں چلا کہ تم لوگ کھدائی کر رہے ہو؟" اقبال نے پوچھا۔

"خواجہ کھرپیوں سے کھدائی کرواتا تھا۔ یہ کام جب بھی ہوا، رات کو ہوا۔ دن کے وقت ہم اس کمرے کو تالا لگا چھوڑتے تھے۔"

عمران ٹارچ کی روشنی زلیخا کے گورے چٹے چہرے پر ڈال کر بولا۔ "زلیخا بی بی! یہ بات ماننے والی ہرگز نہیں ہے کہ تم لوگوں نے اتنی کھدائی کر لی اور تمہیں یہاں سے ملا کچھ نہیں۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ گڑوی کے بعد یہاں سے ایک بھی کام کی شے نہیں ملی۔ خواجہ ہم سے کہتا تھا کہ ہم نے جھوٹ بولا ہے۔ گڑوی بھی یہاں سے نہیں نکلی ہوگی۔ ہم نے کسی کی چرائی ہے یا کہیں اور سے نکالی ہے۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ کھدائی کرتے ہوئے یہاں سے کچھ نکلا ہو مگر ان لوگوں نے... میرا مطلب ہے کہ سراج اور عارف نے تم سے چھپایا ہو؟"

"اللہ کی اللہ ہی جانے... پر میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ جب بھی کھدائی ہوتی تھی، جہاناں ساتھ ہوتا تھا۔ اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو اسے پتا چل جاتا۔" بات کرتے ہوئے زلیخا کے ایک گال پر چھوٹا سا گڑھا پڑتا تھا اور وہ قدرے خوب صورت نظر آنے لگتی تھی۔

"وہ عاشق مسیح اب کہاں ہے؟" اقبال نے پوچھا۔

"اس پر جھگڑے اور ناجائز اسلحے کا کوئی کیس بنا ہوا ہے۔ آج کل وہ گھر سے غائب ہے۔ تین چار مہینے سے اسے دیکھا نہیں ہے۔"

اگلے ایک گھنٹے میں عمران اور اقبال اس زلیخا نامی عورت سے مسلسل سوال جواب کرتے رہے۔ اس ساری گفتگو سے جو کچھ معلوم ہوا اور جو کچھ ہم نے اخذ کیا، وہ کچھ اس طرح تھا۔

زلیخا ہوشیار عورت تھی۔ وہ جو یہ بات کر رہی تھی کہ اس نے خوف زدہ ہو کر سراج وغیرہ کا ساتھ دیا... غلط تھی۔ ممکن ہے کہ اس پر تھوڑا بہت دباؤ بھی ہو مگر اس کے ملوث ہونے کی اصل وجہ اس کا لالچ اور اس کی عیش پسندی تھی۔ سیٹھ سراج نے زلیخا کی فطرت کو سمجھتے ہوئے اسے بڑی ہوشیاری سے شیشے میں اتارا ہوا تھا۔ وہ نہ صرف یہاں زلیخا کے ساتھ اپنی راتوں کو گرما رہا تھا بلکہ نوادر کی تلاش میں کھدائی بھی کروا تا رہا تھا۔ زلیخا کو اپنے لاغر خاوند کی ذرہ بھر پروا نہیں تھی۔ اس کا گھر میں موجود ہونا یا نہ ہونا زلیخا کے لیے برابر تھا۔ بھانجا جہاناں بھی ایک نمبر کا بے غیرت تھا۔ اسے بھی پروا نہیں تھی کہ اس کی ماسی کیا کرتی ہے۔ اسے بس نشے پانی سے مطلب تھا اور یہ نشہ اسے وافر مل رہا تھا۔ اس کی جیب بھی سراج کی مہربانی سے ہر وقت گرم رہتی تھی۔ جب سراج اپنے ہونڈا کی ڈبے پر یہاں آتا تو اکثر عارف خاں بھی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ عارف اور جہاناں دونوں کھدائی میں مصروف رہتے تھے اور سراج علیحدہ کمرے میں زلیخا کے ساتھ مصروف وقت گزارتا تھا۔ اس نے زلیخا کو مٹھی میں رکھنے کے لیے سونے کی چوڑیاں دی تھیں اور ہر ہفتے نقد پیسے بھی دیتا تھا... زلیخا ان عورتوں میں سے تھی جنہیں سونے کی چمک دکھا کر اور نوٹوں کی کڑکڑاہٹ سنا کر کسی بھی کام پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ ویسے یہاں سوچنے کی بات یہ تھی کہ سیٹھ جیسا امیر کبیر شخص اگر ہفتے میں دو بار لاہور سے چل کر یہاں پہنچتا تھا اور اس سارے معاملے میں اتنی زیادہ دلچسپی لے رہا تھا تو پھر اسے یہاں سے غیر معمولی فائدے کی بھی توقع رہی ہوگی۔ یہ فائدہ ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں ہوگا۔

لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے، سراج اور عارف خاں کمرے کے اندر کھدائی سے مایوس ہوتے گئے۔ انہیں کوئی خاص چیز نہیں مل سکی۔ اس کے بعد سراج، زلیخا کے ساتھ بھی سرد مہری سے پیش آنے لگا۔ زلیخا کوئی ایسی حور پری نہیں تھی کہ وہ اس پر فدا ہو جاتا۔ وہ تو فقط اپنے مطلب کے لیے اس کے ناز نخرے اٹھا رہا تھا۔ آٹھ دس روز پہلے سراج نے عارف خاں کے ساتھ ساتھ زلیخا اور اس کے خاوند کو بھی

صلو تیں سنائیں اور انہیں کہا کہ انہوں نے اس کا وقت برباد کیا ہے۔ کل یہ جھگڑا مزید بڑھا۔ زلیخا کے بیان کے مطابق اس کے خاوند کے ساہیوال کے اسپتال میں دو تین ٹیسٹ ہونے تھے۔ اسے پھیپھڑوں میں پانی کی شکایت تھی۔ زلیخا نے سراج سے کچھ پیسے مانگے۔ وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے پہلے انکار کیا پھر جھلاہٹ میں زلیخا کو طمانچے مارے جس کی وجہ سے اس کا ہونٹ بھی پھٹ گیا۔ اس نے زلیخا کی چوڑیاں بھی اتروا لیں اور اس کی الماری کے اندر کے خانے سے بیس بائیس ہزار روپے بھی نکال لیے۔ زلیخا نے بہت واویلا کیا کہ وہ اب کیا کرے گی... وہ جو اتنا بڑا گڑھا اس کے گھر میں کھود دیا گیا ہے، وہ کیسے بھرا جائے گا اور اگر گڑھا ایسے ہی رہا تو کب تک چھپا رہے گا... اور اگر گھر کی بنیادوں کو کچھ ہو گیا تو کیا بنے گا... وغیرہ وغیرہ۔

ان ساری معلومات کے بعد اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ سیٹھ سراج اور عارف خاں وغیرہ نے یہاں جو کچھ کرنا تھا... وہ کر کے جا چکے ہیں اور جاتے جاتے زلیخا وغیرہ کو بھی سخت خفا کر کے گئے ہیں۔ عمران کی گفتگو سے لگ رہا تھا کہ وہ اس صورت حال سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ میرے یہاں آنے سے پہلے ہی وہ بڑی "چابک دستی" سے زلیخا اور چھیدے کو یہ باور کرا چکا تھا کہ ان کا تعلق پولیس سے ہے اور وہ ایک خفیہ اطلاع پر یہاں پہنچے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ زلیخا اور خاص طور سے اس کا شوہر چھیدا بہت سہمے ہوئے تھے۔ ممکن تھا کہ شروع میں زلیخا نے کچھ تن فن دکھائی ہو لیکن اب وہ بھی ٹیپ ریکارڈر کی طرح بول رہی تھی اور ہر سوال کا جواب فر فر دے رہی تھی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے آنے سے پہلے عمران اور اقبال نے ان میاں بیوی کو اس معاملے میں معافی دینے کا تاثر دیا تھا۔

زلیخا تو کافی دیر سے آنسو بہا رہی تھی، اب مجھے چھیدے کی آنکھوں میں بھی نمی نظر آنے لگی تھی۔ وہ بار بار اپنے خشک سیاہ ہونٹوں پر زبان پھیرتا تھا اور پھر پسلیوں پر ہاتھ رکھ کر کھانسنے لگتا تھا۔ زلیخا نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "اگر تم تینوں... واقعی... پولیس والے ہو تو پھر تم عام کپڑوں میں کیوں آئے ہو؟ اور تم نے اپنے منہ بھی چھپائے ہوئے ہیں۔ اب ہمیں کیا پتا کہ تم واقعی پولیس والے ہو یا نہیں... اگر ہم تمہاری وجہ سے... کسی اور چکر میں پھنس گئے تو پھر...؟"

"ہوشیار عورت ہو۔" عمران نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن اگر اس ہوشیاری میں سے کچھ ہوشیاری پہلے دکھائی ہوتی تو سراج کے جال میں نہ آتیں۔ لگتا ہے کہ اس وقت تمہاری ہوشیاری پر ٹھپا لگ گیا تھا اور آنکھوں پر لالچ کی پٹی بندھ گئی تھی۔" پھر وہ اقبال سے مخاطب ہو کر بولا۔ "دکھاؤ بھئی اس ہوشیار عورت کو اپنا کارڈ۔"

اقبال نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کارڈ نکال کر زلیخا کی طرف بڑھا دیا۔ یہ پتا نہیں کس محکمے کا کارڈ تھا۔ انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔ زلیخا اور چھیدے کو خاک سمجھ میں آنا تھا... دونوں ہی خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئے۔ عمران نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "بی بی صاحبہ! اگر آپ کی تسلی نہیں ہو رہی تو پھر علاقہ انچارج سے فون پر آپ کی بات کرا دیتے ہیں... یا پھر ایس پی صاحب سے کہتے ہیں کہ وہ خود یہاں آکر آپ کے پاس حاضری لگوا جائیں۔"

"نن... نہیں... ہم آپ پر شک تو نہیں کر رہے جی... بب... بس اس بات سے ڈر رہے ہیں کہ ہم پر کوئی اور مصیبت نہ آجائے۔" زلیخا کا شوہر چھیدا منمنایا۔

زلیخا نے عاجزی سے کہا۔ "ہم بڑے وچارے لوگ ہیں پھراجی... ہم میں تھانے کچہریوں کی ہمت نہیں ہے۔ آپ جو کہیں گے... ہم ویسا ہی کریں گے۔ بس ہم پر اس معاملے کا بوجھ نہ پڑے۔"

"ہم تو یہی چاہتے تھے... پر اب تمہاری باتوں سے لگ رہا ہے کہ تم لوگ خوار ہونے کا پروگرام بنا رہے ہو۔ یہ بڑا سخت کیس ہے بی بی... یہ جو تمہارا گھر شریف ہے نا، یہ بس چار چھ مہینے میں بک جانا ہے اور یہ جو تیرے پنڈے پر چربی چڑھی ہوئی ہے نا، یہ بھی پگھل جانی ہے سینٹرل جیل میں..." عمران کا انداز جلالی تھا۔

"ہم... مجھے مافی دے دو صاحب جی... میں نے تو بس یونہی بات کی تھی۔ آ... آپ جو کہیں گے، ہم ویسا ہی کریں گے۔ ہم... تو خود چاہتے ہیں کہ خواجے اور اس کے یار کو ہتھکڑیاں لگیں۔ اللہ کرے... اللہ کرے ان کے جنازے نکلیں جیل کے اندر سے۔ اس خواجے نے میرے ساتھ جو کیا ہے، میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ کل جہانے اور چھیدے کے سامنے، مجھے ماں، بہن کی گندی گالیاں دی ہیں۔ مجھے چپیڑیں ماری ہیں۔ میری قمیص پھاڑی ہے۔ آپ خود دیکھ لیں، وہ سامنے الماری میں پڑی ہوئی ہے۔" وہ ایک بار پھر آنسو بہانے لگی۔ اس کے آنسو ہمدردی کے طالب تھے۔

عمران پتھر کی طرح ساکت بیٹھا رہا۔ روایتی تھانے داروں کی طرح اس کے انداز میں کوئی لچک نظر نہیں آرہی تھی۔ غالباً دل ہی دل میں وہ اس صورت حال کو انجوائے بھی کر رہا تھا۔ اسے بے حرکت بیٹھے دیکھ کر چھیدے نے ہاتھ

www.pkdigest.com

جوڑ دیے۔ "معاف کر دیں جی۔ اس نے غلط بات کی ہے، اس کے لیے میں معافی مانگتا ہوں۔ ہم آپ سے پورا پورا تعاون کریں گے۔"

اب عمران نے تھوڑی سی نرمی دکھائی اور دوبارہ سوال جواب شروع کیے۔ اس نے زلیخا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "دیکھو زلیخا! میں اس سارے معاملے کی ہر چھوٹی سے چھوٹی تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔ یہاں سراج اور عارف خاں کے علاوہ اور کون کون آیا ہے؟ انہوں نے کیا کیا ہے؟ ان کے درمیان کیا باتیں ہوتی رہتی ہیں؟ میں چاہتا ہوں کہ تم دونوں اس بارے میں کوئی بھی چھوٹی بڑی بات چھپاؤ مت۔ کون سی بات ہمارے لیے ضروری ہے اور کون سی نہیں، یہ ہم خود طے کریں گے۔"

زلیخا نے ایک بار پھر تھوڑی سی منت ساجت کی کہ ان دونوں کو اور جہانے کو اس معاملے میں سے نکال لیا جائے۔ عمران نے اس بات پر نیم رضامندی ظاہر کی۔ اس کے بعد زلیخا کو چارپائی سے کھول دیا گیا۔ اس کی گردن اور بازوؤں پر گہری خراشیں تھیں۔ یہ تازہ خراشیں آج ہی کی کھینچا تانی کا نتیجہ تھیں۔ جہاں جہاں رسّی کا بل آیا تھا، وہاں اس کے گورے جسم پر نشان سے پڑ گئے تھے۔ وہ ان نشانوں کو سہلانے لگی۔ پھر اس نے اپنی پھٹی ہوئی قمیص الماری میں سے نکال کر ہمیں دکھائی۔ عمران اور اقبال نے قمیص دیکھ کر ایک طرف رکھ دی۔ عمران کے کہنے پر وہ چادر اوڑھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی اور ایک بار پھر شروع سے اپنی روداد سنانے لگی۔ اس بار وہ چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بھی بتا رہی تھی۔ شوہر کی موجودگی کی وجہ سے صرف اس روداد کا "رومانی پہلو" مختصر کر رہی تھی۔

ان کی باتوں سے پتا چلا کہ وارثی نام کا ایک بندہ بھی دو بار سیٹھ سراج کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ اس کی تھوڑی پر زخم کا ایک پرانا نشان تھا۔ اس نے بھی عارف خاں اور جہانے کے ساتھ کھدائی میں حصہ لیا تھا۔ ایک خاص بات جو زلیخا نے بتائی، وہ یہ تھی کہ سراج اور عارف خاں کی باتوں میں اکثر "لال کوٹھیوں" کا ذکر آتا تھا۔ "لال کوٹھیاں" لاہور میں ہی کوئی جگہ تھی۔ وہاں سراج کے علاوہ عارف اور وارثی وغیرہ بھی جاتے رہتے تھے۔ لال کوٹھیوں کے ساتھ کسی میڈم کا تذکرہ بھی ہوتا تھا۔ یہ میڈم یا تو لال کوٹھیوں والی جگہ پر رہتی تھی یا پھر اس کا بھی وہاں آنا جانا تھا۔

عمران نے زلیخا سے دریافت کیا۔ "تم دونوں نے کبھی اس سے پوچھا نہیں کہ یہ کون سی جگہ ہے؟ خاص طور سے تمہارے ساتھ تو وہ ہر طرح کی بات کرتا تھا اور بہت سارا وقت گزارتا تھا۔" عمران کا لہجہ ایک بار پھر معنی خیز تھا۔

زلیخا کی گردن جھک گئی۔ "نہیں جی... میں سچ کہتی ہوں، مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔"

عمران نے اقبال اور مجھ سے ایک ساتھ مخاطب ہو کر پوچھا۔ "ہاں بھئی! تم دونوں نے کچھ سنا ہے لال کوٹھیوں کے بارے میں؟"

اقبال بولا۔ "ہری کوٹھیوں کے بارے میں تو سنا ہے۔ اس جگہ کو ہری کوٹھیاں اسٹاپ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ جگہ سمن آباد لاہور میں ہے لیکن لال کوٹھیاں تو نہیں سنا۔"

عمران نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "لال کوٹھی، پیلی کوٹھی، سفید کوٹھی... اس طرح کے نام اکثر گلی محلوں میں رکھ لیے جاتے ہیں۔ اس طرح تو رنگوں کے نام سے لاہور میں ہزاروں کوٹھیاں ہوں گی مگر یہاں ہمارے لیے تھوڑی سی آسانی موجود ہے۔ یہ ایک کوٹھی نہیں بلکہ ایک سے زیادہ ہیں۔ یقیناً یہ کوٹھیاں ساتھ ساتھ ہوں گی اس لیے انہیں لال کوٹھیاں کہا جانے لگا ہے۔"

"ہاں ظاہر ہے کہ لال کوٹھی کا نام تو کسی بھی بڑے شہر میں بہت سی جگہوں کا ہو سکتا ہے مگر لال کوٹھیاں بہت زیادہ جگہوں کا نہیں ہوگا۔" میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"مجھے لگتا ہے کہ تمہاری ترقی ضرور ہو جائے گی۔" عمران نے ذرا شوخ لہجے میں کہا۔ "اب تم نے دماغ استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔"

وہ فقرہ چست کرنے سے کہیں بھی باز نہیں آتا تھا۔

زلیخا کا خاوند اب تک خاموش بیٹھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اسے سب کچھ دیکھتے سنتے لیکن خاموش رہنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ذرا سیدھا ہو کر بیٹھا تو عمران نے پوچھا۔ "کیا تم بھی کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

وہ پُرسوچ انداز میں منمنایا۔ "کیا لاہور میں کوئی ایسی جگہ بھی ہے جہاں کبوتر وغیرہ اڑانے پر پابندی ہے؟"

"کبوتر اڑانے پر؟ یہ بھلا کیا بات ہوئی؟" اقبال نے کہا۔ "ہم نے تو کبھی ایسا نہیں سنا... اور اگر کوئی ایسی پابندی ہو بھی تو پورے شہر پر ہوتی ہے، کسی ایک جگہ تو نہیں۔"

"تم یہ بات کیوں کہہ رہے ہو؟" عمران نے چھیدے سے پوچھا۔

"بس جی، ویسے ہی۔ ایک دن عارف خاں یہاں موبائل فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ وہ دوسرا بندہ لال کوٹھیوں میں تھا۔ وہ عارف کو بتا رہا تھا کہ یہاں کسی نے

شکایت کر دی ہے کہ ہم نے کوٹھی میں کبوتر رکھے ہوئے ہیں۔ اب ناظم کا ٹیلی فون آ گیا ہے... کچھ اس طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔"

"یہ تو کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔" اقبال نے کہا۔ "کچھ گلی محلوں یا کالونیوں میں علاقے کے لوگ خود ہی کبوتر اور پتنگ بازی وغیرہ پر پابندی لگا لیتے ہیں یا لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

عمران کے چہرے پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ اس نے بڑے دھیان سے چھیدے کی طرف دیکھا۔ وہ چھیدے کی بات پر گہرائی سے غور کر رہا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے انگلی اٹھائی اور بولا۔ "میرے خیال میں ہمیں چھیدے کی اطلاع، غور کرنے کی دعوت دے رہی ہے۔"

"کیا مطلب؟" اقبال نے پوچھا۔

"میری معلومات کے مطابق لاہور میں کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں ہوا میں پرندوں کی موجودگی کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ سول ایوی ایشن والے دھیان رکھتے ہیں کہ اس علاقے کی فضا پرندوں، پتنگوں وغیرہ سے خالی رہے۔"

"سول ایوی ایشن اس میں کہاں سے آ گئی؟" اقبال نے استفسار کیا۔

"تم شاید اخبار غور سے نہیں پڑھتے۔ ابھی پچھلے دنوں بھی اس طرح کی ایک خبر آئی تھی۔ ایوی ایشن کے کسی اعلیٰ افسر نے کہا تھا کہ ہوائی اڈوں کے اردگرد کی فضا کو صاف رہنا چاہیے۔ دوسری صورت میں جہازوں کو لینڈنگ اور ٹیک آف کے وقت خطرات لاحق ہو جاتے ہیں۔ اس خبر میں علاقے کے اندر صفائی ستھرائی کی ضرورت پر بھی خاص زور دیا گیا تھا... کیونکہ کوڑے کرکٹ کی وجہ سے پرندوں کی آمد بڑھ جاتی ہے۔"

"ہاں، اس قسم کی خبریں آتی رہتی ہیں۔" میں نے تائید کی۔

"کبوتر بازی اور پتنگ بازی پر پابندی والی بات بھی میں نے کہیں سنی تھی۔ متعلقہ محکمے کے کسی عہدے دار نے کہا تھا کہ ائیرپورٹ کے اردگرد کے علاقے میں ایسے حفاظتی انتظامات کو یقینی بنایا جائے۔" عمران نے وضاحت کی۔

چھیدے نے ایک بار پھر گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ ٹھیک سوچ رہے ہیں۔ اس روز عارف خاں نے موبائل پر جو گل بات کی تھی، وہ اسی طرح کی تھی۔ اس میں تھانے کی بات بھی ہوئی تھی کہ کہیں کبوتروں کی وجہ سے کوئی پرچہ وغیرہ نہ ہو جائے۔ عارف خاں نے گالی دیتے ہوئے کہا تھا کہ کسی کی شامت نہیں آئی ہے کہ ایسی چھوٹی سی بات پر ہم پر پرچہ کرائے۔"

کچھ دیر تک عمران، اقبال اور چھیدے میں اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ عمران کو لال کوٹھیوں والا "کلیو" اب خاصا اہم محسوس ہونے لگا تھا۔ کم از کم میں نے تو یہی اندازہ لگایا تھا۔ اگلے آدھ پون گھنٹے میں عمران نے زلیخا اور چھیدے کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ اگر اس سنگین کیس میں وہ اپنے لیے کچھ نرمی چاہتے ہیں تو انہیں کیا کرنا ہوگا۔ انہیں اس سارے معاملے میں فی الحال بالکل خاموش رہنا تھا۔ یہاں تک کہ محلے کے چوکیدار سعید سے بھی کوئی بات نہیں کرنا تھی۔ نہ ہی گھر کو تالا لگا کر کہیں غائب ہونا تھا۔ عمران نے ان کو تسلی دی کہ وہ انہیں اس معاملے سے نکالنے کی کوشش کرے گا، یا کم از کم سلطانی گواہ بنا دے گا۔ زلیخا اور چھیدے سے بات کرتے ہوئے عمران نے اپنا لب و لہجہ بالکل پولیس اہلکاروں جیسا بنا لیا تھا۔ وہ اپنا اور ہمارا تعلق خفیہ پولیس سے بتا رہا تھا اور ہم نے جو اپنے چہرے چھپا رکھے تھے، اس کی وجہ بھی یہی بیان کر رہا تھا۔

رات تین بجے کے لگ بھگ ہم اپنے میزبان امتیاز کے گھر واپس آ گئے۔ وہ ہمارے انتظار میں جاگ رہا تھا اور اس انتظار میں کئی کپ چائے کے علاوہ ڈیڑھ دو کلو مونگ پھلی بھی کھا چکا تھا۔

زلیخا اور چھیدے کے گھر میں جو کچھ نظر آیا تھا، اس نے عمران کا حوصلہ بہت بڑھا دیا تھا۔ وہ ایک دم پُرجوش دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا پختہ ارادہ بن گیا تھا کہ وہ سیٹھ سراج سے تعلق رکھنے والے اس معاملے کی تہ تک ضرور پہنچے گا۔ ان لمحوں میں وہ مجھے ایک بازی گر سے زیادہ ایک جاسوس دکھائی دیا۔ سیٹھ سراج کے کالے کرتوت کو سامنے لانے کا سودا اس کے دماغ میں سما گیا تھا اور اب وہ پیچھے ہٹنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اور پتا نہیں کیوں، مجھے لگ رہا تھا کہ وہ یہ کام کر گزرے گا۔ اس تھوڑے ہی عرصے میں، میں نے اس کے بہت سے گن دیکھ لیے تھے اور مجھے اس پر اعتماد سا ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ اس شخص کے اندر سے ہر وقت ایک توانائی سی پھوٹتی رہتی ہے اور یہ توانائی اس کے اردگرد کے لوگوں کو گرماتی ہے۔ ان میں حیران کن تبدیلیاں لاتی ہے۔ میں خود پر ہی غور کرتا تو ان تبدیلیوں کا ثبوت سامنے آ جاتا تھا۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ چند دن پہلے میں نے سیکڑوں افراد کے سامنے ایک خطرناک کھیل کھیلا تھا۔ ریوالور کے چیمبر میں اصلی گولی رکھ کر اپنے جسم پر فائر کیا تھا۔ بے

www.pkdigest.com

شک اس عمل میں میرے اندر کی سخت اضطرابی کیفیت نے بھی میری مدد کی تھی لیکن اس کے لیے اصل حوصلہ مجھے عمران سے ہی ملا تھا۔ تالیوں کی وہ آواز ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی جو میرے ٹریگر دبانے کے بعد فضا میں ابھری تھی۔ اور اس واقعے سے صرف تیرہ چودہ گھنٹے پہلے تک میں اس قدر مایوس تھا کہ ریل کی پٹری پر لیٹ کر اپنے جسم کو ٹکڑوں میں بدلنے کا سوچ رہا تھا۔

ہاں... یہ شخص میرے اندر کچھ تبدیلیاں پیدا کر رہا تھا، بڑی نرمی سے اور صفائی سے۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ یہاں آ کر مجھے اپنے ساتھ زلیخا اور چھیدے کے گھر لے گیا تھا۔ یہ بھی لے کر جاتا تو کیا فرق پڑتا تھا لیکن وہ شاید میرے اندر دلچسپی اور جوش پیدا کرنے کا خواہاں تھا۔

ہم علی الصباح بستی کے جاگنے سے پہلے ہی وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ہڑپہ کا قدیم شہر ابھی تاریکی اور دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ ہماری گاڑی ان ٹیلوں کے قریب سے گزری جن کے نیچے اور جن کے ارد گرد قریباً ساڑھے چار ہزار سال پرانی تہذیب دم سادھے لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے ان کھنڈرات کے ہیولوں کو اپنے بالکل قریب محسوس کیا... اور سوچا کہ یہ کب سے یہاں موجود ہیں۔ بہت دیر سے... بے شک بہت دیر سے۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس دنیا میں آئے اس وقت بھی یہ در و دیوار قریباً 2600 سال پرانے تھے...

ہماری مہران کار اونچے نیچے راستے پر ہچکولے کھاتی ساہیوال کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ اقبال اگلی نشست پر عمران کے ساتھ بیٹھا تھا، میں پچھلی نشست پر نیم دراز ہو گیا۔ آٹھ بجے کے قریب ہم لاہور کے گرد و نواح میں تھے۔ عمران ایک ٹریکٹر ٹرالی کو مسلسل ہارن دے رہا تھا مگر وہ راستہ نہیں دے رہی تھی۔ ایک دو بار عمران نے بائیں جانب سے نکلنے کی کوشش کی مگر ادھر سے بھی راستہ نہیں ملا۔ ٹرالی میں چارے کے گٹھے تھے اور چھ سات افراد سوار تھے۔ یہ نوجوان تھے اور مستی میں دکھائی دیتے تھے۔ ٹرالی کے ٹیپ ریکارڈر پر بلند آواز سے گانے بھی بج رہے تھے۔

تھوڑا سا راستہ ملا تو عمران نے کوشش کر کے اوورٹیک کرنا چاہا۔ اسی دوران میں ٹرالی ڈرائیور نے ٹرالی کو تھوڑا سا لہرایا اور ہماری کار کے پچھلے حصے پر ایک لمبی رگڑ آ گئی... ''الو کے پٹھے!'' عمران نے دانت پیس کر کہا۔

آگے جا کر اس نے گاڑی روک دی اور ہاتھ کے اشارے سے ٹرالی والوں کو بھی رکنے کا کہا۔ کار سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر ٹرالی بھی رک گئی۔ اس میں سے لڑکے چھلانگیں لگا کر نیچے اتر آئے۔ کار کے دونوں بائیں دروازوں پر اچھی خاصی رگڑ آئی تھی۔ ٹرالی والوں سے تو تکرار ہوئی۔ اگر وہ ذرا سی بھی شرمندگی ظاہر کرتے تو عمران انہیں جانے دیتا لیکن وہ ایک نمبر کے اجڈ ثابت ہوئے۔ غالباً ان کا ڈرائیور وغیرہ بھی قریب ہی تھا۔ جب انہوں نے بڑھ بڑھ کر باتیں کیں تو عمران کو بھی تاؤ آ گیا۔ وہ ایسے معاملات میں پیچھے ہٹنے والا کہاں تھا۔ اس نے پھولی ہوئی ناک والے ڈرائیور کا گریبان پکڑا اور ایک طوفانی ٹکر اس کے چہرے پر رسید کی۔ وہ اچھل کر کنارے کے کھیت میں جا گرا۔ ایک دوسرے شخص نے اسے عقب سے دبوچنا چاہا۔ وہ الٹے پاؤں پیچھے ہٹا اور اپنے عقب والے شخص کو بھرپور طاقت سے ٹرالی کے ساتھ ٹکرا دیا۔ یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ اسی جگہ کراہ کر ڈھیر ہو گیا...

اسی دوران میں اقبال نے بھی ایک شخص پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ عمران کی طرح وہ بھی لڑائی بھڑائی میں ماہر نظر آتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں گھمسان کا رن پڑ گیا۔ عمران اور اقبال کم از کم پانچ بندوں سے بھڑ گئے تھے۔ پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ عمران کس بلا کا نام ہے۔ اس نے بے حد مہارت اور بڑی بے رحمی سے چند سیکنڈ کے اندر اندر دو افراد کو بے بس کر دیا۔ ایک اپنا چہرہ... پکڑ کر زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا، دوسرا ٹرالی سے ٹکرانے کے بعد بے حال ہو گیا۔ عمران کے دبلے پتلے جسم میں دبی غیر معمولی پھرتی نظر آئی جو سرکس میں دکھائی دینے والے قریباً چالیس فٹ کی بلندی پر ہوا میں قلابازیاں کھاتے ہوئے نظر آتی تھی۔ اب اس پھرتی میں طیش کا عنصر بھی شامل تھا اس لیے اب یہ اور بھی قابلِ دید ہو گئی تھی۔ عمران اور اقبال کو یوں لڑتے اور غالب آتے دیکھ کر میرے اندر کا خوف بھی ماند پڑنے لگا۔ میں ابھی تک الگ کھڑا تھا اور کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا کروں۔ اسی دوران میں عمران نے گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر نشست کے نیچے سے جیک کی آہنی راڈ نکال لیا۔ اس نے جیک کا راڈ میری طرف اچھالا اور خود جیک کو ہتھیار کے طور پر سنبھال لیا۔

جیک کا راڈ میری طرف اچھال کر اس نے ایک طرح سے مجھے اس لڑائی میں شامل ہونے کی دعوت دی تھی۔ حالانکہ میں نے صاف دیکھ لیا تھا کہ میرے شامل ہوئے بغیر بھی عمران اور اقبال آسانی سے نمٹ لیں گے۔ ابھی میں تذبذب میں ہی تھا کہ کیا کروں... اچانک ٹرالی والوں میں سے ایک بندہ مجھ پر جھپٹا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی لاٹھی تھی۔ اس نے لاٹھی مجھ پر چلائی۔ میں ایک طرف ہٹا۔ لاٹھی میرے کندھے کو چھوتی ہوئی ٹرالی کو لگی۔ میں نے آہنی راڈ گھما کر مدمقابل کی گردن پر رسید کیا... اور حقیقت یہ ہے کہ میری زندگی میں یہ ''پہلا وار'' تھا جو میں نے حقیقی لڑائی میں کسی پر کیا... ایک لمحے کے لیے میں خود دنگ رہ گیا کہ یہ میں نے کس طرح کر لیا۔ گردن پر راڈ کی ضرب کھا کر میرا مدمقابل بری طرح ڈگمگایا۔ میرا حوصلہ بڑھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پلٹتا، میں نے راڈ کی ایک اور ضرب اس کے سر پر لگائی۔ یہ زیادہ زوردار ضرب نہیں تھی پھر بھی مجھے تسلی ہوئی۔ مدمقابل نے اپنا توازن درست کیا اور مجھ پر جوابی وار کرنے کے لیے تیار ہوا مگر یہی وقت تھا جب عمران عقاب کی طرح اس پر جھپٹ پڑا۔ مدمقابل کی لاٹھی اٹھی رہ گئی اور وہ ڈکراتا ہوا گنے کے کھیت میں جا گرا...

ٹرالی میں موجود دو دیگر افراد بیچ بچاؤ کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ چند مزید افراد بھی وہاں جمع ہو گئے۔ ان میں ایک اسٹیشن ویگن سے اترنے والے افراد بھی تھے۔ یہ کسی ادارے کے سیکیورٹی گارڈز تھے۔ ان سب لوگوں نے مل کر بیچ بچاؤ کرایا۔ اقبال کا سر پھٹ گیا تھا اور عمران کے ہاتھ پر معمولی چوٹ آئی تھی۔

اس جھگڑے کو ختم ہونے میں تقریباً ایک گھنٹا لگ گیا۔ عمران کی گاڑی کا نقصان ہوا تھا، دوسری طرف ٹرالی والوں کو خاصی جسمانی ضربیں آئی تھیں۔ ایک [illegible] والے لڑکے کی تو کلائی ٹوٹ گئی تھی۔ تھانے کچہری میں جانے کے بجائے معاملے کو وہیں نمٹا لیا گیا۔ اس سلسلے میں ایک فون نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ یہ فون عمران نے لاہور سے کروایا تھا۔ فون کرنے والا ایک ایس ایس پی تھا۔

ہم دن گیارہ بجے کے لگ بھگ واپس عمران کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ اقبال کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ عمران کو بھی ہاتھ پر ہلکی سی بینڈیج کرانا پڑی تھی۔ بہرحال، وہ دونوں بالکل ہشاش بشاش تھے۔ ان کے لیے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ آج کا دن میرے لیے بہت... بہت اہم رہا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میں ذرا کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹا تو نگاہوں میں ایک بار پھر ٹرالی سواروں کے ساتھ ہونے والی لڑائی کے مناظر گھومنے لگے۔ مجھے اب بھی بھروسا نہیں ہو رہا تھا کہ میں نے اس لڑائی میں حصہ لیا ہے۔ پتا نہیں، وہ کیا کیفیت تھی جس کے تحت میں نے خود پر جھپٹنے والے پر آہنی راڈ کا وار کیا تھا اور یہ اکیلا وار نہیں تھا... دو وار تھے۔ میری زندگی کے پہلے دو وار!

یہ جو کچھ آج میں نے کیا تھا، اس کی مجھے ہمیشہ حسرت ہی رہی تھی۔ اب تک کی زندگی میں بے شمار موقعے ایسے آئے تھے جب مجھے لڑنا چاہیے تھا لیکن میں لڑ نہیں سکا تھا۔ اپنی اس بے بسی کا بدلہ میں نے ہمیشہ خود ہی سے لیا تھا۔ اپنے اندر ہی جل کر کڑھتا رہا تھا۔ اپنے آپ کو اذیت دی تھی یا پھر اپنا سارا غصہ کسی پنچنگ بیگ پر اتارا تھا۔ مارشل آرٹ میں مہارت حاصل کرنے کا جنون بھی دراصل میری انہی محرومیوں و ناتوانیوں کا شاخسانہ تھا۔

''کس سوچ میں کھو گئے ہو جگر؟'' عمران کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔

''کچھ بھی نہیں۔ بس یونہی لیٹا ہوں۔''

''یار! اب یونہی نہیں لیٹنا چاہیے۔ کچھ کرنا چاہیے۔ قدرت نے ہمیں ایک بڑا اچھا موقع دیا ہے۔ ویسے تو ہم شاید سیٹھ سراج جیسے بندے سے ٹکر نہ لے سکتے لیکن اب حالات خود اس سے ٹکر لے رہے ہیں۔ شاید اسی کو مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ ہمارا ارادہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے اپنے کرتوت ہی اس کی سزا کو آواز دے رہے ہیں۔''

میں نے گہری سانس لی۔ اقبال دوسرے کمرے میں سو رہا تھا۔ عمران پھیل کر صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ ''تم کیا چاہ رہے ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''جو میں چاہ رہا ہوں، وہ تم بھی اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔ تمہاری منگیتر ثروت کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کا ذمے دار سراج کا اوباش بیٹا واجی تھا۔ اس کے بعد ثروت کی فیملی کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کی ذمے داری سراسر اس خبیث سراج پر آتی ہے۔ ان باپ بیٹے نے تمہیں اجاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ تابش! یہ دونوں کسی رعایت کے مستحق نہیں ہیں۔ کم از کم میں تو انہیں کسی صورت معاف نہیں کر سکتا۔''

میں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو عمران! سیٹھ اور اس کے بیٹے کو سزا ملنے سے مجھے وہ سب کچھ واپس مل جائے گا جو میں کھو رہا ہوں؟''

عمران نے اپنے لمبے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''تمہارا اشارہ ثروت کی طرف ہے اور میں تمہارے دکھ کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ ہم اس سلسلے میں بھی آسانی سے ہار نہیں مانیں گے... بلکہ ہار مانیں گے ہی نہیں۔ ہم سر دھڑ کی بازی لگائیں گے میرے شہزادے۔ کچے گھڑے پر تیر جائیں گے... اور دریا ہی پار نہیں کریں گے بلکہ سمندر پار کریں گے۔ ہم ڈھونڈیں گے اس کو... اور اتنی شدت سے ڈھونڈیں گے کہ اس کو ملنا ہی پڑے گا... لیکن اب جو بات میں کر رہا ہوں، یہ بھی غیر اہم نہیں ہے۔ قدرت ہمیں سیٹھ سے بدلہ لینے کا

www.pkdigest.org

ایک سنہری موقع فراہم کر رہی ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، وہ آسانی سے گرفت میں آجائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے ہاتھ ہماری توقع سے زیادہ لمبے ہوں۔"

"لیکن ہم بھی تو اس پر نرم ہاتھ ڈالنا نہیں چاہتے۔ نرم ہاتھ ڈالا ہوتا تو وہ آج بھی سلاخوں کے پیچھے نظر آسکتا تھا۔ کم از کم اس پر ایک عدد "پرچہ" تو ہو ہی سکتا تھا۔ اس کے لیے چھیدے اور زلیخا کے بیان کافی تھے۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے شک ہو رہا ہے کہ سیٹھ جو کچھ کر رہا ہے، اس کا دائرہ ہماری توقع سے زیادہ وسیع ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم اس سلسلے میں تھوڑی سی پڑتال کریں۔ چھیدے نے جو لال کوٹھیوں والی اطلاع دی ہے، یہ ہمارے لیے مددگار ثابت ہو سکتی ہے... اور مجھے لگ رہا ہے کہ ہمارے لیے یہ لال کوٹھیوں والی جگہ ڈھونڈنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔"

"لال کوٹھیوں والی جگہ مل گئی تو پھر کیا ہوگا؟"

"پھر یہ پتا چلے گا کہ سراج اور عارف کی باتوں میں بار بار ان کوٹھیوں کا ذکر کیوں آتا رہا ہے۔ یہ میڈم صاحبہ کون ذات شریف ہیں اور کیا سیٹھ سراج جو کچھ ہڑپ میں کرتا رہا ہے، اس کا تعلق ان لال کوٹھیوں سے بھی ہے؟"

میں ویسے تو اس سارے معاملے سے بیزاری ظاہر کر رہا تھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ اب میرے اندر بھی ایک لہر سی جاگی ہوئی تھی۔ سیٹھ سراج اور اس کے بیٹے کے لیے میرے اندر چند روز پہلے جو بے پناہ نفرت پیدا ہوئی تھی اور جس نے مجھے خودکشی کی طرف مائل کر دیا تھا، اب ایک نیا موڑ لے رہی تھی۔ میں سیٹھ سراج کو سزا کے شکنجے میں دیکھنا چاہ رہا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ میرے اندر جو یہ تبدیلی واقع ہوئی تھی، اس کی بڑی وجہ خود عمران تھا۔ اس شخص کا عجیب وغریب کردار اور اس کا بے پایاں حوصلہ مجھ پر بھی اثر انداز ہو رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، کیا یہ لال کوٹھیوں والی جگہ ڈھونڈنا آسان ہوگا؟"

"یہ ہوئی نا فائیو اسٹار بات۔" وہ خوش ہو کر بولا۔ "اب تم نے دلچسپی ظاہر کر دی ہے تو یہ کام ایسا مشکل بھی نہیں ہوگا۔ یہ دیکھو، میں ابھی تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ کام کیسے ہوگا۔" اس کے انداز میں شوخی تھی۔

اس نے الماری میں سے ایک اوورکوٹ نکال کر پہنا، سر پر پی کیپ جمائی اور ہاتھ میں پائپ کی جگہ بڑے اسٹائل سے ایک چمچ پکڑ لیا۔ صوفے پر نیم دراز ہو کر وہ شرلاک ہومز کے اسٹائل میں بولا۔ "دیکھو ڈاکٹر واٹسن... میرا مطلب ہے ڈاکٹر تابش... کہ لاہور میں ایک جگہ ہے جو لال کوٹھیوں کے نام سے مشہور ہے۔ لاہور کی آبادی ساٹھ ستر لاکھ ہو چکی ہے۔ اتنی بڑی آبادی میں سے یہ جگہ ڈھونڈنی مشکل تھی مگر اب ہمارے لیے کافی آسانی پیدا ہوگئی ہے۔ یہ جگہ ایک ایسے علاقے میں ہے جو لاہور ائرپورٹ کے اردگرد ہے۔ اس طرح یہ کام کافی "شارٹ لسٹ" ہو جاتا ہے۔ ہو جاتا ہے کہ نہیں؟"

"بالکل ہو جاتا ہے۔" میرے بجائے ساتھ والے کمرے سے اقبال نے جواب دیا۔ وہ ابھی ابھی بیدار ہوا تھا۔ اس کی کنپٹی پر ایک میڈیکل ٹیپ چپکی ہوئی تھی۔

"ویری گڈ! میرا خیال ہے کہ کل تم جیلانی اور سرفراز کو لے کر علاقے کا... سروے کرو۔ دو چار ڈاک خانوں میں جاؤ۔ مجھے امید ہے کہ اس جگہ کا پتا چل جائے گا۔"

"جو حکم وڈے تھانے دار صیب۔" اقبال نے اسٹائل سے کہا اور پھر دونوں ہنسنے لگے۔

میں بدستور سنجیدہ رہا۔ ہنستا اور مسکراتا تو میں جیسے بھول ہی چکا تھا۔ عمران نے بغور میرا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ "یار! ایک بار گھر فون کرلو۔ تمہاری طبیعت بہتر ہو جائے گی۔"

وہ پچھلے دو تین روز میں کم از کم ایک درجن مرتبہ یہ مشورہ دے چکا تھا۔ شروع میں تو مجھے یہ مشورہ بالکل ناقابلِ عمل لگ رہا تھا مگر اب میرے ردِعمل میں تھوڑی سی تبدیلی آرہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں ایک بار واقعی گھر میں بات کرلوں تو گھر والوں کی پریشانی بڑی حد تک کم ہو سکتی ہے۔ خاص طور سے مجھے والدہ کی طرف سے فکر لاحق تھی۔ میری گمشدگی کی پریشانی انہیں کسی بڑی مصیبت سے دوچار کر سکتی تھی۔ میں نے دیر تک اس معاملے پر غور کیا اور پھر شدید تذبذب میں سے نکل آیا۔

میں نے عمران سے اس کا سیل فون لیا اور گھر کی چھت پر چلا گیا۔ دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں سے میں نے گھر کا نمبر ملایا۔ فون والدہ نے ہی اٹھایا۔ انہوں نے میری آواز سنی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ اس رونے میں خوشی کا عنصر بھی شامل تھا۔ "تم کہاں ہو تابی! خدا کے لیے بتاؤ کہ تم کہاں ہو؟ تم ٹھیک تو ہو نا... تم ایسا کیوں کر رہے ہو ہمارے ساتھ؟ تمہیں پتا ہے میں پورے دو دن اسپتال رہ کر آئی ہوں۔ کیا تم میری جان لینا چاہتے ہو؟ کیا مارنا چاہتے ہو مجھے...؟" وہ بغیر رکے بولتی چلی گئیں۔

میں نے انہیں دلاسا دیا۔ بتایا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں... اور اپنی مرضی سے یہاں موجود ہوں۔

وہ فریاد کناں انداز میں بولیں۔ "تم کیوں واپس نہیں آرہے ہو۔ تمہیں کس بات کا ڈر ہے؟ اگر واجی اور اس کے باپ والا مسئلہ ہے تو ہم یہ گھر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ تمہاری پھوپھی کے گھر سرگودھا چلے جائیں گے، تم کسی بات کی فکر نہ کرو۔ بس واپس آجاؤ۔"

"مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے امی... بس ایک مجبوری ہے۔ میں آکر آپ کو بتاؤں گا لیکن ابھی کچھ دن میں نہیں آسکتا۔ میں آپ کو فون کرتا رہوں گا۔"

"کتنے دن نہیں آسکتے؟ مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ اس طرح ہمیں انتظار کی سولی پر مت لٹکاؤ۔"

اسی دوران میں فرح نے والدہ سے ریسیور لے لیا۔ وہ بھی رونے بلکنے لگی۔ "بھائی! آپ کو میری قسم، آپ واپس آجائیں۔ ہم آپ کے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

میں نے اس کو پچکارا اور تسلی دی۔ چھوٹے بھائی عاطف اور چچا وغیرہ سے بھی میری بات ہوئی... اس گفتگو سے یہ اندیشہ درست ثابت ہوا کہ پارک میں سیٹھ سراج کے کارندوں نے میرے ساتھ جو مار پیٹ کی تھی، اس کی خبر ہر ایک کو ہو چکی ہے۔ شروع میں تو میرے گھر والوں اور عزیزوں کو بھی اندیشہ تھا کہ مجھے پارک میں مارنے پیٹنے کے بعد سراج نے کہیں بے جا میں رکھا ہوا ہے، وہ تھانے جانا چاہتے تھے تاہم بعد میں علاقے کے ناظم نے سیٹھ کی طرف سے اس بات کی گارنٹی دی کہ میں سیٹھ کی تحویل میں نہیں ہوں۔ بعد میں میری طرف سے عمران نے میرے گھر فون بھی کر دیا تھا۔ اس فون کے بعد گھر والوں کو کچھ تسلی ہو گئی تھی۔

میں عمران کے گھر کی چھت پر ٹہلتا رہا اور ساتھ ساتھ گھر والوں سے بات بھی کرتا رہا۔ وہ رو رہے تھے اور میری آنکھوں سے بھی آنسو ٹپک رہے تھے۔ فی الحال میں انہیں تسلی تشفی کے سوا کچھ نہیں دے سکتا تھا۔ والدہ مسلسل فریاد کناں تھیں... "تابی! تو تو ناشتا بھی نہیں کر کے گیا تھا۔ بھوکے پیٹ نکل گیا تھا گھر سے۔ تیری جیب میں تو پیسے بھی نہیں تھے۔ بس ایک جوڑا تھا تیرے پاس۔ کیا پہنتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟"

میں نے انہیں بتایا کہ میں لاہور میں ہی ہوں اور اپنے ایک قریبی دوست کے گھر میں ہوں۔ میری ہر ضرورت پوری ہو رہی ہے۔ آپ فکرمند نہ ہوں۔ میں نے انہیں اطمینان دلایا کہ دوبارہ فون کروں گا اور بات ختم کر دی۔ ہمارے گھر کے فون میں سی ایل آئی نہیں تھا اس لیے مجھے اطمینان تھا کہ عمران کا سیل نمبر گھر والوں کو معلوم نہیں ہوگا۔

گھر میں بات کر کے مجھے کافی تسلی ہوئی۔ یوں لگا کہ سر پر رکھا ہوا ایک بہت بھاری بوجھ اتر گیا ہے۔ یہ ایک ایسا بوجھ تھا جس نے پچھلے چند روز سے میری گردن توڑ رکھی تھی۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ بالکل ہلکا پھلکا ہو گیا تاہم کچھ نہ کچھ ریلیف مجھے ضرور مل گیا تھا۔

میں جن حالات سے گزر رہا تھا، یہ بڑے تند و تیز تھے۔ عمران کی پارہ صفت طبع نے انہیں مزید تند و تیز بنا دیا تھا۔ اس کے باوجود ثروت کا دھیان کسی گھڑی بھی میرے ذہن سے نکلتا نہیں تھا۔ وہ کہاں ہوگی... کیا کر رہی ہوگی؟ میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی؟ اس طرح کے بے شمار سوالات ذہن میں کلبلاتے رہتے تھے۔ میرے پاس ثروت یا ناصر بھائی سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ وہ پاکستان سے یوں اوجھل ہوئے تھے کہ اپنے پیچھے کوئی نشان ہی نہیں چھوڑا تھا۔ ان کا واحد نشان ان کے محلے کے پراپرٹی ڈیلر وہ حاجی صاحب تھے جنہیں وہ اپنے مکان کی فروخت کا ذمے دار بنا گئے تھے۔ بعدازاں حاجی صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ ناصر بھائی انہیں مکان کا مختار نامہ بھی دے گئے ہیں۔ سیٹھ سراج کے ساتھ لڑائی والا واقعہ پیش آنے سے پہلے میں دو تین دفعہ حاجی صاحب کے پاس گیا تھا لیکن وہ مجھے ناصر بھائی کا کوئی سراغ فراہم نہیں کر سکے تھے۔ بہرحال، انہوں نے ہامی ضرور بھری تھی۔ ایک دو بار مجھے ایسے بھی لگا تھا کہ شاید وہ ناصر بھائی کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دانستہ مجھے مکمل معلومات نہیں دے رہے۔

اس روز رات گئے عمران سرکس میں ڈیوٹی دے کر واپس آیا تو میں جاگ رہا تھا جبکہ اقبال سرِشام ہی کھانا کھا کر سو گیا تھا۔ میری سرخ آنکھیں دیکھ کر وہ اپنے مخصوص دل نشیں انداز میں مسکرایا اور میری طرف جھک کر بولا۔ "کیا بات ہے جگر! رونے دھونے کی پریکٹس تو نہیں کر رہے تھے؟"

"رونے سے کچھ ہو سکتا تو سارے شہر کو ڈبو دیتا۔" میں نے آہ بھری۔

"ثروت یاد آرہی ہے نا؟" وہ قدرے شوخی سے بولا۔ پھر ایک دم میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔ "چلو اٹھو... ابھی چلو میرے ساتھ۔"

"کہاں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"بھئی ثروت سے ملنے چلتے ہیں اور کیا؟ یہاں سے اسلام آباد پہنچتے ہیں۔ وہاں سے ویزا لگواتے ہیں۔ سیدھا جرمنی لینڈ کرتے ہیں۔ وہاں مسجدوں میں... نہیں نہیں، گرجا

www.pkdigest.com

گھروں میں اعلان کرواتے ہیں کہ ایک اجلے اجلے مکھڑے والی سوہنی موہنی لڑکی جس نے پاکستانی لباس پہن رکھا ہے اور جس کی آنکھوں میں کسی کا پیار بسا ہے... کچھ عرصہ پہلے پاکستان سے نکلی، ابھی تک واپس نہیں آئی اور نہ اپنے بارے میں کوئی اطلاع دی ہے... لہٰذا...''

''یار مسخری نہ کرو۔ میں ایسے موڈ میں نہیں ہوں۔''

وہ ذرا پیچھے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور غور سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اب اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ وہ اچانک بولا۔ ''کیوں نہ کل ہم انہی حاجی صاحب کے پاس چلیں جن سے تمہارے ناصر بھائی کی بات ہوتی ہے؟''

یہ اس نے میرے دل کی بات کہی تھی۔ کبھی کبھی یوں لگتا تھا جیسے وہ دفعتاً میرے دل میں جھانک لیتا ہے۔ میں نے کہا۔ ''وہاں جانے سے کیا فائدہ ہوگا؟ ناصر بھائی اپنا اتا پتا تو حاجی صاحب کو بھی نہیں بتاتے۔''

وہ مسکرایا۔ ''حاجیوں میں سے کچھ حاجی بڑے پکے چیتے ہوتے ہیں۔ دل کی بات زبان پر نہیں لاتے۔ بڑی گہرائی ہوتی ہے ان کے اندر۔ ہوسکتا ہے یہ حاجی صاحب بھی اسی قسم کے ہوں۔ بہر حال، میں ساتھ ہوں گا تو ہم کچھ نہ کچھ کر گزریں گے۔''

ہمارا پروگرام بنا کہ اگلے روز شام کو ہم حاجی صاحب سے ملیں گے مگر شام سے پہلے ہی ایک ایسی بات ہوگئی کہ یہ پروگرام ملتوی ہوگیا اور ہم ایک دوسرے گمبھیر چکر میں الجھ گئے۔ قریباً چار بجے کا وقت تھا، عمران ابھی سو کر اٹھا تھا اور اپنے ہاتھ کی مالش کررہا تھا۔ یہ ہاتھ ٹرالی سواروں کے ساتھ لڑائی میں تھوڑا سا مڑ گیا تھا۔ بہر حال، اب ٹھیک تھا اور عمران کو امید تھی کہ کل تک وہ سرکس میں موٹر سائیکل کے علاوہ جھولوں والے آئٹمز بھی پیش کرسکے گا۔ اچانک اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف اقبال تھا۔ اس نے عمران کو کوئی من پسند خبر سنائی تھی اور اس خبر کی وجہ سے عمران کے چہرے پر سرخی جھلکنے لگی تھی۔

دو تین منٹ تک اقبال سے بات کرنے کے بعد عمران نے موبائل جیب میں ڈالا اور میرے زانو پر بے تکلفی سے ہاتھ مار کر بولا۔ ''مبارک ہو جگر! لال کوٹھیوں کا پتا چل گیا ہے۔ ہمارے اندازے کے عین مطابق یہ کوٹھیاں جس علاقے میں ہیں، وہ ائرپورٹ سے زیادہ دور نہیں۔ اقبال نے بھی پورا ڈاکٹر واٹسن والا کام کیا ہے۔ وہ کل سے اس چکر میں تھا۔''

اس کے بعد اس نے خود ہی اپنا کندھا تھپک کر خود کو شاباش دی اور مسرور نظر آنے لگا۔

''اور کیا کہہ رہا ہے اقبال؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے بتایا ہے کہ یہ ایک ہی ڈیزائن کی دو کوٹھیاں ہیں۔ دس پندرہ سال پہلے تین بھائیوں نے اپنی رہائش کے لیے بنائی تھیں۔ پھر ان میں نااتفاقی ہوئی اور تینوں یہ جگہ چھوڑ کر چلے گئے۔ اب یہ دونوں کوٹھیاں کسی اور کی ملکیت ہیں۔ اقبال اس بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کررہا ہے، ابھی تھوڑی دیر میں آکر بتائے گا۔''

ہم بے چینی سے اقبال کا انتظار کرنے لگے۔ وہ تھوڑی تاخیر سے آیا۔ بہر حال، اس کا چہرہ دیکھ کر ہی کہا جاسکتا تھا کہ اس کے پاس دلچسپ اور اہم معلومات ہیں۔ اس نے بتایا۔ ''ان دونوں کوٹھیوں میں اب دو بہنیں رہتی ہیں۔ بڑی بہن کا خاوند کچھ عرصہ پہلے ایک حادثے میں ہلاک ہوگیا تھا۔ وہ اسٹیٹ ڈویلپر تھا اور اس کی بنائی ہوئی دو تین ہاؤسنگ اسکیمیں کامیابی سے فروخت ہوئی تھیں۔ اس کی وفات کے بعد اس کا کام اس کی بیوہ نے سنبھال لیا تھا۔ آج کل وہ بھی ایک ہاؤسنگ اسکیم تیار کررہی ہے۔ اسی جواں سال خاتون کو میڈم یا میڈم شیرازی کہا جاتا ہے۔ ساتھ والی کوٹھی میں اس کی چھوٹی بہن رہتی ہے۔ یہ ذرا پُراسرار قسم کی شے ہے۔ اسے بہت کم دیکھا گیا ہے۔ باہر نکلے بھی تو رنگین شیشوں والی گاڑی میں ہوتی ہے۔ یہ اپنے انجینئر خاوند سے طلاق لے چکی ہے۔ اس کا ذریعۂ معاش کیا ہے، یہ بھی پتا نہیں چل سکا۔''

''اس کو بھی میڈم کہتے ہیں؟'' عمران نے پوچھا۔

''کہنے نہ کہنے کا سوال تو تب ہے یار جب یہ کسی سے ملتی ہو۔'' اقبال نے کہا۔ ''کم از کم جن دو چار بندوں سے میری بات ہوئی ہے، وہ میڈم شیرازی کو ہی جانتے ہیں اور اسی کے بارے میں بتاسکے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ اگر کوئی دوسرا نہیں بتاسکا تو ہم خود معلوم کرلیتے ہیں۔ ہم یہاں کس لیے بیٹھے ہیں؟''

''پرائے پھڈوں میں ٹانگ اڑانے کے لیے۔'' اقبال نے ترنت جواب دیا اور پھر ہنسنے لگا۔

''بھئی پھڈے تو ہوتے ہی ٹانگ اڑانے کے لیے ہیں۔ ہم نہیں اڑائیں گے تو کوئی اور اڑائے گا... اور اگر کوئی غلط بندہ کسی غلط پھڈے میں ٹانگ اڑائے گا تو اسے اور غلط کردے گا۔''

''غلط پھڈا میں پہلی بار سن رہا ہوں۔ پھڈا تو ہوتا ہی غلط ہے۔'' میں نے تصحیح کی۔

''چلو، تم بولے تو سہی... چاہے لفظ صحیح کرنے کے لیے

بولے۔'' عمران چہکا۔

☆☆☆

اس رات عمران اور اقبال نے دیر تک لال کوٹھیوں کے بارے میں سرگوشیاں کیں۔ اب تک میں نے عمران کے مزاج کو جو سمجھا تھا، اس سے یہی پتا چلتا تھا کہ وہ ہر وقت کوئی بھی ضروری یا غیر ضروری خطرہ مول لینے کے لیے ایک دم تیار رہتا ہے۔ وہ اس قسم کی صورتِ حال کو تفریح کے طور پر لیتا تھا اور اس تفریح میں ہر حد تک جانے کے لیے آمادہ ہوتا تھا۔ جہاں وہ سمجھتا تھا کہ کوئی زیادتی ہورہی ہے یا ناجائز کام ہورہا ہے، وہاں وہ خدائی فوجدار بن کر دخل در معقولات اور غیر معقولات کے لیے پر تولنے لگتا تھا۔

اب بھی یہی کچھ ہورہا تھا۔ بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں پہنچ گئی تھی۔ سیٹھ سراج کو راہ چلتے تھوڑا سا سبق سکھانے کے لیے عمران نے اپنے ساتھیوں کے ذریعے اس کا ایکسیڈنٹ کروایا تھا۔ اس ایکسیڈنٹ میں اتفاقیہ طور پر بوریوں والا معاملہ سامنے آیا تھا اور اب بوریوں سے بات آگے بڑھ کر لال کوٹھیوں تک جا پہنچی تھی۔ زلیخا کے خاوند جھیدے نے کوٹھیوں کا ذکر کچھ ایسے بھید بھرے انداز میں کیا تھا کہ عمران کا تجسس پوری طرح جاگ اٹھا تھا اور اب یہی تجسس اسے کوٹھیوں اور ان کے مکینوں کی طرف کشش کررہا تھا۔

میرے اندازے کے مطابق اگلے روز بھی عمران اور اقبال لال کوٹھیوں کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش کرتے رہے۔ ساتھ ساتھ وہ اپنا پروگرام بھی ترتیب دیتے رہے۔ یہ پروگرام رات کو گیارہ بجے کے لگ بھگ میرے سامنے آیا۔ سرکس سے واپس آتے ہی عمران اور اقبال نے کہیں جانے کی تیاری شروع کردی۔ عمران نے بڑی اپنائیت سے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔

''لیکن پتا تو چلے کہ جانا کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس ذرا لال کوٹھیوں تک۔'' عمران بولا۔

''مجھے اوکھلیوں میں سر دینے کا کوئی شوق نہیں ہے۔''

''لیکن ہمیں تو ہے نا یار! تم بس یہ دیکھنا کہ اوکھلیاں کیسے چلتی ہیں اور ان میں سر کیسے دے کر کیسے نکالا جاتا ہے۔ تم کچھ نہ کرنا۔ بس ہمارے ساتھ چلو۔ بے شک گاڑی میں بیٹھے رہنا۔ اور اگر دیکھو کہ ہمارا سر واقعی اوکھلیوں میں پھنس گیا ہے تو بلا جھجک واپس چلے آنا۔ ہم اپنے نقصان کے خود ذمے دار ہوں گے۔''

''ویسے اندر کی بات ہے تابش بھائی... ایسی چھوٹی موٹی اوکھلیاں ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں۔'' اقبال نے مسکراتے ہوئے کہا۔ لگتا تھا کہ عمران کے ساتھ رہ رہ کر وہ بھی اسی جیسا ہوگیا ہے۔

اس معاملے پر دس پندرہ منٹ بحث ہوئی۔ آخر عمران نے مجھے اس حد تک راضی کرلیا کہ میں ان کے ساتھ جاؤں گا لیکن کوٹھیوں سے فاصلے پر کار کے اندر بیٹھا رہوں گا۔

مجھے اس حد تک راضی کرلینا بھی بس عمران ہی کا کام تھا۔ اگر یہ شخص ساتھ نہ ہوتا تو میں اس قسم کے کسی کام کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ شخص اپنے اندر سے پھوٹنے والی توانائی کے ذریعے مسلسل میری کیمسٹری تبدیل کررہا تھا۔

ہم رات بارہ بجے کے قریب عمران کی کار میں بیٹھے اور راوی روڈ سے ائرپورٹ کی طرف روانہ ہوگئے۔ کڑاکے کی سردی تھی۔ تاریک آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ کسی وقت ہلکی پھوار پڑنی بھی شروع ہوجاتی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ ہم پینتالیس منٹ کے اندر ائرپورٹ کے نواح میں پہنچ گئے۔ میرے جسم میں سنسنی کی ایک ہلکی سی لہر چلنی شروع ہوگئی تھی۔ ایسی ہی لہر میں نے اس وقت محسوس کی تھی جب درجنوں تماشائیوں کے سامنے میں نے عمران کے اکسانے پر ''دو... چھ'' کا کھیل کھیلنے کا ارادہ کیا تھا۔ گاڑی تاریک سڑک پر پھسلتی چلی جارہی تھی۔ عمران نے مجھے بتایا نہیں تھا مگر مجھے پتا تھا کہ اس کی جیکٹ کے اندر سیاہ رنگ کا بریٹا پسٹل موجود ہے۔ مجھے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ یہ دونوں سر پھرے لال کوٹھیوں پر جاکر کیا کرنا چاہتے ہیں۔ کیا وہ سیدھے طریقے سے ملاقات کے بہانے اندر جائیں گے؟ کیا وہ چوری چھپے اندر گھسیں گے... کیا وہ کسی کو یرغمال وغیرہ بنا کر معلومات حاصل کرنا چاہیں گے؟ ذہن میں کئی سوال ابھر رہے تھے لیکن میں ان سوالات کے جواب حاصل کرکے خود کو اور پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔

ہم ایک پوش رہائشی علاقے میں داخل ہوئے۔ یہاں درختوں کی بھرمار تھی۔ دس مرلے اور ایک کینال کی بہت سی کوٹھیاں نظر آرہی تھیں۔ عمران نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''دیکھ لو یہی لال کوٹھیاں... تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔''

یہ دونوں کوٹھیاں دو منزلہ تھیں۔ ایک کوٹھی کی کسی کسی کھڑکی میں روشنی نظر آرہی تھی لیکن دوسری یکسر تاریک تھی۔ شیشم، کچنار اور توت کے بلند و بالا درختوں نے دونوں کوٹھیوں کو گھیر رکھا تھا۔ عمران نے ایک چھوٹا سا چکر کاٹا اور

www.pkdigest.com

کوٹھیوں کے پچھواڑے پہنچ گیا۔ پچھواڑے کی چھوٹی سڑک بالکل سنسان تھی اور ایک طرف کے پلاٹ ابھی خالی پڑے تھے۔ انہوں نے گاڑی سڑک سے ہٹا کر گارڈینا کی ایک باڑ کے قریب پارک کردی۔ یوں لگتا تھا کہ آج دن کے وقت وہ اس جگہ کا پورا سروے کرچکے ہیں اور اپنا لائحہ عمل ترتیب دے چکے ہیں۔ ان کی ساری حرکات نپی تلی تھیں۔

''تابش! تم ڈرائیونگ سیٹ پر آجاؤ۔'' عمران نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

میں حسبِ پروگرام ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ چابی اگنیشن میں ہی تھی۔ وہ میرا کندھا تھپک کر عجیب جوشیلے انداز میں بولا۔ ''فکر نہیں کرنا جگر... یہ بڑا فائیو اسٹار کھیل ہے۔ جوں جوں کھیلیں گے، مزہ بڑھتا جائے گا۔''

اور واقعی مجھے لگا کہ میرا خوف دب رہا ہے۔ میں نے بے ساختہ سوچا کہ اگر یہ بندہ میرے ساتھ ہے تو پھر مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟

ان دونوں نے کرکٹ کی اننگ شروع کرنے والے بیٹسمینوں کی طرح ایک دوسرے کے ہاتھ سے ہاتھ ٹکرایا اور محتاط قدموں سے لال کوٹھی کی بیرونی دیوار کی طرف بڑھ گئے۔ اس عقبی دیوار میں ایک چھوٹے دروازے کے آثار بھی نظر آرہے تھے۔ دیوار کی اونچائی دس فٹ سے کم نہیں تھی۔ یہ وہی کوٹھی تھی جو مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے گاڑی کے اندر سے دیکھا، عقبی دیوار کے قریب پہنچ کر عمران کا ہیولا ہوا میں اچھلا۔ یہ ویسی ہی جست تھی جیسی وہ ایک جھولے سے دوسرے جھولے تک پہنچنے کے لیے لگاتا تھا۔ اس جست کے ساتھ اس نے باؤنڈری وال کا بالائی کنارہ تھام لیا اور پھر بڑی آسانی کے ساتھ اندر چلا گیا۔ چند لمحے بعد میں نے محسوس کیا کہ دیوار میں نظر آنے والا دروازہ بے آواز کھل گیا ہے۔ اقبال اس دروازے میں داخل ہوا اور دروازہ پھر بند ہوگیا۔

اب میں تھا اور میرے دل کی زیروزبر ہوتی دھڑکنیں تھیں۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی ایک خطرناک مہم جوئی میں شامل ہوچکا تھا۔ اب اس مہم جوئی سے متعلق سارے خطرے میرے لیے بھی تھے۔ میرے کان ہر گھڑی کسی اَن چاہی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ یہ آواز کسی کے چلانے کی ہوسکتی تھی، گولی چلنے کی ہوسکتی تھی یا پھر ملا جلا شور ہوسکتا تھا۔

اسٹیئرنگ پر جمی میری ہتھیلیوں پر پسینا آنے لگا۔ بارش کی ہلکی پھوار ونڈ اسکرین کو دھندلاتی چلی جارہی تھی۔ اسی طرح قریباً پچیس منٹ گزر گئے۔ تاریک کوٹھی مسلسل تاریک تھی۔ کہیں کسی حرکت کے آثار نہیں تھے۔ فقط ایک بالکونی میں دو تین سیکنڈ کے لیے روشنی نظر آنے کے بعد بجھ گئی تھی۔ اچانک ڈیش بورڈ پر رکھا ہوا موبائل فون جاگ گیا۔ یہ فون اقبال میرے لیے ہی یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل اور چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ کال ریسیو کی۔ دوسری طرف عمران خود تھا۔ اس نے نارمل لہجے میں کہا۔ ''تابی! گھبرانے کی بات نہیں ہے لیکن... یہاں ایک چھوٹا سا مسئلہ ہوگیا ہے۔''

''کیا ہوا؟''

وہ مدھم آواز میں بولا۔ ''تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تمہیں بس دو تین منٹ کے لیے اندر آنا ہوگا۔''

''وہ کیوں؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''یار! ایک دروازے کو باہر سے کنڈی لگ گئی ہے۔ اب وہ باہر سے ہی کھل سکتا ہے۔ جلدی آؤ ورنہ ہمارا سارا مشن بے ہوش ہوکر کومے میں چلا جائے گا۔'' وہ سرگوشی میں بول رہا تھا۔

''دیکھو عمران! میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ میں گاڑی سے باہر نہیں آؤں گا... تم نے...''

''جگر! بات تو سنو۔'' اس نے تیزی سے قطع کلامی کی۔ ''میں تمہیں یہاں جوڑو کرانے کے لیے نہیں کہہ رہا۔ صرف دو منٹ کے لیے اندر آنا ہے۔ باؤنڈری وال والا دروازہ کھلا ہے۔ صحن سے آگے برآمدہ ہے۔ برآمدے میں بائیں طرف والا کمرا ہے۔ بس باہر سے کنڈی کھول کر واپس چلے جاؤ۔ یار! اتنی سی مدد تو کوئی راہ چلتا بھی کردیتا ہے۔''

میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ ''لیکن کنڈی لگی کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تمہیں بعد میں بتاؤں گا لیکن یہ گارنٹی ہے کہ خطرہ کوئی نہیں ہے یہاں۔ ساری کوٹھی سنسان پڑی ہے۔ بس آجاؤ جلدی ہے۔'' مجھے یاد آیا کہ تھوڑی دیر پہلے بالکونی میں روشنی بھی ہوئی تھی۔ وہ بڑے ہلکے پھلکے انداز میں بات کررہا تھا۔ اس میں خوف کا دور دور تک شائبہ نہیں تھا۔ ویسے بھی اس کا لب ولہجہ ایسا ہوتا تھا کہ میرے لیے اس کی بات ٹالنا مشکل ہوجاتا تھا۔

میں نے اپنی ہمت بندھانے کی کوشش کی اور یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ ہمت بندھ گئی ہے۔ میں اپنے اندر جو غیر محسوس تبدیلیاں محسوس کررہا تھا، شاید یہ ان کی ہی ایک کڑی تھی۔ سیٹھ کو تھپڑ مارنا پھر اپنی جان لینے کی نہایت سنجیدہ کوشش کرنا... پھر سرکس میں ریوالور کے کھیل میں خود پر گولی

چلانا... اور اس کے بعد بڑ پہ سے واپس آتے ہوئے راستے میں ٹرالی سواروں سے لڑنا اور ایک ٹرالی سوار پر اپنے ہاتھ سے وار کرنا... یہ سب ان تبدیلیوں کی ہی جھلکیاں تھیں۔

میں اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتا ہوا گاڑی سے اترا اور باؤنڈری وال کا دروازہ کھولتا ہوا اندر چلا گیا۔ یہ عقبی صحن تھا۔ قریباً تین چار مرلے میں ہوگا۔ ایک طرف گراسی لان تھا جس میں لوہے کی سفید کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایسی جگہوں پر رکھوالی کے کتے کا اندیشہ ہوتا ہے لیکن اگر کتا ہوتا تو آدھ گھنٹا پہلے ہی سامنے آگیا ہوتا۔ برآمدہ تاریک تھا۔ میں نے موبائل فون مسلسل کان سے لگا رکھا تھا۔ ''اندر آگئے ہو؟'' عمران نے پوچھا۔

''ہوں۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''برآمدے میں بائیں طرف دیکھو۔ ایک چھوٹا دروازہ ہے، دوسرا بڑا ہے، گہرے پیلے رنگ کا... نظر آرہا ہے؟'' میں نے پھر ہنکارا بھرا۔

''دروازے کو باہر سے چٹخنی چڑھائی گئی ہے، اسے آرام سے گرادو۔''

میں نے ہدایت پر عمل کیا اور لرزتے ہاتھوں سے پیلے رنگ کے دروازے کی چٹخنی گرادی... دونوں سامنے ہی کھڑے تھے۔ عمران نے کندھا تھپک کر مجھے شاباش دی۔ ''جیتے رہو۔ دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔ تمہاری ہر دلی مراد پوری ہو۔'' وہ سرگوشی میں بولا۔ اس کے ہاتھ میں پنسل ٹارچ تھی۔ ایسی ہی ٹارچ اقبال کے ہاتھ میں بھی نظر آرہی تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ عمران اور اقبال دونوں نے بڑے سائز کے گرم مفلروں کے ذریعے اپنے چہرے چھپائے ہوئے تھے۔ ان کے سروں پر پہلے ہی ''پی کیپس'' تھیں۔ لہٰذا اب ان کی آنکھوں اور تھوڑی سی پیشانی کے علاوہ باقی چہرہ پوشیدہ تھا۔

''لو، یہ ٹوپی پہن لو تم بھی۔'' عمران نے جیکٹ کی جیب سے ایک گرم ٹوپی نکال کر میری طرف بڑھائی۔ یہ وہی ٹوپی تھی جس میں سے صرف آنکھیں نظر آتی ہیں۔ سر، چہرہ اور گردن وغیرہ چھپ جاتے ہیں۔

''مجھے اس کی ضرورت نہیں۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

میں اب واپس جانا چاہتا تھا۔ میرا ارادہ بھانپ کر عمران نے جلدی سے سرگوشی کی۔ ''ایک چیز دیکھ لو پھر چلتے ہیں۔'' اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر کمرے میں کھینچا اور دروازہ آہستہ سے بند کردیا۔ کوٹھی میں چاروں طرف مکمل سناٹا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے پنسل ٹارچ روشن کی۔ ٹارچ کا چھوٹا سا دائرہ فرش کے قالین پر پڑنے لگا۔ عمران محتاط قدموں سے چلتا ہوا ایک بغلی دروازے تک پہنچا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ ہم ایک مستطیل کمرے میں تھے۔ اس کمرے کی دیواروں پر بہت سی پینٹنگز نظر آرہی تھیں۔ یہ نہایت قیمتی فریموں والی پرانی تصویریں تھیں۔ زیادہ تر وکٹوریہ دور کے مناظر کو پیش کررہی تھیں۔ خاص بات یہ تھی کہ ان ساری تصویروں میں عریانی کا عنصر نمایاں تھا۔ چند تصویروں کو تو فحش بھی کہا جاسکتا تھا۔ ان میں عورتوں کے علاوہ مرد بھی تھے۔ وکٹوریہ دور کے ایک دربار کی پینٹنگ نہایت بولڈ تھی۔ مصور نے دربار میں شراب نوشی، بدمستی اور عیش وعشرت کے مناظر پینٹ کیے تھے۔ بادشاہ اور درباری جام پر جام لنڈھا رہے تھے اور عورتوں کے عریاں جسموں سے کھیل رہے تھے۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔

میں ان تصویروں پر نگاہ دوڑا رہا تھا لیکن میرا دھیان پیچھے کی طرف ہی تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ہم جلد از جلد یہاں سے نکل جائیں... یا کم از کم میں تو واپس گاڑی میں پہنچ جاؤں۔ بے شک کوٹھی میں مکمل سکوت تھا مگر یہ ضروری تو نہیں تھا کہ سکوت برقرار بھی رہے... اور پھر سوچنے کی بات تھی کہ برآمدے والے دروازے کو باہر سے کنڈی کس نے لگائی تھی؟ آخر کوئی نہ کوئی تو یہاں جاگ رہا تھا۔ شاید اس نے یونہی دروازہ چیک کیا تھا اور اسے کھلا دیکھ کر باہر سے چٹخنی چڑھا دی تھی۔ پھر میری نگاہوں میں سیٹھ سراج کا چہرہ گھوما۔ اس کا تعلق بھی تو ان کوٹھیوں سے بیان کیا جارہا تھا۔ اگر سیٹھ سراج یا اس کے کسی کارندے سے یہاں ملاقات ہوجاتی تو میرا بھانڈا بری طرح پھوٹ سکتا تھا۔ ان لمحوں میں، میں نے محسوس کیا کہ مجھے عمران کی ''ٹوپی والی بات'' مان لینی چاہیے تھی۔ ٹوپی اس کی جیکٹ کی بائیں جیب میں تھی۔ میں نے یہ گرم ٹوپی نکالی اور ذرا سی جھجک کے ساتھ پہن لی۔

عمران کی ٹارچ کا دائرہ اب ایک سائڈ بورڈ پر رینگ رہا تھا۔ اس نہایت دیدہ زیب سائڈ بورڈ پر گندھارا آرٹ کے کچھ نمونے سجائے گئے تھے۔ تین چار منٹ مزید گزر گئے۔

''عمران! اب چلو یہاں سے۔'' میں نے تیز سرگوشی کی۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا، ایسا کچھ ہوا جس کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ میں تو خیر اس سارے معاملے کی گہرائی سے ویسے ہی بے خبر تھا، عمران اور اقبال کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ صورتِ حال یوں اچانک پلٹا کھائے گی۔ یہ

www.pkdigest.com

تاریک مستطیل کمرا اچانک چکاچوند روشنی سے بھر گیا۔ ایک نہایت تنومند شخص دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پستول میں صاف دیکھ سکتا تھا۔ اس نے چنگھاڑنے والے انداز میں کچھ کہا مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ اس سے بھی زیادہ حیرت ناک تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ عمران سے ایسے فوری اور انتہائی برق رفتار ردعمل کی توقع مجھے نہیں تھی... اور یقیناً اس گرانڈیل شخص کو بھی نہیں تھی جو اندر گھسا تھا... میں نے بس عمران کی لات کو حرکت کرتے دیکھا۔ اس کے بعد دوسرا منظر جو میری آنکھیں پکڑ سکیں، پستول کے ہوا میں اڑنے اور کمرے کی منقش چھت سے ٹکرانے کا تھا۔ عمران ایک لحظہ ضائع کیے بغیر کسی عقاب کی طرح نو وارد پر جھپٹا۔ اس کا گھٹنا مدمقابل کی ناف پر لگا پھر ایک ایسی ٹکر اس کے چہرے پر پڑی جو شاید پتھر میں بھی دراڑ ڈال سکتی تھی۔ گرانڈیل شخص ڈکراتا ہوا دیوار سے ٹکرایا۔ اس نے عمران پر مکا چلایا۔ یہ بے جان وار، عمران نے آسانی سے جھک کر بچایا اور تب اس کے سر کی دوسری شدید ترین ضرب مدمقابل کے چہرے پر لگی۔ اس بار وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں رہ سکا اور تیورا کر ایک خوب صورت مرتبان پر گرا۔ مرتبان اور وہ دونوں زمین بوس ہوئے۔ یہی وقت تھا جب دو مزید افراد بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچے۔ وہ صورتوں سے اس عمارت کے پہرے دار ہی نظر آتے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کمرے کی صورت حال کو دیکھ کر رائفل استعمال کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کر سکتا، اقبال دروازے کی اوٹ سے رائفل بردار پر جھپٹا اور ایک اندھا دھند جھٹکے کے ساتھ رائفل اس سے چھین لی۔ دوسرے شخص نے اپنی سیاہ جیکٹ میں ہاتھ ڈالا۔ یقیناً وہ بھی ہتھیار نکالنا چاہ رہا تھا۔ ”خبردار!“ عمران دہاڑا اور اپنے بریٹا پستول کی نال اس کے سینے کی طرف کر دی۔ یہ دونوں پہرے دار جہاں کے تہاں سکتہ زدہ کھڑے رہ گئے۔

یہ سارا ایکشن ناقابل یقین حد تک تیز رفتار تھا۔ مجھے اس بے پناہ مہارت کا احساس ہوا جو عمران اور اس کے ساتھی کو ایسے کاموں کے لیے حاصل تھی۔ سب سے زیادہ قابل دید وہ پھرتی تھی جس کی مدد سے عمران نے گرانڈیل شخص کو صرف دو تین سیکنڈ میں چاروں شانے چت کیا تھا۔ یہ اٹھائیس تیس سالہ خطرناک صورت شخص عمران سے قریباً ڈیڑھ گنا وزن تو رکھتا ہوگا۔ اس کے سانولے چہرے پر زخموں کے نشان اس کی جارحانہ طبع کی گواہی بھی دے رہے تھے۔ لیکن فی الوقت وہ اپنے لہولہان چہرے کے ساتھ مرتبان کے ٹکڑوں کے درمیان بے دست و پا پڑا تھا۔

عمران نے بعد میں آنے والے پہرے داروں کو بھی اسی گرانڈیل شخص کے پاس کھڑا کر دیا اور ان تینوں کو ایک ساتھ رائفل کے نشانے پر لے لیا۔ یہ وہی آٹھ ایم ایم رائفل تھی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اقبال نے پہرے دار سے چھینی تھی۔ دھینگا مشتی میں عمران کے چہرے سے مفلر اتر چکا تھا۔

گرانڈیل شخص کے ہاتھ سے نکلنے والا پسٹل اقبال نے قالین سے اٹھایا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ چند سیکنڈ بعد باہر سے کسی عورت کی دبی دبی آواز سنائی دی۔ اس نے چلانے کی ادھوری کوشش کی تھی۔ پھر قدموں کی چاپ ابھری اور اقبال ایک عورت کو دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ یہ چالیس پینتالیس سال کی ایک فربہ اندام ملازمہ تھی۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور چربی دار جسم تھل تھل کر رہا تھا۔

”اسی بھینس نے باہر سے کنڈی لگائی تھی۔“ اقبال نے اس کی پشت پر تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔

وہ خوف زدہ ہونے کے ساتھ سخت حیران بھی تھی۔ میرا یہ اندازہ درست لگتا تھا کہ وہ دروازہ کھلا دیکھ کر بے دھیانی میں کنڈی چڑھا گئی ہے۔

آج میں عمران کا ایک نیا روپ دیکھ رہا تھا۔ ان لمحوں میں وہ خاصا بے رحم نظر آ رہا تھا۔ اس کے تاثرات گواہ تھے کہ اگر ان تین افراد میں سے کسی نے چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو وہ انہیں زخمی کرنے کے لیے بے دریغ گولی چلا دے گا۔ ظاہر ہے جو شخص ریوالور کے تین خانوں میں گولی رکھ کر خود پر فائر کر سکتا تھا، وہ دوسروں پر بھی کر سکتا تھا۔

”تم چاروں کے علاوہ اور کون ہے یہاں؟“ عمران نے پوچھا۔

”کک... کوئی نہیں۔“ لمبے قد والے پہرے دار نے جواب دیا۔

”اگر بات جھوٹ نکلی تو مرغا بننا پڑے گا۔“ اقبال نے وارننگ دی۔

پہرے دار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

”اقبال! یہ سامنے والے باتھ روم کا دروازہ کھولو۔“

اقبال نے دروازہ کھولا۔ ”چلو، تم دونوں گھس جاؤ باتھ روم میں۔ اگر گرم پانی آ رہا ہے تو نہا لو۔ اگر نہیں آ رہا تو انتظار کرو... چلو شاباش!“ اس کا اشارہ بعد میں آنے والے دونوں گارڈز کی طرف تھا۔

وہ دونوں متحیر نظروں سے عمران کو دیکھتے رہے۔ ”میں

ادری نہیں بول رہا۔“ وہ پھنکارا۔ ”اندر گھس جاؤ اور اگر آواز وغیرہ نکالی تو پھر وہ آخری آواز ہوگی۔“ اس کے لہجے میں بلا کی سفاکی اتری ہوئی تھی۔

پہرے دار مرعوب تو یہی دیکھ کر ہو چکے تھے کہ ان کا پہلوان چند سیکنڈ میں لہولہان ہو کر زمین بوس ہو گیا تھا، اب رہی سہی کسر عمران کے انداز نے پوری کر دی۔ وہ رائفل کو خوف زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے باتھ روم کی طرف بڑھے۔ ”ٹھہرو۔“ عمران نے نیا حکم جاری کیا۔ وہ ٹھٹک کر رک گئے۔ عمران نے اقبال سے کہا کہ وہ ان کی تلاشی لے۔ کہیں ان کی جیبوں میں موبائل فون وغیرہ نہ ہو۔ اقبال نے بڑی احتیاط اور مہارت سے دونوں کی تلاشی لی۔ ایک کی جیب سے موبائل نکل آیا۔ اقبال نے دونوں کو باتھ روم میں دھکیل کر دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔

چند سیکنڈ بعد گرانڈیل شخص اور فربہ اندام ملازمہ کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ عمران اور اقبال نے تلاشی کے بعد ان دونوں کو دوسرے باتھ روم میں لاک کر دیا۔ گرانڈیل شخص میں ابھی تک کچھ دم خم موجود تھا۔ اس کی تلاشی لیتے ہوئے عمران نے یہ احتیاط کی تھی کہ اس کی جیکٹ ہی اتروا لی تھی۔

ابھی گرانڈیل شخص اور ملازمہ کو باتھ روم میں بند کیے چند سیکنڈ ہی ہوئے تھے کہ ان پر ایک اور آفت ٹوٹ پڑی۔ یہ آفت ایک لڑکی کی صورت میں تھی۔ یقین یہی لگا کہ یہ لڑکی اچانک زمین میں سے اگ آئی ہے۔ وہ بغلی دروازے سے برآمد ہوئی اور عجیب انداز میں چلا کر عمران سے لپٹ گئی۔ وہ عقب سے آئی تھی۔ اس نے عمران کو رائفل سمیت اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور اس کے بال مٹھی میں بھینچ لیے۔

عمران نے خود کو تیزی سے گھمایا اور لڑکی کی بانہوں کا گھیرا توڑ دیا۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار کے ساتھ جا لگی۔ اس سے پہلے کہ عالم وحشت میں وہ پھر عمران پر جھپٹتی، اقبال نے اسے چھاپ لیا۔ اقبال نے ایک ہاتھ بڑی مضبوطی سے اس کے منہ پر جمایا اور ایک ہاتھ اس کی کمر میں ڈال کر اسے تھوڑا سا ہوا میں اٹھا دیا۔ وہ ہوا میں ٹانگیں چلا کر رہ گئی۔ اس کی آواز اس کے منہ میں ہی دب گئی تھی۔ بس مسلسل ”غوں غاں“ سنائی دے رہی تھی۔

تیس چوبیس سالہ قبول صورت لڑکی تھی۔ سب سے حیران کن چیز لڑکی کا حلیہ تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ بالکل یہی لگا کہ کسی انگریزی یا نئی انڈین فلم کا سین دیکھ رہا ہوں۔ لڑکی کے جسم پر مختصر ترین لباس تھا۔ چند انچ کپڑا بالائی جسم پر اور اتنا ہی زیریں جسم پر۔ اس کا دودھیا جسم ٹیوب لائٹس کی تیز روشنی میں دمک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی سوئمنگ پول سے نکل کر سیدھا یہاں آ گئی ہے۔

اتنی رات گئے، ایسی سردی میں، ایسا لباس؟ یہ بات سمجھ سے باہر تھی۔ اگر وہ کسی نیم گرم بیڈ روم سے نکل کر آئی تھی تو بھی اس کے قیامت خیز جسم پر سلیپنگ گاؤن وغیرہ تو ہونا چاہیے تھا۔ ”بس بے بی، بس!“ اقبال نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں کے شکنجے میں لے کر بری طرح جھنجوڑا تو اس کا ہیجان قدرے کم ہوا۔ تاہم وہ خود کو چھڑانے کی کوشش مسلسل کر رہی تھی۔

عمران نے اپنی جیب سے ایک چوڑی انگلش ٹیپ نکالی اور اس کے دو ٹکڑے بڑی مضبوطی اور صفائی کے ساتھ لڑکی کے ہونٹوں پر چپکا دیے۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ ٹیپ چپکانے کے دوران میں ہی اس نے عمران کی ناف میں اپنے ننگے پاؤں کی ایک زوردار ضرب لگائی۔ عمران نے بمشکل اس

مال کا مآل

مشہور امریکی میگزین فوربس کے مطابق دنیا کے امیر ترین اور ارب پتی افراد میں بھارت کے لکشمی متل، مکیش امبانی، انل امبانی اور کشال پال سنگھ بالترتیب چوتھے، پانچویں، چھٹے اور آٹھویں نمبر پر ہیں۔ ان کی دولت اربوں میں ہے۔ دولت مند ہونا کوئی بری بات نہیں ہے لیکن کیا دولت ہی سب کچھ ہو سکتی ہے؟

اس کا جواب بھارتی شہر کرنال کے مام راج نامی کروڑ پتی نے اپنی اور گھر والوں کی اجتماعی خودکشی سے دیا ہے۔ اس کے بیٹوں نے مال و دولت میں تیز تر اضافے کی ہوس میں بہت سے لوگوں کو کروڑوں روپے بھاری سود پر ادھار دے ڈالے۔ ان میں سے اکیس نادہندہ افراد نے بھرپور تقاضوں کے باوجود رقم لوٹانے سے انکار کر دیا۔ سود کے لالچ میں اصل رقم بھی ڈوب گئی۔ مام راج مالی مشکلات سے دوچار ہو گیا۔ اس نے آئی سی آئی سی بینک سے پانچ کروڑ کا قرضہ لیا۔ اس کا برا وقت آیا ہوا تھا۔ وہ رقم بھی ڈوب گئی۔ بینک کے قرضے کی واپسی کے آثار ناپید ہو گئے تو مام راج کے سامنے ایک ہی راستہ رہ گیا۔

اس نے اپنی ساس، بہوؤں اور بیٹوں کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھایا اور سب کے ساتھ تیز رفتار گاڑی کو ایک خونی نہر میں گرا کر آٹھ زندگیوں کا خاتمہ کر لیا۔ بیٹے اپنی ہوس کے نتائج بھگتنے کے لیے زندہ ہیں۔ یہ ہے ہوس زر کا عبرت انگیز انجام!

www.pkdigest.com

ناگہانی ضرب کو برداشت کیا۔

دفعتاً نہ جانے کس طرح لڑکی نے خود کو اقبال کی گرفت سے چھڑایا اور ساتھ والے کمرے کی طرف دوڑی۔ عمران اور اقبال اس کے پیچھے گئے۔ پہلے اس نے اپنے منہ سے ٹیپ اتارنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ پھر وہ بیڈ روم میں گھسی۔ بڑی پھرتی سے اس نے ایک الماری کھولی۔ شاید وہ یہاں سے کوئی ہتھیار وغیرہ نکالنا چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے کہ اسے کوئی کامیابی ہوتی، عمران نے اسے دوبارہ دبوچ لیا۔ اس نے پلٹ کر عمران کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ مارا۔ عمران نے گھما کر اسے بستر پر پٹخا اور اس کے دونوں بازو کھول کر دونوں طرف دبا لیے۔ وہ عمران کے نیچے بے بس نظر آنے لگی۔ دھینگا مشتی میں اس کی عریانی مزید عریانی میں بدل گئی تھی۔ اس کے بال بکھر گئے تھے اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اب وہ کراہنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر پا رہی تھی... ہتھیار نکالنے کے لیے جو الماری اس نے کھولی تھی، اس میں شراب خانہ خراب کی بہت سی بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔ ساتھ میں چمکیلے گلاس تھے۔

"اقبال! تم پہرے داروں کا دھیان رکھو۔" عمران نے کہا۔

اقبال فوراً رائفل سنبھال کر باتھ روم کی طرف چلا گیا۔ لڑکی کی مزاحمت مزید کم کرنے کے لیے عمران نے اس کے منہ پر دو تھپڑ رسید کیے تو وہ رونے لگی۔ وہ عمارت کے اس اندرونی کمرے میں شاید اپنی بے بسی کو پوری طرح محسوس کر چکی تھی۔ اب اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

میرا ذہن کہہ رہا تھا کہ یہی گھر کی مالکہ ہے۔ میڈم کی وہ چھوٹی بہن جو بہت کم گھر سے نکلتی ہے اور جس کے بارے میں اقبال نے پُراسرار اور ناقابلِ فہم ہونے کی رپورٹ دی تھی۔ اس نے موقع دیکھ کر ایک بار پھر عمران کا منہ نوچنے کی کوشش کی تو عمران نے بے رحمی سے اسے اوندھا کر دیا اور اس کے دونوں بازو پیچھے موڑ دیے۔ "اس خبیث کو باندھو۔" عمران نے مجھ سے کہا۔

میں نے عمران کا سرخ مفلر اس کے کندھوں سے اتارا اور لڑکی کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پشت پر باندھ دیے۔ یہ کام کرتے ہوئے میں نے اپنے اندر ایک عجیب سا تھرل اور حوصلہ محسوس کیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اس مار دھاڑ کا حصہ بنا ہوا ہوں اور عمران کے کہنے پر وہ سب کچھ کر رہا ہوں جو اس سے پہلے صرف تصورات میں کر سکتا تھا۔

عمران نے اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑے اور اس کا چہرہ تکیے پر رگڑتے ہوئے پھنکارا۔ "اب ٹِکی بیٹھ جا... ورنہ بری طرح پچھتائے گی۔ ہماری جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک تیرا حشر نشر شروع ہو گیا ہوتا۔ خدا کا شکر کر کہ تیرا واسطہ شریفوں سے پڑا ہے۔"

میں نے اطمینان کی سانس لی ورنہ چند لمحے پہلے مجھے خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ شاید عمران مشتعل ہو کر کوئی غلط راستہ اختیار کرنے والا ہے... اسی دوران میں، میں نے عمران کے چہرے پر کچھ الجھن دیکھی۔ وہ منقش چھت کے ایک گوشے کو دھیان سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا اور پھر مجھے بھی شک گزرا کہ یہاں کوئی وی ٹی آر کیمرا نصب ہے۔

اچانک ایک بندہ لنگڑاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے پتلون اور جرسی پہن رکھی تھی... عمر کوئی چوبیس پچیس سال رہی ہوگی۔ عمران اسے دیکھ کر چونکا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس شخص کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ اس نے عمران کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ لڑکی چونکہ عمران کے نیچے اوندھی دبی ہوئی تھی، لہٰذا وہ اس شخص کی آمد کو دیکھ سکی اور نہ اشارے کو۔ نہ جانے کیوں مجھے یوں لگا کہ یہ شخص اس کوٹھی کے مکینوں میں سے ہے لیکن وہ عمران کو اشارہ کیوں کر رہا تھا... اور کیا عمران اسے جانتا تھا؟

اگلے دو چار منٹ میں میرا یہ خیال درست ثابت ہوا کہ عمران اس شخص کو جانتا ہے۔ اس شخص کی طرف سے باہر آنے کا اشارہ ملنے کے فوراً بعد عمران نے لڑکی کی عریاں ٹانگوں کو ایک اسکارف نما سوتی کپڑے کے ساتھ نہایت مضبوطی سے باندھا اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔ ہاتھ اور پاؤں بندھنے کے بعد لڑکی اب پوری طرح بے بس تھی۔ وہ کسی لاچار پرندے کی طرح بس تھوڑا بہت پھڑپھڑا سکتی تھی۔ میں بھی عمران کے پیچھے ہی باہر آ گیا۔

لنگڑانے والا قبول صورت شخص کوریڈور میں عمران کے پاس کھڑا تھا... وہ کہہ رہا تھا۔ "خدا کا شکر کریں کہ میں یہاں موجود ہوں اور آپ کو خطرے کے بارے میں بتا رہا ہوں۔ بس آپ یہاں سے نکل جائیں۔"

"لیکن کچھ پتا تو چلے۔"

"یہ دیکھیں ہیرو بھائی! میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔" وہ سخت ہیجانی لہجے میں بولا۔ "آپ کو کچھ اندازہ نہیں، یہاں کیا ہو رہا ہے۔ آپ بری طرح پھنسنے والے ہیں۔ دیکھیں، آپ کے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔ میں آپ کو کسی مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا۔ پلیز ہیرو بھائی!"

"کیا تمہارا مطلب ہے، یہاں اور لوگ بھی موجود ہیں؟"

"بالکل ہیں بھائی! یہ حرام زادی ڈراما کر رہی ہے۔ میں خود آ کر آپ کو سب کچھ بتاؤں گا۔ ایک ایک بات بتاؤں گا۔ بس ابھی آپ نکل جائیں۔"

عمران کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی لگ رہا تھا کہ وہ نووارد کی باتوں پر بھروسا کر رہا ہے۔

"ادھر آئیں، میں دکھاؤں آپ کو۔" اس نے ہیجانی انداز میں عمران کا بازو پکڑا اور اسے اپنے ساتھ کوریڈور میں چلا کر ایک گیلری نما کمرے میں لے گیا۔ یہاں بھی فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور دیواروں پر تنابیجے آویزاں تھے۔ میں بھی عمران کے پیچھے ہی گیلری میں داخل ہو گیا۔ ہم یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ یہاں دیواروں کے ساتھ ایک پینل پر پانچ چھ مانیٹرز نظر آ رہے تھے۔ مانیٹرز کی اسکرینوں پر اس کوٹھی کے مختلف مناظر کلوز سرکٹ پر دکھائی دے رہے تھے۔ ایک اسکرین پر وہ دیوار نظر آ رہی تھی جو ایک گھنٹا پہلے عمران نے پھاندی تھی اور وہ دروازہ بھی جس سے گزر کر میں یہاں پہنچا تھا۔ پھر ایک نیم روشن راہداری کا منظر تھا۔ ایک اور نہایت روشن منظر میں اقبال آٹھ ایم ایم رائفل تھامے باتھ روم کے دروازوں پر پہرا دے رہا تھا... یہ وہی کمرا تھا جہاں عمران اور اقبال لال گیٹ والے شخص کے درمیان طوفانی لیکن مختصر لڑائی ہوئی تھی۔

www.pkdigest.com

نووارد نے ایک بار پھر عمران کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ کوریڈور میں پہلے والے مخصوص مقام پر پہنچ کر وہ پھر سرگوشی میں بولا۔ "یہ چھوٹی میڈم بڑی انوکھی اور خطرناک شے ہے۔ آپ کے اندر آنے کے پندرہ بیس منٹ بعد ہی اس کو پتا چل گیا تھا کہ آپ یہاں ہیں۔ میں آپ کو اس کے بارے میں بہت کچھ بتاؤں گا مگر اس وقت آپ یہاں سے چلے جائیں۔" نووارد کے لہجے میں التجا، محبت، ہمدردی بہت کچھ یکجا ہو گیا تھا۔

"میرا ایڈریس معلوم ہے تمہیں؟"

"بالکل ہیرو بھائی۔" اس نے جلدی سے کہا۔

صرف دو تین منٹ بعد ہم تینوں عقبی دروازے سے گزر کر گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ عمران اور اقبال بھی الجھن میں تھے۔ تاہم لگتا تھا کہ عمران نے کسی حد تک صورتِ حال کا تجزیہ...... کیا ہے۔ ہماری گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ ایک ٹیک آف کرتا ہوا جہاز عین ہمارے سروں کے اوپر سے شور

ریل گاڑی

"بھائی خیر دین! بڑا دکھ ہوا۔ ریل گاڑی نے تمہاری گائے کو کچل دیا...... اللہ تمہیں صبر دے۔ تمہاری گائے بہت پیاری تھی، بستی میں پھرتی رہتی تھی۔ وہ ریل گاڑی کے نیچے کیسے آ گئی؟"

"وہ ریل گاڑی کو دیکھ کر بھاگی۔" خیر دین نے کڑوے لہجے میں کہا۔ "اسے دیکھ کر انجن پٹڑی سے اترا، کھیتوں میں اس کا پیچھا کیا، میدان میں بھی اسے نہیں چھوڑا، پھر ہانک کر پٹڑی پر لے گیا اور اسے کچل کر سیٹی بجاتا ہوا آگے چلا گیا...... بھلے آدمی! تم کو یہ بھی پتا نہیں کہ آدمی اور جانور ریل گاڑی کے نیچے کیسے آتے ہیں!"

مچاتا گزر گیا۔ وہ اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا، ہم اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم واپس گھر جا رہے تھے۔

☆☆☆

اگلے دن میں بے چین رہا۔ مجھے صورتِ حال... سے سنگین اندیشوں کی بو آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ عمران اور اقبال کی "خطرات پسندی" بھی واضح ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے یہ بھی شک تھا کہ کل رات دروازے کو باہر سے کنڈی لگ جانے کے بعد عمران نے مجھے جان بوجھ کر اندر بلایا تھا۔ ورنہ وہ اس جگہ سے نکلنے کے لیے کوئی اور راستہ بھی اختیار کر سکتا تھا۔ پینٹنگز والے کمرے کے پاس سے ایک زینہ بھی تو اوپر جاتا تھا۔ شاید وہ اس طرح سے میرے اندر حوصلہ ابھارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بہرحال، یہ سارا معاملہ ہی پُراندیشہ تھا۔

زلیخا اور جمیدے کے گھر میں جو کچھ سامنے آیا تھا، وہی کچھ کم حیرت انگیز نہیں تھا۔ وہاں ایک گھر کی چار دیواری کے اندر بڑی رازداری سے ایک کنوئیں جیسا گڑھا کھودا گیا تھا اور قیمتی اشیا نکالنے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ ابھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ یہ پروگرام کامیابی سے ہمکنار ہوا تھا یا نہیں۔ اب یہ لال کوٹھیوں والا معاملہ شروع ہوا تھا اور دونوں معاملات کی کڑیاں آپس میں مل رہی تھیں۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ عمران اور اقبال ایک سنگین معاملے کو چھیڑ رہے ہیں۔ دوسری طرف ان دونوں کو جیسے کچھ پروا ہی نہیں تھی۔ انہوں نے ڈٹ کر حلوہ پوری کا ناشتا کیا تھا، دوپہر کو مٹن کڑاہی کھائی تھی۔ پھر عمران کی گرل فرینڈ شاہین کا فون آ گیا تھا۔ دونوں نوک جھوک کرتے رہے تھے۔ اب عمران

اور اقبال آپس میں ہنسی مذاق میں مشغول تھے۔ ان میں کافی بے تکلفی تھی۔ لگتا ہے بچپن سے ایک دوسرے سے ہاتھاپائی بھی کرگزرتے تھے۔ اب بھی میں دیکھ رہا تھا کہ رات والے واقعات کا ان دونوں پر کوئی خاص اثر نہیں ہے۔ ہاں، وہ انتظار ضرور کررہے تھے اور یہ عمران کے اس شناسا کا انتظار تھا جس نے آج اس سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ عمران نے اس کا نام سلیم بتایا تھا اور اس کا کچھ غائبانہ تعارف بھی مجھ سے کرایا تھا۔

اس تعارف کے مطابق کچھ عرصہ پہلے تک سلیم اس کے ساتھ ہی سرکس میں کام کرتا تھا۔ موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل سے گر کر اس کی ٹانگ کی ہڈی تین جگہ سے ٹوٹ گئی تھی۔ عمران نے اپنے خرچ پر اس کا علاج کرایا اور اس کی بیماری کے دوران میں اس کے بیوی بچے کی بھرپور کفالت بھی کی۔ مگر صحت یاب ہونے کے بعد سلیم نے اس سے کچھ رقم ادھار لی اور اس ادھار کے حوالے سے عمران کے ساتھ دھوکا کیا۔ اس واقعے کو تقریباً ایک برس گزر چکا تھا۔ ان دونوں کے درمیان کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی اور نہ عمران نے ملاقات کی کوشش کی تھی۔

سلیم نے پانچ بجے تک آنے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ نہیں آیا۔ اس کی آمد رات آٹھ بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ وہ حسبِ سابق ذرا لنگڑاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ کل کی طرح بہت جذباتی نظر آتا تھا اور بار بار عقیدت کے انداز میں عمران کا ہاتھ تھام رہا تھا۔ رسمی گفتگو اور چائے کے دور کے بعد اصل بات شروع ہوئی۔ سلیم نے کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں ہیرو بھائی! کل رات آپ تینوں ایک بہت بڑے خطرے سے بچے ہیں۔ مجھے نہیں پتا کہ آپ وہاں کیوں آئے تھے اور کیا چاہتے تھے؟ مگر وہ جو کچھ بھی تھا، بہت سخت مصیبت میں ڈالنے والا تھا۔ یہ لڑکی نادیہ ایوب جسے ہم چھوٹی میڈم بھی کہتے ہیں، بڑی عجیب وغریب شے ہے۔ ایک نمبر کی ڈرامے باز، مکار اور نشئی۔ اس کی کئی کہانیاں مشہور ہوچکی ہیں اور ہورہی ہیں۔ دراصل یہ ایک بیمار لڑکی ہے۔ نشہ آور چیزوں کے استعمال نے اس کے ہوش ٹھکانے پر نہیں رہنے دیے۔“

”اس کے بیمار ہونے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“ اقبال نے پوچھا۔

”میں شاید آپ کو ٹھیک سے سمجھا نہ سکوں۔ یہ ٹوٹل طور پر بے راہ رو لڑکی ہے۔ اپنے انجینئر شوہر سے طلاق کے بعد بالکل ہی آزاد ہوگئی ہے۔ ہر طرح کے مردوں میں دلچسپی لیتی ہے۔ جنہیں پسند کرتی ہے، ان کے ساتھ کچھ وقت گزارتی ہے۔ پھر انہیں ایک دم لات مار کر نکال دیتی ہے اور پلٹ کر بھی نہیں دیکھتی۔“

”نشہ کیا کرتی ہے؟“

”کوئی ایک نشہ ہو تو بتاؤں۔ شراب سے لے کر ہیروئن اور کوکین تک اس سے کچھ بھی بچا ہوا نہیں ہے۔ بڑی بہن مجبور ہے۔ اسے خود اس کے لیے نشہ مہیا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی نشے کی حالت میں اپنے جسم پر کٹ لگا لیتی ہے اور ان میں مرچیں بھر کر سسکتی رہتی ہے۔ کبھی سخت سردی میں یخ بستہ پانی سے نہانا شروع کردیتی ہے۔ اس کے سارے شوق عجیب و غریب ہیں۔ شاید آپ نے گھر میں لگی ہوئی پینٹنگز دیکھی ہوں۔ یہ ساری پینٹنگز ننگی اور گندی ہیں۔ پتا نہیں کہاں کہاں سے ڈھونڈ کر لاتی ہے...“ سلیم نے چند لمحے توقف کرنے کے بعد کہا۔ ”مجھے پورا یقین ہے کہ کل جب آپ گھر میں گھسے اور گارڈز سے مار ماری کی تو یہ کلوز سرکٹ پر سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ پھر جب آپ نے گارڈز اور ملازمہ آسیہ کو بے بس کر کے باتھ روموں میں بند کردیا تو یہ اچانک آپ کے سامنے آگئی۔ آپ نے شاید اس بات پر غور نہیں کیا کہ جب یہ آپ کے سامنے آئی تو سردی کے باوجود بالکل تھوڑے سے کپڑوں میں تھی... بلکہ نہ ہونے کے برابر کپڑے تھے۔“

”ہاں، یہ بات ذہن میں آتی ہے۔“ عمران نے کہا۔

”اس نے آپ کے پیٹ میں لات ماری پھر تھپڑ بھی مارا۔ اس کے پیچھے بھی وجہ تھی۔ وہ آپ کو غصہ دلانا چاہتی تھی۔ اس کے بعد وہ بھاگی اور بیڈروم میں آگئی۔ یہاں اس نے الماری کھولی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے پستول وغیرہ نکالنا چاہ رہی ہو۔ پر مجھے پتا ہے کہ وہاں پستول تھا ہی نہیں۔ وہ دراصل صرف الماری کھولنا چاہ رہی تھی۔ آپ تینوں کو شراب کی بوتلیں دکھانا چاہ رہی تھی۔ آپ کو شاید میری ان باتوں پر یقین نہیں آئے گا لیکن میں جو کہہ رہا ہوں، سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ ایک بیمار عورت ہے۔ یہ چاہ رہی تھی کہ آپ... اس سے زبردستی کریں۔ یہ آپ کو ”ریپ“ کی طرف لا رہی تھی۔ حالانکہ اپنے ہاتھ بندھنے سے پہلے وہ جب چاہتی، بیڈ پر لگا ہوا ایک نیلا بٹن دبا کر ساتھ والی کوٹھی سے ایک درجن گارڈز کو مدد کے لیے بلا سکتی تھی۔“

ہم سب تعجب کے عالم میں سن رہے تھے۔ فضا میں سنسناہٹ سی تیرتی محسوس ہوتی تھی۔

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

تحقیق و جستجو میں امکانات کی نئی جہت سے روشناس کرانے کا عزم رکھنے والے نوجوان کی داستان

خود اعتمادی اور مشاہدہ مطلوبہ ہدف میں دلچسپی کے عنصر کو برقرار رکھتے ہیں ایک سیدھے سادے نوجوان کی زندگی کے شب و روز ..... جو اپنی نمایاں شناخت کا خواہش مند تھا۔

احمق

ثمر عباس

”یہ کیا ہے؟“ ڈاکٹر گرٹ نے کوئی دو فٹ لمبا بھٹا اٹھایا۔ اس پر لگے دانے بھی خاصے بڑے تھے، کوئی کبوتر کے انڈے کے سائز کے۔ ”کیا یہ بھٹا ہی ہے؟“ ڈاکٹر گرٹ نے جیمی کی طرف دیکھا جو سخت شرمندہ سا کھڑا تھا۔

”یس سر! یہ بھٹا ہی ہے۔“ اس نے تصدیق کی۔ جیمی بیج پر تحقیق کرنے والے ایک ادارے میں بہ طور ریسرچر کام کرتا تھا۔ ڈاکٹر گرٹ اس کا باس تھا۔ جیمی گزشتہ دو سال سے بھٹے کی اس نئی قسم پر کام کررہا تھا لیکن جب یہ عملی صورت میں سامنے آیا تو کچھ اس طرح کا تھا۔ اس کا سب سے چھوٹا بھٹا بھی کوئی دو فٹ لمبا تھا اور اس کا وزن کسی طرح تین کلو گرام سے کم نہیں تھا۔ خود جیمی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بھٹے کا سائز اتنا کس طرح بڑھ گیا۔ اصل میں اس نے ایسی مکئی ایجاد کرنے کی کوشش کی تھی جس میں تیل کی مقدار زیادہ ہو تاکہ عالمی سطح پر خوردنی تیل کی بڑھتی طلب کو پورا کیا جاسکے۔ مکئی کی موجودہ اقسام سے اوسطاً بائیس فیصد تیل نکل رہا تھا اور اس کی کوشش تھی کہ اس کی تیار کی ہوئی مکئی سے کم سے کم پچیس فیصد تیل حاصل ہو تاکہ اسے اگانے کے اضافی اخراجات کو پورا کیا جاسکے۔

اضافی خصوصیات والی فصلوں کو پانی اور کھاد کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور وہ بیماریوں کا بھی آسانی سے شکار ہو

www.pkdigest.com

جاتی ہیں۔ ان پر جراثیم کش ادویات کا خرچ بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے نئی فصل کا پہلے کی نسبت زیادہ نفع بخش ہونا لازمی ہوتا ہے۔ ورنہ اخراجات ہی پورے نہ ہوں تو نئی قسم کاشت کاروں میں مقبولیت حاصل نہیں کرتی۔

طلبا دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو بہت ذہین لیکن وہ ذرا آرام طلب ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے طلبا وہ ہیں جو ذہین تو زیادہ نہیں ہوتے لیکن محنتی ہوتے ہیں اور اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے وہ اپنی ذہانت کی کمی پوری کر لیتے ہیں۔ جیمی کا شمار دوسری قسم کے طلبا میں ہی ہوتا تھا بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اس میں ذہانت کی کمی کچھ زیادہ ہی تھی۔ اس کی کمی وہ زیادہ محنت کر کے پوری کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ہائی اسکول میں اس نے بیالوجی میں پوری ریاست میں پہلا نمبر حاصل کیا تھا۔ اس پر اسے گورنر کی طرف سے ایک خصوصی تقریب میں انعام اور یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کے لیے اسکالر شپ دی گئی۔ اسے سرکاری خرچ پر ہارورڈ یونیورسٹی جیسے ادارے میں تعلیم کا موقع ملا تھا۔

لمبا، دُبلا اور موٹے شیشوں کی عینک استعمال کرنے والا جیمی شو میں شکل سے کسی قدر احمق لگتا تھا۔ وہ صورت کا برا نہیں تھا بلکہ ان بہت سارے لڑکوں سے اچھا ہی تھا جو صرف لڑکیوں کو متوجہ کرنے کے لیے نت نئے فیشن کرتے ہیں اور ہیئر اسٹائل بنواتے ہیں... جبکہ اس کے سنہری بال ہمیشہ بکھرے... رہتے تھے کیونکہ اسے بالوں میں برش کرنے کا خیال ہی کم آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پہلے اسکول میں اور پھر یونیورسٹی میں کوئی لڑکی مشکل سے اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی اور اگر کوئی ہوتی بھی تھی تو جلد اس کی بوکھلاہٹ کی وجہ سے بیزار ہو کر چلی جاتی تھی۔ خود جیمی کو بھی لڑکیوں سے خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی توجہ ہمہ وقت اپنی کتابوں کی طرف رہتی۔ اسکول میں اس کی غیر نصابی سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ یونیورسٹی میں آ کر تو وہ کتابوں کا ہی ہو کر رہ گیا تھا۔ وہاں اسے کتابی کیڑے کے نام سے جانا جاتا تھا۔

یونیورسٹی میں بھی اس نے دل لگا کر تعلیم حاصل کی اور ہر سمسٹر میں ٹاپ کیا لیکن اسے سب سے زیادہ نمبر دینے والے پروفیسرز بھی اس کی ذہانت پر شک کرتے تھے۔ جیمی کے بارے میں ان کے ریمارکس ہوتے تھے کہ وہ کبھی کوئی تخلیقی کام نہیں کر سکتا۔ ماسٹرز کے بعد اس نے ہارورڈ یونیورسٹی سے ہی پی ایچ ڈی کے لیے درخواست دی جو اسکالر شپ کے ساتھ منظور ہوگئی اور پی ایچ ڈی کے دوران ہی اسے ایک بہت بڑی لیب کی طرف سے آفر آگئی جو فصلوں پر تحقیق

کرتی تھی اور اس کا سالانہ بجٹ کئی ارب ڈالرز کا ہوتا تھا۔ جیمی نے اسی شعبے کا انتخاب کیا اور بہت اعزاز کے ساتھ صرف پچیس برس کی عمر میں پی ایچ ڈی مکمل کر لیا۔ اتنی کم عمری میں کم سے کم اس شعبے میں ہارورڈ سے کسی اور نے پی ایچ ڈی نہیں کیا تھا۔

جیمی کو بہت سارے اعزازات، انعامات اور میڈلز سے نوازا گیا تھا۔ اسے ایک لاکھ ڈالرز نقد بھی ملے جو اس نے اپنی ماں کو بھیج دیے۔ جیمی کی ماں نے ہی اس کی پرورش کی تھی۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی عورت نہیں تھی۔ ایریزونا کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں اس نے بہت جاں فشانی سے محنت کر کے جیمی کی پرورش کی تھی۔ اس کے پاس چند ایکڑ زمین تھی جس پر وہ خود کاشت کرتی تھی۔ جیمی کو اپنی ماں کی وجہ سے ہی اس شعبے سے دلچسپی ہوئی تھی پھر اس نے چوتھی کلاس میں ریکارڈ نمبر لیے تو اسے فونکس کے ایک اسکول میں اسکالرشپ مل گئی۔ جیمی گھر سے دور جاتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اس موقع پر اس کی ماں نے اس کی ہمت بندھائی۔

”فونکس بڑا شہر ہے اور یہ چھوٹا سا گاؤں ہے تمہیں وہاں پڑھنے کا بہتر موقع ملے گا اور مجھے یقین ہے وہاں تم بہت آگے جاؤ گے۔“

ماں نے اسے دل پر پتھر رکھ کر بھیج دیا۔ جیمی کا ڈیڈ... جنگ میں مارا گیا تھا۔ جیمی اس وقت پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ باپ کے مرنے کے کوئی دو مہینے بعد پیدا ہوا۔ اس کے لیے اس کی ماں ہی سب کچھ تھی۔ آٹھ سال کی عمر تک ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب وہ ماں سے لپٹ کر نہیں سویا ہو۔ فونکس کے اسکول کے ہاسٹل میں کئی راتوں تک اسے اسی وجہ سے نیند نہیں آئی کہ وہ ماں کے پاس نہیں تھا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ عادی ہوگیا اور ماں سے دوری کے احساس کو دور کرنے کے لیے وہ پہلے سے زیادہ تعلیم پر توجہ دینے لگا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر کلاس میں ٹاپ کرتا رہا۔

تعلیم سے ہٹ کر اس کا دل پسند مشغلہ ماں کو خط لکھنا تھا۔ وہ روزانہ رات کو سونے سے پہلے ماں کو خط میں سارے دن کی تفصیلات لکھ کر سوتا اور ہر تیسرے دن وہ خط پوسٹ کرتا۔ اتوار کے دن وہ چھٹی کرتا اور اس دن وہ گھومتا پھرتا اور شہر دیکھتا تھا۔ اسے اسکول کی طرف سے وظیفہ ملتا تھا لیکن وہ اسے خرچ کرنے کے بجائے جمع کرتا اور جب وہ چھٹیوں میں گاؤں جاتا تو اس رقم سے ماں کے لیے کچھ لے جاتا۔ اسے اپنی ماں سے دیوانگی کی حد تک پیار تھا۔ اس کے بعد بھی وہ اسکالرشپ پر تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اسے اخراجات کے لیے

نوکری نہیں کرنا پڑی۔ البتہ جب وہ گرمائی چھٹیوں میں گھر جاتا تو ماں کا ہاتھ بٹانے کے لیے زمین پر کام کرتا۔ اسی دوران اسے مکئی کی فصل سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اس نے سوچا کہ وہ ضرور اس پر کام کرے گا۔

جیمی کو احساس تھا کہ اس کی ماں نے بہت محنت کر کے اور اپنے جذبات کی قربانی دے کر اس کی پرورش کی ہے۔ جب اس کا باپ مرا تو وہ جوان اور خوب صورت بھی تھی۔ چاہتی تو اسے کوئی اچھا آدمی مل سکتا تھا لیکن اس نے اپنی ساری توجہ کا محور جیمی کو بنا لیا۔ اس کی اچھی پرورش کرنے کے لیے وہ خود زمین پر کام کرنے لگی۔ اس کے پاس زیادہ وسائل نہیں تھے اس لیے زیادہ کام ہاتھ سے کرنا پڑتا۔ اس کے پاس ایک کھٹارا سی کار تھی۔ وہ آئے دن خراب رہا کرتی تھی... پرانا سا ٹی وی تھا اور مکان بھی اچھی حالت میں نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ خوش رہتے۔ اس الگ تھلگ اور ٹوٹے گھر میں بھی جیمی کو خوشی اور تحفظ کا جو احساس ہوتا، وہ

پھر کہیں اور نہیں ہوا۔

یہی وجہ تھی کہ جب پی ایچ ڈی کرنے پر اسے ایک لاکھ ڈالرز کا نقد انعام ملا تو وہ اس نے ماں کو بھیج دیا۔ اس سے انٹرویو کے لیے آنے والے رپورٹرز نے...... سوالات کی بوچھاڑ کر دی کہ وہ اس رقم کا کیا کرے گا؟ ان کا خیال تھا کہ وہ اس سے کار لینے یا کہیں سیر کرنے کی بات کرے گا لیکن جیمی نے بہت خوش ہو کر کہا۔ ”میں اسے اپنی ماں کو بھیج دوں گا۔“

اس کے جواب اور انداز نے بہت ساری آنکھوں کو نم کر دیا اور بہت سارے لوگوں نے اسے دل ہی دل میں احمق کا خطاب دیا لیکن اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ اس نے ایک لاکھ ڈالرز کے بارے میں جو کہا تھا، وہی کیا۔ اب اسے ملازمت کے لیے لیب جوائن کرنا تھا مگر اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے اسکالر شپ یونیورسٹی نے دی تھی اور وہ ایک مخصوص عرصے تک یونیورسٹی کے لیے کام کرنے کا پابند تھا۔ جب تک وہ اجازت

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ -/350
اندھیری رات کے مسافر -/325
ثقافت کی تلاش -/150
قیصر و کسریٰ -/380
اور تلوار ٹوٹ گئی -/350
گمشدہ قافلے -/350
داستانِ مجاہد -/200
پردیسی درخت -/325
یوسف بن تاشفین -/325
معظم علی -/325
خاک اور خون -/350
کلیسا اور آگ -/300
قافلۂ حجاز -/350
محمد بن قاسم -/300
پورس کے ہاتھی -/180
انسان اور دیوتا -/280
پاکستان سے دیارِ حرم تک -/160
آخری چٹان -/325
سو سال بعد -/150
سفید جزیرہ -/225
شاہین -/325

Buy online:
www.anarkalimall.com
www.jbdpress.com

جہانگیر بک ڈپو
061-4781781
022-2780128
051-35539609
021-2765086
042-37220879
041-2627568

نہیں دیتی، جیمی اس لیب میں کام نہیں کر سکتا تھا... لیکن لیب والے اسے حاصل کرنے کے لیے اتنے بے تاب تھے کہ انہوں نے ایک پروجیکٹ کے لیے یونیورسٹی کو اس شرط پر پارٹنر بنالیا کہ وہ جیمی کو لیب میں ملازمت کرنے کی اجازت دے۔ اس طرح جیمی لیب میں آ گیا۔

اتفاق سے لیب کا مرکز ایریزونا میں اس کے گاؤں سے کوئی سو میل کے فاصلے پر تھا اس طرح اسے ہر دوسرے تیسرے دن جاکر ماں سے ملنے کا موقع بھی مل جاتا۔ اس کی ماں ابھی بھی زمین پر کام کرتی تھی۔ اس نے نہ تو گھر کی مرمت کرائی تھی اور نہ ہی کوئی دوسرا کام کیا تھا۔ جیمی کو بھی پوچھنے کا خیال ہی نہیں آیا کہ ماں نے ایک لاکھ ڈالرز کا کیا کیا۔ ملازمت کے بعد اس کی تنخواہ اچھی خاصی تھی، وہ اپنی تنخواہ میں سے ہی گھر جاکر کچھ نہ کچھ کام کروا دیا کرتا۔ ایک سال میں اس نے گھر کی حالت بہت اچھی کر دی۔ دوسرے سال اس نے ماں کے لیے ایک اچھی گاڑی لی۔ اس نے ماں کو کام کرنے سے منع کیا تھا لیکن جولیا کا کہنا تھا کہ اس طرح وحشت رہے گی۔

جولیا سینتالیس برس کی ہونے کے باوجود چالیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ اس کا جسم کسی جوان عورت کی طرح مضبوط تھا اس لیے اس نے زمین پر کام نہیں چھوڑا تھا۔ صرف زمین ہی نہیں بلکہ گھر کے سارے کام بھی وہی کرتی تھی۔ اپنے استعمال کی سبزیاں تک وہ فارم پر لگاتی تھی۔ وہ چوبیس میں سے سولہ گھنٹے روز کام کرتی تھی۔ جب جیمی نے دیکھا کہ ماں کو کوئی مشکل نہیں ہے اور وہ یہ کام خوشی سے کرتی ہے تو اس نے پھر اسے منع نہیں کیا البتہ وہ اپنے طور پر اس کے لیے آسانیاں پیدا کرتا رہتا تھا۔

لیب میں اسے ڈاکٹر گرٹ کے سپرد کیا گیا۔ ڈاکٹر اس لیب کا سینئر سائنس داں تھا اور تحقیق کا تمام کام اس کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ اس نے فصلوں کے شعبے بنا رکھے تھے۔ جیمی نے اناج کے شعبے میں اور مکئی پر کام کرنے کی خواہش ظاہر کی اس لیے اسے مکئی کا پروجیکٹ دے دیا گیا۔ جیمی نے منصوبہ بنایا کہ مکئی کی ایک ایسی قسم پیدا کی جائے جس میں تیل عام مکئی سے زیادہ ہو اور کم زمین سے زیادہ پیداوار حاصل ہو سکے۔ چونکہ کسی اور نے اس پروجیکٹ پر کام کرنے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی اس لیے جیمی اکیلا ہی کام کرتا رہا۔ تنہا ہونے کی وجہ سے اس سے غلطیاں بھی بہت ہوتیں۔

جب ڈاکٹر گرٹ اس کی کارکردگی چیک کرتا تو اسے مایوسی ہوتی۔ وہ جیمی سے کہتا۔ "تمہیں اپنے کام میں بہتری لانی ہوگی... تم غلطیاں بہت کرتے ہو۔"

"میں کوشش کرتا ہوں سر۔" جیمی شرمندگی سے جواب دیتا۔ وہ بے چارہ واقعی محنت کرتا تھا۔ دوسرے ریسرچر شام چھ بجے چھٹی کرکے چلے جاتے لیکن وہ آٹھ نو بجے تک اپنے کام میں مصروف رہتا اور کبھی کبھی تو اسے لیب میں اپنے اپارٹمنٹ میں جاتے جاتے بارہ بج جاتے مگر جس دن اسے گھر جانا ہوتا تھا، اس دن وہ ٹھیک چھ بجے اٹھ جاتا۔ وہ دفتر سے سیدھا گھر کے لیے نکلتا اور دو گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد گھر پہنچ جاتا۔ رات وہیں رک کر وہ صبح چھ بجے گھر سے نکلتا اور آٹھ بجے تک دفتر پہنچ جاتا۔ البتہ جب ہفتے کی شام کو جاتا تو پیر کی صبح براہ راست دفتر آتا اس طرح اسے پورا اتوار ماں کے ساتھ گزارنے کا موقع مل جاتا۔

لیب میں شروع کے دن تو اچھے گزرے۔ اس کے ساتھیوں اور لیب انتظامیہ کا اس کے بارے میں خیال تھا کہ اس نے اتنے اعزاز کے ساتھ پی ایچ ڈی کی ڈگری لی ہے تو وہ یقیناً بہت ذہین ہوگا۔ وہ اس سے توقع کر رہے تھے کہ وہ ان کے لیے کوئی انقلابی کام کرے گا لیکن اول تو اس نے مکئی جیسی عام سی چیز کا انتخاب کیا تھا پھر وہ اس پروجیکٹ میں کافی وقت لگا رہا تھا۔ اس کی بار بار کی ناکامیوں کی وجہ سے اس کا پروجیکٹ اپنی منظور شدہ لاگت سے اوپر جا چکا تھا اور ڈاکٹر گرٹ سے کہہ دیا گیا تھا کہ اگر اس سال کے اندر یہ پروجیکٹ کسی انجام تک نہیں پہنچا تو اسے بند کر دیا جائے گا۔ لیب کے کرتا دھرتا اب اس پر مزید رقم لگانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ڈاکٹر گرٹ نے جیمی کو اپنے دفتر میں بلا کر یہ وارننگ دی اور کہا۔

"یہ تمہارے لیے آخری موقع ہے... اور اگر تم ناکام رہے تو مجھے خطرہ ہے کہ تمہاری ملازمت بھی جاسکتی ہے۔"

ملازمت کی تو اسے اتنی پروا نہیں تھی لیکن وہ بہرصورت اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا کیونکہ وہ ناکام رہتا تو اس سے پروجیکٹ لے لیا جاتا چنانچہ وہ پوری تندہی سے اپنے کام میں لگ گیا۔

آخر اس نے ایک ایسی مکئی کا پودا تیار کر لیا جس کے دانے میں عام مکئی کے دانے سے کہیں زیادہ تیل پایا جاتا تھا لیکن یہ زیادہ تیل صرف تھیوری کی حد تک تھا۔ اس پودے کو اس نے ٹشوز کی مدد سے بڑے پیمانے پر لگایا اور اب اسے بے چینی سے اس کے تیار ہونے کا انتظار تھا۔

جیمی کی پریشانی کا آغاز اس وقت ہوا جب پودوں میں بھٹے نمودار ہونے لگے اور اس نے محسوس کیا کہ ان کا سائز

خاصا بڑا ہے۔ حالانکہ اس نے بھٹے کا سائز بڑا کرنے والا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد تو بھٹوں کا سائز روز بروز بڑھتا ہی چلا گیا۔ جب فصل پکی تو اس میں جناتی سائز کے بھٹے لگے ہوئے تھے۔ مضبوط تنوں کے باوجود پودے بھٹوں کے وزن سے جھکے جا رہے تھے اور جیمی کے ساتھی اس کا مذاق اڑا رہے تھے کہ اس نے یہ کیا چیز تیار کی ہے۔ فی ایکڑ کے حساب سے بھٹے بہت کم تھے لیکن وزن کے حساب سے یہ عام فصل سے کوئی ساٹھ فیصد زیادہ مکئی تھی۔ بھٹے اتارنے کے بعد جب ان کا جائزہ لیا گیا تو جیمی کو ایک صدمہ اور برداشت کرنا پڑا کہ اس میں تیل عام مکئی سے بھی کم تھا اور اس کا تناسب سترہ فیصد نکلا۔ گویا اس کی تین سال کی محنت مکمل طور پر ضائع چلی گئی تھی۔ اس نے لاکھوں ڈالرز کا خرچہ کروانے کے بعد جو مکئی تیار کی تھی، وہ معیار میں عام مکئی سے بھی کمتر تھی اور اس کا بھٹا بھی اتنا بڑا تھا کہ اسے کسی کام میں نہیں لایا جاسکتا تھا۔ پھر اس کا ذائقہ بھی اچھا نہیں تھا۔ اس سے کہیں اچھے ذائقے والی مکئی بازار میں دستیاب تھی۔

ڈاکٹر گرٹ نے اسے طلب کرلیا اور نوشتۂ دیوار جیمی کے سامنے تھا۔ اسے معلوم تھا کہ گرٹ اس کی کلاس لینے کے بعد اسے برطرفی کا پروانہ تھمائے گا اور وہ اس کا مستحق بھی تھا۔ ادارے میں اس کا پہلا پروجیکٹ ہی بری طرح ناکام رہا تھا۔ گرٹ نے اسے بتایا کہ اس نے ایک احمقانہ کام پر لیب کے کوئی بائیس لاکھ ڈالرز خرچ کروا دیے تھے۔ اس نے بھٹا لہراتے ہوئے کہا۔ "اور اس کے بدلے کیا حاصل ہوا، یہ جناتی بھٹا... جسے شاید جانور ہی کھا سکتے ہیں لیکن میرے دوست! جانوروں کے لیے سستی مکئی کی بے شمار اقسام پہلے ہی موجود ہیں اور اسے تو شاید جانور بھی کھانا پسند نہیں کریں... کیا خیال ہے تمہارا؟"

"مجھے اپنی ناکامی کا اعتراف ہے سر!" جیمی نے سر جھکا کر کہا۔

اس بار ڈاکٹر گرٹ نے اسے ہمدردی سے دیکھا۔ "مجھے افسوس ہے کہ لیب نے تمہیں فارغ کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم تحقیق کے شعبے میں غلط آگئے ہو تمہیں چاہیے کہ کسی کالج یا یونیورسٹی میں لیکچرار شپ کرکے طلبا کو بنیادی قسم کی بیالوجی پڑھاؤ۔ یہ تحقیق وغیرہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔"

"شاید میں یہی کروں۔" جیمی نے سرد آہ بھر کر کہا اور گرٹ کے دفتر سے نکل آیا۔ اس نے اپنے دفتر میں آکر اپنا سامان سمیٹا اور وہ پلاسٹک کا بڑا سا جار بھی لے لیا جس میں اس جناتی مکئی کے دانے بھرے ہوئے تھے۔ اسے افسوس ہو رہا تھا۔ آج سے پچیس برس پہلے وہ ایک مقصد لے کر گھر سے نکلا تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرے گا اور دنیا میں ایک نام کمائے گا لیکن اب وہ ناکام واپس جا رہا تھا۔ اس نے اعلیٰ تعلیم تو حاصل کر لی تھی لیکن وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکا تھا۔ شاید وہ سچ مچ احمق ہی تھا جیسا کہ پہلے اس کے کولیگز اور پھر لیب کے ساتھی کہا کرتے تھے۔

گھر جاتے ہوئے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ماں کا سامنا کیسے کرے گا اور اسے کیسے بتائے گا کہ وہ اپنے مقصد میں ناکام ہو گیا ہے؟ لیکن اسے بتانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ جولیا نے اسے دیکھتے ہی جان لیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس نے بے وقت اور سارے سامان کے ساتھ آنے والے بیٹے کا معمول کے مطابق استقبال کیا اور اسے بتایا کہ آج وہ اس کی پسندیدہ ڈش مشروم گوشت بنانے جا رہی ہے۔ یہ جیمی بہت شوق سے کھاتا تھا۔

جیمی نے اپنا سامان لے جاکر اپنے کمرے میں رکھا اور اپنے کپڑے الماری میں لگانے لگا۔ جولیا نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ رات کھانے کے بعد جب وہ برآمدے میں بیٹھا تاریکی میں دیکھ رہا تھا تو جولیا اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس سے ملازمت کے بارے میں پوچھے گی لیکن اس کے بجائے اس نے جیمی سے کہا۔

"تمہیں یاد ہے... تم نے تین سال پہلے مجھے ایک لاکھ ڈالرز بھیجے تھے؟"

جیمی مسکرایا۔ "یس مام! لیکن آپ نے انہیں خرچ نہیں کیا۔"

"نہیں جیمی... میں نے انہیں خرچ کیا تھا لیکن پورے لاکھ ڈالرز نہیں بلکہ پچاس ہزار ڈالرز خرچ کیے تھے۔ باقی بینک میں ایک سیونگ اکاؤنٹ میں ڈال دیے تھے۔"

جیمی چونکا۔ "اچھا مام آپ نے کیا لیا تھا؟"

"میں نے اس سے زمین لے لی تھی۔" جولیا نے کہا۔ "تمہیں یاد ہوگا ہمارے ساتھ کارٹر کی زمین تھی۔ وہ اسے بیچ رہا تھا۔ میں نے وہ زمین لے لی۔ پورے پندرہ ایکڑ زمین ہے۔ اب تم آگئے ہو تو اس کے گرد باڑ لگا کر اسے فارم میں شامل کر لو۔"

جیمی کو خوشی ہوئی کہ اب ان کا فارم بڑھ گیا تھا۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ میں واپس آ گیا ہوں۔ مجھے جاب سے نکال دیا گیا ہے۔ میں اپنے پروجیکٹ میں ناکام رہا ہوں۔"

"کیا تم نے کوئی چیز نہیں بنائی؟"

www.pkdigest.com

"جیمی... بنائی تو ہے لیکن جو بنانا چاہ رہا تھا وہ نہیں بنا سکا۔"

"تب تو تم ناکام نہیں ہو میرے بچے، یاد رکھو، جو چیز بن جائے وہ کبھی نہ کبھی انسان کے کام آتی ہے۔"

"لیکن میں نے جو چیز بنائی ہے وہ شاید کبھی کام نہ آئے۔ میں آپ کو دکھاتا ہوں۔"

جیمی ماں کو لے کر اندر آیا اور اس نے اسے جناتی مکئی دکھائی۔ جولیا حیران رہ گئی۔ اس نے کبھی اس قسم کی مکئی نہیں دیکھی تھی۔ جیمی نے وضاحت کی۔ "مام! یہ دنیا میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ میں نے جو مکئی ایجاد کرنے کی کوشش کی تھی، اس کے بجائے یہ چیز وجود میں آ گئی۔"

"میرے بچے! یہ تو حیرت انگیز ہے۔" جولیا خوش ہو کر بولی۔ "مجھے اس کے بارے میں اور بتاؤ۔"

جیمی اسے بتانے لگا کہ اس نے اسے کس طرح لگایا اور یہ کیسے تیار ہوئی۔ "یہ وزن میں عام مکئی سے ساٹھ فیصد زیادہ ہوتی ہے۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔"

"لیکن مام! اس کا نہ تو ذائقہ اچھا ہے اور نہ ہی اس میں عام مکئی کی طرح زیادہ تیل پایا جاتا ہے۔"

"پھر بھی میرا مشورہ ہے کہ تم اسے لگا کر دیکھو۔ وہاں تم نے اسے لیب کے ماحول میں لگایا تھا۔ اب اسے کھلے فارم میں لگا کر دیکھو کہ کیا نتیجہ نکلتا ہے۔" جولیا نے کہا تو جیمی سوچ میں پڑ گیا۔

جیمی کے خیال میں نتیجہ تو کوئی مختلف نہیں نکلنا تھا مگر ماں کے کہنے پر وہ اسے لگانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ان کی زمین پر اس وقت مکئی کی فصل تیار تھی اور ساتھ میں آلو اور گاجریں بھی تیاری کے مرحلے میں تھیں۔ جیمی نے اگلے دن سے اپنی زمین کی نئی حد بندی شروع کر دی۔ ان کی زمین بارانی تھی لیکن ان کے پاس بورنگ کا پانی بھی تھا جو کوالٹی کے لحاظ سے اچھا تھا۔ اگر وہ کوئی اور فصل لگانا چاہتا تو اسے پانی کی کمی نہیں تھی۔ جیمی لکڑی خرید کر لایا اور اس نے اس کی مدد سے اپنے فارم کی نئی حد بندی شروع کر دی۔ اس نے نئی زمین کا معائنہ کیا۔ وہاں خاصے عرصے سے کاشت نہیں ہوئی تھی اس لیے زمین کی زرخیزی بڑھ گئی تھی۔ کارٹر نے اس کے گرد اونچے اونچے درخت لگا رکھے تھے۔ ان کے گرتے پتے زمین کو مسلسل زرخیز کرتے رہتے۔ جیمی نے ان درختوں کو کاٹا نہیں۔ ایک مہینے کی محنت کے بعد اس نے باڑھ لگانے کا کام مکمل کر لیا۔ اس دوران میں اس نے جولیا کے ساتھ مل کر مکئی کی فصل بھی اتاری۔

مارکیٹ میں مکئی کی قیمت میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ جیمی کو اس کی وجہ معلوم تھی۔ گرین فیول کی طلب میں اضافے کی وجہ سے مکئی کی قیمت بڑھ رہی تھی کیونکہ مکئی بھی گرین فیول بنانے میں کام آتی ہے۔ اس نے سوچا کہ کہیں جاب کرنے سے پہلے وہ کچھ عرصے اپنی زمین پر کام کر کے اپنے تجربات میں اضافہ کرے گا۔ اس نے یہ فیصلہ کرنے کے بعد پہلے زمین کے لیے کچھ مشینری لینے کا سوچا۔ ایک چھوٹے ٹریکٹر کی ضرورت تھی اور دوسرے ایک طاقت ور پمپ کی بھی ضرورت تھی جس سے بہ وقتِ ضرورت زمین کو فواروں سے پانی فراہم کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ کچھ چھوٹے موٹے آلات تھے۔ اس کے پاس رقم تو تھی لیکن اس نے سوچا کہ پہلے سیونگ اکاؤنٹ میں پڑی رقم دیکھ لے۔ یہ جان کر اسے حیرت ہوئی کہ اس دوران میں رقم بڑھ کر ستر ہزار ڈالرز ہو گئی تھی۔ اس نے سامان کے لیے مطلوبہ رقم نکالی اور مشینری لے لی۔

ان دنوں موسم سرما کا آغاز تھا۔ بہار کے موسم سے پہلے وہ زمین تیار کر لینا چاہتا تھا۔ جولیا کے پاس جو زمین تھی، وہ اسے بھی پورا کاشت نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اس کے پاس مشینری اور مزدور رکھنے کے وسائل نہیں تھے۔ جب جیمی اپنے بل بوتے پر تعلیم حاصل کر رہا تھا تو اسے مزید آمدنی کی ضرورت نہیں تھی اور پھر جیمی ملازمت کرنے لگا لیکن اب جیمی کو ضرورت تھی کہ وہ اپنی زمین کو پوری طرح استعمال کرے۔ اس لیے اس نے نہ صرف تمام ضروری مشینری لے لی بلکہ اس نے سوچ لیا تھا کہ جب وہ کام کا آغاز کرے گا تو مزدور بھی رکھے گا اور اپنی زمین کو پوری طرح استعمال میں لائے گا۔

وہ سرما میں زمین تیار کرتا رہا۔ اس نے زمین کا ایک حصہ بالکل الگ کر کے اسے اپنی جناتی مکئی اگانے کے لیے تیار کر لیا۔ اس نے اس زمین کو قدرتی کھاد کی مدد سے تیار کیا تھا۔ لیب میں مکئی کیمیائی کھاد کی مدد سے اگائی گئی تھی۔ اب وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کیمیائی کھاد اور اسپرے کے بغیر یہ مکئی کیا فصل دیتی ہے۔ اس نے احتیاطاً اس زمین پر تجرباتی فصل کا بورڈ لگا دیا اور علاقے کی کونسل سے اس کی اجازت بھی لے لی... کیونکہ امریکا میں بنا اجازت کے کسی بھی فصل کی کوئی نئی قسم نہیں اگائی جا سکتی۔ جیمی اسے صرف تجرباتی طور پر اگانے کا مجاز تھا اور اس کی پیداوار کو وہ مارکیٹ میں نہیں لا سکتا تھا۔

جولیا، بیٹے کے پاس آنے اور زمین پر کام کرنے سے خوش تھی۔ شاید اس کی خواہش تھی کہ جیمی اب مستقل یہیں رہے لیکن اس نے کبھی زبان سے اس خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ البتہ اس نے جیمی سے کہا۔ "تم شادی

کیوں نہیں کر لیتے؟"

جیمی جھینپ گیا۔ "مام! میں نے اس بارے میں ابھی سوچا نہیں ہے۔"

"تو سوچو نا... اب تم انتیس برس کے ہونے والے ہو۔ تمہارے پاپا کی مجھ سے شادی بائیس برس کی عمر میں ہوئی تھی اور میں اس وقت صرف اٹھارہ برس کی تھی۔"

جولیا کی اس بات نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ جب وہ لیب میں کام کرتا تھا تو وہاں ایک لڑکی رمیلا تھی۔ وہ کمپیوٹر آپریٹر تھی اور ڈیٹا انٹری کا کام کرتی تھی۔ وہ دلکش اور خوش مزاج لڑکی تھی۔ جیمی اسے پسند کرتا تھا لیکن اس نے کبھی اس کے بارے میں اس زاویے سے نہیں سوچا تھا کہ وہ اسے شادی کی پیش کش کرے۔ رمیلا ان چند لڑکیوں میں سے تھی جو اس سے اچھی طرح پیش آتی تھیں۔ ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ مرتبے میں جیمی اس سے کہیں بڑا تھا۔ ماں کی بات پر اسے رمیلا یاد آ گئی لیکن اب یہ پرانی بات ہو چکی تھی۔ اس کے چند دن بعد وہ زمین پر کام کر رہا تھا کہ جولیا نے اسے اطلاع دی۔ "تمہاری کال آئی ہے۔"

جولیا نے یہ نہیں بتایا تھا کہ کال کہاں سے آئی ہے۔ اس نے اندر آ کر کال ریسیو کی۔ "ہیلو۔" اس نے کہا۔

www.pkdigest.com

"مسٹر شون؟"

"ہاں، بات کر رہا ہوں۔"

"میں لیب سے رمیلا بات کر رہی ہوں۔"

"رمیلا۔" اسے خوشگوار حیرت ہوئی کیونکہ چند دن پہلے وہ اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ "کیسی ہو تم؟"

"ٹھیک ہوں... لیکن تمہارے لیے ایک بری اطلاع ہے۔ میں نے سوچا تمہیں پہلے سے ہی خبردار کر دوں۔"

"وہ کیا؟" اس کا دل دھڑکنے لگا۔

"لیب نے مکئی پروجیکٹ کی ناکامی کے سلسلے میں تم پر مقدمہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"مقدمہ... مگر کیوں؟"

"لیب کو اس میں تین ملین ڈالرز کا نقصان ہوا ہے اور لیب حکام نے مکئی کے سلسلے میں کسی کمپنی سے بات بھی کر لی تھی۔ اس سے بھی بات خراب ہوئی تھی۔"

"تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟" جیمی گھبرا کر بولا۔ "وہ تو ایک تجربہ تھا اور تجربے تو ناکام ہوتے رہتے ہیں۔"

"یہ تو میں نہیں جانتی لیکن لیب نے فیصلہ کر لیا ہے۔ ممکن ہے اسی ہفتے تمہیں عدالت کی طرف سے بلاوا آ جائے۔"

"میرے خدا!" جیمی نے کہا۔ "لیکن رمیلا! تم نے مجھے یہ سب کیوں بتایا؟"

"تم مجھے اچھے لگتے تھے اور میں نہیں چاہتی کہ تمہیں... کوئی نقصان ہو۔" رمیلا نے شرمیلے لہجے میں کہا۔

جیمی کو اس کی بات اور اس کا لہجہ اتنا اچھا لگا کہ وہ فی الحال بری خبر کو بھی بھول گیا۔ "سچ... میں تمہیں اچھا لگتا تھا؟"

"اب بھی اچھے لگتے ہو۔" وہ بولی۔

"رمیلا! کیا تم مجھ سے کہیں مل سکتی ہو؟ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اس بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔"

وہ ہچکچائی۔ "میں اتنی دور نہیں آ سکتی۔"

"کوئی بات نہیں... میں آ جاؤں گا۔" اس نے جلدی سے کہا۔

جیمی کے لیے یہ بہت تشویش ناک بات تھی۔ دو دن بعد وہ رمیلا سے لیب کے دفتر کے پاس ایک کیفے میں ملا۔ اس بار رمیلا نے اسے تفصیل سے بتایا کہ اس سارے چکر کے پیچھے لیب کا ایک ڈائریکٹر جیمی جون تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ نام نہاد ریسرچر لیب کا ملین ڈالرز برباد کر کے مزے سے چلے جاتے ہیں۔ انہیں مزہ چکھانا چاہیے۔ جیمی کو غصہ آیا لیکن وہ غصہ کرنے والا شخص نہیں تھا۔ اسے تو کسی خلافِ معمول بات سے الجھن ہونے لگتی تھی۔ اس وقت بھی پریشانی سے اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔

"اب میں کیا کروں؟" اس نے کہا۔

"میرے ایک انکل وکیل ہیں... اگر تم کہو تو میں ان سے پوچھوں؟" رمیلا نے کہا۔

"ہاں، پلیز... ان سے کہو کہ کسی طرح مجھے اس چکر سے بچا لیں۔ اگر عدالت نے میرے خلاف فیصلہ دے دیا تو میں اتنی بڑی رقم کہاں سے ادا کروں گا۔"

"ایسا ممکن نہیں ہے کیونکہ تم نے ان کا جان بوجھ کر کوئی نقصان نہیں کیا ہے اور اب اس بات کو کافی وقت بھی گزر چکا ہے۔" رمیلا اب اس سے بے تکلفی سے بات کر رہی تھی۔

"لیکن وہ مجھے عدالت میں پریشان تو کریں گے۔"

رمیلا اسے اپنے انکل وکیل سے ملوا سکتی تھی لیکن اس معاملے میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ لیب کی جانب سے اسے ایک ہفتے بعد ہی نوٹس مل گیا۔ رمیلا کے انکل نے اس سے کہا کہ مقدمے میں کوئی جان نہیں اور زیادہ سے زیادہ ایک سال میں اس کا فیصلہ اس کے حق میں ہو جائے گا۔ جیمی بے چارہ عدالت کا سن کر ہی پریشان ہو گیا لیکن اسے سامنا تو کرنا تھا۔ اس نے رمیلا کے انکل کو ہائر کر لیا اور اس نے ابتدائی طور پر جیمی سے دس ہزار ڈالرز فیس لے لی۔

شروع میں کیس کی پیشیاں زیادہ نہیں تھیں لیکن پھر اسے ہر ہفتے ہی جانا پڑتا۔ عدالت فونکس میں تھی کیونکہ لیب حکام نے براہ راست ریاستی کورٹ میں مقدمہ کردیا تھا۔ بے چارہ جیمی پیشی والے دن صبح سویرے نکل جاتا اور کوئی چار گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد فونکس پہنچتا۔ پیشی بھگت کر اسی روز واپس آجاتا کیونکہ وہ فارم پر کام بھی کررہا تھا۔ ایک مہینے بعد رمیلا کے انکل وکیل جسٹن ایڈ نے اس سے دس ہزار ڈالرز مزید مانگ کر اسے حیران کردیا جس پر اس نے احتجاج کیا۔

"میں نے ابھی تو تمہیں دس ہزار ڈالرز دیے ہیں۔"

"وہ تو سمجھو کہ مقدمے کے ابتدائی اخراجات میں ہی کھپ گئے۔ میری فیس تو ابھی باقی ہے۔"

جسٹن نے ایسے اخراجات کی کچھ ایسی فہرست دی جو اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ ساتھ ہی اس نے بتایا کہ لیب والوں نے اپنے اثر رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے جج پر دباؤ ڈلوایا ہے۔ جیمی کے لیے یہ ایک اور پریشان کن اطلاع تھی۔ اس نے فکر مندی سے کہا۔ "تو کیا فیصلہ میرے خلاف ہوسکتا ہے؟"

"جب تک میں تمہارا وکیل ہوں تب تک تو نہیں ہوسکتا۔" جسٹن نے اعتماد سے کہا۔

لیکن جسٹن سستا وکیل نہیں تھا۔ اس نے دو مہینے بعد پھر اس سے دس ہزار ڈالرز مانگ لیے جو جیمی کو دینا پڑے۔ اس مقدمے کے چکر میں اس کی جمع پونجی بڑی تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ اس نے اس دوران میں اپنے فارم پر مکئی کاشت کر دی تھی۔ اس نے ایک عام مکئی کاشت کی تھی اور دوسری اس نے اپنی خاص مکئی کاشت کی تھی۔ اس دوران میں اس کا مقدمہ میڈیا پر شہرت حاصل کرنے لگا۔ اگرچہ یہ پہلی مثال نہیں تھی، جب کسی سائنس داں پر غلط ریسرچ کے حوالے سے مقدمہ بنا تھا لیکن اس لیب کی جانب سے یہ پہلا مقدمہ تھا اور جیمی ایک نیا ریسرچر تھا اس لیے میڈیا اس میں زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔

مزید دو مہینے بعد جب جسٹن نے جیمی سے مزید دس ہزار ڈالرز کا مطالبہ کیا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ اسے بے وقوف بنا رہا ہے کیونکہ وہ مہینے میں صرف چار بار کیس کی سماعت میں حاضر ہوتا تھا اور اس دوران میں بھی وہ زیادہ تر چپ بیٹھا رہتا تھا اور مخالف پارٹی پر بہت کم اعتراضات کرتا تھا... جبکہ مخالف وکیل بہت سرگرم تھا۔ وہ ہر پیشی میں کوئی نہ کوئی نئی دستاویز جج کے ملاحظے کے لیے پیش کردیتا تھا۔ جبکہ جسٹن اسے دیکھنے کا مطالبہ بھی نہیں کرتا۔ اس پر وہ ہر دو مہینے بعد اس سے دس ہزار ڈالرز کا مطالبہ کررہا تھا۔ اب تک وہ اس سے تیس ہزار ڈالرز لے چکا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیس کس رخ پر جارہا ہے۔ تم تو عدالت میں کچھ کرتے نظر نہیں آرہے۔"

"مسٹر! یہ میرا کام ہے اور تم مجھے مت بتاؤ کہ کیس کس طرح لڑتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ تم دس ہزار ڈالرز دے رہے ہو یا نہیں؟"

"تم نے شاید غلطی سے مجھے دولت مند سمجھ لیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اب کنگال ہونے والا ہوں۔"

"یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔" وہ رکھائی سے بولا۔ "مقدمہ لڑنے کے لیے رقم کی ضرورت تو پڑتی ہے۔"

باول ناخواستہ جیمی کو اسے دس ہزار ڈالرز دینا پڑے۔ ان دنوں وہ بہت پریشان تھا۔ یہ دس ہزار ڈالرز دینے کے بعد اس کے پاس بچ کچھ زیادہ رقم نہیں بچی تھی۔ ان دنوں رمیلا بھی اس سے کم ملتی تھی اور جب وہ اس سے ملنے کو کہتا تو وہ اسے ٹال جاتی۔ دوسری طرف اس کی مکئی کی فصل بڑی تیزی سے پک رہی تھی اور اس کے پودے کے بڑھنے کی رفتار عام مکئی سے زیادہ ہی تھی۔ عام مکئی کا پودا ابھی فٹ بھر اونچا ہوا تھا جبکہ جناتی مکئی کا پودا دو فٹ اونچا ہوچکا تھا اور اس کا تنا بھی مضبوط ہورہا تھا۔ جیمی نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ اسے کیمیائی کھاد نہ دے اور پانی بھی عام پودوں جتنا دے رہا تھا۔ اس پر بھی اس کے بڑھنے کی یہ رفتار حیران کن تھی۔

لیب کی طرف سے دائر کیا جانے والا مقدمہ چھٹے مہینے میں داخل ہوگیا تھا۔ اس روز وہ پیشی کے لیے نکل رہا تھا کہ جولیا نے اس سے مقدمے کے بارے میں پوچھا۔ وہ مایوسی سے بولا۔ "وکیل کچھ بھی نہیں کررہا ہے۔"

"تو تم وکیل بدل دو۔" جولیا نے مشورہ دیا۔ "خراب آدمی سے انسان جتنی جلدی جان چھڑا لے اچھا ہوتا ہے۔"

جیمی بھی یہی سوچ رہا تھا۔ وہ بہت سویرے نکلا تھا کیونکہ اس بار پیشی صبح نو بجے تھی۔ اس نے روانگی سے پہلے کافی کا صرف ایک کپ لیا اور تیز رفتار ڈرائیونگ کی وجہ سے وہ ساڑھے آٹھ بجے ہی فونکس پہنچ گیا۔ اس نے سوچا کہ پہلے ناشتا کرلے۔ اس نے کورٹ کے پاس ہی ایک کیفے منتخب کیا اور اپنی ناشتے کی ٹرے لے کر ایک میز پر آبیٹھا۔ ابھی وہ ناشتا کررہا تھا کہ اسے اپنی پشت کی طرف سے ایک جانی پہچانی آواز آئی۔

"تم نے اس بے چارے کو زیادہ ہی نچوڑ لیا ہے۔"

www.pkdigest.com

چھوٹے قد والے
دِل چھوٹا نہ کریں!!
گروٹال®

اگر آپکی عمر 30 سال سے کم ہے تو گروٹال آپ کا قد بڑھا سکتی ہے
ملک بھر کے تمام اچھے میڈیکل، یونانی اور ہومیو سٹورز پر دستیاب
TT
بذریعہ ڈاک منگوانے کا پتہ ٹاپ ٹریٹمنٹس 100 بی، ملتان روڈ لاہور ۔ 35789146 - 35789145
toptreatments@gmail.com • www.toptreatments.net

جیمی ساکت رہ گیا کیونکہ یہ آواز رمیلا کی تھی۔ پھر جسٹن کی آواز آئی۔ اس نے کہا۔ ”میں نے تھوڑا تو ہے لیکن اس میں سے آدھا حصہ تمہارا بھی تو ہے۔“

”آدھا!“ رمیلا بولی۔ ”تم اس سے چالیس ہزار ڈالرز لے چکے ہو اور تم نے مجھے کیا دیا ہے... صرف پندرہ ہزار ڈالرز۔“

”میں مقدمہ لڑ رہا ہوں۔“ جسٹن دفاعی انداز میں بولا۔

”مقدمہ!“ اس بار رمیلا طنزیہ انداز میں بولی۔ ”تمہیں مقدمہ دیتا کون ہے اور تمہیں مقدمہ لڑنا آتا تو تم اس طرح فارغ گھوم رہے ہوتے؟ تم میرا احسان ماننے کے بجائے الٹا مجھے دھوکا دے رہے ہو۔ میں چاہوں تو جیمی ابھی تمہیں اس مقدمے سے فارغ کر دے۔“

”تم چاہتی ہو کہ وہ مقدمہ ہار جائے؟“

رمیلا ہنسی۔ ”وہ بے چارہ مقدمہ ہار رہا ہے کیونکہ اس کے وکیل تم ہو اور اس سے اچھا تو وہ خود لڑ سکتا ہے۔ اگر تم نے مجھے فوراً پانچ ہزار ڈالرز نہیں دیے تو میں اسے یہی مشورہ دوں گی۔“

”شوق سے دو۔“ جسٹن بے پروائی سے بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ اب اس بے چارے کے پاس دینے کے لیے کچھ ہے بھی نہیں۔“

جیمی یہ سب سن کر ناشتا کرنا بھول گیا۔ وہ اچانک اٹھا اور دونوں کے سامنے آیا تو وہ بھونچکے رہ گئے۔ خاص طور سے رمیلا کی حالت بری ہوگئی تھی۔ اس نے ہکلا کر کہنا چاہا۔ ”جیمی تم... تم شاید...“

”کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر سرد لہجے میں کہا۔ ”میں صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ مجھے اب جسٹن کی ضرورت نہیں ہے۔ جسٹن! تمہیں اب عدالت آنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

جسٹن بے فکر تھا کیونکہ جیمی کو دھوکا اس نے نہیں بلکہ رمیلا نے دیا تھا۔ جیمی کا دل اندر سے کٹ رہا تھا۔ دنیا اسے احمق سمجھتی اور شاید بتاتی بھی رہتی تھی مگر اس نے کبھی کسی کی پروا نہیں کی۔ البتہ رمیلا نے اسے سچ مچ بہت تکلیف پہنچائی تھی۔ وہ باہر آیا تو رمیلا اس کے پیچھے تک آئی۔ اس نے عقب سے جیمی کو آواز دی۔ ”جیمی... پلیز! میری بات تو سنو۔“

وہ رک گیا۔ ”کیا ابھی میرے احمق بننے میں کوئی کمی باقی ہے؟“

رمیلا شرمندہ لگ رہی تھی۔ ”میں تم سے سوری کرتی ہوں۔ میں نے واقعی تمہارے ساتھ دھوکا کیا۔“

”کیا تمہارے معافی مانگنے سے میرے اس نقصان کا ازالہ ہو جائے گا؟“ جیمی کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

”نہیں۔“ رمیلا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

جیمی کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ وہ کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی پھر جیمی کو اس پر ترس آ گیا یا شاید اس کے دل میں رمیلا کے لیے گنجائش تھی۔ ”ٹھیک ہے، میں نے تمہیں معاف کیا۔“

وہ کہہ کر اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ اس سماعت پر اس نے وکیل نہ ہونے کا عذر کر کے آگے کی تاریخ لے لی تھی۔ جب اس نے گھر آ کر جولیا کو یہ بات بتائی تو اس نے کہا۔ ”تم فکر مت کرو۔“

”لیکن مام... اب وکیل کہاں سے ہوگا؟ اس کی فیس کی ادائیگی کے لیے رقم کہاں سے آئے گی؟“

”وہ بھی آ جائے گی لیکن تم نے ایک کام بہت اچھا کیا۔ وہ یہ کہ اس لڑکی کو معاف کر دیا۔“

”میں شاید اس کے لیے مجبور تھا مام۔“ اس نے سرد آہ بھری۔

جولیا کا بارٹ نامی ایک کزن وکیل تھا۔ اس نے اس سے رابطہ کیا تو اس نے آ کر جیمی سے کیس کی فائل لی۔ وہ ایک دن ان کے گھر رکا۔ اس دوران میں اس نے کیس کا مطالعہ کیا پھر اس نے جولیا اور جیمی سے کہا۔ ”اس میں تو کچھ ہے ہی نہیں۔ لیب نے بہت غلط کیس کیا ہے۔ اسے نہ صرف کیس واپس لینا پڑے گا بلکہ ہرجانہ بھی ادا کرنا ہوگا۔“

جیمی خوش ہو گیا۔ ”وہ کیسے؟“

”تم نے لیب سے اپنی ملازمت کا معاہدہ غور سے نہیں پڑھا۔ اس میں واضح طور پر درج ہے کہ کسی پروجیکٹ کی ناکامی کی ذمے داری تم پر عائد نہیں کی جا سکتی... جب تک تمہارا اسٹنٹ تمہاری رپورٹ نہ کرے... اور ڈاکٹر گرٹ نے تمہارے خلاف رپورٹ نہیں کی ہے۔ تم مجھے ایک ہفتہ دو، میں اس کیس کو فائنل کر لوں گا۔“ بارٹ نے وضاحت سے سمجھایا۔

”تم بے شک آرام سے کام کرو۔“ جولیا بولی۔ ”لیکن اس کی فیس ہم تمہیں اتنی جلدی نہیں دے سکتے۔“

بارٹ نے شاکی نظروں سے جولیا کی طرف دیکھا۔ ”کیا میں نے تم سے فیس کی بات کی ہے؟“

یوں طے ہو گیا کہ کیس اب بارٹ دیکھے گا۔ اس نے جیمی سے کہا۔ ”میری کوشش ہوگی کہ تمہیں کم سے کم ایک ملین ڈالرز کا ہرجانہ دلواؤں۔“

”ایک ملین ڈالرز!“ جیمی نے حیرانی سے کہا۔ ”میں تو اس پر بھی خوش ہوں گا کہ اس کیس سے میری جان

چھوٹ جائے۔“

بارٹ مسکرایا۔ ”تم بھی اپنی ماں کی طرح سادہ انسان ہو... تبھی یہ لوگ اس حد تک گئے ہیں۔“

بارٹ نے اسے کیس سے متعلق بے فکر کر دیا اور وہ پوری طرح فصل کی تیاری میں لگ گیا۔ جناتی مکئی کے پودے خاصے بڑے ہو گئے تھے اور اب ان میں بھٹے بھی آنے لگے تھے جبکہ عام مکئی میں بھٹے نہیں آئے تھے۔ اس نے کچھ بھٹے اتار کر ان کا تجزیہ بھی کیا۔ ان میں کچے دانے کا سائز خاصا بڑا تھا۔ اس کے پاس مکئی کے لیب تجربات کے لیے ضروری آلات نہیں تھے۔ اس لیے وہ اس کے خواص نہیں جان سکا لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ جب فصل پوری طرح پک جائے گی تو وہ اس کا مکمل تجزیہ کروائے گا۔

انہی دنوں میڈیا اور رپورٹرز نے اس کے گھر کے چکر لگانے شروع کر دیے۔ کیونکہ بارٹ نے کیس کو اس طرح سے ہینڈل کیا تھا کہ اس کی پہلی چند پیشیوں میں لیب کا وکیل پریشان ہو گیا تھا۔ ایک رپورٹر نے جیمی کا انٹرویو کیا اور اس کی جناتی مکئی کے بارے میں ایک فیچر تیار کر کے ایک معروف میگزین میں شائع کرا دیا۔ جیمی اس پذیرائی سے خوش تھا کیونکہ ان چند دنوں میں وہ سارے ملک میں مشہور ہو گیا تھا اور اسے ملک بھر سے خطوط اور ای میل مل رہی تھیں۔ اسے امید تھی کہ وہ مقدمہ جیت گیا تو اسے کہیں اور اچھی ملازمت مل جائے گی۔

ایک مہینے بعد جیوری نے کیس کا فیصلہ کرنا تھا۔ اس روز جیمی کے ساتھ جولیا بھی عدالت میں موجود تھی۔ پہلے لیب کے وکیل نے آخری دلائل دیے اور اس کے بعد بارٹ نے جیمی کے حق میں دلائل دیے۔ جیوری کے اراکین فیصلہ کرنے سے پہلے اپنے کمرے میں گئے اور آدھے گھنٹے بعد انہوں نے آ کر جیمی کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے جیمی کو بلاوجہ پریشان کرنے اور اس کی ساکھ کو نقصان پہنچانے پر اسے ہرجانے کے مقدمے کا اختیار بھی دیا تھا۔

فیصلے کے بعد وہ باہر نکلے تو رپورٹرز نے اسے اور بارٹ کو گھیر لیا۔ وہ جاننا چاہ رہے تھے کہ جیمی ہرجانے کا مقدمہ کرے گا۔ جیمی سے پہلے بارٹ نے کہا۔ ”بالکل... ہم یہ مقدمہ ضرور کریں گے کیونکہ اس مقدمے پر مسٹر شومین کے نہ صرف لاکھوں ڈالرز خرچ ہوئے ہیں بلکہ انہیں اس سے کہیں زیادہ ذہنی کوفت اٹھانی پڑی ہے۔ لیب کو اس کا ازالہ بھی کرنا ہوگا اور ایک مقدمہ ہم لیب پر نئے تحقیق کاروں کی حوصلہ شکنی کا بھی کریں گے۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مستقبل کے سائنس دانوں نے اس مقدمے کے بعد کیسا محسوس کیا ہوگا۔“

اس کے چند دن بعد جب جیمی اپنے فارم پر کام کر رہا تھا تو اس کا سابق باس ڈاکٹر گرٹ وہاں پہنچا۔ جیمی نے گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ ”اگر تم ایک سابق کولیگ کی حیثیت سے آئے ہو تو ٹھیک ہے... لیکن اگر تم لیب کے نمائندے بن کر آئے ہو تو میں اپنے وکیل کے بغیر تم سے کوئی بات نہیں کروں گا۔“

ڈاکٹر گرٹ مسکرایا۔ ”خوب! لگتا ہے کہ تم اس دوران میں بہت ہوشیار ہو گئے ہو۔“

”یہ تو ہے... اس مقدمے کے دوران مجھے کچھ ایسے تجربات ہوئے ہیں کہ میں پہلے جتنا احمق نہیں رہا ہوں۔“

”مجھے افسوس ہے کہ میں دوست بن کر کیوں نہیں آیا۔“

”میں تم سے لیب اور مقدمے کے متعلق کوئی بات نہیں کروں گا۔ ہاں تمہیں ایک چیز ضرور دکھاؤں گا۔“

جیمی اسے فارم پر لایا اور جناتی مکئی دکھائی۔ ”اسے دیکھو... اس نے لیب کے ماحول کے مقابلے میں یہاں کہیں بہتر کارکردگی دکھائی ہے۔ جبکہ میں نے اسے کیمیائی کھاد بھی نہیں دی اور پانی بھی عام مکئی جتنا دیا ہے۔ اس پر بھی اس کی تیزی تم دیکھ رہے ہو۔ عام مکئی میں ابھی بھٹے نمودار ہو رہے ہیں اور اس میں تقریباً پکنے والے ہو گئے ہیں۔“

ڈاکٹر گرٹ بھی حیران رہ گیا۔ ”ہاں... یہ تو ہے۔“

”اس رفتار سے یہ تو نے دن میں پک جائے گی۔“ جیمی بولا۔ ”تم اس کا مطلب سمجھتے ہو...؟ کاشت کار ایک موسم میں مکئی کی دو فصلیں لے سکتے ہیں۔“

”ہاں یہ بھی ممکن ہے... لیکن اس کا فائدہ؟“

”یہ تو جب پک جائے گی تو میں اس کا تجزیہ کراؤں گا... اس میں کوئی نہ کوئی افادیت سامنے آ جائے گی۔“

ڈاکٹر گرٹ سوچنے لگا۔ اس نے جیمی کو مشورہ دیا۔ ”اس کے اسٹارچ سے میتھول بنانے کا تجزیہ بھی کرانا۔“

”میں نے یہ بھی سوچا ہے۔“

جب ڈاکٹر گرٹ جانے لگا تو جیمی نے اس سے کہا۔ ”میں صرف جیمی جون سے بات کروں گا اور اگر وہ دو دن میں میرے پاس نہیں آیا تو میرا وکیل کیس عدالت میں لے جائے گا۔“

”میں لیب ڈائریکٹرز تک تمہارا یہ پیغام پہنچا دوں گا۔“

جیمی جون اگلے روز ہی آ گیا۔ جیمی نے بارٹ کو بھی بلوا لیا۔ جیمی جون چاہتا تھا کہ معاملہ عدالت سے باہر طے کر لیا جائے کیونکہ عدالت میں جانے سے لیب کی بدنامی ہوتی۔

www.pkdigest.com

جیمی نے تلخی سے کہا۔ ”اچھا، لیب کی عزت ہے اور میری عزت نہیں تھی۔“

”تمہیں ہرجانہ اسی بات کا تو دیا جا رہا ہے۔“

جیمی جون لیب ڈائریکٹرز کی طرف سے پیش کش لایا تھا کہ جیمی کو پانچ لاکھ ڈالرز ہرجانے کے ساتھ لیب میں اس کی ملازمت پر بھی بحال کر دیا جائے گا لیکن جیمی نے بارٹ کے مشورے سے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے مطالبہ کیا کہ اسے ایک ملین ڈالرز ہرجانہ دیا جائے اور جیمی کی بنائی ہوئی مکی کا سارا پروجیکٹ مع پیٹنٹ کے اس کے حوالے کیا جائے۔ جیمی جون ان کا مطالبہ سن کر پریشان ہو گیا۔

”لیب والے شاید یہ مطالبہ نہ مانیں۔“

”تب عدالت تو موجود ہے... اور ہمارا مطالبہ وہاں دس ملین ڈالرز کا ہوگا۔“ بارٹ نے اسے خبردار کیا۔

جیمی جون ان سے ایک دن میں جواب دینے کا کہہ کر چلا گیا۔ بارٹ نے یقین سے کہا۔ ”یہ مان جائیں گے لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تم نے ملازمت پر واپس جانے کی بات کیوں نہیں مانی؟“

جیمی بولا۔ ”ایک تو میں محسوس کرنے لگا ہوں کہ اس مکی کی تجارتی افادیت ہے اس لیے اس کا پیٹنٹ مجھے چاہیے۔ دوسرے میرے لیے وہاں کا ماحول بھی بہتر نہیں ہوگا۔ ممکن ہے، ملازمت کرنے کی صورت میں وہ پھر مجھے کسی چکر میں پھنسا کر بدلہ لینا چاہیں۔“

بارٹ نے اس سے اتفاق کیا۔ ”کیس جیتنے کے بعد تمہیں کہیں بھی ملازمت مل سکتی ہے۔“

اگلے روز پتا چلا کہ لیب کی طرف سے جیمی کے مطالبات تسلیم کر لیے گئے۔ اسے کہا گیا کہ وہ اپنے وکیل کے ساتھ آ جائے تاکہ صلح نامے کو باقاعدہ حیثیت دے دی جائے۔ ایک ہفتہ اسی بھاگ دوڑ میں گزرا۔ اسے نہ صرف ایک ملین ڈالرز مل گئے بلکہ اسے جناتی مکی کا پروجیکٹ بھی دے دیا گیا اور لیب اس سے تحریری طور پر دست بردار ہو گئی۔ ابھی پیٹنٹ ممکن نہیں تھا کیونکہ یہ قسم حکومت سے منظور شدہ نہیں تھی۔ جب تک جیمی ان کاموں سے فارغ ہوا، مکی پک چکی تھی۔

ڈاکٹر کرٹ کا مشورہ مفید ثابت ہوا۔ جب اس نے اس مکی سے ایتھنول نکالنے کے تجربات کروائے تو اس کا نتیجہ حیرت انگیز تھا۔ اس سے عام مکی کی نسبت دگنا گرین فیول حاصل ہو رہا تھا۔ جب جیمی نے اسے پیٹنٹ کرایا تو ایک بڑی کمپنی نے اس سے اس مکی کے بیج بنانے کے حقوق دس ملین ڈالرز کے عوض حاصل کر لیے۔ یہی نہیں بلکہ بیجوں کی فروخت پر بھی اسے ایک حصہ ملتا اور کمپنی نے اسے بیج تیار کرنے اور اس پر مزید تحقیق کرنے کے لیے اپنے تحقیقی مرکز میں انچارج بھی بنا دیا۔ اس نے یہ ملازمت اس شرط کے ساتھ قبول کر لی کہ وہ یہ کام اپنے گھر میں کرے گا۔

☆☆☆

رمیلا دفتر سے نکل کر پارکنگ میں آئی تو اچانک ہی جیمی اس کے سامنے آ گیا۔ آج اس نے سلیقے سے سوٹ پہن رکھا تھا۔ ریم لیس عینک اور نفاست سے بنے بالوں کے ساتھ وہ خاصا ہینڈسم لگ رہا تھا۔ اس نے ایک گلاب کی کلی رمیلا کے سامنے کی تو وہ چونکی۔

”میں خواب تو نہیں دیکھ رہی؟“

”نہیں... یہ سچ ہے۔ میں پہلے آ جاتا لیکن کچھ ضروری کام نمٹانے تھے۔“

رمیلا نے اسے دیکھا اور بولی۔ ”تم جانتے ہو کہ میں نے تمہیں دھوکا دیا تھا... اس کے باوجود تم مجھ سے ملنے آئے ہو؟“

”ہاں۔“ اس نے سر ہلایا۔

”جو ایک بار دھوکا دے سکتا ہے، وہ دوبارہ بھی دھوکا دے سکتا ہے... تم یہ بھی جانتے ہو؟“

”ہاں، جانتا ہوں لیکن بعض دھوکے اتنے حسین ہوتے ہیں کہ انسان بار بار کھانا چاہتا ہے۔“

رمیلا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”تم بہت اچھے ہو... میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔“

”اگر ایسا ہوتا تو میں یہاں نہ آتا۔“

”جیمی! یہ عقل مندی نہیں ہے۔“

”میں نے عقل مند ہونے کا دعویٰ کب کیا ہے؟ دنیا والے ویسے ہی مجھے احمق کہتے ہیں۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔ ”تم یہ جانتی ہو کہ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے اور میں یہ جانتا ہوں کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ اتنے عرصے تک میں انتظار کرتا رہا کہ تم میرے دل سے اتر جاؤ لیکن اب میں نے محسوس کیا ہے کہ ایسا ممکن نہیں ہے اس لیے میں یہاں آیا ہوں۔ پلیز! یہ پھول قبول کر لو تاکہ میں طے کر سکوں کہ آج رات ڈنر ہم نے کہاں کرنا ہے۔“

رمیلا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ گلاب کی کلی تھام لی۔

ماں بیٹی

آصف ملک

تبدیلی یا تغیر کے بغیر زندگی نامکمل رہتی ہے ... لیکن بسا اوقات یہ تغیر زندگی کو خس و خاشاک کی طرح اڑا لے جاتا ہے ... ماں اور بیٹی کے درمیان پائی جانے والی ازلی محبت کا احوال جس کا کہیں کوئی بدل نہیں۔

بدلے اور ناانصافی کی آگ جس نے ہر جنس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا

موریل اپنی نشست پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ ٹرین کے اس ڈبے میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ ٹرین کو نیویارک سے روانہ ہوئے ایک گھنٹہ ہوا تھا اور اس کی منزل میڈیسن تھا۔ یہ کوئی بارہ گھنٹے کا سفر تھا جو رات میں ہی کٹ جاتا۔ ٹرین سات بجے روانہ ہوئی تھی اور صبح سات بجے ہی وہ میڈیسن پہنچتی۔ اس ٹرین میں زیادہ رش نہیں ہوتا تھا کیونکہ یہ ایک چھوٹے ٹریک کی ٹرین تھی اور زیادہ تر چھوٹے اسٹاپس پر ہی ٹھہرتی ہوئی میڈیسن جاتی۔ جس ڈبے میں موریل تھی، اس میں تو بہت تھوڑے سے لوگ تھے اور ان میں سے بیشتر شروع کے کچھ اسٹیشنز پر اتر گئے۔

کچھ عرصے سے اس ٹرین میں سفر کرنے والی عورتیں کسی جنونی قاتل کا نشانہ بن رہی تھیں۔ سات مہینے میں چھ عورتیں قتل کی جا چکی تھیں اور پولیس اب تک قاتل کے بارے میں کچھ بھی نہیں جان سکی تھی۔ ٹی وی میڈیا میں تو اس کیس کا زیادہ چرچا نہیں ہوا تھا کیونکہ الیکٹرونک میڈیا تو آنے والے صدارتی انتخابات کی گہما گہمی میں مصروف تھا۔ البتہ اخبارات میں اس کا بہت چرچا تھا اور پولیس پر سخت تنقید کی جا رہی تھی کہ اس نے اب تک قاتل کا سراغ لگانے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ قتل ہونے والی چھ عورتیں شریف اور ملازمت پیشہ تھیں۔ ان میں چار شادی شدہ اور صاحبِ اولاد

بھی تھیں۔ البتہ ان میں ایک قدر مشترک تھی کہ وہ سب اکیلے ہی سفر کررہی تھیں۔

پہلی عورت کی لاش نیویارک سے دو سو میل دور ایک ریلوے اسٹیشن کے باہر جنگل سے ملی تھی۔ بعد میں پولیس کو پتا چلا کہ عورت اسی ٹرین سے آئی تھی اور اس کی منزل اسٹیشن سے کچھ دور ایک قصبہ تھا لیکن راستے میں ہی قاتل نے اسے دبوچ لیا اور پے در پے کسی تیز دھار آلے کے وار کرکے قتل کر دیا۔ پولیس کے مطابق قاتل بہت طاقت ور تھا اور اس نے عورت کو سنبھلنے کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ سارے زخم اس کے پیٹ اور سینے پر تھے۔ اگر وہ مزاحمت کر پاتی تو اس کے ہاتھ پر بھی زخم آنے چاہیے تھے۔ اس کے ایک مہینے بعد دوسری عورت کی لاش میڈیسن سے دو اسٹیشن پہلے ایک چھوٹے سے اسٹیشن کے باہر ملی۔ مقتولہ اسی طرح ٹرین سے اتر کر جارہی تھی کہ قاتل نے حملہ کر دیا اور عورت کو بنا مزاحمت کے موت کی نیند سلا دیا۔ لیکن اس وقت پولیس دونوں قتل میں مماثلت تلاش نہیں کر سکی تھی۔

مگر جب تیسری عورت بھی اسی ٹرین سے اترنے کے بعد ایک ویران جگہ پر قتل کی گئی تو پولیس کے ساتھ پریس بھی چونک گیا اور پھر ان وارداتوں کی کڑیاں آپس میں ملائی جانے لگیں۔ میڈیکل رپورٹس کے مطابق قاتل ایک ہی جیسا آلۂ قتل استعمال کر رہا تھا۔ یہ نکیلا اور بے حد تیز دھار چاقو یا خنجر تھا... کوئی سات انچ لمبا کیونکہ سب سے بڑا زخم اتنا ہی گہرا تھا اور اس میں ایک طرف دھار تھی۔ قاتل عام طور سے سامنے سے دل یا کسی اور اعضائے رئیسہ پر وار کرتا تھا۔ وہ عورت کو مزاحمت کا موقع نہیں دیتا تھا... شاید وہ اسے پکڑ لیتا تھا۔ ماری جانے والی عورتوں کے جسم پر تشدد کا کوئی اور نشان نہیں ملا تھا۔ اس سے لگتا تھا کہ قاتل بہت تیزی سے اپنا کام کرتا ہے اور چند وار کرکے شکار کو ختم کر دیتا ہے۔

پھر مزید تین عورتیں اسی ٹرین سے اترنے کے بعد کسی ویران مقام پر ماری گئیں تو پریس نے اسے ٹرین نائٹ سیریل کلر کا نام دے دیا تھا۔ پولیس نے سرگرمی سے تحقیق کی۔ اس نے ٹرین میں پولیس کی اضافی نفری لگا کر قاتل کو تلاش کرنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکے۔ جب تک پولیس سرگرم رہا کرتی، قاتل خاموش رہتا اور جب پولیس آرام سے بیٹھ جاتی تو وہ حرکت میں آجاتا اور کسی عورت کو قتل کر دیا کرتا۔ یہ کام وہ اتنی ہوشیاری سے کرتا تھا کہ پولیس اب تک اس کے بارے میں معمولی سی بات معلوم کرنے میں بھی ناکام رہی تھی۔ پولیس نے ان افراد کی مکمل فہرست حاصل کی جو ان وارداتوں والی رات اس ٹرین میں سوار ہوئے تھے۔

ان میں چند ایک لوگ تھے جو دو بار سفر کرتے پائے گئے تھے لیکن ان کا ان وارداتوں سے تعلق ثابت نہیں ہو سکا۔ اول تو وہ سب ہی اپنے اسٹیشنوں پر اترے تھے اور دوسرے ان میں سے کوئی بھی مقتولہ کے ڈبے میں موجود نہیں تھا۔ یہ قتل خاصے پُراسرار تھے۔ ماہرین نے قاتل کا جو خاکہ تیار کیا تھا، اس کے مطابق وہ نہایت سفاک اور جبلی طور پر قاتل تھا لیکن ساتھ ہی اس کی ظاہری شخصیت بالکل مختلف تھی اور لوگ اس پر آسانی سے بھروسا کر لیتے تھے... اور جب تک وہ قتل کر ان کے سامنے نہیں آجاتا وہ اس پر شک نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ لاشوں کے چہروں اور آنکھوں میں تعجب کے تاثرات پائے گئے تھے۔

موریل یہ سب جانتی تھی، اس نے اس سیریل کلنگ کے بارے میں اخباروں میں شائع ہونے والی تمام رپورٹس پڑھی تھیں۔ اس کے باوجود اس نے اسی ٹرین سے سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ موریل جب میڈیسن جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی تو اس کے باس نے اسے قاتل کے بارے میں خبردار کیا۔ ”وہ عورتوں کو ہی قتل کرتا ہے اور اسی ٹرین میں سفر کرنے والی اکیلی عورتوں کو قتل کرتا ہے... بہتر ہے تم اس ٹرین سے مت جاؤ۔“

مگر جانا موریل کی مجبوری تھی کیونکہ اس کا خاندان میڈیسن میں تھا اور اس کی ماں کی طبیعت بہت خراب تھی۔ اس کے قریبی رشتے داروں میں بس ماں ہی باقی رہ گئی تھی۔ وہ میڈیسن کے ایک نرسنگ ہوم میں اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہی تھی۔ اسے چند سال پہلے فالج ہو گیا تھا، تب سے وہ نرسنگ ہوم میں داخل تھی۔ ڈاکٹروں نے اس کی حالت میں بہتری کا امکان مسترد کر دیا تھا۔ وہ صرف دیکھ اور سن سکتی تھی... بولنا اور حرکت کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اپنے سارے کاموں کے لیے وہ دوسروں کی محتاج تھی۔ آخری بار موریل نو مہینے پہلے اسے دیکھ کر آئی تھی اور اس کے بعد اسے مصروفیت کی وجہ سے جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ البتہ وہ فون کرتی تھی تو نرسنگ ہوم کا عملہ اس کی ماں کے کان سے فون لگا کر اسے موریل کی آواز سنوا دیتا تھا۔ وہ ہفتے میں ایک بار کال کرتی تھی۔ دو دن پہلے اسے نرسنگ ہوم سے کال آئی تھی کہ اس کی ماں کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے اور ڈاکٹرز نے اسے جواب دے دیا ہے۔ وہ آکر اس سے مل لے۔ موریل نے کوشش کی لیکن میڈیسن جانے والی تمام فلائٹس پوری

www.pkdigest.com

طرح بک تھیں پھر اس نے ٹرین کی کوشش کی تو اس میں جگہ مل گئی۔ اگر وہ ٹرین چھوڑتی تو اسے اور دیر ہو جاتی۔ اس سے بس میں طویل سفر نہیں ہوتا تھا اور وہ خود سے اتنی لمبی ڈرائیو نہیں کر سکتی جبکہ بائی روڈ جانے میں دیر بھی لگتی۔ اس کے مقابلے میں ٹرین سے سفر جلدی طے ہو جاتا۔

اونیل ہی اسے اسٹیشن تک چھوڑنے آیا۔ اونیل ایک انشورنس ایجنٹ تھا اور موریل سے محبت کرتا تھا۔ موریل بھی اسے پسند کرتی تھی لیکن اس نے ابھی تک اونیل سے شادی کرنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اونیل پُرامید تھا کہ موریل نے جب بھی شادی کا فیصلہ کیا، اسی کے حق میں کرے گی۔

موریل تقریباً اٹھائیس برس کی پُرکشش اور متناسب جسم کی لڑکی تھی۔ وہ گزشتہ بارہ سال سے نیویارک میں تھی۔ ہائی اسکول کے بعد اس نے میڈیسن کو خیرباد کہہ دیا اور مستقل نیویارک آگئی۔ اس نے کالج کی تعلیم یہیں سے مکمل کی اور یہیں جاب کر لی۔ اس نے ایک گھر لے لیا۔ اس کے پاس ایک اچھی کار بھی تھی اور ملازمت کے دوران اس نے کافی بچت بھی کر لی تھی۔ بس شادی کرنا باقی تھی۔ وہ یہ فیصلہ کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

”مجھے امید ہے کہ تمہارے وہاں جاتے جاتے مام کی حالت بہتر ہو جائے گی۔“ اونیل نے اسے تسلی دی۔

”مشکل ہے۔“ موریل [illegible] ہوئے بولی۔ ”شاید میں مام کو ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچا کر آؤں۔“

اونیل ٹرین کی آخری وسل تک اس کا ہاتھ تھامے رہا۔ اس کی موجودگی سے موریل نے بہت ڈھارس محسوس کی ورنہ وہ شاید یہیں بکھر جاتی۔ اونیل نے اس سے معذرت کی۔ ”میں کچھ ایسا پھنسا ہوا ہوں کہ یہاں سے نکل نہیں سکتا ورنہ تمہارے ساتھ چلتا... لیکن میری کوشش ہوگی کہ دو دن بعد کام نمٹا کر میں بھی میڈیسن آجاؤں۔“

”سچ!“ موریل کو اس کی بات سے حوصلہ ہوا۔ ”میں تمہارا انتظار کروں گی۔“

وسل سن کر اونیل نے اسے سہارا دے کر ڈبے میں سوار کرایا۔ ”اپنا خیال رکھنا اور وہاں پہنچ کر مجھے کال ضرور کرنا۔ اس وقت میں سو رہا ہوں گا ورنہ میں تمہیں کال کر لیتا۔“

”تم فکر مت کرو، میں کال کر دوں گی۔“ موریل بولی۔ وہ اپنی نشست پر بیٹھی تو اونیل کھڑکی پر آگیا اور پھر ٹرین کے ساتھ ساتھ چلتا رہا حتیٰ کہ ٹرین نے رفتار پکڑ لی۔ موسم سرد تھا اس لیے کھڑکی کے شیشے بند تھے۔ یہ انفرادی سیٹوں والا ڈبا تھا۔ موریل نے برتھ والے کوپے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اسے ملا نہیں۔ ڈبے میں کوئی نصف درجن لوگ تھے۔ موریل نے ان کا جائزہ لیا۔ ایک طرف ایک لمبا تڑنگا آدمی اپر پہنے بیٹھا تھا اور اس سے کچھ دور ایک بڑی بی اپنی سیٹ پر بیٹھی نٹنگ کر رہی تھیں۔ ان کے علاوہ تین افراد اور تھے لیکن وہ موریل کو قابلِ توجہ نہیں لگے۔

دس بجے تک باقی تین افراد آنے والے مختلف اسٹیشنز پر اتر گئے اور اب ڈبے میں موریل کے علاوہ اپر والا اور بڑی بی رہ گئیں۔ موریل کو ڈائننگ کار کا کھانا پسند نہیں تھا اس لیے وہ اپنے ساتھ پیزا اور کچھ چیزیں لائی تھی۔ اس نے نو بجے کھانا کھا لیا اور پھر ایک کتاب کھول کر بیٹھ گئی۔ ایک بار وہ واش روم گئی تو اس نے واپسی میں بڑی بی کو نٹنگ بند کرکے اونگھتے پایا۔ اپر والا جیسے بیٹھا تھا ویسے ہی بیٹھا رہا۔ اس دوران میں وہ نہ تو یہاں سے اٹھا تھا اور نہ ہی اس نے کوئی اور حرکت کی تھی۔ موریل کو اس سے ذرا خوف محسوس ہوا لیکن اسے ساتھ ہی یہ اطمینان بھی تھا کہ وہ یہاں محفوظ ہے کیونکہ ڈبے میں دوسرے ڈبوں سے لوگوں کا آنا جانا بھی لگا ہوا تھا۔ کبھی کبھی گارڈ اور ٹرین کا عملہ بھی آتا تھا... پھر اس سیریل کلر نے ٹرین میں کوئی واردات نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ اسٹیشن پر

خوشخبری

طلسماتی انگوٹھی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورۂ یاسین کے نقش پر فیروزہ، یشمی عقیق، پکھراج، لاجورد، نیلم، زمرد، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ ان شاء اللہ جو بھی یہ طلسماتی انگوٹھی پہنے گا اس کے تمام بگڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو تکیے کے نیچے رکھنے سے لاٹری کا نمبر، جادو کس نے کیا، کاروبار میں فائدہ ہوگا یا نقصان معلوم ہو جائے گا۔ آفیسر اپنی طرف مائل، نافرمان اولاد نیک، میاں کی عدم توجہ، جج یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، فلیٹ یا دکان کسی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، یرقان، جسم میں مرد و عورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کو راضی کرنے یہ سب کچھ اس انگوٹھی کی بدولت ہوگا۔ یاد رکھو سورۂ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

رابطہ: صوفی علی مراد

0333-3092826 , 021-2446647

M-20A الرحمان ٹریڈ سینٹر بالمقابل سندھ مدرسہ کراچی

اترنے والی عورتوں کا تعاقب کر کے انہیں کسی ویرانے میں ہلاک کر رہا تھا۔ قاتل کو سہولت یہ تھی کہ ٹرین رات دس بجے کے بعد جہاں بھی رکتی تھی، اسٹیشن کے باہر ویرانہ ہی ہوتا تھا۔ اس لیے وہ آرام سے اپنے شکار کو بنا کسی مداخلت کے قتل کر دیا کرتا۔ یہ تو کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ قتل کیوں کرتا تھا؟

اپنی نشست پر واپس آ کر موریل نے اپنی توجہ پھر سے کتاب پر مرکوز کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا ذہن منتشر ہو گیا۔ رہ رہ کر اسے اپر والے کا خیال آ رہا تھا۔ جب وہ اس کے پاس سے گزری تھی تو نہ جانے کیوں موریل کو اس کی نگاہیں اپنے بدن میں چبھتی محسوس ہوئیں۔ حالانکہ اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنی توجہ کتاب پر مرکوز کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اسے اپنے پاس ہی کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو وہ بری طرح دہل گئی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے سر اوپر کیا تو بڑی بی کو اپنے پاس موجود پا کر اطمینان کا سانس لیا تھا... ورنہ اسے ایسا لگا تھا جیسے اپر والا آ گیا ہو۔

"معاف کرنا... میں نے تمہیں چونکا دیا۔" بڑی بی مسکرائیں۔ "میں وہاں اکیلے بور ہو رہی تھی... اگر تم اجازت دو تو یہاں آ جاؤں۔"

موریل کو اگرچہ زیادہ باتیں کرنے سے وحشت ہوتی تھی... ممکن ہے، کوئی اور موقع ہوتا تو وہ بڑی بی کو انکار کر دیتی لیکن اس وقت اسے اس کا آنا غنیمت لگا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "کیوں نہیں... تم یہاں بیٹھ سکتی ہو۔"

بڑی بی کے پاس صرف ایک بڑا سا ہینڈ بیگ تھا۔ وہ اسے سنبھالتی ہوئی موریل کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گئیں۔ احتیاطاً موریل نے کتاب نہیں رکھی تھی کیونکہ وہ اس کے بہانے بڑی بی کی گفتگو سے بچ سکتی تھی لیکن بڑی بی نے کتاب کو سرے سے نظر انداز کر دیا۔ انہوں نے بیٹھتے ہی اپنا تعارف کرایا۔ "مجھے ایشلی پارکسن کہتے ہیں۔"

"موریل کولن ووڈ۔" مجبوراً موریل نے بھی اپنا تعارف کرایا۔

"میں میڈیسن تک جا رہی ہوں، تم کہاں جا رہی ہو؟"

"میں بھی میڈیسن ہی جا رہی ہوں۔" موریل نے بادل ناخواستہ جواب دیا۔

"لگتا ہے کہ تم میڈیسن کی ہی رہنے والی ہو؟"

"ہاں۔" اس نے مختصراً کہا اور کتاب ذرا اوپر اٹھا لی لیکن بڑی بی چپ ہونے کو تیار نہیں تھیں۔ اب انہوں نے اپنے بارے میں بتانا شروع کر دیا اور موریل نہ چاہتے ہوئے بھی سن رہی تھی۔ بڑی بی بھی میڈیسن کی رہنے والی تھیں اور آج کل وہ نیویارک میں مقیم تھیں۔ وہ اپنے عزیزوں سے ملنے میڈیسن جا رہی تھیں۔

"نیویارک میں کہاں؟" موریل نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔

"اپنی بیٹی کے پاس۔" وہ بولیں۔ "میں اپنی ایک کزن سے ملنے جا رہی ہوں۔ تم کس کے پاس جا رہی ہو؟"

"اپنی مام کو دیکھنے۔" موریل افسردہ ہو گئی۔ "مام کو ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔"

"اوہ... بہت افسوس ہوا۔ کیا ہوا ہے تمہاری مام کو؟"

"وہ کئی سال سے فالج کا شکار تھیں۔ اب وہ مرنے کے قریب ہیں۔"

"بہت افسوس ہوا۔" بڑی بی بولیں۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد انہوں نے اگلا سوال کیا۔

"تم نیویارک میں کیا کرتی ہو؟"

اس بار موریل نے مروت ایک طرف رکھ دی اور بولی۔ "معاف کرنا... تم کچھ زیادہ ہی پرسنل ہوتی جا رہی ہو؟"

"اوہ!" بڑی بی نے کہا۔ "معاف کرنا... اصل میں بڑھاپے میں سب سے بڑی خرابی یہی ہوتی ہے کہ انسان بے کار میں زیادہ بولنا شروع کر دیتا ہے۔ تم نے اچھا کیا جو مجھے یاد دلا دیا۔"

یہ کہہ کر بڑی بی نے اپنے بیگ سے بننگ کا سامان نکالا اور پھر سے بنائی میں لگ گئیں۔ موریل نے سکون کا سانس لیا۔ وہ پھر سے کتاب پڑھنے کی کوشش کرنے لگی لیکن اس بار بھی اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ اصل میں اسے مطالعے کی عادت نہیں تھی۔ اس نے سفر کا سوچ کر یہ کتاب ساتھ رکھ لی تھی اور اب وہ پچھتا رہی تھی کہ اس ناول کی جگہ کوئی میگزین رکھ لیتی تو اسے پڑھنے کے لیے زیادہ دلچسپ چیز مل جاتی۔ کچھ دیر بعد اس نے جماہی لی اور کتاب کو اپنے بیگ میں رکھ دیا۔

"میرا خیال ہے کہ مجھے اب سونا چاہیے۔" اس نے جیسے خود سے کہا۔

بڑی بی نے اس کی طرف دیکھا۔ "ضرور سو جاؤ، تمہاری عمر بھی ہے... مجھے تو سفر میں بالکل نیند نہیں آتی۔"

موریل نے اپنی نشست کو دراز کیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے کچھ دیر کے لیے نیند کا جھونکا بھی آیا لیکن پھر آنکھ کھل گئی۔ بڑی بی اب بننگ بند کر کے اونگھ رہی تھیں۔ اس نے پہلو بدلا تو وہ چونک گئیں۔ اسے جاگتا دیکھ کر آہستہ سے کہا۔ "لگتا ہے، تمہیں بھی نیند نہیں آ رہی ہے۔"

اس نے سر ہلایا۔ "شاید مام کی وجہ سے مجھے پریشانی ہے۔"

"ایسا ہوتا ہے۔" بڑی بی نے شفقت سے کہا۔ "ماں اور بیٹی کا رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ ایک مشکل میں ہو تو دوسرے کو بھی آرام نہیں ملتا۔ میری بیٹی بھی مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔"

موریل چونکی۔ "کرتی تھی؟"

بڑی بی نے سر ہلایا۔ "ہاں، اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔"

"اوہ... مجھے سن کر افسوس ہوا۔" موریل کو سچ مچ افسوس ہوا۔ "کیا وہ بیمار تھی؟"

"نہیں، اسے کسی نے قتل کر دیا تھا۔" بڑی بی کا لہجہ یہ بتاتے ہوئے سپاٹ تھا۔ "وہ بہت اچھی اور نیک لڑکی تھی۔ سب سے محبت کرنے والی اور سب کا خیال رکھنے والی... اس کے باوجود کسی نے اسے بے رحمی سے قتل کر دیا۔"

"قاتل پکڑا گیا؟"

"نہیں۔" بڑی بی کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "پولیس کا خیال تھا کہ یہ کسی جنونی شخص کا کام ہے اور ایسے جنونی بہت کم گرفت میں آتے ہیں کیونکہ ان کا مقتول سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور وہ اچانک ہی موقع ملنے پر اپنا کام کر جاتے ہیں۔"

موریل کو خیال آیا کہ کہیں بڑی بی کی بیٹی بھی انہی عورتوں میں تو شامل نہیں جنہیں اس ٹرین سے اترنے کے بعد قتل کیا گیا تھا۔ "کیا وہ بھی اسی سیریل کلر کا شکار ہوئی تھی جو اپر کا ...؟"

"نہیں... نہیں، یہ تو بہت پرانی بات ہے۔ دو سال ہو گئے ہیں۔" بڑی بی بولیں۔ "اس کا اس معاملے سے تعلق نہیں ہے۔"

"اچھا، میں سمجھی تھی... بہرحال، مجھے افسوس ہوا سن کر۔"

"مارٹینا بہت اچھی تھی۔ اس نے مجھے میڈیسن سے نیویارک بلا لیا کیونکہ میرا اس کے سوا کوئی نہیں تھا اور میں میڈیسن میں اکیلی رہتی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا، ماما! آپ میرے پاس آ کر رہیں۔"

موریل کو شرمندگی محسوس ہوئی کیونکہ اس نے اپنی ماں کو کبھی بلانے کا سوچا ہی نہیں تھا۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ ماں وہاں خوش تھی۔ اس کے سارے رشتے دار تھے اور سارا محلہ جاننے والوں پر مشتمل تھا۔ اسے تنہائی محسوس نہیں ہوتی ہو گی... لیکن شاید ہوتی تھی اور یہی تنہائی اسے اندر ہی اندر کھاتی رہی تھی... تب ہی تو ایک دن وہ اچانک ہی فالج کا شکار ہو گئی۔ اس نے کہا۔ "یقیناً مارٹینا اچھی بیٹی تھی۔"

"ہاں، وہ بہت اچھا کھانا بناتی تھی۔" بڑی بی کا لہجہ بیٹی کے بارے میں بات کرتے ہوئے محبت بھرا ہو گیا۔ "میں

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاء اللہ اولاد ہو گی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061

0547-521787

فون اوقات

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں

دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

شروع سے پھوہڑ تھی۔ جب کھانا بناتی تو ایسا ہوتا کہ کسی اور نے کیا، مجھ سے بھی نہیں کھایا جاتا تھا۔ میرا شوہر اسی وجہ سے مجھ سے الگ ہو گیا تھا کہ اس سے باہر کا کھانا نہیں کھایا جاتا تھا۔ اس کے بعد میں نے مارتھا کی پرورش خود کی لیکن میں نے بھی اسے کوئی اچھی چیز بنا کر نہیں کھلائی مگر جب اس نے کوکنگ شروع کی تو وہ بہت اچھا کھانا بناتی تھی۔ بارہ تیرہ برس کی عمر میں وہ اتنے شان دار کھانے بنانے لگی کہ ان کھانوں کو دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ انہیں کسی بارہ تیرہ برس کی لڑکی نے بنایا ہے۔"

"بعض لوگوں میں کوئی کام کرنے کی فطری صلاحیت ہوتی ہے۔" موریل نے تبصرہ کیا۔

"شاید اسی وجہ سے اس نے پیشے کے طور پر کوکنگ کا انتخاب کیا۔ اس نے ایک ادارے سے پروفیشنل کک کا سرٹیفکیٹ بھی حاصل کیا تھا۔ کاش... پارکسن چند سال اور صبر کر لیتا تو ہمارے درمیان علیحدگی نہیں ہوتی۔ میرے ہاتھ کے نہ سہی، وہ مارتھا کے ہاتھ سے بنے کھانے کھا لیتا۔"

گویا بڑی بی ابھی تک اپنے شوہر کا نام ہی استعمال کر رہی تھیں حالانکہ وہ اس سے طلاق لے چکی تھیں۔ موریل نے مارتھا کے بارے میں پوچھا۔

"پھر وہ نیویارک آ گئی؟"

"ہاں... میڈیسن ایک چھوٹا سا شہر ہے اور وہاں زیادہ مواقع نہیں تھے اس لیے اس نے نیویارک جانے کا فیصلہ کیا۔ میں اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتی تھی اس لیے میں نے اسے جانے دیا۔ دو سال بعد اس نے مجھے بھی بلا لیا۔ اسے ایک بہت اچھے ریستوران میں اسسٹنٹ شیف کی جاب مل گئی تھی۔"

"تم اب بھی نیویارک میں رہ رہی ہو؟"

"ہاں، مارتھا نے میرے لیے سارا بندوبست کر دیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اسے اچانک کچھ ہو گیا تو میرا کیا ہو گا کیونکہ میں نے ساری عمر جو کمایا تھا، وہ خرچ کر دیا تھا اور اب میرے پاس کچھ نہیں تھا، سوائے مارتھا کے۔ اس نے میرے لیے گھر لیا، میرے لیے ہیلتھ انشورنس لی اور اپنی زندگی کا بیمہ کرایا۔ جب اس کا مرڈر ہوا تو مجھے اس بارے میں پتا چلا۔ مجھے انشورنس کی بڑی رقم ملی تھی جو میرے گزارے کے لیے کافی تھی۔" بڑی بی کی آواز بھرا گئی۔

موریل کو اس لڑکی کی اپنی ماں سے محبت پر رشک آیا۔ جس عمر میں لڑکیاں صرف اپنے بارے میں سوچتی ہیں، اس عمر میں اس نے ماں کا اس حد تک خیال رکھا کہ مرنے کے بعد بھی اس کے کام آ رہی تھی۔ موریل نے کہا۔

"وہ واقعی بہت اچھی لڑکی تھی۔"

"ہاں... میں نے اس جیسی کوئی اور بیٹی نہیں دیکھی۔ میری بھی خواہش ہے کہ اس کا قاتل پکڑا جائے اور میں مرنے سے پہلے اسے سزا پاتا دیکھوں۔"

"اس قاتل کے بارے میں کیا خیال ہے جو اس ٹرین میں سوار ہونے والی عورتوں اور لڑکیوں کو قتل کر رہا ہے؟"

"وہ بھی اسی قسم کا کوئی جنونی لگتا ہے جس نے مارتھا کو قتل کیا تھا۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا... کہ وہ وہی قاتل ہو جس نے مارتھا کو بھی قتل کیا ہو؟" موریل نے ایک اور زاویے سے سوال کیا۔

بڑی بی نے بے یقینی سے کہا۔ "شاید... لیکن مارتھا کا مرڈر تو دو سال پہلے ہوا تھا۔"

"ممکن ہے اس دوران میں قاتل کسی وجہ سے خاموش رہا ہو اور ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور جرم میں جیل میں ہو یا کہیں چلا گیا ہو اور اس نے سات مہینے پہلے اس ٹرین میں سفر کرنے والی عورتوں کو قتل کرنا شروع کر دیا ہو۔ شہر کی نسبت اسے ٹرین میں شکار آسانی سے مل جاتا ہو گا اور وہ منتظر ہوتا ہو گا کہ کوئی عورت کسی سنسان اسٹیشن پر اترے۔ وہ موقع دیکھ کر اس کے پیچھے اتر جاتا ہو گا اور کسی ویران جگہ گھیر کر اسے قتل کر دیتا ہو گا۔"

بڑی بی کو شاید ایسی باتوں کی زیادہ سمجھ بوجھ نہیں تھی اس لیے انہوں نے پھر بے یقینی سے سر ہلایا۔ "ہاں، ہو سکتا ہے۔"

"ممکن ہے، وہ قاتل اس ٹرین میں سوار ہو۔" موریل بولی اور پھر خود جھرجھری لے کر رہ گئی۔ "خدا نہ کرے... ورنہ آج رات پھر کوئی عورت اس کی درندگی کا نشانہ بن جائے گی۔"

ٹرین سے باہر مکمل طور پر تاریکی تھی۔ یہ ایک تاریک رات تھی۔ آسمان پر چاند بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ٹرین کے ساتھ گزرتے مختلف چیزوں کے ہیولے بڑے بھیانک لگ رہے تھے۔ جو مناظر دن میں خوب صورت نظر آتے تھے، وہ اس وقت دلوں میں دہشت پیدا کر رہے تھے۔ بڑی بی خاموش ہو کر اونگھنے لگیں یا شاید اپنی بیٹی کو یاد کرنے لگیں پھر انہوں نے کچھ دیر بعد کہا۔

"نہیں... اس ٹرین میں عورتوں کو قتل کرنے والا میری بیٹی کا قاتل نہیں ہو سکتا کیونکہ ان سات عورتوں میں سے کسی کی بے حرمتی نہیں ہوئی ہے جبکہ میری بیٹی پہلے قاتل کی ہوس کا نشانہ بنی اور اس کے بعد اس نے اسے مار ڈالا۔" یہ کہتے

ہوئے بڑی بی کی آواز بھرا گئی۔ "میرے خدا! میں ساری عمر اس کی لاش نہیں بھولوں گی۔ اس پر اس درندے کے نشانات ثبت تھے۔"

موریل نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "پلیز! تم دکھی مت ہو۔ وہ اب تمہارے پاس نہیں ہے لیکن اس کی یادیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

بڑی بی نے عینک اتار کر آنسو صاف کیے۔ "ہاں، میرے پاس بس اس کی یادیں باقی رہ گئی ہیں۔"

زیادہ دیر جاگنے کی وجہ سے موریل پھر واش روم جانے کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ اس نے بڑی بی سے کہا۔ "میں ابھی واش روم سے آتی ہوں۔"

"ضرور... میں تمہارے بیگ کا خیال رکھوں گی۔" بڑی بی نے سر ہلاتے ہوئے اسے پیش کش کی۔ موریل کے بیگ میں سوائے کپڑوں اور چند استعمال کی چیزوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ اس کی نقدی اور دوسرے کاغذات سب اس کے پاس ہی تھے اس لیے اسے بیگ کی اتنی زیادہ فکر بھی نہیں تھی۔ وہ واش روم کی طرف جانے لگی۔ اپر والا جاگ رہا تھا کیونکہ وہ بالکل سیدھا ہو کر اور دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے بیٹھا تھا۔ اس پوز میں آدمی سو نہیں سکتا۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے موریل نے پھر اس کی نظروں کی چبھن اپنے بدن میں محسوس کی۔ وہ کچھ آگے گئی تو اپر والا بھی اٹھ کر اس کے پیچھے آنے لگا۔ ایک لمحے کو موریل کا دل رک گیا لیکن پھر اس نے خود کو تسلی دی کہ وہ اس بھری ٹرین میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ لیڈیز واش میں داخل ہوئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ اس کے کان باہر کسی آہٹ پر مرکوز تھے۔ ٹرین کی کھٹ کھٹ میں اسے لگا جیسے اپر والا واش روم کے دروازے کے سامنے رکا ہو پھر راہداری کے دوسری طرف مردانہ واش روم کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ جب موریل باہر آئی تو وہ اندر ہی تھا کیونکہ اس کی نشست خالی تھی۔ بڑی بی جو اس کے بیگ کی حفاظت کرنے کی بات کر رہی تھیں اس وقت بے خبر سو رہی تھیں۔ وہ اپنی نشست پر جانے کے لیے ان کے پاس سے گزرنے لگی تو ان کی آنکھ کھل گئی۔

"اوہ... شاید مجھے نیند کا جھونکا آ گیا تھا۔" انہوں نے شرمندہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اس عمر میں یہی ہوتا ہے۔ جب انسان سونا چاہے تو نیند نہیں آتی اور جب جاگنا چاہتا ہے تو آنکھیں خود بہ خود بند ہو جاتی ہیں۔"

"کوئی بات نہیں... اگر تمہیں نیند آ رہی ہے تو تم سو جاؤ۔"

"نیند تو نہیں آ رہی لیکن تھکن سی ہو رہی ہے۔" بڑی بی نے تھکن کا سامان اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لیا۔ "میرا خیال ہے کہ میں کچھ آرام کر لوں۔ صبح ٹرین سے اتر کر بھی کچھ سفر کرنا ہے۔"

موریل بھی ایسی ہی تھکن محسوس کر رہی تھی۔ اس نے بھی بہتر سمجھا کہ سونے کی کوشش کرے۔ وہ نشست کو پھر سے پھیلا کر نیم دراز ہو گئی۔ کچھ دیر بعد موریل کی آنکھیں خود بہ خود بند ہوتی چلی گئیں۔ اسے معلوم نہیں کب احساس ہوا کہ ٹرین رکی ہوئی ہے۔ وہ چونک کر بیدار ہوئی تو یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کہ بڑی بی اس کے برابر میں نہیں تھیں۔ اس نے اچک کر دیکھا لیکن وہ اپنی پچھلی والی سیٹ پر بھی نہیں تھیں۔ وہی نہیں بلکہ اپر والا بھی غائب تھا۔ موریل گھبرا کر اٹھی۔ یہ کیا معما تھا؟ ٹرین رکی ہوئی تھی اور وہ دونوں غائب تھے۔ اس نے اٹھ کر باہر جانے والا دروازہ کھولا تو ایک سنسان پلیٹ فارم نظر آ رہا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ یہاں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ پوری ٹرین اور اس پلیٹ فارم پر وہی ذی روح ہو۔ وہ گھبرا کر نیچے اتر آئی اور اس نے پکار کر کہا۔

"اے! یہاں کوئی ہے۔"

مگر کسی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ اس شیڈ کی طرف بڑھی جس کے نیچے ایک کمرا نظر آ رہا تھا۔ شاید یہی اس اسٹیشن کا دفتر تھا لیکن جب وہ اس کے پاس پہنچی تو اسے دروازہ بند ملا۔ رات کے وقت دفتر بند ہی ہوتے ہیں۔ وہ بہت خوف زدہ تھی اور گھبرائی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ اچانک اسے پلیٹ فارم کے سرے سے کوئی آتا نظر آیا۔ اس کے خوف میں مزید اضافہ ہو گیا اور جب وہ قریب آیا تو موریل کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ وہی اپر والا شخص تھا۔ موریل ٹرین میں اپنے ڈبے کی طرف بھاگی لیکن اس سے پہلے کہ وہ ڈبے تک پہنچتی، ٹرین چل پڑی۔ موریل نے رفتار تیز کی مگر ٹرین کی رفتار اس سے کہیں تیز تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹرین پلیٹ فارم سے نکل گئی۔ وہ بے بسی سے اسے جاتا دیکھتی رہی پھر اس نے اپر پوش کو دیکھا اور پلیٹ فارم سے باہر جانے والے راستے کی طرف بھاگی۔ جب وہ باہر آئی تو اس نے دیکھا کہ اسٹیشن کے باہر تاحد نگاہ ویرانہ ہے۔ ایک طرف جھاڑیاں اور جنگل تھا۔ وہ پناہ کے لیے اس طرف بھاگی۔ اس دوران میں اپر پوش بھی باہر آ گیا تھا۔ وہ اس کے پیچھے بھاگا۔ اس نے چلا کر کہا۔

"مجھ سے بچ کر کہاں جاؤ گی؟"

مارے خوف کے موریل کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اچانک اسے ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑی۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتی

www.pkdigest.com

ایرپوش اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اور اس نے اپنے اپر کی جیب سے ایک چاقو نکال لیا۔ موریل چیخی۔ پھر کسی نے اسے جھنجوڑا۔ ”کیا ہوا ہے؟“

موریل چونک کر اٹھی۔ وہ ٹرین میں اپنی سیٹ پر تھی اور اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ کچھ دیر تک تو اسے یقین نہیں آیا کہ وہ خواب تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے بازو پر چٹکی کاٹی۔ بڑی بی اسے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے کہا۔ ”لگتا ہے، تم خواب میں ڈر گئی ہو؟“

موریل نے گہری سانس لی۔ ”شکر ہے، وہ خواب ہی تھا۔“

”کیا کوئی برا خواب تھا؟“ بڑی بی نے ہمدردی سے پوچھا۔

”ہاں... میں دیکھ رہی تھی کہ وہ سیریل کلر میرے پیچھے ہے اور مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔“ اس نے کہا لیکن یہ بتانے سے گریز کیا کہ وہ اسی ایرپوش کو سیریل کلر کی صورت میں دیکھ رہی تھی۔

بڑی بی مسکرائیں۔ ”اصل میں ہم اسی کے بارے میں بات کر رہے تھے اس لیے سوتے وقت تمہارے ذہن میں وہی سوار رہا اور تم نے خواب میں بھی اسے ہی دیکھا۔“

موریل کو خواب کی تشریح سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ خواب دیکھ رہی تھی اور قاتل نے اسے سچ مچ قتل نہیں کیا تھا۔ اس نے دزدیدہ نظروں سے ایرپوش کی طرف دیکھا، وہ اپنی نشست پر نظر آ رہا تھا۔ یہ نہیں پتا چل رہا تھا کہ وہ سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے۔ موریل نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے اور ابھی میڈیسن آنے میں دو گھنٹے باقی تھے۔ اسے شدت سے کافی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اکیلے ڈائننگ کار تک جا سکے اور بڑی بی سے کہتے ہوئے اسے جھجک محسوس ہو رہی تھی اس لیے وہ نشست سے سر ٹکا کر بیٹھ گئی۔

”مجھے بھی نیند آ گئی تھی۔“ انہوں نے موریل کو بتایا۔

”میرا خیال ہے، میں نے تمہاری نیند بھی خراب کر دی۔“ موریل نے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں، ابھی تو میں جاگ رہی تھی جب تم خواب میں ڈر کر چیخی تھیں۔“ بڑی بی نے کہا۔

موریل نے کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھا۔ ابھی تک تاریکی تھی اور اسے معلوم تھا کہ اس موسم میں میڈیسن میں صبح سات بجے بھی تاریکی ہوتی ہے۔ سورج سوا سات بجے نکلتا ہے اور اگر دھند اور بادل ہوں تو روشنی ہونے میں بہت دیر لگتی ہے۔ ریلوے اسٹیشن سے بس اسٹاپ تک ایک طویل اور ویران سڑک سے گزرنا پڑتا تھا اور اس سڑک پر آج بھی کوئی آبادی نہیں تھی۔ وہ سوچ رہی تھی، اچھی بات ہے کہ اس کے ساتھ یہ بڑی بی ہیں ورنہ اکیلے جاتے ہوئے اسے ڈر لگتا۔ اگر اس نے خواب نہ دیکھا ہوتا تو وہ شاید اتنا نہیں ڈرتی لیکن اب اس جگہ سے اکیلے گزرنا اسے بہت مشکل لگ رہا تھا۔ اس نے بڑی بی کی موجودگی پر شکر ادا کیا۔

”کیا خیال ہے، کافی پی کر نہ آئیں؟“ بڑی بی نے غیر متوقع طور پر اس کے دل کی بات کہہ دی تو وہ حیران رہ گئی۔

”ضرور۔“ اس نے کہا۔ ”سچی بات ہے کہ مجھے بھی خواہش ہو رہی تھی۔“

”تو چلو۔“ بڑی بی نے کھڑے ہو کر اپنا ہینڈ بیگ اٹھا لیا لیکن موریل نے اپنا بیگ وہیں پڑا رہنے دیا۔ راستے میں بڑی بی نے کہا۔ ”اچھا ہے، کچھ چل پھر لوں گی۔ بیٹھے بیٹھے جسم اکڑ گیا ہے۔“

ڈائننگ کار خاصی دور تھی۔ انہیں جا کر کافی پینے اور پھر واپس آنے میں ایک گھنٹا لگ گیا۔ اب ایک گھنٹے کا سفر ہی باقی تھا۔ موریل نے بہتر سمجھا کہ کچھ آرام اور کر لے۔ بڑی بی بھی تھک گئیں۔ ویسے بھی وہ رات بھر کی جاگی ہوئی تھیں اس لیے دونوں ہی اپنی نشستوں سے سر ٹکا کر اونگھنے لگیں۔ کوئی نصف گھنٹے بعد بڑی بی نے اسے ہلایا۔ ”وقت کم رہ گیا ہے اگر تمہیں خود کو فریش کرنا ہے تو واش روم سے ہو آؤ۔“

موریل اٹھی اور واش روم سے ہو کر آ گئی۔ ایرپوش ابھی تک ٹرین میں موجود تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے میڈیسن ہی جانا تھا کیونکہ میڈیسن سے پہلے آخری اسٹیشن گزر چکا تھا۔ اس کے آنے کے بعد بڑی بی اپنا ہینڈ بیگ سنبھال کر واش روم کی طرف چلی گئیں۔ ابھی سات بجنے میں دس منٹ تھے کہ اچانک ہی شہر کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ اسے حیرت ہوئی۔ کیا ٹرین جلدی پہنچ گئی تھی؟ ٹرین دو منٹ بعد پلیٹ فارم میں داخل ہو گئی۔ یہاں پانچ منٹ رکنے کے بعد ٹرین واشنگ برتھ کی طرف چلی جاتی۔ ٹرین رکنے پر اس نے اٹھ کر دروازے سے باہر دیکھا۔ یہ میڈیسن کا اسٹیشن ہی تھا۔ وہاں واجبی سی چہل پہل تھی۔ بڑی بی ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ اس نے کچھ دیر بڑی بی کا انتظار کیا پھر اپنا بیگ سنبھال کر نیچے اتر آئی اور باہر جانے والے راستے کی طرف چل پڑی۔ اس نے اس امید پر باہر کا رخ کیا کہ شاید دھند نہ ہو اور کچھ چہل پہل شروع ہو گئی ہو لیکن اس کی امید پوری نہیں ہوئی۔ باہر

دھند کچھ زیادہ ہی تھی۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی کہ کیا کرے... بڑی بی کا انتظار کرے؟ پھر اس نے سوچا کہ خود ہی چلنا چاہیے۔ اس نے اپروالے کو نہیں دیکھا تھا، شاید وہ ابھی تک ڈبے میں تھا۔

وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی۔ جیسے ہی وہ کھلی فضا میں آئی، ٹھنڈی اور اس سے زیادہ شدید دھند نے اسے لرزا دیا۔ یہاں اس کے اندازے سے زیادہ ہی دھند تھی پھر اسے یاد آیا کہ بس اسٹاپ تک جانے والی سڑک پر بائیں طرف ایک جھیل ہے اور اس سے اٹھنے والی بھاپ کی وجہ سے یہاں دھند زیادہ ہی ہوتی ہے۔ روشنی بہت ہلکی سی تھی۔ اسٹریٹ لائٹس بھی موم بتیوں کی طرح جھلملا رہی تھیں۔ پہلے اس نے سوچا کہ واپس چلی جائے اور بڑی بی کے ساتھ ہی آئے لیکن پھر اسے شرم آنے لگی۔ وہ جوان تھی اور اس بڑھیا کا سہارا چاہتی تھی؟ اس نے بیگ کو مضبوطی سے تھاما اور تیز تیز قدموں سے چلنے لگی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور رہ رہ کر اسے خیال آتا کہ کوئی اس کے پیچھے نہ آ رہا ہو۔ اس کا ذہن اس واہمے کو جھٹک رہا تھا لیکن ساتھ ہی اس کے کان کسی آہٹ پر لگے ہوئے تھے پھر اسے محسوس ہوا کہ کوئی سچ مچ اس کے پیچھے آ رہا ہے۔ وہ چلتے چلتے رک گئی۔ اس نے کان لگا کر سنا لیکن اس بار کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ یہ اس کا وہم ہی تھا لیکن جب اس نے چلنا شروع کیا تو آواز دوبارہ آنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بھاری جوتے پہنے ہوئے کوئی شخص پاؤں دبا کر چل رہا ہو لیکن دھمک ہلکی سنائی دے رہی تھی۔ موریل نے رفتار مزید تیز کی تو پیچھے سے آتی چاپ بھی تیز ہو گئی۔

موریل بہت زیادہ ڈر گئی اور اس نے تقریباً بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ بھاگتے بھاگتے اچانک رکی تو عقب میں آنے والے کو رکنے میں کچھ وقت لگا اور اس بار موریل نے یقینی طور پر اس کے قدموں کی آہٹ سن لی۔ وہ پھر بھاگنے لگی۔ تعاقب کرنے والے نے جان لیا تھا کہ وہ اس کے تعاقب سے واقف ہو گئی ہے اس لیے اس نے بھی احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ موریل اب بے تحاشا بھاگ رہی تھی اس کے باوجود اسے لگ رہا تھا کہ اس کے پیچھے آنے والا قریب آتا جا رہا ہے اور شاید اب وہ اس سے چند گز دور تھا۔ وہ اس سے کہیں زیادہ تیز تھا اور کسی بھی لمحے اسے پکڑ سکتا تھا۔

اچانک موریل بائیں طرف گھوم گئی۔ اس طرف جنگل تھا اور اسے چھپنے کی جگہ مل سکتی تھی۔ یہاں سیدھی سڑک پر وہ پکڑی ہی جاتی۔ کچی زمین پر آتے ہی اس کی رفتار سست ہو گئی اور وہ دیکھ کر قدم رکھنے لگی کیونکہ اندھا دھند بھاگنے کی صورت میں وہ کسی درخت سے بھی ٹکرا سکتی تھی اور کسی گڑھے میں بھی گر سکتی تھی۔ یہاں جھاڑیاں تھیں اور کہیں کہیں درخت تھے۔ موریل ایک جگہ رک کر سانس درست کرنے لگی۔ اس کے کان آہٹ پر لگے تھے لیکن جیسے کچی زمین پر اس کے قدموں کی آواز نہیں آ رہی تھی، اسی طرح اس کے پیچھے آنے والے کے قدموں کی آواز بھی نہیں آئی۔ موریل نیچے جھکی اور ایک گھنی جھاڑی میں گھس کر سانس روک لی۔

کچھ دیر بعد اسے لگا کہ کوئی آس پاس پودوں میں گھوم رہا ہے پھر اس کے پیر تلے آ کر کوئی سوکھی شاخ چٹخی تو موریل نے بہ مشکل اپنی چیخ روکی۔ وہ آہستہ سے پیچھے سرکی اور جھاڑی کے دوسری طرف نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر اچانک ہی اس کے پاؤں تلے آ کر بھی کوئی شاخ چٹخی اور اسے فوراً ہی کسی کی غراہٹ سنائی دی۔ اس بار درختوں اور گڑھوں کی پروا کیے بغیر وہ بے تحاشا بھاگی۔ اس کے عقب میں دوڑتے قدموں کی آواز آنے لگی۔

وہ جھاڑیوں سے الجھ رہی تھی اور کئی بار درختوں سے بھی ٹکرائی لیکن رکی نہیں۔ اسے معلوم تھا کہ وہ رکے گی تو اس شخص کی گرفت میں آ جائے گی۔ اس کے ماتھے پر چوٹ آئی تھی اور اس سے خون رس رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں پر بھی خراشیں آئی تھیں۔ کچھ دیر بعد اسے احساس ہوا کہ اس کے عقب سے آتی قدموں کی آواز رک گئی ہے۔ وہ بھی رک گئی اور اپنی سانس پر قابو پانے لگی۔ شاید وہ شخص کسی اور طرف نکل گیا تھا۔ موریل نے ایک درخت سے سر ٹکا لیا اور دبی دبی سسکیوں کے ساتھ رونے لگی۔ ساتھ ہی وہ اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے پتا تھا کہ اس نے حوصلہ ہار دیا تو اس جنونی کے ہتھے چڑھ جائے گی۔

کچھ دیر بعد اس کی سانس قابو میں آئی تو اس نے سورج کی نمودار ہوتی روشنی سے سمت کا اندازہ کیا۔ مشرق کی طرف زیادہ اجالا تھا اور مغرب میں بدستور تاریکی تھی۔ وہ مشرق کی طرف بڑھنے لگی۔ شہر اسی سمت میں تھا۔ اگر وہ کسی گھر تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی تو پولیس سے مدد طلب کر سکتی تھی۔ مگر اس نے چند ہی قدم اٹھائے تھے کہ کوئی اس کے بالکل پاس سے غرایا۔ غرانے والے نے اسے گلے سے پکڑ لیا۔ اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ موریل چیخنا تو در کنار، آواز بھی نہیں نکال سکی۔ اس کے منہ سے بس ''خاں... خاں'' کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

اسے دبوچنے والے نے اسے کسی کھلونے کی طرح اٹھا لیا اور آگے بڑھنے لگا۔ موریل کا دہشت سے برا حال تھا۔ اسے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ وہ اسی سیریل کلر کے ہتھے چڑھ گئی ہے اور آج اس کی باری تھی۔ پھر اس نے اسے زمین پر پٹخ دیا لیکن اس کا گلا نہیں چھوڑا۔ وہ ہاتھوں سے مزاحمت کر رہی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ قاتل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بہت مضبوط اور طاقت ور تھا پھر اس نے موریل کا زیریں لباس اتارنے کی کوشش کی تو موریل پر اس کے اصل عزائم واضح ہو گئے۔ اس بار اس نے زیادہ مزاحمت کی۔ اسے یاد آیا کہ سیریل کلر نے جن عورتوں اور لڑکیوں کو مارا تھا، ان میں سے کسی کی آبروریزی کی کوشش نہیں کی تھی۔ تو کیا یہ کوئی اور شخص تھا؟

''کتیا!'' اس کی مزاحمت پر مشتعل ہو کر اس شخص نے اسے تھپڑ مارا۔ اس کا ہاتھ اتنا بھاری تھا کہ موریل کو چکر آ گیا اور دوسرا تھپڑ کھا کر وہ بالکل ہی ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ شخص بولا۔ ''پورے دو سال بعد تو موقع ملا ہے۔''

موریل نے چکراتے ذہن سے سوچا۔ 'دو سال بعد؟ تو کیا اس نے باقی عورتوں اور لڑکیوں کو قتل نہیں کیا ہے؟ یہ سیریل کلر نہیں ہے؟'

اس نے موریل کو تقریباً بے لباس کر دیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنی درندگی کا مظاہرہ کرتا، اس کے منہ سے کراہ نکلی اور وہ موریل پر گر گیا۔ پہلے موریل سمجھی کہ وہ اس پر مجرمانہ حملہ کرنے والا ہے مگر اس کا انداز بے دم ہو کر گرنے والا تھا۔ موریل کی گردن بھی اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ موریل کی سانس کافی دیر سے رکی ہوئی تھی، اسے موقع ملا تو وہ دیوانہ وار سانس لینے لگی پھر اسے احساس ہوا کہ اس کا جسم چپچپا ہو رہا ہے اس نے بہ مشکل اس شخص کو دور دھکیلا۔ تب اس نے دیکھا کہ اس شخص کے جسم سے خون نکل کر موریل پر گرا تھا۔ موریل کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ اپنے لباس سے خون صاف کرنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک ہی اس شخص کو کیا ہوا ہے۔ اس نے جھک کر اسے دیکھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ یہ اپر والا ہو گا لیکن یہ کوئی اور شخص تھا۔ اس نے نیلے رنگ کا ریلوے گارڈ کی وردی جیسا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی پشت پر عین دل کی جگہ سوراخ تھا جس سے خون ابل رہا تھا۔

موریل کو پاس ہی کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو وہ بدکی لیکن پھر بڑی بی کو دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''اوہ... یہ تم ہو... میں تو ڈر...'' وہ اس کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گئی۔ بڑی بی کے ہاتھ میں خون آلود چاقو تھا... کوئی سات انچ لمبا اور نوک دار۔ موریل چاقو کی طرف دیکھ کر ہکلائی۔ ''یہ... یہ تم نے کیا ہے؟''

''ہاں۔'' بڑی بی نے اطمینان سے کہا۔ ''میں دو سال سے اپنی بیٹی کے قاتل کی تلاش میں تھی۔ آج یہ مجھے مل گیا۔''

موریل نے خوف زدہ نظروں سے اس شخص کی لاش کو دیکھا۔ ''یہ تمہاری بیٹی کا قاتل ہے؟''

''ہاں... اسی نے دو سال پہلے میری بیٹی کو قتل کیا تھا۔''

موریل کو اس شخص کی بات یاد آ گئی۔ اس نے کہا تھا کہ اسے پورے دو سال بعد موقع ملا ہے۔ اس نے غیر ارادی طور پر کہا۔ ''تو یہ سیریل کلر نہیں ہے؟''

''ہاں... اس نے باقی عورتوں اور لڑکیوں کو قتل نہیں کیا۔ اس نے دو سال پہلے صرف میری بیٹی کو اسی جنگل میں آبروریزی کے بعد قتل کر دیا تھا۔ وہ اکیلی یہاں اپنے اسکول کے پرانے کولیگز کی تقریب میں آئی تھی اور ٹرین سے اترنے کے بعد اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ وہ تقریب میں نہیں پہنچی تو اس کے دوستوں نے مجھ سے رابطہ کیا۔ میں نے پولیس کو اطلاع دی اور دوسرے دن اس کی لاش یہاں سے ملی۔''

موریل کو ایسا لگا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گی۔ اس شخص نے باقی عورتوں اور لڑکیوں کو قتل نہیں کیا تھا۔ ان چھ عورتوں کی بے حرمتی کی کوشش بھی نہیں کی گئی تھی... اور بڑی بی کے ہاتھ میں ایک سات انچ لمبا چاقو تھا جس سے اس نے نہایت مہارت سے اس گرانڈیل شخص کو ایک ہی وار میں ہلاک کر دیا تھا۔ موریل کے ذہن میں کڑیاں جڑنے لگیں۔ اس نے بڑی بی کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دیں۔

''تم سمجھ گئیں... ان چھ عورتوں کو میں نے ہی ہلاک کیا تھا۔ میں ٹرین سے کسی ویران اسٹیشن پر اترنے والی ان عورتوں اور لڑکیوں کا اس امید پر پیچھا کرتی تھی کہ شاید قاتل انہیں بھی مارنے کی کوشش کرے اور میری نظر میں آ جائے... اور میں اس سے اپنی بیٹی کا انتقام لے سکوں۔ لیکن جب میں دیکھتی کہ کوئی قاتل ان عورتوں کے پیچھے نہیں آ رہا ہے تو مجھے غصہ آ جاتا۔ میری بیٹی قتل کر دی گئی تھی اور ان عورتوں کو کوئی کچھ نہیں کہتا تھا۔ تب میں انہیں قتل کر دیتی تھی۔ اس ناانصافی کا شکار صرف میری بیٹی کیوں ہوئی تھی؟ باقی عورتیں اور لڑکیاں کیوں محفوظ ہیں؟'' بڑی بی کا لہجہ جنونی ہوتا جا رہا تھا۔ اس وقت بڑی بی کے چہرے کے تاثرات بہت خوفناک ہو گئے تھے۔

موریل لرز گئی۔ ''تم صرف اس وجہ سے ان بے گناہ

عورتوں کو مار دیا کرتی تھیں... ان کا کیا قصور تھا؟"

"میری بیٹی بھی تو بے گناہ تھی۔" بڑی بی اس کی طرف بڑھنے لگیں۔ ان کا چاقو والا ہاتھ اوپر اٹھ رہا تھا۔ موریل پیچھے ہٹنے لگی کہ اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ گر گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتی، بڑی بی اس کے سر پر پہنچ گئیں۔ انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔ "مجھے افسوس ہے میری بچی... لیکن میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔" بڑی بی نے چاقو والا ہاتھ بلند کیا۔

"کیوں؟" موریل رونے لگی۔

"میں نہیں چاہتی کہ تم کسی سنسان راستے پر کسی جنسی جنونی کا شکار ہو۔" بڑی بی نے یہ کہتے ہوئے چاقو تھام کر مارنا چاہا کہ ایک فائر ہوا اور بڑی بی ایک جھٹکے سے رک گئیں پھر انہوں نے گھوم کر عقب میں دیکھا اور اوندھے منہ زمین پر گر گئیں۔

موریل نے اپر پوش کو بھاگ کر آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود پستول کی نال سے دھواں نکل رہا تھا۔ بڑی بی کی پشت میں سوراخ سے گاڑھا خون ابل رہا تھا۔ اپر پوش نے جھک کر بڑی بی کو دیکھا اور ایک واکی ٹاکی میں بولا۔

"ایمبولینس بھیجو... جلدی۔" پھر اس نے موریل کی طرف دیکھا۔ "میں لیفٹیننٹ جیری ہوں... تم ٹھیک ہو نا؟"

موریل نے سر ہلایا اور کھڑی ہوگئی۔ "تم پولیس والے ہو؟" اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

لیفٹیننٹ نے سر ہلایا اور اپنے اپر سے پولیس کارڈ نکال کر اسے دکھایا جس پر اس کی تصویر بھی تھی۔ صورت اور بالوں سے وہ پولیس والا ہی لگتا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں اس کیس پر کام کر رہا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ قاتل ویسا نہیں ہے جیسا کہ ہم نے سوچ رکھا ہے۔" اس نے بڑی بی کی طرف دیکھا۔ "اور میرا اندازہ درست نکلا۔"

"اس کی بیٹی کی موت نے اسے پاگل کر دیا اور یہ دوسری عورتوں کی جان لینے لگی۔" موریل نے دکھ سے کہا۔

"کسی کے کیے کی سزا دوسرے کو دینا انصاف نہیں ہے۔" لیفٹیننٹ جیری نے کہا۔

موریل نے اس کی طرف دیکھا۔ "تم نے یہ حلیہ کیوں بنا رکھا ہے؟ اس میں تو تم خود سیریل کلر لگ رہے ہو۔"

وہ مسکرایا۔ "مجبوری تھی... دوسرے کسی بھی حلیے میں میری پولیس کی شناخت نہیں چھپ سکتی تھی۔ جیسا کہ تم دیکھ رہی ہو، میں صورت سے ہی پولیس والا لگ رہا ہوں اس لیے میں نے اپر پہن لیا۔ اس طرح میں چھپ گیا اور پولیس والا نظر آنے کے بجائے مشکوک نظر آنے لگا۔"

"لیکن یہ شخص جو..."

"اسے میں جانتا ہوں۔ یہ ریلوے گارڈ ہے اور دو سال پہلے شاید اسی نے یہاں ہونے والا مرڈر کیا تھا۔ اگرچہ بات یقینی نہیں ہے لیکن پولیس کے پاس مارتھا کے جسم سے ملنے والے مواد کا ڈی این اے محفوظ ہے۔ وہ اس سے چیک کر کے دیکھا جائے گا۔"

موریل نے گارڈ کی لاش کی طرف دیکھا۔ "کیا یہ مر چکا ہے؟"

"یقینی طور پر بڑی بی نے بہت ناپ تول کر وار کیا تھا۔ چھ قتل کر کے وہ اس کام میں ماہر ہو چکی تھی۔"

"تم اس کیس پر کام کر رہے ہو لیکن تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ میرے ساتھ ہی کچھ ہو سکتا ہے؟"

"بہت آسانی سے... میں دیکھتا تھا کہ کون عورت یا لڑکی اکیلے سفر کرتی ہے۔ میں اسی ڈبے میں سوار ہو جاتا جس میں وہ عورت ہوتی تھی۔ اگرچہ یہ یقینی فارمولا نہیں تھا کیونکہ یہ میرا ستائیسواں سفر تھا لیکن بہرحال اس نے کام کیا۔" لیفٹیننٹ جیری نے بتایا۔ "جب میں نے تمہیں دیکھا تو میں نے محسوس کیا کہ تم قاتل کے لیے ایک موزوں شکار ہو۔ اس لیے میں تمہارے ڈبے میں آ گیا۔"

"تمہیں بڑی بی پر شک نہیں ہوا؟"

"نہیں... اس کی شخصیت ایسی تھی کہ اس پر شک کرنا بہت مشکل تھا۔" لیفٹیننٹ جیری نے [illegible] بتایا۔ "حالانکہ میں اسی مجبوری پر کام کر رہا تھا کہ قاتل متوقع حلیے سے بالکل مختلف ہوگا... اور میں تمہیں بتاؤں کہ دو لڑکیوں کا قتل میرے اس ٹرین میں سفر کے دوران ہوا اور میں بالکل نہیں جان سکا کہ یہ کام اسی عورت کا ہے۔"

لیفٹیننٹ جیری نے بڑی بی کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے ایک ایمبولینس وہاں آ کر رکی اور اس سے طبی عملہ اتر کر آیا۔ ڈاکٹر نے جھک کر بڑی بی کی نبض چیک کی اور مایوسی سے سر ہلا دیا۔ "یہ مر چکی ہے۔"

موریل نے افسردگی سے اس عورت کو دیکھا جو اپنی بیٹی کے قتل کا داغ لیے دوسری بے گناہ عورتوں کو قتل کرتی پھر رہی تھی۔ مرنے کے بعد اس کا چہرہ پھر پہلے کی طرح معصوم ہو گیا تھا۔ پولیس کاریں بھی آ گئی تھیں۔ جب لیفٹیننٹ جیری نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ اس کے ساتھ چل پڑی۔ اسے اپنی ماں کا خیال آیا جو نرسنگ ہوم میں آخری سانسیں لیتے ہوئے اس کی منتظر تھی۔ وہ اس کے پاس جانے کے لیے بے تاب ہو گئی۔

کچھ چیزیں حقیقت ہونے کے باوجود نہ جانے کیوں خواب و خیال کا حصہ لگتی ہیں — ایک ایسے ہی شخص کا ماجرا جسے گھر بیٹھے ایک اچھوتی اور منفرد ہستی کا ساتھ مل گیا تھا

اپنے موضوع اور جدت کے لحاظ سے منفرد انداز کی تحریر خاص

رضوان اللہ منظر

تقاضائے انصاف

وکیل استغاثہ ایک دبلا پتلا شخص تھا، جس کا نام ایمری ہیبر تھا۔ اخبارات میں اس مقدمہ قتل کے متعلق شائع ہونے والی خبریں اتنی... سنسنی خیز اور ناقابل یقین تھیں کہ لوگوں کے منہ کھلے رہ گئے۔ اسی لیے عدالت کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔

ملزم نل میلونی بہت بیزار تھا لیکن وہ بے چین اور فکرمند بھی تھا۔ زیادہ فکر اسے اپنے وکیل جسٹن مارکس کی طرف سے تھی۔ مارکس کو اس کیس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اگر وہ ملزم نل میلونی کا بہترین دوست نہ ہوتا تو اس کیس کو ہاتھ بھی نہ لگاتا۔ وکیل جسٹن مارکس ایک معقول اور خوش رو جوان تھا، جو جاگتی آنکھوں سے سپریم کورٹ کا جسٹس بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ اسے یہ پریشانی تھی کہ نل میلونی کا کیس اس کے اس خواب کو تباہ کر دے گا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ وکیل استغاثہ جو درحقیقت بہت قابل وکیل تھا، نل میلونی کو سزائے موت دلوانے کا تہیہ کر چکا تھا۔

ملزم نل میلونی کو اپنے وکیل کی ہدایت یاد آئی کہ اسے جیوری پر بہت اچھا تاثر چھوڑنے کی کوشش کرنی ہے۔ چنانچہ اس نے ایک بے ساختہ جماہی کا گلا گھونٹ دیا پھر اس نے اپنے وکیل کی ہدایت پر خلوص سے پوری طرح عمل کرنے کی غرض سے جیوری کے اراکین کا جائزہ لیا اور اگلی قطار میں بیٹھی ہوئی ایک خاتون کو منتخب کر لیا۔ اس نے خاتون کو دیکھ کر بڑی معصومیت سے پلکیں جھپکائیں۔ جواباً خاتون پھنکاری اور تند نگاہوں سے گھورنے لگی۔

یہاں تو دال نہیں گلے گی۔ مل نے سوچا۔ کیوں نہ اس پر توجہ دی جائے کہ سرکاری وکیل کیا کہہ رہا ہے۔

''اور جناب عالی، استغاثہ یہ ثابت کرے گا کہ 10 جولائی کی شام ملزم میلونی نے اپنے پڑوسی جم پر خوف ناک حملہ کیا اور اس کی کھوپڑی کچل کر اسے ہلاک کر دیا۔ ہم یہ بھی ثابت کریں گے کہ قاتل اور مقتول کے درمیان کافی عرصے سے سنگین نوعیت کا ایک تنازعہ چل رہا تھا اور تنازعے کا سبب ملزم کی بے راہ روی تھی...'' وکیل استغاثہ بولتا رہا۔ کمرے میں بہت گرمی تھی۔ ملزم نے کرسی پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے زوردار جماہی لی۔ جسٹن مارکس کی پھنکار سن کر وہ اچھل پڑا۔ اسے یاد آ گیا کہ یہ جماہی کے سلسلے میں جسٹن کی طرف سے تنبیہ ہے۔ وہ جیوری کے اراکین کی طرف دیکھ کر معذرت خواہانہ انداز میں مسکرایا۔ ان میں سے کچھ نظریں چرانے لگے۔

پستہ قامت فربہ اندام ڈاکٹر کوبی کو گواہوں کے کٹہرے میں بلوایا گیا۔ اس سے حلف لیا گیا۔ پھر سرکاری وکیل نے احترام آمیز لہجے میں اس سے سوالات کیے جن سے اس کے نام اور پیشے پر روشنی پڑی تھی اور یہ بھی ثابت ہوتا تھا کہ وہ قتل کے پچاس منٹ بعد جائے واردات پر پہنچا تھا۔

''اب ڈاکٹر کوبی، آپ اپنے الفاظ میں تفصیل سے بتائیں کہ آپ نے کیا دیکھا اور آپ کو کیا کچھ ملا؟'' سرکاری وکیل نے کہا۔

ڈاکٹر کوبی چند لمحے اپنا گھٹنا کھجانے میں مصروف رہا پھر اس نے کہا۔ ''اسے ٹیکنیکل سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ میں دونوں مکانوں کے درمیان جنگلے کے پاس کھڑا تھا۔ میں مقتول جم فنچ والے حصے میں تھا۔ وہاں خون کا ایک بڑا دھبا تھا۔ کچھ خون جنگلے پر بھی تھا۔ زمین پر بھیجے کے کچھ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی تھے۔ ان میں سے کوئی بھی سکے سے بڑا نہیں تھا۔ کھوپڑی کا بھی ایک چھوٹا ٹکڑا تھا... کوئی دو مربع انچ کا۔ اس پر جم کے بال بھی تھے۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ بات لیبارٹری ٹیسٹ سے ثابت ہو چکی ہے اور مجھے ہڈیوں کے کچھ ٹکڑے بھی ملے، زیادہ نہیں، تھوڑے سے۔'' وہ مسکرایا۔ ''بہرحال میرا اندازہ ہے کہ فنچ مر چکا ہے۔ بال بھی اس کے تھے اور خون بھی اسی کا تھا۔''

جیوری کے تین اراکین کی طبیعت بگڑنے لگی۔ چوتھا اپنے ہاتھوں کو پنکھا جھلنے کے انداز میں ہلانے لگا۔

کوبی نے سرکاری وکیل کے چند اور سوالوں کے جواب دیے۔ پھر وکیل مارکس نے اس پر جرح شروع کی۔ ''آپ کے خیال میں فنچ کی موت کا سبب کیا تھا؟''

اس پر حاضرین میں سے بیشتر کی سانسیں رکنے لگیں۔ وہ یہ فرض کیے بیٹھے تھے کہ وکیل صفائی یہ موقف پیش کرے گا کہ لاش کی عدم موجودگی میں قتل ثابت ہی نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر کوبی ایک لمحے سر کھجاتا رہا پھر بولا۔ ''میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''ڈنڈے یا ایسے ہی کسی بھاری ہتھیار سے کھوپڑی کا یہ حشر ہو سکتا ہے؟'' وکیل مارکس نے پوچھا۔

''نہیں، یہ تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' ڈاکٹر کوبی نے بے ساختہ کہا۔ ''انسانی سر کو خدا نے بہت دیرپا اور مضبوط بنایا ہے جو کچھ میں نے دیکھا ہے، اس کی روشنی میں ایک ہی بات کہی جا سکتی ہے۔ فرض کر لیں کہ انسانی سر کو کنکریٹ کی ٹھوس دیوار سے لگا دیا جائے۔ پھر اسی چپکی ہوئی حالت میں اس پر بیس بال کے بیٹ سے پوری قوت سے وار کیا جائے، تب بھی اس کا وہ حشر نہیں ہو سکتا جو میں نے دیکھا ہے۔''

''ڈاکٹر کوبی، آپ دس فٹ لمبی اور اسی مناسبت سے موٹی سنسی کا تصور کریں۔ اگر ایسی کسی سنسی سے مسٹر فنچ کا سر دبوچا جاتا اور پھر ایسے زور لگایا جاتا جیسے سروتا سے اخروٹ توڑا جاتا ہے، کیا اس عمل سے یہ نتائج حاصل ہو سکتے تھے؟''

ڈاکٹر کوبی نے پہلے ناک کی پھننگ کو سہلایا، پھر اپنا کان مروڑا اور ناک بھوں پر زور دیتے ہوئے کچھ سوچتا رہا۔ ''اگر بالکل اچانک اور بے خبری میں دبوچ لیا جائے تو شاید ایسا ہو سکے لیکن اتنی بڑی سنسی کو تھام کر اتنا دباؤ تو کوئی دیو ہی ڈال سکتا ہے۔ انسان کے بس کی بات تو نہیں معلوم ہوتی۔''

''ٹھیک ہے ڈاکٹر... شکریہ۔'' جسٹن مارکس نے کہا۔

ایمری ہیمر نے اور گواہوں کو طلب کیا۔ ان میں انیتا ہیسپ بھی تھی۔

''آپ ملزم کے گھر کے سامنے، سڑک کے پار رہتی ہیں؟'' ہیمر نے پوچھا۔

مس انیتا کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی۔ تجرد کی زندگی نے اس کی شخصیت کو خشکی اور سختی کا تاثر بخشا تھا۔ اس کی آواز میں بھی عجیب سی کھڑکھڑاہٹ تھی۔ ''ہاں، میں 35 سال سے اس مکان میں رہ رہی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''یہ میلونی جو سامنے بیٹھا ہے، اسے اس علاقے میں آئے دو سال ہوئے ہیں۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ...''

''آپ کو اپنے گھر کی کھڑکیوں سے ملزم مل میلونی کا مکان نظر آتا ہے؟'' ہیمر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اگلا سوال کیا۔

''بالکل نظر آتا ہے۔''

''آپ عدالت کو یہ بتائیں کہ آپ نے سرخ بالوں والی اس عورت کو پہلی بار کب دیکھا تھا؟''

مس انیتا نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''پہلی بار... اس عورت کو میں نے پہلی بار...'' وہ ذہن پر زور دیتی رہی۔ ''ہاں، یہ مئی کی بات ہے۔ وہ ایک خوش گوار صبح تھی... یا یوں کہیے کہ اس عورت پر نظر پڑنے تک وہ صبح خوش گوار ہی تھی۔ کوئی دس بجے کا وقت تھا۔ وہ میلونی کے مکان کے سامنے والے باغیچے میں بڑی بے باکی سے کھڑی تھی۔ وہ چمک دار سلور کلر کا لباس پہنے تھی۔ لیکن اسے لباس تو نہیں کہا جا سکتا۔ اتنی مختصر چیز کو لباس کہنا مناسب نہیں۔ لباس تو بدن ڈھانپنے کے لیے ہوتا ہے۔ وہ اتنا مختصر تھا کہ... میرے خیال میں وہ آدھا بھی نہیں تھا۔ بلکہ...''

''وہ کیا کر رہی تھی؟''

''وہ مکان سے باہر آئی تھی... اور رک کر ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی، جیسے خود کو وہاں موجود پا کر حیران ہو۔ میری نگاہ بہت تیز ہے۔ اس کا چہرہ مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے غور سے چاروں طرف دیکھا۔ پھر عجیب مسخرا پن کیا۔ اس نے جھک کر نیچے کسی چیز کو دیکھا۔ پھر جیسے قدم جمائے اور یوں آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا، جیسے پہلے کبھی زمین پر چلی ہی نہ ہو۔ وہ بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی گیٹ کی طرف بڑھی۔ اس وقت مسٹر میلونی دوڑتے ہوئے گھر سے نکلے۔ میں نے انہیں اس عورت پر چیختے سنا۔ وہ رک گئی پھر میں نے مسٹر میلونی کو اسے اشارے کرتے دیکھا۔ اسے گھر میں آنے کو کہہ رہے تھے۔ اشارے وہ یوں کر رہے تھے، جیسے عورت بہری ہو۔

''ذرا دیر بعد عورت دوبارہ گھر میں چلی گئی۔ میں نے سوچا، شاید یہ اس دھماکے میں بہری ہو گئی ہو گی، جو تین دن پہلے گورنمنٹ کی حماقت کے نتیجے میں ہوا تھا۔''

''پھر آپ نے اس عورت کو دوبارہ نہیں دیکھا؟''

''دوبارہ! میں نے تو اسے کئی بار دیکھا لیکن اس کے بعد وہ ہمیشہ معقول لباس میں نظر آئی۔ میرا خیال ہے کہ مسٹر میلونی شہر میں اس کے لیے ملبوسات خریدتے پھرے تھے۔ شریفوں کے محلے میں ایسی باتیں نہیں ہونی چاہئیں۔ جم فنچ کا بھی یہی خیال تھا۔ دیکھیں نا... علاقہ بدنام ہو جائے تو مکانوں کے دام گر جاتے ہیں۔''

''آپ کے خیال میں میلونی اور فنچ کے درمیان کبھی جھگڑا ہوا؟''

''اس عورت کے نظر آنے کے چند دن بعد سے ان دونوں کے درمیان جھگڑے شروع ہو گئے تھے۔ دونوں جنگلے

بزدل

ایک دفعہ اس کا ایک نواسہ علاج معالجے کی سہولت نہ ملنے کے سبب اس کے ہاتھوں میں انتقال کر گیا تو میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ زندگی اور موت، غریبی اور امیری صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔ اس پر وہ پہلی دفعہ غصے میں آیا۔ اس نے کہا۔ ''یہ سب باتیں تم ظالموں نے اپنے ظلم اور ناانصافی کے جواز کے لیے گھڑی ہوئی ہیں۔ تم لوگوں نے رزق کے سرچشموں پر قبضہ کیا ہوا ہے اور اپنی غیر منصفانہ تقسیم کو خدا کی تقسیم قرار دے کر ہم لوگوں کا منہ بند کرنے کی کوشش کرتے ہو!''

میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں لیکن بے دینی کی باتیں مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں۔ چنانچہ میں نے ایک زوردار تھپڑ غفورے کے منہ پر رسید کیا اور کہا۔ ''آج کے بعد تم سے اس وقت تک میرا کوئی تعلق نہیں جب تک تم دوبارہ کلمہ پڑھ کر اپنے ایمان کی تجدید نہیں کرتے اب میری نظروں سے فوراً دور ہو جاؤ!''

اس پر غفورے نے زار و قطار رونا شروع کر دیا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ ہچکیوں کے دوران میں ہولے ہولے کلمہ پڑھ رہا ہے! یہ غریب لوگ کتنے بزدل ہوتے ہیں۔ ہشت!

ولید بلال کا انتخاب، عطاء الحق قاسمی کی کتاب ''جرم و ناتمام'' سے اقتباس

کے پاس کھڑے ہو کر ایک دوسرے پر چیختے چلاتے۔ مسٹر فنچ کو چوروں اور نقب زنوں سے ہمیشہ خوف رہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایسے انتظامات کیے تھے کہ اس کی مرضی کے بغیر کوئی اس کے گھر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے کئی بار میلونی کو فنچ کے دروازے اور کھڑکیوں کو پیٹتے دیکھا لیکن فنچ نے ایسے مواقع پر کبھی اسے توجہ نہیں دی۔''

اب جسٹن مارکس نے خاتون گواہ پر جرح شروع کی۔ ''مس انیتا، آپ کو معلوم ہے کہ مل میلونی نے بازار جا کر اس عورت کے لیے کپڑوں کی خریداری کی تھی۔ تمہاری معلومات کے مطابق اس نے عورت کے لیے اور بھی کچھ خریدا تھا؟''

''ہاں۔'' انیتا نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ وہ عورت ذہنی طور پر پسماندہ رہی ہو گی۔ میں نے ادھر اُدھر پوچھ گچھ کی تو پتا چلا کہ میلونی نے بلیک بورڈ اور چاک کے علاوہ کچھ ایسی کتابیں خریدی تھیں جو چھوٹے بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں۔''

''تم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ عورت کہاں

www.pkdigest.com

سے آئی ہے اور میلونی کے ہاں کیوں ٹھہری ہوئی ہے؟"

"ہاں... کی تھی۔ یہ طے ہے کہ وہ ٹرین سے نہیں آئی۔ ورنہ ڈیو وینچل نے ضرور اسے دیکھا ہوتا۔ بس سے آئی ہوتی تو مارٹن گسکو کو یقیناً خبر ہوتی۔ وہ ائرپورٹ سے آتی تو جونی فارنس اسے لایا ہوتا۔ پھر میں نے سوچا، یہ عورت اتنی بے حیا ہے کہ کھلے بندوں میلونی کے ساتھ رہ رہی ہے... بغیر کسی رشتے کے۔ تو یہ یقیناً مختلف گاڑیوں میں لفٹ لیتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہوگی۔ اس کے سوا کوئی صورت نہیں۔"

"بس مس انیتا ہیپ فلیٹ، شکریہ۔"

بل میلونی نے سرد آہ بھری۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جسٹن مارکس اتنا فکرمند کیوں ہے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ منصوبے کے مطابق۔ وہ جانتا تھا کہ جیوری کے اراکین اسے بے حد ناپسندیدہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں لیکن اسے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ جیسے ہی ان لوگوں کو معلوم ہوگا کہ درحقیقت کیا کچھ ہوا تھا تو وہ اس کے حامی بن جائیں گے لیکن جسٹن مارکس نہ جانے کیوں پسینے میں نہا رہا تھا۔

ایمری ہیمر نے اپنا کیس بہت ذہانت سے تیار کیا تھا اور اپنے طور پر اس میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ یہ طے تھا کہ جیوری کے اراکین بل میلونی کو موت کی سزا سنائیں گے۔ انہوں نے ابھی سے اسے ہمدردانہ نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا تھا اور افسردہ نظر آنے لگے تھے۔

ایمری ہیمر کو اپنا کیس پیش کرنے میں دو دن لگے اور اس نے زبردست طریقے سے کام کیا تھا۔ ہر قسم کے حلقے میں معقول وضاحت کی گئی تھی اور ہر موجود چیز سے پوری طرح فائدہ اٹھایا تھا۔ محرک، موقع... سب کچھ!

☆☆☆

تیسری صبح عدالت میں بڑی کشیدگی تھی۔ اب وکیلِ صفائی کو اپنا کیس پیش کرنا تھا۔

وکیلِ صفائی کھڑا ہوا تو عدالت میں ایسا سناٹا تھا کہ سوئی بھی گرائی جاتی تو زبردست دھماکا ہوتا۔ "یور آنر! اس موقع پر میں دفاع کے کیس کا خلاصہ پیش کرنے سے پہلے بل میلونی کو گواہ کی حیثیت سے پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کی کہانی اس کی زبانی سن لیں۔"

"اجازت ہے۔"

عدالت میں بھنبھناہٹ دوڑ گئی۔ میلونی کو گواہوں کے کٹہرے میں لانے کا مطلب ایمری ہیمر کو جرح کا موقع فراہم کرنا تھا۔ اور یہ طے تھا کہ سرکاری وکیل میلونی کے چیتھڑے اڑا دے گا۔ بیشتر لوگوں کے نزدیک یہ غلطی تھی۔ چنانچہ حاضرین سنسنی خیزی کی توقع پر دم سادھ کر بیٹھ گئے۔

"تمہارا نام اور پتا؟"

"بل میلونی۔ 12، بریڈن روڈ۔"

"پیشہ؟"

"دھات کے ٹوٹے پھوٹے برتنوں کی مرمت کرنا۔ اسے کوئی معتبر نام دینا چاہو تو ریسرچ کہہ لو۔"

"تمہارا ذریعۂ آمدنی؟"

"کچھ چیزیں میں نے پیٹنٹ کرا رکھی ہیں۔ ان کی رائلٹی آتی رہتی ہے۔"

"اب عدالت کو اس جرم کے متعلق تفصیل سے بتاؤ جس میں تمہیں ملوث کیا جا رہا ہے۔ بالکل ابتدا سے بتاؤ پلیز۔"

بل میلونی نے پیشانی پر بکھرے ہوئے سنہرے بالوں کو ہاتھ سے پیچھے ہٹایا۔ پھر وہ جیوری کے اراکین کو دیکھ کر خوش دلی سے مسکرایا۔

"یہ سب 7 مئی کو شروع ہوا... اس روز جب آرمی والوں نے وہ راکٹ والی حماقت کی۔ میرا ورکشاپ میرے گھر کے تہ خانے میں ہے۔ میرا زیادہ تر وقت وہیں گزرتا ہے۔

"آپ سب جانتے ہیں کہ اس راکٹ پر ایٹمی وار ہیڈ نصب تھا۔ وہ قصبے سے چالیس میل دور پہاڑیوں میں پھٹا تھا۔ دھماکے کی وجہ سے میرے آلات اور سامان بری طرح ڈسٹرب ہوا۔ کچھ چیزیں تباہ بھی ہو گئیں۔ مجھے اس بات پر بہت غصہ تھا۔

"میں نے زیرِ لب گالیاں بکتے ہوئے سر گھما کر دیکھا۔ جہاں میرا کوئلے کا چولہا رکھا ہوتا تھا، وہاں مجھے ایک کمرا نظر آیا۔ کمرے کا محرابی دروازہ خاصا چوڑا تھا اور میں اس سے اندر دیکھ سکتا تھا۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں کہ اس کمرے کی موجودگی نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ ایک منٹ تو میں یہ سوچتا رہا کہ کہیں دھماکے سے میرے دماغ میں خلل تو واقع نہیں ہو گیا ہے۔

"اس کمرے میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی... میرا مطلب ہے، روایتی فرنیچر۔ وہاں چاندی کی سی رنگت والی کسی دھات کے کچھ بڑے اور کچھ چھوٹے کیوبس رکھے تھے۔ ان کی روشنی میری سمجھ سے باہر تھی۔

"میں متجسس آدمی ہوں۔ چنانچہ میں کمرے میں چلا گیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ چیزوں کو ہینڈل کرنے اور سمجھنے کے معاملے میں، میں بہت تیز ہوں۔ وہاں وہ واحد چیز، جسے میں اٹھا سکتا تھا، ایک نامعلوم پرزہ تھا، جو سب سے بڑے کیوب کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے اٹھا لیا۔ وہ

تقریباً بے وزن تھا۔

"اس چیز کو سمجھنے کے لیے آپ کو بچوں کے اس آہنی حلقے کا تصور کرنا ہوگا، جسے وہ گھماتے ہیں... چاندی کے تاروں کا بنا ہوا چھلا۔ پھر ان تاروں کے درمیان سیاہ رنگ کے توے کا تصور کیجیے اس توے کی سیاہی کو میں سیاہ ترین رات ہی سے تشبیہ دے سکتا ہوں۔

"میں اسے دیکھ رہا تھا کہ مجھے اس کے اندر بہت گہرائی میں ارتعاش کا احساس ہوا اور اچانک کمرا غائب ہو گیا۔ میں اپنے کوئلے کے چولہے کے پاس کھڑا تھا لیکن وہ حلقہ بدستور میرے ہاتھ میں تھا۔ میں اسے لے کر اپنی کام کرنے والی بینچ کے پاس آیا۔ وہاں روشنی بہتر تھی۔ میں نے اس حلقے کو ایک ہاتھ میں تھاما اور دوسرے ہاتھ کی انگلی سیاہ دھات سے ٹکرائی۔ لیکن ٹکرانا کیا، میری انگلی اندر تک چلی گئی مگر مجھے محسوس کچھ نہیں ہوا تھا۔ انگلی کو باہر نکالے بغیر میں نے حلقے کی دوسری طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ انگلی دوسری طرف نکل گئی ہوگی۔ اس لیے کہ وہ دھات کی پتلی چادر تھی اور انگلی دھنسنے کے بعد میں نے سوچا کہ وہ کسی طرح کا ربڑ ہے۔

"مگر دوسری طرف بھی وہی گہری سیاہ چیز تھی۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا... گاک۔ تب سے میں اسے گاک ہی کہتا ہوں۔ بہرحال، میری انگلی دوسری طرف باہر نہیں آئی تھی۔ ایک میں نے اپنا پورا بازو اس میں گھسا دیا۔ اور بازو غائب ہو گیا!

"میں نے جلدی سے بازو باہر نکالا۔ وہ ثابت و سالم تھا... ہر طرح سے محفوظ۔ البتہ 'گاک' کی دوسری طرف مجھے گرمی کا احساس ہوا تھا۔

"اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مجھ جیسے آدمی کے لیے اس چیز کا ملنا کیا معنی رکھتا تھا۔ مجھے تو ویسے ہی ایسی چیزوں میں دلچسپی تھی اور میں ان کے ساتھ توڑ پھوڑ کرتا رہتا تھا۔ میں سب کچھ بھول گیا... حتیٰ کہ کھانا بھی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کیا چیز ہے... اور جو کچھ ہوا، وہ یوں ہوا۔ گاک کے اندر جا کر میرا ہاتھ غائب کیوں ہو جاتا ہے۔ میں نے گاک کو عقبی حصے سے تھام کر اسے اپنے چہرے کے سامنے رکھا۔ میں نے گاک کو اپنی ناک سے چھونے کی کوشش کی لیکن نہ چھو سکا۔ گاک کا جیسے وجود ہی نہیں تھا..."

"مجھے اعتراض ہے یور آنر!" ایمری ہیمر نے احتجاج کیا۔ "یہ غیر متعلق گفتگو..."

"میرا موکل ان واقعات کی تفصیل سنا رہا ہے جن کے نتیجے میں وہ قتل ہوا۔" جسٹن نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اعتراض مسترد کیا جاتا ہے۔" جج نے رولنگ دی۔

"شکریہ یور آنر۔" میلونی نے کہا۔ "تو میں نے سوچا کہ جب میں نے گاک میں ہاتھ گھسایا تو وہ کہیں نہ کہیں تو رہا ہوگا۔ ممکن ہے، وہ اس چیز میں نہ رہا ہو۔ ممکن ہے، اس وقت میں بھی نہ رہا ہوں لیکن کہیں نہ کہیں تو رہا ہوگا۔ یعنی مجھے معلوم کرنا تھا کہ گاک کی دوسری طرف کیا ہے۔ میں نے سوچا، کیوں نہ میں خود ہی اس میں گھس کر دیکھوں، یہ خیال بہت ہی سنسنی خیز تھا میرے لیے۔

"میں نے پہلے لمس کو آزمایا۔ اپنا ہاتھ اندر ڈالا اور ہاتھ کو سامنے رکھتے ہوئے آگے بڑھا۔ کوئی پانچ فٹ آگے گیا ہوں گا کہ میرا ہاتھ کسی چیز سے ٹکرایا۔ میں نے اس چیز کو محسوس کیا۔ وہ کوئی ہموار دیوار معلوم ہوتی تھی۔ لیکن میرے تہ خانے میں ایسی کوئی دیوار نہیں تھی۔

"تاہم تجسس کی ایک حد ہوتی ہے اور احتیاط کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ میں نے اپنا سر گاک میں نہیں گھسایا۔ اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔ پھر میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ گاک کی دوسری طرف کوئی ایسی چیز ہے، جسے دوست نہیں سمجھا جا سکتا۔

"میں نے گاک کا رخ گھمایا اور دوسری طرف سے اپنا ہاتھ اس میں گھسایا۔ اس جانب کسی دیوار سے واسطہ نہیں پڑا۔ لیکن مجھے ایسی شدید تکلیف ہوئی کہ میں نے گھبرا کر اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ ہاتھ کی سطح کے قریب خون کی بہت سی نسیں ٹوٹ گئی تھیں۔ گاک میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ چند لمحے بعد مجھے احساس ہوا کہ یہ تو پالا مار جانے والا کیس ہے۔ ٹوٹی ہوئی نسوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ میرا ہاتھ خلا میں گیا تھا۔ اور ایک سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں پالا لگنے کا مطلب یقینی طور پر منفی درجہ حرارت تھا جو کچھ بھی ہو، مجھے خوشی تھی کہ میں نے اپنا سر اندر نہیں ڈالا تھا۔

"میں نے گاک کو اپنی کام کرنے والی بینچ پر رکھا اور کئی چیزوں کو اس میں دھکیلا۔ انہیں کچھ دیر اندر رکھنے کے بعد میں باہر لے آیا۔ میں مختلف دھاتوں پر اس منفی درجۂ حرارت کے اثرات نوٹ کر رہا تھا۔ پھر جب تھکن سے برا حال ہو گیا تو میں سونے کے لیے اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"اگلے روز میں نے کافی کا تھرموس ساتھ لیا اور ورکشاپ میں چلا گیا۔ میں نے اپنے لیے پیرسکوپ بنایا اور اسے گاک میں دھکیلا۔ لیکن مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ میں نے تھرمامیٹر سے درجۂ حرارت چیک کیا۔ اندر خاصی گرمی تھی۔ لیکن پیرسکوپ کی مدد سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں

www.pkdigest.com

نے سوچا، ممکن ہے روشنی کی لہریں اس اندھیرے سے گزرتی ہوں تو ان کی ہیئت میں کوئی تبدیلی رونما ہوتی ہو۔ بعد میں میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔

''دوپہر تک میں اس کے متعلق ایک اور بات معلوم کر چکا تھا۔ گاک کو جب بھی گھمایا جاتا تو میں ہر بار ایک مختلف فضا اور ایک مختلف ماحول اس میں پاتا۔ میں نے اسے تھرمامیٹر سے بھی چیک کیا۔ ایک ماحول میں تو پارا اور رنگ ابل پڑا اور تھرمامیٹر کو توڑ کر باہر نکل گیا۔ میرا ہاتھ بھی جل گیا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ پہلی بار میں اس ماحول سے واسطہ نہیں پڑا۔ ورنہ میرا ہاتھ کلائی تک جل چکا ہوتا۔ میں گاک کے ہر ٹرن کے ساتھ نئے ماحول کا پوری طرح ریکارڈ رکھ رہا تھا۔

''میں نے گاک کو اپنی ورک بینچ پر رکھا اور اسے چمٹے کی مدد سے ٹٹولنا شروع کیا۔ ایک موقع پر چمٹا کسی نرم اور جان دار چیز سے ٹکرایا۔ اگلے ہی لمحے چمٹے کو جھٹکے سے اندر کھینچ لیا گیا اور چمٹا غائب ہو گیا۔ یقین کریں، مجھ پر تو لرزہ چڑھ گیا۔ میں نے سوچا، اگر چمٹے کی جگہ میرا ہاتھ ہوتا تو میں پورے کا پورا اندر ادھر ہو گیا ہوتا۔ میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ چمٹا جھپٹنے والا جو کوئی بھی ہے، وہ مجھے کھا کر بہت ہی خوش ہوتا۔

''اس کے بعد میں نے آنکڑے دار ٹِک استعمال کیے اور اپنی کارروائی جاری رکھی لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ میں نے ایک ڈوری سے وزن باندھا اور اسے گاک میں اتار دیا۔ وزن کے نچلے حصے پر میں نے چکنائی لگا دی تھی۔ ڈوری ڈھیلی پڑی تو میں نے اسے واپس کھینچ لیا۔ وزن کے نچلے حصے سے باریک زرد ریت چپکی ہوئی تھی اور ریت تک پہنچنے تک اس نے 38 فٹ کا فاصلہ طے کیا تھا۔

''بالآخر 208 ویں کوشش میں، میں گاک سے ایک چیز نکال کر لانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ چیز اس وقت بھی جسٹن کے بیگ میں موجود ہے۔ جسٹن، ان لوگوں کو دکھاؤ تو۔''

میرے وکیل جسٹن کو اسے بے تکلفانہ تخاطب پر غصہ تو بہت آیا۔ تاہم اس نے بیگ کھول کر اس میں سے ایک چیز نکال کر جج کی طرف بڑھا دی۔ جج نے بے حد دلچسپی سے اس کا معائنہ کیا۔ پھر اسے جیوری کے اراکین کی طرف بڑھا دیا۔ پھر اسے ٹیگ لگا کر مقدمے کی اہم چیزوں میں شامل کر دیا گیا۔

''اب آپ لوگ خود دیکھ لیں۔ یہ ہماری دنیا کی چیز تو نہیں ہے نا؟'' میلونی نے کہا۔

''مجھے اعتراض ہے اس پر۔'' سرکاری وکیل چلایا۔ ''ممکن ہے یہ ملزم نے خود بنائی ہو۔''

''ہش... خاموش رہو۔'' جج نے اسے جھڑک دیا۔

''شکریہ یور آنر۔'' میلونی نے کہا۔ ''آپ لوگوں نے دیکھا کہ یہ ایک بڑا بلور ہے۔ اور بلور کے اندر ایک بڑا طلائی بچھو ہے۔ یہ بچھو اصل بچھو سے کم از کم پانچ گنا بڑا ہے۔ یہ کنارے سے کٹا ہوا ہے۔ اس لیے کہ جم فج نے اس پر آری چلائی تھی۔ آپ دیکھیں کہ اسے اس حد تک کاٹا گیا ہے کہ بچھو کی ایک ٹانگ بھی کٹی ہوئی ہے۔ جم نے مجھے بتایا تھا کہ بچھو کی وہ ٹانگ اصلی سونے کی تھی۔ یعنی یہ پورا بچھو ہی سونے کا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ کسی اور دنیا کا زیور ہے۔

''یہاں جم فج اس کہانی میں داخل ہوتا ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ فج کا تعلق جیولری بزنس سے ہے اور وہ پانچ سال پہلے بزنس سے ریٹائر ہوا تھا۔ جم بہت عقل مند تاجر ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جم فج نے اپنی بچت کو کس انداز میں استعمال کیا تھا۔ قصبے کے ہر اہم کاروبار میں وہ حصے دار تھا۔ وہ ہر نئی ایجاد کے موقع پر میرے پیچھے پڑ جاتا کہ میں اس میں اسے بھی شریک کر لوں۔ شاید میری رائلٹی کے چیک دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ یہ نہ لیں کہ ہمارے درمیان دوستی کا تعلق بھی نہیں رہا۔ میں دن میں اکثر اس کے ساتھ کچھ وقت گزارتا تھا لیکن وہ دوست بننے والا آدمی تھا نہیں۔

''بہرحال، جب میں نے گاک سے یہ چیز نکالی تو مجھے جم فج کا خیال آیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ اس ڈیزائن کی کوئی چیز ہمارے یہاں کسی زیورات میں ہے یا نہیں۔ میں اسے لے کر اس کے گھر چلا گیا۔ وہ گھر پر ہی موجود تھا۔ اس نے جو اس کرسٹل کو دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ فج نے اپنی چھوٹی سی دکان گھر کے گیراج میں بنا رکھی ہے۔ بہرکیف اس نے سنار والی آری سے اس کا ایک حصہ کاٹا۔ پھر اس نے بتایا کہ اس نے ایسی کوئی چیز زندگی میں کبھی نہیں دیکھی۔ وہ حیران تھا کہ اسے کیسے بنایا گیا ہے۔ یہ ممکن کیسے ہوا۔ اس پر میں نے کہا کہ شاید یہ چیز روئے زمین پر تخلیق نہیں کی گئی ہے۔ بس پھر وہ میرے پیچھے پڑ گیا اور مجھ سے یہ کہانی اگلوا کر ہی دم لیا۔ اسے یقین نہیں آیا۔ مجھے اس بات پر غصہ آنے لگا۔ میں اسے اپنے تہ خانے میں لے گیا۔ وہاں پہلے میں نے اسے گاک دکھایا۔ پھر گاک میں آنکڑا ڈالا۔ کوئی تین منٹ کے اندر میں ایک اور چیز پکڑ لایا۔ وہ چیز بل کھاتی معلوم ہو رہی تھی۔'' میلونی نے ایک گہری سانس لی۔ ''یہ اندازہ ہوتے ہی میں محتاط ہو گیا۔ میں اسے بہت آہستگی سے اوپر لایا۔ اس چیز کا پہلے سر باہر نکلا۔ اس کی تھوتھنی ریچھ کی سی تھی۔ لیکن ٹانگوں کی جگہ اس کے چھوٹے چھوٹے سیکڑوں پاؤں تھے... کنکھجورے جیسے۔ اور اس کی آواز اتنی کریہہ تھی کہ میں نے

گھبرا کر اسے چھوڑ دیا۔ وہ دوبارہ گاک میں گر گیا۔

''میں نے سر گھما کر دیکھا تو فج دیوار سے لگا منہ ہی منہ میں کچھ بدبدا رہا تھا۔ پھر وہ سر تھام کے فرش پر بیٹھ گیا۔ وہ بدستور بڑبڑا رہا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا یہ رینگنے والا ریچھ اور یہ بلور ایک ہی جگہ سے آئے ہوں گے؟''

''میں نے اسے بتایا کہ میں کس طرح گاک کو تھوڑا تھوڑا ٹرن کر کے آزمائش کر رہا ہوں۔ میں نے اسے عملی مظاہرہ کر کے دکھایا۔ پھر وہ کھیل بن گیا۔ ہم کھیلتے رہے۔ یہاں تک کہ آنکڑے میں پتھروں کا ایک گچھا الجھ کر نکل آیا۔ جم نے انہیں ہاتھ میں لے کر دیکھا تو اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلنے لگیں، جسم لرزنے لگا۔ 'جانتے ہو، یہ کیا ہے؟' اس نے کہا۔ 'یہ نا تراشیدہ یاقوت ہے... بہت اچھی کوالٹی کا، اب جم اتنی جلدی جلدی بول رہا تھا کہ میرے لیے اس کی بات سمجھنا تک دشوار ہو گیا۔ بڑی مشکل سے اس کی بات میری سمجھ میں آئی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم بھاری مشینری لا کر گاک میں کھدائی کریں اور اس کان کی تو صفائی کر ہی ڈالیں۔ وہ گاک سے یاقوت کے ان گنت گچھے اور بس ٹن دو ٹن سونا نکالنا چاہتا تھا۔

''میں نے اسے بتایا کہ میرا مطلق ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ اس پر وہ غصے سے اچھل کود کرنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''میں ایسی کسی چیز کے ساتھ ہوا کھیل نہیں کھیل سکتا جس کے بارے میں مجھے کچھ بھی معلوم نہ ہو۔ اور جلد ہی میں اسے کسی سائنسی تحقیقاتی ادارے کے سپرد کر دوں گا۔ وہ اسے بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔''

''اس کا بس چلتا تو وہ مجھے جان سے مار دیتا۔ اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم کتنی آسانی سے ارب پتی بن سکتے ہیں۔ میں نے کہا، خدا کا شکر ہے۔ اب بھی میں جتنا کماتا ہوں، وہ خرچ نہیں کر پاتا۔ میں اسی حال میں خوش ہوں۔

''میرا خیال ہے کہ ایٹمی دھماکے کے نتیجے میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے اور اسے سمجھنا سائنس دانوں کا کام ہے۔ اب تم اپنے گھر جاؤ۔ میں نے نرم لہجے میں کہا اور اب مجھے پریشان نہ کرنا۔''

وہ بادلِ ناخواستہ چلا گیا۔

''دس تاریخ کی صبح تک میں تھک کر چور ہو چکا تھا۔ نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے اور برا حشر ہو چکا تھا۔ میں نے گاک کو بیس مختلف جہتوں میں گھما کر آزمائش کی تھی لیکن کچھ بھی نہیں ملا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید گاک کے اس طرف اب کوئی نئی دنیا باقی نہیں رہی ہے۔ میں نے گاک کو ورک بینچ سے کھولا، اسے اٹھایا اور تہ خانے کی دیوار کی طرف اچھال دیا۔ وہ خاصا اونچا گیا اور پھر گھومتے ہوئے آہستہ آہستہ نیچے آنے لگا۔

''اور اچانک میرے تہ خانے میں سرخ بالوں والی ایک نہایت حسین لڑکی نظر آئی۔ نہ جانے کہاں سے آن ٹپکی تھی وہ۔ وہ چمک دار چاندی کا سا لباس پہنے تھی۔ وہ لباس جسٹن کے بیگ میں موجود ہے۔ جسٹن، ذرا دکھاؤ تو ان لوگوں کو۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ دھاتی تاروں سے بنا ہوا ہے۔ لیکن یہ دھات کی طرح سرد نہیں ہے۔ لگتا ہے کہ یہ حرارت کو جذب کرنے کے بجائے اسے روک کر واپس اچھال دیتا ہے۔''

جسٹن نے دھاتی تاروں کا وہ لباس نکالا۔ لباس گردش میں آ گیا۔ ہر شخص اسے چھو کر دیکھ رہا تھا اور حیرت کا اظہار کر رہا تھا۔ ایبری ہیبر کا انداز ایسا تھا، جیسے وہ کہنا چاہتا ہو کہ یہ لباس بھی مل میلونی کی تخلیق ہے۔

مل میلونی نے ایبری ہیبر کو آنکھ ماری۔ ہیبر کا چہرہ تمتما اٹھا۔

''تو جناب... وہ گاک کے تلوؤں بیچ کھڑی تھی... اور گاک فرش پر دری کی طرح بچھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کا تاثر تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ گم صم کھڑی تھی۔ 'تم کہاں سے آئی ہو؟' میں نے اس سے پوچھا۔ وہ چند لمحے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر اس کے منہ سے نامانوس الفاظ کا فوارہ ابل پڑا۔ انداز ایسا تھا، جیسے وہ غصے میں ہے... اور پریشان بھی ہے۔

''ایسے میں مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟'' میلونی نے سوال اٹھایا۔ ''مجھے گاک کو فرش سے اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دینا چاہیے تھا۔ یوں شاید وہ اپنی دنیا میں واپس چلی جاتی۔ لیکن اس سے پہلے ہی وہ گاک سے اتر آئی اور میری حماقت دیکھیے۔ میں نے گاک کو زور زور سے گھمانا شروع کر دیا۔ یعنی کوئی حسابی گڑبڑ کر دی، جس سے اس کی دنیا اوجھل ہو گئی۔

''اس کا میک اپ میرے لیے حیران کن تھا۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک نہیں تھی۔ دونوں پلکوں کے کناروں پر چھوٹے سرخ موتی جھول رہے تھے۔ ہر دانت پر سبز رنگ کے چھوٹے چھوٹے مثلث پینٹ کیے گئے تھے۔ ہیئر اسٹائل زیادہ حیران کن نہیں تھا۔ کیونکہ آج کل ایسے ایسے اسٹائل دیکھنے میں آتے ہیں کہ اب انہیں دیکھ کر حیرت بھی نہیں ہوتی۔

''تو جب اس نے گاک میرے ہاتھ میں دیکھا تو مجھ پر جھپٹی۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ آنکھوں میں التجا تھی۔ وہ گاک میں قدم رکھ دینا چاہتی تھی۔ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اسے پیچھے دھکیلا۔ اور جلدی سے گاک کو ورک

www.pkdigest.com

شیخ پر کس دیا۔ پھر میں نے اسٹیل کی ایک سلاخ لی جس کے ایک سرے پر سیمنٹ کا کور چڑھا تھا۔ میں نے اس سلاخ کو گاک میں دھکیل دیا۔ گاک کی تاریکی کے عقب میں خوفناک گرمی تھی۔ چند سیکنڈ میں سلاخ سرخ انگارہ بن گئی۔

''وہ میری بات سمجھ گئی۔ کیونکہ اس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔ آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔

''پھر وہ اوپر کی طرف دوڑی۔ میں نے دیکھا، اس نے سیدھا دروازے میں گھسنے کی کوشش کی تھی، جیسے اسے امید ہو کہ دروازہ خود بہ خود کھل جائے گا۔ اس سے پہلے کہ میں اس تک پہنچتا وہ تاب کے سسٹم کو سمجھ کر دروازہ کھول چکی تھی۔ اوپر پہنچ کر وہ گیٹ کی طرف لپکی۔

''یہی وہ وقت تھا کہ جب جاسوس آنٹی نے اسے دیکھا ہوگا۔ میں نے چیخ کر لڑکی کو پکارا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے اسے چمکار، دلاسا دینے کی کوشش کی مگر وہ کھڑی رہی۔ پھر میں بہلا پھسلا کر اسے گھر میں لے آیا۔ میں نے اتنی خوب صورت لڑکی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کی جلد بہت حسین تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ بال ایسے سرخ تھے کہ آپ نے ایسا شیڈ بھی نہ دیکھا ہو۔

''اب وہ کہاں جاتی، وہ میری ذمے داری تھی۔ اسے ویلفیئر ڈیپارٹمنٹ کے سپرد کر دوں، اس پر میرا دل نہیں مانا تھا۔ میں نے گھر کے فاضل کمرے میں اس کے سونے کا بندوبست کر دیا۔ مجھے اس کو بہت کچھ سکھانا پڑا۔ نل کھولنا، لائٹ آن اور آف کرنا وغیرہ۔

''چار دن تک اس نے رونے کے سوا کوئی کام نہیں کیا۔ میں نے اسے کھانا دیا۔ لیکن اس نے نہیں کھایا۔ میں اس کی طرف سے فکرمند رہنے لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کی دنیا کا دروازہ کیسے تلاش کروں۔ اس کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ یوں میں اسے کسی بھی دنیا میں دھکیل دیتا لیکن یہ زیادتی ہوتی۔

''چھٹے دن میں تہ خانے سے نکلا تو وہ آرام کرسی میں دراز کسی میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ میگزین میں عورتوں کی جو تصویریں تھیں، انہیں وہ بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور مسکرائی۔ یہ اس دن کی بات ہے، جب میں بازار گیا اور اس کے لیے لباس خرید کر لایا۔ میں نے اسے زپ بند کرنا اور کھولنا اور بٹن لگانا سکھایا۔ اس نے نئے کپڑے پہنے تو پھر مسکرائی۔ اس روز اس نے کھانا بھی کھایا۔ میں اسے مختلف چیزوں کے نام بتاتا رہا۔

''اس دوران میں نے اسے جس چیز کا نام بتایا، وہ اسے کبھی نہیں بھولی، اس کی یادداشت غضب کی تھی۔ ذہانت غیر معمولی تھی۔ کوئی دس دن بعد مجھے اس کا نام معلوم ہوا۔ راجاپاچالنڈا کینا۔ میں اسے کینا کہہ کر پکارتا تھا تو اسے اچھا لگتا تھا۔ پہلا جملہ جو اس نے ادا کیا، وہ یہ تھا۔ 'کینا کہاں ہے؟'

''یہ بڑا مشکل سوال تھا۔ کیونکہ اس کے دو پہلو تھے... زمان و مکاں۔ کب اور کہاں! یہ دنیا کون سی جگہ ہے۔ کہاں ہے؟ اسپیس کے کس حصے میں ہے؟ وقت کے دھارے کی کس پٹی میں؟ اب میں اسے یہ جواب دیتا کہ یہ دنیا ہے تو کیا فائدہ ہوتا۔ یا یہ کہ یہ ہماری دنیا ہے۔ کیونکہ اب میں نے جان لیا تھا کہ کائنات میں ایک سے زیادہ دنیائیں موجود ہیں۔ کتنی... یہ میں نہیں جانتا تھا۔

''لکھنا اس کے لیے لفظوں کا ساؤنڈ سمجھنے سے زیادہ دشوار ثابت ہوا۔ اس نے مجھے اپنی تحریر دکھائی۔ اس نے کاغذ کا ایک ٹکڑا لے کر قالین پر رکھا۔ پنسل ہاتھ میں بالکل سیدھی پکڑی اور پنسل کو ہتھوڑے کی طرح استعمال کرنے لگی... کاغذ کے داہنے کارنر سے نیچے کی طرف۔ پھر اس نے عبارت پڑھی... اور صحیح کرتے ہوئے .... کاغذ میں ایک سوراخ کا اضافہ کیا، تب میری سمجھ میں آیا کہ وہ سوراخ کی شکل میں لکھی جانے والی تحریر ہے جیسے بریل...

''اس کا ... بہت تیزی سے پڑھنا سیکھیں۔ ایک دن میں اس کے لیے ریاضی کی کتابیں خریدنے گیا۔ واپس آیا تو اس نے بتایا۔ ''آدمی آیا جب ملی گیا تھا۔'' وہ مجھے ملی کہہ کر پکارتی تھی۔ ''کینا چھپ گیا۔''

میں نے فوراً تہ خانے کا رخ کیا۔ وہاں سے صرف ایک چیز غائب تھی... گاک، جو کینا کے لیے اپنی دنیا میں واپسی کا واحد ذریعہ تھا۔ یہ طے تھا کہ جم فنچ گاک اٹھا کر لے گیا ہے۔ میں فوراً ہی نکلا اور اس کے گھر گیا۔ میں اس کا دروازہ پیٹنے لگا۔ اس نے زنجیر لگاتے ہوئے دروازہ کھولا۔ تاکہ پانچ انچ سے زیادہ نہ کھلے۔ میں اندر نہیں گھس سکتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اس نے میرا گاک چرا لیا ہے۔ اس نے کہا۔ 'جاؤ... جا کر پولیس میں چوری کی رپورٹ درج کراؤ۔ انہیں یہ بھی تفصیل سے بتانا کہ کیا چیز چرائی گئی ہے۔' اس کی آنکھوں کی فاتحانہ چمک بتا رہی تھی کہ گاک اس کے پاس ہے۔ 'انہیں یہ بھی بتانا کہ وہ تمہیں ملا کہاں سے تھا۔' اس نے مزید کہا۔

''میں پریشان ہو گیا۔ واقعی میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں واپس چلا آیا۔

''کینا کی انگریزی تیزی سے بہتر ہو رہی تھی۔ اب وہ

میری فزکس اور کیمسٹری کی کتابوں میں گھسنے لگی تھی۔ مگر انہیں پڑھ کر وہ الجھتی تھی اور کہتی تھی... تم لوگ کئی ہزار سال پیچھے کے لگتے ہو... بالکل ابتدائی دور کے آدمی۔ اس نے مجھے اپنی دنیا کے بارے میں بھی بہت کچھ بتایا۔ وہاں شہر نہیں ہوتے۔ گھر بہت زیادہ فاصلے پر ہوتے ہیں۔ ہر ایک کو اس کی اہلیت کے مطابق ذمے داری سونپی جاتی ہے۔ زیادہ تر لوگوں کو ثقافتی ذمے داریاں تفویض کی جاتی ہیں۔ کینا خود ڈیزائنر تھی۔ اپنے کام کے سلسلے میں اسے پوری کائنات میں استعمال ہونے والے کپڑے کے میٹریل کی کمپوزیشن کے بارے میں جاننا تھا۔

''وہ باتیں کرتی تھی اور میں نوٹس لیتا تھا۔ یور آنر! اس وبال سے نکلنے کے بعد میں جو کچھ کروں گا، وہ پلاسٹک انڈسٹری میں انقلاب لے آئے گا۔

''کینا ذہین تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ کس طرح اچانک میرے تہ خانے میں نمودار ہوئی... اور کیوں اور کیسے... تو اس نے اس حقیقت کو فوری طور پر قبول کر لیا۔ میں نے بھی یہ حقیقت اسے بہت آہستہ آہستہ بتائی تھی۔ میری پوری بات سننے کے بعد وہ دیر تک ساکت و صامت بیٹھی رہی تھی۔ پھر وہ بولی۔ 'یہ ممکن نہیں کہ میری وہاں سے روانگی کا کسی کو علم نہ ہوا ہو۔ شاید میرے بارے میں لوگوں کی نظریں اس مقام کو ... ہوں گی جہاں کھڑی میں اپنے چند دوستوں سے بات کر رہی تھی۔ بلکہ ممکن ہے، اب تک انہوں نے میرے غائب ہونے کا سبب جان لیا ہو۔ اب وہ اس دنیا کو چھان ماریں گے اور بالآخر مجھے تلاش کر کے واپس لے جائیں گے۔'

''اگر ہمارے پاس گاک موجود ہو تو اس سے کچھ زیادہ آسانی نہیں ہو جائے گی تمہاری واپسی میں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔ اس کی اتنی ضرورت نہیں۔ ہوتی تو میں خود ہی جم فنچ کے پاس چلی جاتی۔ مجھے لوگوں کو قابو میں کرنے کا طریقہ آتا ہے۔ ایک بار اس کی آنکھوں میں دیکھ لوں تو میں اس پر پوری طرح قابو پا سکتی ہوں بلکہ میں تو اس کے دل کو بھی بند کر سکتی ہوں۔

''میرے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ خوب صورت انداز میں مسکرائی۔ 'جب تم نے مجھے اس گاک میں کودنے سے روکا تھا تو میں نے تقریباً تمہارا کام تمام کر دیا تھا۔'' اس نے سادگی سے کہا۔ ''یہ کام ہماری دنیا کا ہر شخص بہ آسانی کر سکتا ہے۔''

''خیر جناب، پھر جون آیا اور گزر بھی گیا۔ کینا کا یقین پختہ ہو گیا کہ اس کے لیے امداد آنے ہی والی ہے۔ اس کی زبانی اس کی دنیا کے متعلق سنتے سنتے مجھے بھی اس بات کا یقین ہو گیا کیونکہ وہ لوگ واقعی ہم سے ہزاروں سال آگے معلوم ہوتے تھے۔ وہاں جنگیں نہیں ہوتی تھیں۔ وہ لوگ تمام بیماریوں پر قابو پا چکے تھے... بلکہ خاتمہ کر چکے تھے بیماریوں کا۔

''اور جیسے جیسے میرے ہاں اس کا قیام طویل ہوتا گیا، اس سے جدائی کا تصور مجھ پر شاق گزرنے لگا۔ لیکن اس کی یہی خواہش تھی۔ میں نے خود کو اس کی جگہ رکھ کر سوچا کہ اگر کوئی مجھے چند ہزار سال پیچھے دھکیل دے تو وہاں میرا دل لگے گا بھلا۔ میں تو جلد از جلد اپنی دنیا میں واپس آنا چاہوں گا۔ یہی حال کینا کا بھی تھا۔

''10 جولائی کو جم فنچ نے مجھے فون کیا۔ اس کی آواز لرز رہی تھی۔ اس نے کہا۔ 'میلونی، میں وہ چیز تمہیں واپس دینا چاہتا ہوں۔ ابھی... اسی وقت۔' لیکن فنچ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے بدن کا میل بھی کسی کو نہ دیں۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ کینا کی دنیا کے لوگ اس کے پیچھے پڑ گئے ہوں گے۔ چنانچہ میں اس کا مذاق اڑانے... اس پر ہنسنے لگا۔ شاید میں اس لیے بھی ہنس رہا تھا کہ خود بھی خوف زدہ تھا اور اپنا خوف اس سے چھپانا چاہتا تھا۔ بات ڈرنے کی بھی تھی۔ اگر وہ کسی اور دنیا سے چند ہزار سال آگے کا کوئی بم گاک سے نکال لایا ہے تو...؟ میں نے کہا۔ 'اگر اس سے کھیل کھیل کر دل بھر گیا ہے تو اب اسے جلا ڈالو۔'

''اس پر جم فنچ گڑگڑانے لگا۔ میں نے اسے کبھی اس طرح بات کرتے نہیں سنا تھا۔ 'وہ نہ جلتا ہے، نہ ٹوٹتا ہے۔ اسے تباہ کرنے کی کوئی صورت نہیں۔' اس نے بلبلا کر کہا۔ 'تم نہیں لیتے تو نہ سہی۔ میں ابھی باہر آ رہا ہوں۔ بنگلے کے پاس کھڑے ہو کر اس بلا کو تمہارے باغیچے میں پھینک دوں گا۔''

''میں اپنے دروازے کی طرف لپکا۔ میں نے اسے بھاگ کر گھر سے نکلتے دیکھا۔ اس نے گاک کو یوں تھاما ہوا تھا، جیسے وہ کوئی دستی بم ہو، جس کی پن کھینچ لی گئی ہو۔ وہ بنگلے کے پاس پہنچا تو مجھے اس کے سر کے گرد دھند کا وہ ہالہ سا نظر آیا۔ اس کا قطر کوئی دس فٹ رہا ہوگا۔ اس حلقے کے اندر گہرے نیلے رنگ کی بہت بڑی سنسی تھی۔ اس کے جبڑے کم از کم جج صاحب کی ڈیسک کی چوڑائی جتنے تو ہوں گے۔

''میرے دیکھتے ہی دیکھتے سنسی نے جھپٹا مارا اور جم فنچ کو سر سے پکڑ لیا۔ سنسی کے جبڑے بہت سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ چرچراہٹ کی آواز آئی اور فنچ کے سر کی تمام ہڈیاں بیک وقت چٹخ گئیں۔ فنچ کے ہاتھوں سے گاک چھوٹ گیا۔ ایک

www.pkdigest.com

لمحے کو وہ سنسنی کی گرفت میں لٹکا رہا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس دھند نے اسے نگل لیا۔ میری آنکھوں کے سامنے یور آنر... وہ غائب ہوگیا۔ پھر دھند کا وہ حلقہ نیچے آتا گیا۔ گھاس کی سطح تک آنے کے بعد وہ تحلیل ہوگیا، جیسے تھا ہی نہیں۔ اس کے ساتھ ہی گاگ بھی غائب ہوگیا۔

''میں اپنے باغیچے میں کھڑا اس صدمے سے سنبھلنے کی کوشش کررہا تھا کہ کی بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے خون دیکھا اور پھر بھاگتا ہوا واپس چلا گیا۔ اس کے بعد پولیس آگئی۔ بس یہ ہے پوری کہانی یور آنر، کینا یہیں موجود ہے۔ جسٹن کل اسے گواہی کے لیے لائے گا۔'' مل میلونی نے جماہی لی اور جیوری کے اراکین کو دیکھ کر مسکرایا۔

ایمری ہیمر اٹھا۔ اس نے اپنے دونوں انگوٹھے پتلون کی بیلٹ میں پھنسائے اور بھاری قدموں سے مل میلونی کی طرف بڑھا۔ وہ دس سیکنڈ تک مل کے مسکراتے چہرے پر نظریں جمائے رہا۔ مل نے پہلو بدلا اور بے چین نظر آنے لگا۔

ایمری ہیمر نے دھیمی آواز اور تلخ لہجے میں کہا۔ ''گاگ! سونے کا بچھو! نامعلوم دنیا میں! نیلے جزیرے!'' اس نے گہری سانس لی اور اراکین جیوری کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ ذہین اور تعلیم یافتہ لوگ ہیں میلونی۔ میں تم سے کوئی سوال نہیں کروں گا۔ پریوں کی کہانی پر جرح نہیں کی جاسکتی۔''

کورٹ میں سرگوشیاں گونجنے لگیں۔ جج نے کئی بار میز کو ہتھوڑے سے بجایا تو خاموشی ہوئی۔ پھر جج نے سماعت اگلی صبح تک کے لیے ملتوی کردی۔

☆☆☆

اگلی صبح مل میلونی کو اس کی کوٹھری سے نکال کر عدالت میں لایا گیا تو جیوری کے اراکین نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ یہ بات طے تھی کہ میلونی نے بہت خراب رات گزاری ہے اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے تھے۔ وہ تھکے تھکے انداز میں بیٹھا اور چہرہ دونوں بازوؤں میں چھپا لیا۔ وہ لوگ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ میلونی کے کندھے کیوں لرز رہے ہیں۔

جسٹن مارکس کی حالت اس سے بھی زیادہ تباہ تھی۔

مل میلونی نہ جانے کہاں گم تھا۔ لگتا تھا اسے نہیں معلوم کہ وہ اس وقت کہاں ہے... اور اسے اس کی پروا بھی نہیں تھی۔

جسٹن مارکس نے کھڑے ہوکر کہا۔ ''یور آنر! ہماری درخواست ہے کہ سماعت کو 24 گھنٹے کے لیے ملتوی کردیا جائے۔''

''وجہ بھی تو بتاؤ۔'' جج نے کہا۔

''یور آنر... آج میں اس عورت کینا کو گواہی کے لیے لانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ ہوٹل ہولی فیلڈ کے ایک کمرے میں مقیم تھی۔ گزشتہ رات مجھ سے گفتگو کرنے کے بعد وہ گیارہ بجے اپنے کمرے میں گئی تھی اس وقت سے اب تک اسے کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ اس کا کمرا خالی ہے۔ اس کی تمام چیزیں کمرے میں موجود ہیں۔ لیکن وہ غائب ہے۔ مجھے اس کو تلاش کرنے کے لیے مہلت درکار ہے یور آنر!''

جج بے حد مایوس نظر آنے لگا۔ اس نے اپنے ہونٹ سکیڑے اور بے حد شیریں لہجے میں جسٹن مارکس سے پوچھا۔ ''تمہیں یقین ہے کہ ایسی کسی عورت کا وجود ہے؟''

جسٹن مارکس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ ایمری ہیمر خوش نظر آنے لگا۔ ''جی ہاں یور آنر! کل رات ہی تو میں...''

''اس کی دنیا کے لوگ آئے اور اسے لے گئے۔'' مل میلونی نے بھاری لہجے میں کہا۔ اس نے نظریں نہیں اٹھائی تھیں۔

جیوری کے اراکین پہلو بدلنے لگے۔ وہ اس خوب صورت سرخ بالوں والی کو دیکھنے کے لیے رات بھر بے چین رہے تھے، جو اس دنیا کی مخلوق نہیں تھی۔ اس کی گواہی کے بغیر مل میلونی کی سنائی ہوئی کہانی قطعاً لغو اور بے ہودہ تھی۔ اور ایسی لغو کہانی انہوں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ ایسے پیارے نوجوان کو الیکٹرک چیئر پر بٹھانے کا تصور روح فرسا تھا۔ لیکن لوگوں کو یہ اجازت بھی نہیں دی جاسکتی کہ وہ اپنے پڑوسیوں کو اتنی بے رحمی سے قتل کریں اور پھر ایسی لغو کہانیاں سنا کر باعزت بری ہوجانے کے خواب دیکھیں۔

''ارے... یہ کیا...؟'' جج نے اچانک کہا۔

☆☆☆

ابتدا میں وہ گنگناہٹ سی تھی۔ آواز کے بجائے اسے ارتعاش کہنا زیادہ مناسب تھا۔ ایسا لگ رہا تھا، جیسے زمین اپنی گہرائی میں کہیں دھڑک رہی ہے۔ پھر دھمک میں اضافہ ہوتا گیا۔ جج نے اگر اس سلسلے میں مزید کچھ کہا بھی ہوتا تو کسی نے سنا نہ ہوتا۔ وہ میز پر ہتھوڑے مارتا رہا۔ لیکن وہ آوازیں کسی نے نہیں سنی۔

آہستہ آہستہ کورٹ روم اس آواز سے گونجنے لگا۔ کھڑکیوں کے شیشوں کے چٹخنے کا ارتعاش سنائی دیا۔ لیکن شیشے کے ٹوٹ کر گرنے کی آواز سنائی نہیں دی۔ ایک شخص جو نظر کا چشمہ لگائے ہوئے تھا، کھڑکی کے خالی فریم کو حیرت سے دیکھتا رہا۔

آواز انسانی سماعت کی آخری حدود سے گزر کر سپر سانک ہوگئی۔ کورٹ روم میں موجود ہر شخص کو اپنے سر میں درد کا احساس ہونے لگا۔

پھر آواز اچانک ہی رک گئی جیسے رات میں ابھرنے والی کوئی چیخ۔

ایک لمبے کو ٹھوس دیوار پر دھند کی بنی ہوئی ایک محراب سی ابھری۔ اس کے عقب میں نیلگوں پہاڑوں کا مدھم سا سلسلہ نظر آرہا تھا۔ حالانکہ وہاں پہاڑ تھے ہی نہیں۔

وہ تیزی سے اس محراب سے گزر کر آئی پھر محراب ہوا میں تحلیل ہوگئی۔ وہ دراز قد نہیں تھی۔ لیکن طویل القامتی کا تاثر چھوڑتی تھی۔ اس کے بالوں کی سرخ رنگت چونکا دینے والی تھی۔ اسے کسی حد تک شراب سرخ سے تشبیہ دی جاسکتی تھی۔ اس کی جلد اتنی شفاف تھی کہ نیلگوں معلوم ہوتی تھی۔ اس کی آنکھیں شہد رنگ تھیں۔ اس کی دونوں پلکوں کے کناروں سے چھوٹے سرخ موتی آویزاں تھے۔ اس کے بھرے بھرے ہونٹ ادھ کھلے تھے۔ اس کے دانتوں پر پینٹ کیے ہوئے سبز مثلث نظر آرہے تھے۔ اور وہ چاندی کے تاروں والے اس لباس جیسا پہنے ہوئے تھی، جسے وہ لوگ چھو کر دیکھ چکے تھے۔ مگر یہ لباس سنہرا تھا اور وہ لباس بغیر کسی ظاہری سپورٹ کے اس کے جسم سے چپکا ہوا تھا۔

اس نے کورٹ روم میں ادھر اُدھر دیکھا۔

میلونی کی آنکھوں میں قندیلیں جل اٹھیں۔ ''کینا۔'' اس نے پکارا۔

www.pkdigest.com

لڑکی اس کی طرف لپکی اور والہانہ انداز میں اس سے لپٹ گئی۔ میلونی دھیرے دھیرے اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ جیوری کے اراکین سننے کے لیے سماعت پر زور دے رہے تھے۔

ایمری ہیمر نے سب سے پہلے خود کو سنبھالا۔ اسے احساس ہوگیا تھا کہ اس کا کیس بھی ہوا میں تحلیل ہورہا ہے۔

''یہ ٹیپنا جرم ہے۔'' اس نے دہاڑ کر کہا۔

حاضرین کو خاموش کرنے کے لیے جج کو پورے ایک منٹ تک ہتھوڑے بازی کرنی پڑی۔ جب خاموشی ہوگئی تو اس نے کہا۔ ''اب شور ہوا تو میں کمرا خالی کرانے کا حکم دے دوں گا۔''

میلونی جیسے اچانک جی اٹھا۔ لڑکی اس کے زانو پر بیٹھی اس سے پوچھ رہی تھی۔ ''یہ لوگ کیا کررہے ہیں تمہارے ساتھ؟''

وہ مسکرایا۔ ''یہ مجھے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میں نے جم فنچ کو قتل کیا ہے۔''

لڑکی نے سر گھمایا۔ اس کی نظریں جج اور اراکین جیوری کے چہروں پر جم گئیں۔ ''اسٹوپڈ۔'' وہ پھنکاری۔

عدالت کی کارروائی تیزی سے شروع ہوئی۔ کینا سے حلف لیا گیا کہ وہ جو کچھ کہے گی، سچ کہے گی اور سچ کے سوا کچھ نہ کہے گی۔ یہ جان کر کہ میلونی نے جو کچھ کہا تھا حرف بہ حرف درست تھا، جسٹن کی خود اعتمادی بحال ہوگئی۔ رات ہوٹل کے لاؤنج میں تو وہ اسے عام سی لڑکی لگ رہی تھی۔ اس نے کینا سے ماہرانہ انداز میں سوال کیے۔ کینا نے میلونی کی کہی ہوئی ہر بات کی تائید کی۔ میلونی سحر زدہ سا اسے دیکھے جارہا تھا، جیسے اس کے چہرے سے نظریں ہٹانا اس کے اختیار میں نہ ہو۔ کینا کا لہجہ عجیب سا تھا اور آواز میں خوب صورت بھاری پن تھا۔

جسٹن مارکس نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے احتراماً ایمری ہیمر کے سامنے سر خم کیا۔ ''آپ جرح کرسکتے ہیں۔''

ہیمر نے سر کو تفہیمی جنبش دی، اٹھا اور آہستہ آہستہ کینا کی طرف بڑھا۔ چند لمحے کینا کو بغور دیکھنے کے بعد اس نے کہا۔ ''خاتون... آپ کی اداکاری کی بے پناہ صلاحیتوں کو سلام۔ ایک بات بتائیں، آپ نے تربیت کہاں سے لی ہے اداکاری کی؟ یقینی طور پر آپ اسٹیج پر بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرتی رہتی ہیں۔''

''اسٹیج؟''

''آپ زیادہ بننے کی ضرورت نہیں۔ یہ سب کچھ دلچسپ ضرور ہے مگر اب ہمیں خوابوں کی اس دنیا کو خیرباد کہہ کر حقائق کی طرف آجانا چاہیے۔ آپ کا اصلی نام کیا ہے؟''

''راجاپا چالنڈا کینا۔'' کینا نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

ہیمر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''یعنی آپ اپنے اس فکشن پر جمے رہنا چاہتی ہیں۔ بہرحال، مجھے یقین ہے کہ ہدایت کاری کے فرائض ملزم مل میلونی نے کامیابی سے ادا کیے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ جیوری کی طرف مڑا اور فخریہ انداز میں مسکرایا۔ پھر وہ کینا کی طرف مڑا۔ ''تو مس نامعلوم، وکیل صفائی نے اس پر انحصار کیا ہے کہ تم کسی اور دنیا سے آئی ہو... یا کسی اور وقت سے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ہم پر یہ بات ثابت کردو کہ تم واقعی اس دنیا کی نہیں ہو۔'' اس کا لہجہ زہریلا ہوگیا۔ ''دو چار کام ایسے کرکے دکھاؤ محترمہ جو ہم فانی انسان نہیں کرسکتے۔''

کینا سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے اپنی ٹھوڑی ہاتھ پر ٹکا دی۔ چند لمحے بعد وہ بولی۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ تم لوگ کیا کچھ کرسکتے ہو اور کیا نہیں کرسکتے۔ زمانۂ جاہلیت کے بیشتر لوگوں نے جو کچھ سیکھا، وجدان کی مدد سے سیکھا۔ کیا میرا یہ خیال درست ہے کہ کٹہرے کے اس پار بیٹھے ہوئے وہ لوگ میرے ہم

کی زندگی اور موت کا فیصلہ کریں گے۔" اس نے جیوری کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں... یہ درست ہے۔"

کینا نے سر گھمایا اور جیوری کے اراکین کو دیر تک گھورتی رہی۔ وہ ایک ایک چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ جیوری کے اراکین مضطرب ہو کر پہلو بدلنے لگے۔ "عجیب بات ہے۔" کینا نے کہا۔ "دوسری قطار میں بائیں جانب جو عورت بیٹھی ہے، اس کی یہاں موجودگی عجیب ہے۔ اسے تو یہاں نہیں ہونا چاہیے۔ زیادہ عرصے پہلے کی بات نہیں کہ اس نے اپنے شوہر کو زہر دیا تھا۔ وہ طویل عرصے...... بیمار رہا اور پھر مر گیا۔ کیا یہ تمہارے احمقانہ قانون کے خلاف نہیں؟"

جس عورت کی طرف اس کا اشارہ تھا، وہ گھبرا گئی۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنے حلق پر گیا، آنکھوں کے حلقے اوپر کی طرف گئے اور وہ اپنی کرسی سے لڑھک گئی لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ سب کی نظریں کینا کی طرف تھیں۔

کورٹ روم کے عقبی حصے میں حاضرین میں بیٹھی ہوئی ایک عورت چلائی۔ "مجھے شبہ تھا کہ ڈیو کی موت میں کوئی گڑبڑ ہے۔ مسز والٹسن کو فوراً گرفتار کیا جائے۔"

کینا نے سر گھما کر اس عورت کو دیکھا جس نے یہ مطالبہ کیا تھا۔ وہ عورت گڑبڑا کر بیٹھ گئی۔ "جس ڈیو کی تم بات کر رہی ہو، اسے اس کی بیوی نے تمہاری وجہ سے قتل کیا تھا۔ میں یہ بات تمہاری آنکھوں میں پڑھ سکتی ہوں۔"

ایمری ہیٹر یوں منہ چلانے لگا، جیسے منہ میں کوئی مزے دار چیز ہو۔ "شان دار! اچھی ترکیب ہے۔ لیکن محض تخیل۔ یعنی تم اس صورت حال کے لیے تیار تھیں پہلے سے۔ تمہیں پہلے سے بتا دیا گیا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ کیا خیال ہے خاتون؟"

کینا کی آنکھیں شعلے اگلنے لگیں۔ "تم بہت بدتمیز آدمی ہو...... دوسروں کی توہین کرنے والے۔" اب وہ ایمری ہیٹر کو گھور رہی تھی۔ ہیٹر کے پسینا چھوٹنے لگا۔ اچانک اس نے ناچنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بری طرح چیخ بھی رہا تھا۔ پھر اس کی جیبوں سے دھواں نکلنے لگا۔ وہ پاگلوں کی طرح اچھل اچھل کر جیبوں سے چیزیں نکال کر پھینکنے لگا۔ شکاری چاقو، سکے اور نوٹ کلپ۔ وہ تمام چیزیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ فضا میں گوشت جلنے کی بو پھیلنے لگی۔

پھر ہیٹر کے ٹائی پن سے دھواں اٹھنے لگا۔ اس نے اسے نکال پھینکا۔ اب اس کی انگلیوں سے بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ ٹائی پن کے بعد بیلٹ کے بکل کی باری آ گئی۔ اس وقت تک فرش پر پڑے سکے پگھل چکے تھے۔ آخر میں اسے جوتے بھی اتارنے پڑے۔ تسمہ ڈالنے والے سوراخوں کے گرد بھی دھات لگی تھی۔ اس کے نتیجے میں چمڑا بھی جلنے لگا تھا۔

ایمری ہیٹر اب ہانپ رہا تھا۔

کینا مسکرائی۔ "ہاں... اب تمہارے پاس دھات کی کوئی چیز نہیں ہے۔" اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "اور ثبوت چاہتے ہو؟"

ایمری ہیٹر نے تھوک نگلتے ہوئے جیوری کی طرف دیکھا۔ پھر جج کو دیکھا جس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ "استغاثہ کیس واپس لیتا ہے۔" اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

جج کا کھلا ہوا منہ بند ہو گیا۔ "کیس خارج کیا جاتا ہے۔" اس نے کہا۔ پھر وہ کینا کی طرف مڑا۔ "خاتون... میری تجویز ہے کہ تم وہیں واپس چلی جاؤ، جہاں سے آئی ہو۔"

کینا مسکرائی۔ "نہیں... اب یہ ممکن نہیں۔ میں واپس گئی تھی۔ مگر مجھے وہ دنیا بے حد خالی خالی لگی۔ وہ لوگ میرے بنے کپڑوں پر ہنسنے لگے۔ میں نے کہا... میں ملی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ انہوں نے کہا... کوئی مسئلہ نہیں۔ اسے بھی لے آئیں گے مگر میں جانتی تھی کہ ملی وہاں خوش نہیں رہے گا۔ چنانچہ میں خود ہی آ گئی۔"

میلونی اٹھا۔ اس نے جمائی لی اور پھر انگڑائی لی۔ وہ پھر جیوری کے اراکین کو دیکھ کر مسکرایا۔ وہ اپنی ساتھی عورت کو سہارا دے کر اٹھا رہے تھے۔ وہ اب بھی ہوش میں نہیں تھی۔ میلونی نے مسکراتے ہوئے کینا کو دیکھا۔ "گھر چلیں بی بی؟"

وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دروازے سے نکل گئے۔ کسی کو انہیں روکنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

انیتا ہیپ فلیٹ کو شدت سے یاد آ رہا تھا کہ جس شخص نے 31 سال پہلے شادی کے دن قربان گاہ پر اسے گھنٹوں بے سود انتظار کرایا تھا، بالآخر اس کے گھر کے عقبی باغیچے میں دفن کر دیا گیا تھا، اس نے خود اسے قتل کیا تھا... بے وفا کو...

یہ سوچتے ہوئے وہ مسکرائی اس نے اپنے اردگرد بیٹھے لوگوں کو مسکراہٹ سے نوازا اور گونج دار آواز میں بولی۔ "میں اتنا جانتی ہوں کہ یہ لڑکی بہت اچھی پڑوسن ثابت ہو گی۔ مجھے اجازت دیں اسے اسٹرابری کی سویٹ ڈش بنا کر کھلاؤں گی آج۔"

پہلا رنگ

منظر امام

تماشا گر

پنجرہ سونے کا ہو...... یا لوہے کا ...... ہوتا وہ اسیری کا ٹھکانہ ہی ہے

ایک ایسی لڑکی کی کہانی جس کی دنیا میں کسی بھی مرد کا داخلہ ممنوع تھا جو اپنے گھر میں رہتے ہوئے بھی اجنبی تھی...... اس بوجھل اور کشیدہ ماحول میں گزرے ہوئے لمحوں تک میں گھٹن کا احساس رچا بسا تھا...... وہ ہر صورت اس قید خانے سے نکلنا چاہتی تھی

پابندیوں...... قاعدے قوانین کے تناظر میں لکھا گیا ایک عجیب و دلچسپ سرورق

جب بارش ہوتی تھی تو جیرو اس گنبد کے نیچے آ کر بیٹھ جاتی۔ یہ گنبد حویلی کی چھت پر بنا ہوا تھا۔ لوہے کے چار ستون جس پر بیلیں لپٹی ہوئی تھیں اور ان ستونوں کے اوپر ایک گنبد نما

چھت... جس کے نیچے ایسے ہی موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے بید کی کرسیاں لا کر رکھ دی گئی تھیں۔

یہاں بیٹھ کر دور تک دیکھا جا سکتا تھا۔

اور دور تک تھا بھی کیا... حویلی کی بہت اونچی سی دیوار۔ اس دیوار کی دوسری طرف جو کچھ بھی تھا، وہ حویلی سے دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔

دیواریں اتنی اونچی بنائی گئی تھیں کہ ان کے درمیان لوہے کا ایک بڑا سا پھاٹک تھا اور اس پھاٹک سے اس طرف حویلی کا وسیع و عریض باغ جس میں طرح طرح کے درخت لگائے گئے تھے۔ ان درختوں کے درمیان مور، ہرن اور خرگوش وغیرہ لا کر چھوڑ دیے گئے تھے۔

عمیرہ کے لیے یہی پوری کائنات تھی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس پھاٹک کے دوسری طرف کیا ہے۔ اسے حویلی سے نکلنے نہیں دیا جاتا تھا۔ وہ حویلی مراد شاہ کی تھی اور مراد شاہ عمیرہ کا باپ تھا۔ عمیرہ اس کی اکلوتی اولاد تھی۔

حویلی کی چھت سے بہت دور پہاڑیاں دکھائی دیتی تھیں اور عمیرہ یہ سوچتی کہ کاش وہ کوئی پرندہ ہوتی جو پرواز کرتا ہوا ان پہاڑیوں تک چلا جاتا۔

وہ اکثر سوچتی کہ اس طرف کیسے لوگ رہتے ہوں گے؟ کیا کرتے ہوں گے؟ ان کی زندگی کس طرح گزرتی ہو گی؟ اور بھی طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن میں آتے لیکن کسی سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

کسی کے قدموں کی آہٹ نے اسے چونکا دیا۔ آنے والی اس کی ملازمہ رقیہ تھی... جو اپنے ہاتھ میں ایک ٹرے اٹھا کر لا رہی تھی۔ اس میں عمیرہ کے لیے چائے اور پکوڑے تھے۔

رقیہ بارش میں اس قسم کا اہتمام کیا کرتی تھی۔

عمیرہ کی امی کا بہت پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ عمیرہ..... اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ اسے اپنی ماں کی صورت بھی یاد نہیں تھی۔ اس کی پرورش اس کے بابا مراد نے کی تھی اور وہ بھی اس انداز سے کہ شاید دنیا کی کسی لڑکی کی اس طرح پرورش نہ کی گئی ہو۔

اس نے سوائے اپنے بابا مراد کے اور کسی مرد کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ مراد شاہ نے اس پر کسی مرد کا سایہ بھی نہیں پڑنے دیا تھا۔

اس حویلی میں کوئی بھی مرد ملازم نہیں تھا۔ کام کرنے والی سب کی سب عورتیں تھیں۔ انتہا یہ تھی کہ اسے اسکول تک نہیں بھیجا گیا تھا۔ اس کی ساری تعلیم گھر پر ہی ہوئی تھی اور تعلیم دینے والی بھی خواتین ہی تھیں جنہیں منہ مانگے معاوضے پر شہر سے لا کر اس حویلی میں رکھا جاتا تھا۔

حویلی میں عمیرہ نے اردو، انگریزی... دینیات اور دیگر چیزوں کی تعلیم حاصل کی تھی۔ انتہا یہ تھی کہ یہاں ٹی وی تک نہیں تھا کیونکہ ٹی وی اسکرین پر مرد بھی آیا کرتے تھے۔

عمیرہ ایک ایسے بچے کی طرح تھی جسے باہر کی زندگی اور دنیا کا کوئی اندازہ ہی نہیں تھا۔ ملازماؤں کو سختی کے ساتھ یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ کسی بھی حال میں عمیرہ کے سامنے کسی مرد کا ذکر نہیں کریں گی۔ عمیرہ کے لیے حویلی سے باہر جانے پر بھی پابندی تھی کیونکہ باہر ایک گاؤں تھا اور اس گاؤں میں بہت سے مرد تھے۔ اس کا باپ مراد اس پر بہت مہربان بھی تھا۔ وہ اس کی ہر خواہش پوری کرنے کے لیے بے چین رہا کرتا۔ سوائے اس کے کہ وہ بھی بھولے سے بھی کسی مرد کا نام اپنے ہونٹوں تک بھی نہیں لائے گی۔

حویلی کی ملازم عورتیں عمیرہ کی حالت پر افسوس کیا کرتی تھیں۔ عمیرہ کے پاس ذاتی استعمال کی چیزوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے لیکن اس کی حالت پنجرے میں بند کسی پرندے سے مختلف نہیں تھی۔

رقیہ جب ٹرے اس کے سامنے رکھ کر جانے لگی تو عمیرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ ”رقیہ! سامنے بیٹھ جاؤ۔“ اس نے حکم دیا۔

رقیہ اس کے سامنے والے ایک اسٹول پر بیٹھ گئی۔ وہ حویلی سے باہر گاؤں کی رہنے والی تھی جہاں وہ اپنے ایک بیٹے اور شوہر کے ساتھ رہا کرتی تھی۔

وہ حویلی میں صبح آتی اور رات تک عمیرہ کی خدمت میں لگی رہتی۔ عمیرہ اس سے گاؤں کے بارے میں پوچھتی رہتی تھی۔ اس وقت رقیہ بہت پرجوش ہو کر بتایا کرتی کہ گاؤں کیسا ہوتا ہے۔ کیسی دکانیں ہوتی ہیں۔ کیسی چہل پہل ہوتی ہے۔

اور جب وہ گاؤں کے مردوں کا ذکر کرتی تو عمیرہ کی آنکھوں میں خواب جاگنے لگتے۔ اس نے سوائے اپنے بابا مراد کے کسی کو دیکھا ہی نہیں تھا۔

وہ رقیہ سے پوچھا کرتی۔ ”ایک بات بتا۔ یہ جو مرد ہوتے ہیں، کیا میرے بابا کی طرح ہوتے ہیں؟“

”نہیں بی بی۔ سب کی الگ الگ صورتیں ہوتی ہیں۔ کوئی چھوٹے قد کا، کوئی لانبا، کوئی خوب صورت، کوئی بدصورت... ہر طرح کے ہوتے ہیں۔“

یہ ساری باتیں عمیرہ کے لیے حیران کن ہوتیں۔ رقیہ اسے بتایا کرتی... پوری دنیا میں عورت اور مرد ایک ساتھ مل

جل کر رہا کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔

عمیرہ کے لیے یہ سب کچھ حیرت انگیز تھا۔ اس وقت رقیہ اس سے درخواست کرتی۔ ”بی بی جی! آپ کو میرے بچے کی قسم... آپ سرکار کو مت بتائیے گا کہ میں آپ سے ایسی باتیں کرتی ہوں۔“

رقیہ کو مراد سے بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ ایک تندرست جسم کا باوقار آدمی تھا جس کی آنکھیں سرخ رہتی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر گھنی مونچھیں چھائی رہتیں۔ وہ عام طور پر دھیمے لہجے میں بات کرتا تھا لیکن جب اسے غصہ آتا تو ایسا لگتا جیسے سامنے والی پہاڑیوں سے چٹانیں لڑھک لڑھک کر نیچے آ رہی ہوں۔

بہت پہلے کی بات ہے۔ رقیہ کے بیٹے کی عمر اس وقت صرف چار برس کی تھی۔ رقیہ غلطی سے اسے حویلی میں لے آئی تھی۔ مراد نے اس بچے کو دیکھ لیا تھا۔ وہ غصے سے دہاڑنے لگا۔ ”تجھ میں اتنی ہمت کیسے ہو گئی کہ تو اس بچے کو حویلی کے اندر لے آئی؟“

”سرکار! یہ بہت ضد کر رہا تھا۔ بیمار بھی ہے اسی لیے...“ رقیہ سے مارے خوف کے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

”کیا تجھے نہیں معلوم کہ اس حویلی میں مرد ذات کی کوئی چیز نہیں آسکتی... چاہے وہ دو سال کا بچہ ہی کیوں نہ ہو۔“

اس وقت عمیرہ نے مداخلت کر کے رقیہ کی جان بخشی کروا دی تھی۔ اس کے بعد سے رقیہ مراد سے بہت خوف زدہ رہنے لگی تھی۔

ویسے اس کے علاوہ مراد اس پر مہربان بھی تھا۔

وہ گاہے بہ گاہے اسے بخشش بھی دے دیا کرتا اور یہ بخشش رقیہ کی پورے مہینے کی تنخواہ کے برابر ہی ہوا کرتی تھی۔

ایسے پس منظر میں عمیرہ اپنی زندگی کے دن گزار رہی تھی۔

”جی بی بی!“ رقیہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اسے یاد آیا کہ رقیہ بہت دیر سے اس کے سامنے بیٹھی ہے۔

”رقیہ! یہ بتا جب بارش ہوتی ہے تو پھر تیرے گاؤں والے کیا کرتے ہیں؟“ عمیرہ نے پوچھا۔

”خوب مزے کرتے ہیں جی۔ گانے گاتے ہیں، بھنگڑا ڈالتے ہیں، کبڈی کھیلتے ہیں... اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔“

رقیہ شاید ابھی کچھ اور بھی بتاتی کہ گھنٹی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ یہ گھنٹی اس بات کا اشارہ تھی کہ سرکار نے کسی ملازمہ کو کسی کام کے لیے آواز دی ہے۔

مراد نے پوری حویلی میں اس قسم کی گھنٹیاں لگوا رکھی

قارئین متوجہ ہوں

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

تھیں۔ رقیہ اٹھ کر چلی گئی۔ عمیرہ نے اس کے جانے کے بعد پھر پہاڑیوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

بارش اسی طرح ہو رہی تھی۔

عمیرہ کے لیے یہ سب کچھ ناقابل فہم تھا۔ اس کا باپ ایسا کیوں تھا؟ اس نے عمیرہ کو دنیا بھر کے مردوں سے کیوں کاٹ کر اس ویرانے میں رکھا ہوا تھا؟ عمیرہ نے اگرچہ مردوں کو دیکھا تو نہیں تھا لیکن رقیہ کی باتوں سے اسے بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ وہ ایک ذہین لڑکی تھی اور اسے یہ احساس تھا کہ وہ غیر فطری زندگی گزار رہی ہے۔ شاید دنیا کی کوئی بھی لڑکی اس جیسی زندگی نہیں گزار رہی ہو گی۔

☆☆☆

بارش رات بھر ہوتی رہی۔

دوسری دوپہر کو بارش رکی تو ہلکی ہلکی دھوپ کا احساس بہت خوش گوار تھا۔ ویسے بھی سردیوں کی آمد آمد تھی اور اس موسم میں عمیرہ کو اپنے وسیع و عریض باغ میں ہرنوں کے ساتھ گھومتے رہنا بہت اچھا لگتا تھا۔

ہرن اس سے بہت مانوس تھے۔ اسے دیکھتے ہی اس کے گرد جمع ہو جاتے۔ عمیرہ کے لیے بھی ہرن اس کے دوست تھے۔ وہ ان سے باتیں کیا کرتی۔ ویسے بھی اس کے پاس باتیں کرنے کے لیے زیادہ مواد نہیں ہوتا تھا۔ بس اپنی دن بھر کی مصروفیات تھیں۔ ہاں، اس کے پاس ڈھیری کہانیوں کی کتابیں ضرور تھیں۔ وہ پرندوں کو وہی کہانیاں سنایا کرتی۔ جانوروں کے انداز سے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ سب اس کی باتیں سمجھ رہے ہوں۔

وہ ہرنوں کو ساتھ لے کر آم اور لیچی کے درختوں کے درمیان سے گزرتی چلی گئی اور ایک درخت کے پاس پہنچ کر اس کے پاؤں رک گئے۔

وہ جو کچھ بھی دیکھ رہی تھی، وہ اس کے لیے بالکل نیا تھا۔ کم از کم اس حویلی میں تو اس نے ایسی کوئی چیز پہلے بھی نہیں دیکھی تھی۔

وہ ایک مرد تھا... ایک نوجوان... جو ایک درخت

کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا...۔ شاید بے ہوش تھا یا سو رہا تھا۔ عمیرہ کو یہ اندازہ نہیں ہو سکا کیونکہ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

عمیرہ کو ایسا لگا جیسے اس کے جسم کا سارا خون سمٹ کر اس کے چہرے پر آ گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں اتر آیا ہو۔ وہ زندگی میں پہلی بار اپنے بابا کے علاوہ کسی مرد کو دیکھ رہی تھی۔

اس کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں... تیز اور تیز۔ کون تھا یہ؟ یہاں کس طرح آ گیا تھا؟ زندہ تھا یا مر چکا تھا؟ شاید زندہ ہی تھا کیونکہ اس کی سانسیں چل رہی تھیں۔

اس نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ جب تک انسان کی سانسیں چلتی رہتی ہیں وہ زندہ رہتا ہے۔ تو یہ شخص زندہ تھا... تو پھر کیا ہوا تھا اسے؟ اس کی آنکھیں کیوں بند تھیں؟

اس کا پورا لباس بری طرح بھیگا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی نیلاہٹ تھی۔ شاید وہ ساری رات پانی میں بھیگتا رہا تھا۔

عمیرہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کے لیے کیا کرے۔ کیا اسے مدد کے لیے کسی کو بلا لینا چاہیے؟ لیکن نہیں... اس طرح تو اس کے بابا کو پتا چل جاتا کہ اس کی حویلی میں کوئی مرد داخل ہو گیا ہے۔ پھر بابا اسے اٹھوا کر باہر پھنکوا دیں گے... گیٹ سے باہر!

اس نے قریب جا کر اس آدمی کا جائزہ لیا۔ اس کے جسم پر شہری لباس تھا۔ وہ شہری اور دیہاتی لباس کے درمیان فرق جانتی تھی۔ یہ فرق بھی اسے کتابوں کے ذریعے پتا چلا تھا۔ کتابیں تو اسے بہت کچھ سکھایا کرتی تھیں۔ اس حویلی میں قید رہنے کے باوجود اس کی معلومات بہت وسیع تھیں۔

اس نے آگے بڑھ کر اس نوجوان کے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس کا ہاتھ جیسے جل اٹھا۔ وہ نوجوان بخار میں تپ رہا تھا۔

اسی وقت اس نوجوان نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ شاید اس کی غنودگی عمیرہ کے ہاتھ کے لمس سے ختم ہو گئی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر عمیرہ کو دیکھتا رہا پھر اس نے اپنی گردن جھکالی۔ شاید اس پر پھر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔

''کون ہو تم؟'' عمیرہ نے اسے مخاطب کیا۔ ''اٹھو یہاں سے... آؤ میرے ساتھ... ورنہ مر جاؤ گے۔''

اس نے پھر آنکھیں کھول دیں اور اپنے تڑختے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ ''تم بہت بیمار ہو... بخار ہے تمہیں۔'' عمیرہ نے پھر کہا۔ ''تم یہاں نہیں رہ سکتے... ورنہ مر جاؤ گے۔''

اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن لڑکھڑا کر رہ گیا۔ غیر ارادی طور پر عمیرہ نے اسے سنبھالنے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ وہ عمیرہ کے ہاتھ کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ عمیرہ یہ سوچ رہی تھی کہ اگر اس وقت اس کے بابا یہ سب دیکھ لیں تو پھر کیا ہو گا؟

اس نوجوان نے اب درخت کے تنے کا سہارا لے لیا تھا۔ عمیرہ نے فوری طور پر اس کے لیے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اسے پناہ دے گی۔

حویلی بہت بڑی تھی۔ اس میں ایسے بے شمار کمرے تھے جو کسی استعمال میں نہیں آتے تھے۔ یونہی بند پڑے رہتے تھے۔ اگر وہ اس نوجوان کو ان میں سے کسی ایک کمرے میں چھپا دیتی تو برسوں اس کا سراغ نہیں مل سکتا تھا اور وہ اس وقت بیمار بھی تو تھا۔

عمیرہ نے کتابوں میں یہ بھی پڑھا تھا کہ کسی کو سہارا دینا بہت نیکی کا کام ہے۔ وہ اس وقت اس نوجوان کو سہارا ہی تو دے رہی تھی جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی کہ وہ کون ہے اور اس حویلی میں کہاں سے آ ٹپکا ہے۔

وہ اس اجنبی کا ہاتھ تھامے اسے حویلی کے ایک دور افتادہ کمرے میں لے آئی۔ اس کمرے میں بستر بھی تھا اور گرم کمبل بھی۔

اجنبی خود اپنے پیروں پر چلتا ہوا یہاں تک آیا تھا۔ یہاں پہنچ کر وہ بستر پر گر پڑا۔ عمیرہ نے اس پر کمبل ڈال دیا۔ نہ جانے کیوں اسے یہ سب کرنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

جو کچھ بھی ہو رہا تھا، وہ پہلی پہلی بار تھا۔ اس نے پہلی بار اپنے بابا کے علاوہ کسی اور مرد کو دیکھا تھا۔ پہلی بار اس نے کسی کا ہاتھ تھاما تھا۔ پہلی بار کسی کو پناہ دی تھی اور پہلی بار اس نے اپنے بابا کے اصولوں سے بغاوت کی تھی۔ کیوں؟ اس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

اجنبی اس وقت کچھ بولنے کے قابل نہیں تھا۔ شاید اسے خوراک کی ضرورت تھی... شاید دواؤں کی ضرورت تھی۔ اس حویلی میں یہ دونوں چیزیں موجود تھیں۔ وہ اس اجنبی کی دیکھ بھال کر سکتی تھی۔

وہ اسے اسی طرح چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کے کمرے میں ایک کنگ سائز ریفریجریٹر تھا جس میں کھانے پینے کی بے شمار چیزیں بھری تھیں۔ دودھ، کارن فلیکس، مکھن، پنیر اور نہ جانے کیا کیا۔ اس نے جلدی جلدی کچھ چیزیں ایک شاپر میں ڈالیں اور دوبارہ اس کمرے کی طرف چل دی جہاں وہ اس اجنبی کو چھوڑ آئی تھی۔

☆☆☆

بختاور بھی اسی حویلی میں کام کرتی تھی۔

اس کی ڈیوٹی کچن میں تھی اس لیے مراد کے سامنے آنے کا اتفاق نہیں ہوتا تھا۔ حویلی میں گھر کے افراد صرف دو تھے۔ مراد اور عمیرہ۔ باقی سارے کھانے ملازماؤں کے لیے بنانے پڑتے تھے۔

بختاور کی ڈیوٹی رات آٹھ بجے ختم ہو جاتی تھی۔ حویلی سے نکل کر وہ اپنے گھر آ جاتی۔ اس کا گھر بھی حویلی کے پاس والے گاؤں میں ہی تھا۔

اس رات بھی وہ گھر پہنچی تو رگھو کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ رگھو اس کا بیٹا تھا۔ جوان، خوب صورت اور صحت مند۔ وہ شہر میں رہتا تھا۔ بختاور نے اسے بارہویں تک تعلیم بھی دلوائی تھی۔ وہ شہر ہی میں ملازمت کرتا تھا۔

رگھو پچھلے مہینے ہی تو گیا تھا۔ اس لیے بختاور اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ''ارے بیٹا تو! تو کیسے آ گیا... اتنی جلدی چھٹی کیسے مل گئی؟''

''بس اماں! یہ سمجھ ہمیشہ کے لیے چھٹی ہو گئی ہے۔'' رگھو نے بتایا۔ ''میری نوکری ختم ہو گئی ہے۔ میں نے سوچا جب نوکری ہی نہیں رہی تو شہر میں رہ کر کیا کرنا ہے۔ بس یہ سوچ کر واپس آ گیا۔''

رگھو کی آواز بجھی بجھی تھی۔ بختاور نے اسے دلاسا دیا۔ ''چل کوئی بات نہیں۔ نوکری چلی گئی تو دوبارہ مل جائے گی۔ میں کل ہی عمیرہ بی بی سے بات کروں گی۔''

''تمہاری یہ عمیرہ بی بی کیا کر لیں گی؟''

''وہ تو کچھ نہیں کریں گی لیکن وہ سرکار سے بات کر لیں گی۔ سرکار کے یہاں بھی پچاس کام ہیں۔ جتنی کی مل لگی ہوئی ہے۔ اتنی زمینیں ہیں۔ کوئی نہ کوئی کام تو نکل ہی آئے گا۔''

''اماں! ایک بات تو بتاؤ۔ کیا یہ سچ ہے کہ اس حویلی میں کوئی مرد نہیں جاتا؟''

''ہاں، عمیرہ بی بی نے آج تک کسی مرد کی صورت نہیں دیکھی۔ ایسی پابندی میں رکھا ہے ان کو۔''

''لیکن کیوں؟''

''اب یہ کون پوچھے؟ ان کی مرضی۔ وہ جس طرح چاہیں اپنی بیٹی کو رکھیں۔ ہم کون ہوتے ہیں پوچھنے والے۔''

''کیا مراد صاحب بہت پیسے والے ہیں؟''

''اب یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ یہ سمجھ لے کہ یہ سارا گاؤں انہی کا ہے۔'' بختاور نے کہا۔

''مجھے تو وہ کوئی پاگل معلوم ہوتے ہیں۔'' رگھو نے کہا۔

''پھر وہی بات۔'' بختاور جلدی سے بولی۔ ''ہم کون ہوتے ہیں یہ سب بولنے والے؟ وہ جس طرح چاہیں رہیں۔ میرا کام ہے وہاں کھانا بنانا۔ میں اپنی ڈیوٹی دے کر واپس آ جاتی ہوں۔''

رگھو نے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔

وہ اپنی ماں سے بہت کچھ جان لینا چاہتا تھا لیکن بہت آہستہ آہستہ۔ ایک دم سے ساری باتیں پوچھنے بیٹھ جاتا تو اس کی ماں جواب دینے سے انکار کر دیتی۔

شہر میں اس کی نوکری ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ ایک خاص پلاننگ کے ساتھ گاؤں آیا تھا۔ اس گاؤں کے رہنے والے اس کے دو چار دوست بھی تھے جو اسی کی طرح شہر میں کام کرتے تھے۔ رگھو ان دوستوں کو بھی ایک بڑے کام کا آسرا دے کر گاؤں واپس لے آیا تھا۔

ماں سے کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد وہ ایوب کے گھر پہنچ گیا۔ ایوب اسی کے ساتھ واپس آیا تھا۔ وہ اکیلا آدمی تھا۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ ایوب کو جب شہر جانا ہوتا، اس مکان میں تالا لگا کر چلا جاتا اور واپس آنے کے بعد اس کی بیٹھک دوستوں سے پھر آباد ہو جاتی۔

ایوب کی بیٹھک میں فیاض، بالے اور جواد بھی اس کے انتظار میں تھے۔ ایوب نے سب کے لیے چائے بنا کر رکھی ہوئی تھی۔ چائے پینے کے دوران ایوب نے رگھو سے پوچھا۔ ''ہاں بھئی... اب بتاؤ کہ تم ہم لوگوں کو کس کام کا آسرا دے کر گاؤں لے آئے ہو؟''

''ابے یہاں کون سا کام ہے۔'' فیاض نے کہا۔

''بات دراصل یہ ہے کہ ہم لوگوں نے گاؤں میں سوائے کھیتوں اور چھوٹی چھوٹی دکانوں کے اور کچھ دیکھا ہی نہیں ہے۔ ہماری نگاہیں کہیں تک رہی ہیں۔ ورنہ اس گاؤں میں کروڑوں روپے بکھرے ہوئے ہیں جو ہمیں آواز دے رہے ہیں کہ آؤ... آ کر لے جاؤ۔''

''کہاں ہیں وہ کروڑوں روپے؟'' بالے نے پوچھا۔

''سرکار کی حویلی میں ہیں۔'' رگھو نے بتایا۔

ایک لمحے کے لیے وہاں گہرا سناٹا ہو گیا۔ سب ایک دوسرے کی طرف الجھی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر جواد نے خاموشی توڑی۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ ہم حویلی میں ڈاکا ڈالیں؟''

''بے وقوف ہو تم۔ ڈاکا ڈالنے سے کیا ملے گا۔ مراد اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ وہ حویلی میں کروڑوں روپے رکھتا ہو۔ اس کی ساری دولت بینک میں ہو گی۔ ہمیں وہ دولت

www.pkdigest.com

چینک سے نکلوانی ہوگی۔"

"وہ کس طرح؟"

"اس حویلی کی سب سے قیمتی چیز کو قابو میں کر کے۔" رگھو نے بتایا۔ "اور اس حویلی کی سب سے قیمتی چیز حویلی میں رہنے والی وہ لڑکی ہے جس کی ہم کہانیاں سنتے آئے ہیں۔ جو کسی روح کی طرح پوری حویلی میں چکراتی پھرتی ہے۔"

"سمجھ گیا۔ تم اغوا برائے تاوان کے چکر میں ہو؟"

"ہاں۔" رگھو مسکرا دیا۔ "کم از کم بیس کروڑ روپے۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ پلاننگ تیار کی ہے۔ مراد اپنی اس بیٹی کو بچانے کے لیے آسانی سے ہمیں کروڑوں روپے دے دے گا۔"

"لیکن اس حویلی میں داخل ہونا ہی بہت مشکل ہے۔" بالے نے کہا۔

"اس لڑکی کو کسی طرح باہر نکال کر لانا ہے پھر سارا کام آسان ہو جائے گا۔"

"سوال تو یہ ہے کہ باہر کیسے بلایا جائے؟"

"میں نے اس کی بھی ترکیب سوچ لی ہے۔"

"یار! جب تم نے سب کچھ سوچ ہی لیا ہے تو پھر ہم لوگوں کی کیا ضرورت ہے... ہمیں کیوں اپنے ساتھ شامل کر رہے ہو؟" فیاض نے پوچھا۔

"دیکھو، یہ ایک بڑا اور خطرناک کام ہے۔ اس کے لیے پوری ٹیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہت سے کام ہوتے ہیں... جیسے گھر کا بندوبست کرنا جہاں اس لڑکی کو لے جا کر رکھا جائے۔ اس کے کھانے پینے کا انتظام، اس کی نگرانی... پھر اس کی رہائی کے لیے مراد سے بات چیت.... سواری کا بندوبست اور بھی بیچاس کام ہیں اس لیے تم لوگوں کی ضرورت ہے اور ویسے بھی تم سب میرے دوست ہو۔ میں سب کو ساتھ لے کر چلنا چاہتا ہوں۔"

رگھو کی یہ بات اس کے دوستوں کی سمجھ میں آ گئی لیکن سوال یہ تھا کہ اس لڑکی کو حویلی سے باہر کیسے لایا جائے؟

"اس کے لیے نیلما ہمارے کام آئے گی۔" رگھو نے بتایا۔

"کون نیلما؟" سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"میری ایک دوست ہے۔" رگھو نے بتایا۔ "بہت ذہین لڑکی ہے اور چلتی پھرتی پُرزہ ... ہے بلکہ یہ کہو کہ یہ پلاننگ ہم دونوں نے ہی کی ہے۔ وہ آسانی سے حویلی میں جا سکتی ہے۔ اس کے پاس سیکڑوں بہانے ہیں۔ وہ اس لڑکی کو باہر نکال کر لے آئے گی۔ مجھے اس کی چالاکی اور ہوشیاری پر پورا بھروسا ہے۔ اس کے بعد کے معاملات ہمیں سنبھالنے ہیں۔"

"اور تمہاری وہ نیلما آئے گی کب؟"

"جب ہم لوگ اپنی طرف سے پورا بندوبست کر لیں گے تو پھر میں اسے فون کر کے بلالوں گا۔"

☆☆☆

شرجیل نام تھا اس نوجوان کا۔

اس نے ہوش میں آنے کے بعد عمیرہ کو اپنا یہی نام بتایا تھا۔ عمیرہ نے اس کا بہت خیال رکھا تھا۔ اسے دوائیں دی تھیں۔ وہ اس کے لیے کھانے پینے کی چیزیں لاتی رہی تھی اور اب وہ بالکل تندرست ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا۔ "میرا نام شرجیل ہے۔ میں ایک بڑے اخبار کا رپورٹر ہوں۔ کہانیوں کی تلاش میں بھٹکتا رہتا ہوں۔ یہاں بھی اسی سلسلے میں آیا تھا۔ پھر بے پناہ بارش نے مجھے گھیر لیا۔ میں بری طرح بھیگ چکا تھا۔ ایسے میں اس حویلی کا کھلا ہوا گیٹ نظر آ گیا اور میں اندر داخل ہوتا چلا گیا۔ بخار بھی تھا۔ اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں دو قدم آگے بڑھ سکتا۔ نڈھال ہو کر ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ تمہارے سامنے ہے۔"

"چلو، یہاں آنے کے بعد تم کہانیاں میں نہیں رہے کیونکہ یہاں بھی تمہیں ایک کہانی مل جائے گی۔"

"کیسی کہانی؟"

"وہ کہانی یہ ہے کہ میں پہلی دفعہ کسی مرد کو دیکھ رہی ہوں۔ اس سے باتیں کر رہی ہوں۔ میں نے آج تک اپنے باپ کے علاوہ کسی کو دیکھا ہی نہیں ہے اور یہ بالکل سچ ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ یہ کیسے ممکن ہے؟"

پھر عمیرہ نے اسے اپنے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ وہ بولتی چلی گئی۔ اس کے پاس اپنی کہانی سنانے کے لیے سوائے اس حویلی کے ماحول کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ اسی ماحول کے بارے میں بتاتی چلی گئی... بتاتی چلی گئی۔

"حیرت انگیز!" شرجیل نے اس کے خاموش ہو جانے کے بعد تبصرہ کیا۔ "اس دور میں بھی یہ سب ممکن ہے۔ آخر تمہارے بابا چاہتے کیا ہیں؟ انہوں نے تو تمہاری شخصیت کو کچل کر رکھ دیا ہے۔"

"کاش! میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب ہوتا۔ ویسے وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

"یہ محبت نہیں دشمنی ہے۔ انہوں نے تمہیں غیر فطری زندگی کے لیے مجبور کر دیا ہے۔ تم دنیا کی ہر خوشی سے محروم ہو گئی ہو۔ تم نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔ تم یہ بھی نہیں جانتیں کہ اس حویلی سے باہر کیا ہے۔ دنیا کیا ہے... زندگی کیا ہے۔"

"یہ سب میں نے صرف کتابوں میں پڑھا ہے۔" عمیرہ نے ایک گہری سانس لی۔

"میں نے کسی کی اپنی اولاد کے ساتھ ایسی دشمنی کی مثال پہلے کبھی نہیں سنی۔" شرجیل نے کہا۔ "لیکن تم فکر مت کرو۔ میں تمہیں اس حویلی سے نکال کر باہر لے جاؤں گا۔"

"نہیں... ہرگز نہیں۔" عمیرہ گھبرا کر چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔ "میں نے تمہیں اس لیے پناہ نہیں دی تھی کہ تم مجھے بابا کے خلاف کرو۔ انہوں نے میرے لیے جو اصول بنائے ہیں، میں ان پر چلتی رہوں گی۔"

"اور انہی اصولوں پر چلتے چلتے ایک دن مر جاؤ گی۔" شرجیل نے کہا۔ "زندگی کا لطف حاصل کیے بغیر۔ یہ جانے بغیر کہ یہ دنیا کیا ہے اور زندگی کے رنگ کتنے خوب صورت ہوتے ہیں۔"

"میرے لیے سارے رنگ اس حویلی میں ہیں۔ اس سے باہر کچھ بھی نہیں ہے۔"

"میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا۔" شرجیل نے کہا۔ "تم بچپن سے لے کر اب تک اسی طرح کی زندگی گزارتی آئی ہو۔ اسی لیے ابھی میری باتوں کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔"

عمیرہ نے پھر کچھ نہیں کہا۔

وہ خاموشی سے اس نوجوان کو دیکھتی رہی جو اس کی زندگی میں شامل ہونے والا پہلا مرد تھا... بالکل پہلا۔ اس کے بابا سے کتنا مختلف۔ بابا کا لہجہ بھی اگرچہ نرم ہوا کرتا تھا لیکن اس لہجے میں ایسا رچاؤ، ایسا پیار نہیں ہوتا تھا جیسا اس نوجوان کے لہجے میں تھا۔ یہ ایک مختلف احساس تھا۔ ایسا انجانا احساس جو اسے لذت دے رہا تھا۔ جیسے کوئی اس کے دل کے آس پاس آ گیا ہو۔ سب کچھ نیا نیا سا ہو گیا تھا اس کے لیے۔

"بتاؤ، اب تم کیا کرو گے؟" اس نے شرجیل سے پوچھا۔

"کچھ نہیں... میں حادثاتی طور پر تمہاری حویلی کے اندر آ گیا ہوں لیکن میں یہاں رہ تو نہیں سکتا۔ مجھے یہاں سے واپس جانا ہے۔"

"اتنی جلدی؟" عمیرہ بے ساختہ بول اٹھی۔

شرجیل نے گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"دیکھو، مجھے جانا تو ہوگا... چاہے آج جاؤں یا کل۔ تمہاری یہ حویلی والی دنیا میری تو نہیں ہو سکتی۔"

"کم از کم ایک دو دن تو آرام کر لو۔" عمیرہ نے کہا۔ "اس کے بعد چلے جانا۔"

شرجیل نے اس کی بات مان لی۔ "ٹھیک ہے۔ صرف ایک دن اور رک سکتا ہوں۔ میرے دفتر اور گھر والے بھی میری طرف سے پریشان ہو رہے ہوں گے کہ میں کہاں غائب ہو گیا ہوں۔"

"تم آرام کرو۔ میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔"

شرجیل نے کچھ نہیں کہا۔ عمیرہ دروازے کی طرف جانے لگی تو اچانک کوئی اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ رقیہ تھی۔

عمیرہ کو ایسا لگا جیسے اچانک اس کی سانسیں رک گئی ہوں۔ وہ سکتے کے عالم میں کھڑی رہ گئی۔ "بی بی جی!" رقیہ آگے بڑھ کر بولی۔ "آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں؟ مجھے تو پہلے ہی دن معلوم ہو گیا تھا کہ اس حویلی میں کوئی آیا ہوا ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"میں نے آپ کو کھانے پینے کی چیزیں لے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔" رقیہ نے بتایا۔ "پھر مجھے کھوج پڑ گئی۔ آپ نے ایسا تو کبھی نہیں کیا۔ آپ کس کے لیے یہ سب چھپ چھپ کر لے جا رہی تھیں۔ پھر میں آپ کا پیچھا کرتی ہوئی یہاں تک آ گئی اور مجھے سب معلوم ہو گیا کہ یہ بابو جی آپ کو باغ میں ملے تھے۔ یہ بہت بیمار تھے۔ آپ ان کو اٹھا کر یہاں لے آئیں۔"

"ہاں رقیہ! جب تمہیں سب کچھ پتا ہی چل گیا ہے تو پھر تم سے کیا کہوں... لیکن دیکھو، بابا کو یہ سب نہیں معلوم ہونا چاہیے۔ ورنہ بہت بُرا ہوگا۔"

"میں جانتی ہوں بی بی! آپ بے فکر رہیں۔" رقیہ نے کہا۔ "بلکہ میں تو یہ کہتی ہوں کہ آپ اس موقعے سے فائدہ اٹھائیں۔ نکل جائیں اس حویلی سے۔ آپ جو زندگی گزار رہی ہیں، وہ زندگی نہیں قید ہے۔ قید سے نکل جائیں ورنہ اسی طرح مر جائیں گی۔ مر جائیں گی اسی طرح۔"

☆☆☆

دونوں بہت خوش تھے۔

مراد اور اس کی بیوی علینہ۔ شادی کے بعد دونوں ہنی مون کے لیے لندن آ گئے تھے۔ مراد نے علینہ کو حاصل کر کے شاید زندگی کی ہر خوشی حاصل کر لی تھی۔

www.pkdigest.com

مراد ایک دولت مند شخص کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے باپ نے زندگی کے کچھ اصول بنا رکھے تھے۔ ان میں سے ایک اصول یہ بھی تھا کہ مراد اپنی پسند سے شادی نہیں کر سکے گا کیونکہ اس کی سوچ کے مطابق دولت مند گھرانوں کے بیٹے ہمیشہ خود سے کم درجے کی لڑکیوں کو پسند کیا کرتے تھے اور مراد کے باپ کے لیے یہ قابلِ قبول نہیں تھا۔

لیکن پھر یہ ہوا کہ مراد نے ایک متوسط گھرانے کی لڑکی علیزہ کو پسند کر لیا۔ وہ اسے ٹوٹ کر چاہنے لگا۔ اس دوران اور بھی بہت سے ہنگامے ہوتے رہے۔ اس کے باپ کو یہ ملاپ پسند نہیں تھا لیکن مراد نے زمین آسمان ایک کر کے رکھ دیا۔

وہ اپنی محبت کی تلوار سونت کر باپ کے مقابل کھڑا ہو گیا۔ بالآخر باپ کو ہار ماننی پڑی اور اپنے اصول بدلنا پڑے۔

مراد اس زمانے میں بہت خوش اخلاق اور بے فکرا قسم کا نوجوان ہوا کرتا تھا۔ اس نے اپنے باپ کی طرح دولت کو بھی اتنی اہمیت نہیں دی۔ اس کے نزدیک انسانی قدریں زیادہ اہمیت رکھتی تھیں۔ اسی لیے اس نے محبت کی تھی اور اپنی محبت میں کامیاب ہو کر علیزہ کے ساتھ لندن کی سڑکوں پر گھومتا پھر رہا تھا۔

علیزہ کو بھی اس سے اتنی ہی محبت تھی۔ دیکھنے والے دونوں کو دیکھ کر رشک کرتے۔ دونوں ہی خوب صورت تھے۔ جب وہ ایک ساتھ نکلتے تو دیکھنے والوں کی آنکھیں ان پر مرکوز ہو کر رہ جاتیں۔ اسی دوران ایک شام جب وہ دونوں پیکاڈلی میں کبوتروں کو دانا کھلا رہے تھے تو کسی نے مراد کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

مراد نے مڑ کر دیکھا۔ وہ امجد تھا، اس کے بچپن کا دوست۔

امجد کا باپ مراد کے باپ جیسا دولت مند اور اثر رسوخ والا تو نہیں تھا پھر بھی اچھی خاصی حیثیت تھی اس کی۔ مراد نے اپنی زندگی میں صرف ایک ہی شخص سے دوستی کی تھی اور وہ امجد تھا۔

امجد ایک عرصہ پہلے لندن آ چکا تھا۔ مراد کو اس کے بارے میں پھر کچھ نہیں معلوم ہو سکا کیونکہ امجد کا پورا گھرانا لندن آ کر آباد ہو گیا تھا۔

اور اب پیکاڈلی سرکس میں امجد اچانک اس کے سامنے آ گیا۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ بہت دیر تک گلے شکوے اور پرانی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر امجد ان دونوں کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے آیا۔

امجد نے انہیں ہوٹل میں نہیں رہنے دیا۔ علیزہ بھی اس ہنس مکھ اور بے تکلف قسم کے انسان سے بہت مانوس ہو گئی تھی جس کے بارے میں مراد نے اس سے کہا تھا۔ ”علیزہ! میں نے اپنی زندگی میں صرف ایک شخص کو دوست بنایا ہے۔ صرف ایک پر بھروسا کیا ہے اور وہ ہے امجد۔ میں آنکھیں بند کر کے اس پر اعتبار کر سکتا ہوں۔“

اور آنکھیں بند کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت دنوں کے بعد پاکستان واپس آ کر جب عبیرہ کی پیدائش ہوئی تو اس وقت مراد نے علیزہ اور امجد کو ایک ساتھ دیکھ لیا۔

امجد بھی پاکستان آ کر کاروبار کرنے لگا تھا۔ اس دوران بہت سی تبدیلیاں ہو گئی تھیں۔ مراد کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی ساری دولت مراد کے نام منتقل ہو گئی تھی۔ وہ خود تو اپنی زمینوں، جائداد، کاروبار اور فیکٹریز وغیرہ کو سنبھالنے میں اس قدر مصروف ہو گیا تھا کہ علیزہ کے لیے وقت نہیں نکال پاتا... تاہم یہ خلا امجد نے پُر کر دیا تھا۔

مراد کو جب علیزہ اور امجد کے درمیان اس تعلق کا پتا چلا تو اس نے علیزہ کو طلاق دے دی۔ اس وقت عبیرہ صرف دو سال کی تھی پھر اس نے عبیرہ کو پوری دنیا سے کاٹ کر رکھ دیا۔

وہ اسے اپنے ہی گاؤں کی اس حویلی میں لے آیا جو اس کے آبا و اجداد نے بنوائی تھی۔ اسے عبیرہ کے لیے اپنی ذات کے علاوہ کسی اور پر بھروسا نہیں رہا تھا۔ اس نے عبیرہ کو مردوں سے الگ کر دیا تھا۔ اس کے چاروں طرف عورتیں بکھیر کر رکھ دی تھی۔

صرف عورتیں... اس کا یہ پاگل پن جنون کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ وہ کسی بھی قیمت پر عبیرہ پر کسی مرد کا سایہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ وہ اکثر یہاں تک کہا کرتا کہ اگر عبیرہ کا کوئی بھائی بھی ہوتا تو وہ اسے بھی عبیرہ کے قریب نہیں آنے دیتا۔ اس کی پرورش کہیں اور ہوتی۔

عبیرہ کو اپنی ماں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ اس نے صرف اپنے باپ کو دیکھا تھا۔ ماں کے لیے یہ بتایا گیا تھا کہ وہ مر چکی ہے۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ ماں کا کوئی رشتے دار بھی ہے یا نہیں۔ اس سانحے کے بعد مراد نے پھر شادی تو نہیں کی تھی لیکن اس کی راتیں خالی نہیں جاتی تھیں۔

وہ عورتوں کے لیے بے رحم ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے پاس دولت تھی، طاقت تھی۔ وہ سب کچھ کر سکتا تھا اور کرتا رہا۔

دی انسٹی ٹیوٹ
Registered with CBR
Govt. of Pakistan
MoB: 0300-2219514,0344-2609828
Tel: 021-34519074
75080

اس نے نہ جانے کتنوں کو برباد کر کے رکھ دیا اور جب عیرہ سترہ اٹھارہ برس کی ہو گئی تو شہر چھوڑ کر اس حویلی میں آ کر آباد ہو گیا۔

اس کا وہ بے وفا دوست امجد بھی نہ جانے کہاں غائب ہو چکا تھا۔ مراد کا یہ خیال تھا کہ دنیا کے سارے مرد دھوکے باز اور بے وفا ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس نے اپنی بیٹی کو ان سے محفوظ کر لیا ہے۔

اب خود اس کی اپنی زندگی بھی ایک ڈھرے پر چل رہی تھی۔

زمینوں اور کاروبار کی دیکھ بھال کے لیے وہ روزانہ گاؤں سے شہر آ جایا کرتا اور شام کو اس کی واپسی ہوتی۔ اسے یقین تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں بھی کوئی مرد حویلی میں داخل نہیں ہو سکے گا۔

وہ اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا کسی فائل کو دیکھنے میں مصروف تھا کہ ملازمہ نے کسی لڑکی کے آنے کی خبر سنائی جو اس سے ملنے کے لیے آئی تھی۔

اسے یاد آیا کہ پچھلے دنوں اس نے اخبارات میں اشتہارات دیے تھے کہ اسے اپنی حویلی کی دیکھ بھال کے لیے ایک خاتون نگراں کی ضرورت ہے۔ ہو سکتا تھا کہ وہ لڑکی اسی سلسلے میں آئی ہو۔ اس نے ملازمہ سے کہا کہ وہ اس لڑکی کو بلا لے۔

چند لمحوں بعد ایک خوب صورت، اسمارٹ، جوان لڑکی اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' مراد نے پوچھا۔

''نیلما۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''کیا ہمارا اشتہار دیکھ کر آئی ہو؟''

نیلما کو ذرا سی حیرت تو ہوئی لیکن اس نے چہرے سے اپنی حیرت کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ ''جی ہاں۔'' اس نے بات سنبھال لی۔ ''اشتہار ہی پڑھ کر آئی ہوں۔''

''کیا تجربہ ہے تمہیں۔''

''کوئی کام دیا جائے تو پوری ذمے داری سے ادا کر لیتی ہوں۔''

''ہوں۔'' مراد نے ایک ہنکارا بھرا پھر اپنے لہجے پر زور دیتا ہوا بولا۔ ''تمہیں مستقل طور پر اس حویلی میں رہنا ہو گا۔ تم کہیں باہر نہیں جاؤ گی۔ حویلی میں دو درجن کے قریب ملازمائیں ہیں ان سے کام لینا ہو گا اور سب سے بڑی بات یہ کہ تم کسی مرد کو اس حویلی میں نہیں بلاؤ گی اور نہ ہی کوئی تعلق رکھو گی۔''

''لیکن جناب! میری اپنی بھی زندگی بھی تو ہے۔''

''اس کے لیے مہینے میں دو چھٹیاں ملا کریں گی۔ تم حویلی سے باہر جا کر جتنے مردوں سے ملنا چاہو، اس دوران مل لینا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ تم میری بیٹی کے سامنے مردوں کا ذکر نہیں کرو گی۔ صرف اپنے کام سے کام رکھو گی۔ سمجھ گئیں؟''

''جی جناب! سمجھ گئی۔''

''خوب! تو اپنا کام شروع کر دو۔ رقیہ تمہیں سارے کام سمجھا دے گی اور تمہاری تنخواہ بیس ہزار روپے ہو گی۔''

''جناب! مجھے اپنے گھر والوں کو بتانے، ان سے اجازت لینے کے لیے ایک دن کی ضرورت ہے۔ میں پرسوں سے اپنا کام شروع کر سکتی ہوں۔ مجھے اپنا سامان بھی لانا ہو گا۔''

''ٹھیک ہے۔ تم جا سکتی ہو۔'' مراد نے کہا۔ ''پرسوں صبح سے میں تمہیں یہاں دیکھنا چاہتا ہوں؟''

نیلما اس حویلی سے نکل کر رگھو کے پاس پہنچ گئی۔

رگھو اسے ایوب کے گھر لے آیا تھا۔ یہاں فیاض، ...بالا اور جواد بھی موجود تھے اور اس کی رپورٹ سننے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔

''میں نے اس حویلی میں ملازمت حاصل کر لی ہے۔'' نیلما نے بتایا۔ ''یہ اتفاق ہے کہ اس نے اخبار میں حویلی کے لیے کسی نگراں کا اشتہار دیا تھا۔ اس نے جب مجھ سے پوچھا تو ذرا سی دیر کے لیے تو میں گڑبڑا گئی۔ پھر میں نے بات سنبھال لی۔''

''کیا اس لڑکی سے تمہاری ملاقات ہوئی؟'' رگھو نے پوچھا۔

''نہیں، ابھی نہیں ہوئی لیکن مجھے امید ہے کہ میں اسے حویلی سے باہر نکال لاؤں گی۔ اس آدمی کی باتوں سے یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ اس نے بے چاری کو باہر کی ہوا بھی نہیں لگنے دی ہے اور ایسی لڑکیوں کو ورغلانا مشکل نہیں ہوتا۔''

''یار رگھو! تیری یہ دوست تو بہت ہوشیار ہے۔'' جواد نے تعریف کی۔

''اب یہ ہماری ٹیم کی مستقل ممبر ہے۔'' رگھو نے بتایا۔

نیلما نے ان لوگوں کی طرف دیکھا پھر دھیرے سے بولی۔ ''دیکھو ساتھیو! بات یہ ہے کہ اس زندگی پر، اس کی خوشیوں پر کچھ ہمارا بھی حق ہے۔ اب تک ہم صرف محنت ہی کرتے چلے آئے ہیں۔ ہمیں کچھ بھی نہیں ملا ہے۔ رگھو نے جب میرے سامنے یہ اسکیم رکھی تو ذرا سی دیر کے لیے مجھے

شاک سا لگا۔ میں یہ سوچنے لگی کہ نہیں... یہ غلط ہے۔ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ پھر میں نے سوچا کہ کیوں نہ کیا جائے۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ کسی کے پاس اربوں روپے ہیں اور کسی کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کے اربوں روپے میں سے کچھ ہمیں بھی ملنا چاہیے۔ ہمارا بھی حق ہے۔''

''اور اب ہم اپنا یہ حق حاصل کر کے رہیں گے۔'' بالے نے کہا۔

''لیکن تم لوگ ایک بات کان کھول کر سن لو۔ وہ ایک لڑکی ہے اور وہ بھی ایسی لڑکی جیسے ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی ہو۔ اس نے دنیا نہیں دیکھی ہے۔ اس لیے جب وہ ہمارے پاس آ جائے تو اس کا احترام کرنا۔ میں اس کے ساتھ کوئی بدتمیزی برداشت نہیں کروں گی۔''

''واہ... تم تو اس طرح آرڈر دے رہی ہو جیسے ہم تمہارے غلام ہیں۔'' فیاض منہ بنا کر بولا۔

''نیلما ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' رگھو نے کہا۔ ''ہمارا مقصد دولت حاصل کرنا ہے۔ لڑکی سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔''

رگھو کے اس فیصلے کے بعد پھر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔

اب رقیہ بھی عیرہ کی ہم راز بن چکی تھی۔

شرجیل کے لیے کھانے پینے کا بندوبست اب خود رقیہ ہی کیا کرتی تھی۔ عیرہ کے لیے چوری چھپے شرجیل کے لیے کھانا لے جانے کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ یہ ذمے داری رقیہ نے سنبھال لی تھی۔

شرجیل کی باتیں عیرہ کو بہت اچھی اور انوکھی محسوس ہوا کرتیں۔ باہر کی دنیا اس کے لیے ایک خوب صورت خواب کی طرح تھی... ایسا خواب جو اس کی آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

شرجیل بہت غیر محسوس طور پر آہستہ آہستہ اس کے ذہن اور دل کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ وہ یہ سوچتی کہ جب شرجیل حویلی سے چلا جائے گا تو پھر کیا ہو گا؟

پھر وہی ویران اور اداس تنہا زندگی! یا تو ملازماؤں کو دیکھتے رہو یا بابا کی باتیں سنتے رہو... یا پھر کتابوں میں الجھے رہو۔ اس کے علاوہ تو زندگی میں اور کچھ بھی نہیں تھا۔

اسی لیے اس کی خواہش تھی کہ کاش شرجیل کبھی واپس نہ جائے۔ وہ یہیں رہ جائے۔ اسی حویلی میں۔ اس کے قریب... لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا؟

وہ تو ایک ایسا مسافر تھا جسے... ایک حادثہ اس تک لے آیا تھا۔

اسے تو واپس جانا ہی تھا۔ اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار شرجیل سے بھی کر دیا۔ ''سنو! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم ہمیشہ کے لیے یہیں رہ جاؤ؟''

''نہیں عیرہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ ناممکن ہے۔ میں کب تک تمہاری حویلی میں چھپا رہوں گا؟ ایک نہ ایک دن میری موجودگی کا پتا چل جائے گا اور اس وقت کیا ہو گا، یہ تم خود بھی جانتی ہو۔''

''تو کیا میرے مقدر میں یہی تنہائی لکھی ہے؟'' عیرہ نے اداس ہو کر پوچھا۔

''نہیں، سب کچھ بدلا جا سکتا ہے... بشرطیکہ تم خود اس حویلی سے باہر نکل جاؤ۔'' شرجیل نے کہا۔ ''کسی ایسی جگہ جہاں تم پر اس قسم کی احمقانہ پابندیاں نہ ہوں۔ جہاں تم مردوں کے درمیان رہ سکو۔ جہاں تم نارمل زندگی گزار سکو کیونکہ جو کچھ بھی تمہارے ساتھ ہو رہا ہے وہ ابنارمل ہے۔''

''لیکن میں بابا کو چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں؟'' عیرہ نے کہا۔ ''اور بابا سے اجازت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

اس وقت شرجیل نے کہنا چاہا کہ وہ اپنے بابا کو بتائے بغیر اس کے ساتھ نکل جائے لیکن فی الحال ایسا کہنا مناسب نہیں تھا۔ بچپن سے آج تک عیرہ نے جس انداز سے زندگی گزاری تھی، وہ دو چار دنوں میں اس انداز سے اسے باہر نہیں لا سکتا تھا۔

یہی بات رقیہ نے بھی عیرہ سے کہی تھی۔ ''بی بی! شرجیل اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔''

''تو پھر؟''

''پھر یہ کہ خدا کی طرف سے آپ کو ایک موقع ملا ہے۔ آپ اس سے فائدہ اٹھا لیں۔ نکل جائیں یہاں سے۔ عورت اور مرد ایک دوسرے کے لیے ضروری ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر ادھورے ہیں۔ خود سوچیں، آپ کی تو شادی بھی ہونی ہے۔ اس حویلی میں رہ کر تو کبھی بھی نہیں ہو گی۔''

رقیہ کی باتیں بھی ٹھیک تھیں لیکن عیرہ کے پاؤں میں پڑی ہوئی زنجیریں بہت مضبوط تھیں۔ وہ اتنی آسانی سے ٹوٹنے والی نہیں تھیں۔

شرجیل نے اس کے دل میں ایک آگ سی بھڑکا دی تھی۔ اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ دبی زبان میں کہی، اپنے بابا

www.pkdigest.com

سے فریاد تو کرے کہ اس کی زندگی کو کیا بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

دوسرے دن ایک عجیب بات ہوئی۔

مراد نے ایک لڑکی سے اس کا تعارف کرواتے ہوئے بتایا۔ ”بیٹی! یہ نیلما ہیں۔ اس حویلی کی نگراں کی حیثیت سے آئی ہیں۔ ان کا قیام اسی حویلی میں ہوگا۔“

عمیرہ نے دلچسپی سے اس لڑکی کو دیکھا جو شاید اس سے دو چار سال ہی بڑی ہوگی لیکن وہ بہت ہوشیار دکھائی دے رہی تھی۔

”میں نے نیلما کو اس حویلی کے سارے اصول بتا دیے ہیں۔“ مراد نے کہا۔ ”اور تم بھی ان باتوں کا خیال رکھنا۔“

”جی بابا!“

”اب جاؤ، ان کو لے جا کر پہلے پوری حویلی دکھاؤ پھر سارا کام سمجھا دو۔“

عمیرہ اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے کر کمرے سے باہر آ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نیلما نے شہر چھوڑ کر یہاں اس حویلی میں کام کرنا کیوں پسند کیا ہے؟

ایک جگہ بیٹھ کر اس نے نیلما سے یہی سوال کیا۔

”عمیرہ بی بی! پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے ایک جاب کی شدید ضرورت تھی۔“ نیلما نے بتایا۔ ”پھر مراد صاحب مجھے بیس ہزار روپے مہینا دیں گے جو اور کہیں نہیں مل سکتے۔ اس لیے میں نے یہ ملازمت قبول کر لی۔“

عمیرہ کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس لڑکی سے ڈھیری باتیں کرے۔ اس سے پوچھے کہ وہ شہر میں کن لوگوں کے درمیان رہتی ہے؟ کیسی زندگی گزارتی ہے؟ شہر میں اس کے مشاغل کیا کیا ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

اس کے ذہن میں ڈھیر سارے سوالات تھے لیکن اس وقت ساری باتیں کرنا مناسب نہیں تھا۔ مراد نے کہا تھا کہ وہ اسے پوری حویلی دکھا دے اور عمیرہ اسے حویلی کی سیر کراتی پھر رہی تھی۔

اس حویلی کی غلام گردشیں، بڑے بڑے کمرے، دیوان خانے، لائبریری، ان گنت کتابیں اور اس کے آباؤ اجداد کی قد آدم تصویریں جنہیں دیکھ کر نیلما کچھ مرعوب سی ہو گئی تھی۔

”بس... اس حویلی میں مردوں کے نام پر یہی تصویریں ہیں یا پھر میرے بابا ہیں۔“ عمیرہ نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

”ہاں، مراد صاحب مجھے سب کچھ بتا چکے ہیں۔“ نیلما نے کہا۔ ”ان کا کہنا ہے کہ حویلی میں مردوں کا تذکرہ کرنا بھی منع ہے۔“

”تم نے ٹھیک سنا ہے۔ یہ ایک ایسی جنت ہے جس میں مرد کا کوئی وجود نہیں ہے۔“

نیلما نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

عمیرہ حویلی دکھاتے ہوئے نیلما کو اس طرف نہیں لے گئی... جہاں اس نے شرجیل کو رکھا تھا۔ نیلما کے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ اس طرف کے کمرے بند رکھے گئے ہیں اس لیے نیلما کو اس طرف جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

نیلما کے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ عمیرہ سیدھی سادی لڑکی تھی۔ وہ بڑی آسانی سے اسے اس حویلی سے باہر لے جا سکتی تھی لیکن اس کے لیے اسے تھوڑی سی محنت اور تھوڑے انتظار کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

عمیرہ شرجیل کے سامنے بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔

اس کے ذہن میں جس قسم کی آندھیاں چل رہی تھیں، وہ آندھیاں اسی طرح تھم سکتی تھیں جب وہ دنیا دیکھنے کے لیے حویلی سے باہر چلی جائے۔

شرجیل نے اس کی آنکھوں میں خوب صورت خواب بھر دیے تھے۔ ان خوابوں کی تعبیر کے لیے اسے باہر جانا تھا اور اس نے شرجیل کے ساتھ اس حویلی سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ بابا اس کے غائب ہونے کے بعد ٹوٹ کر رہ جائیں گے۔ جس طرح وہ عمیرہ کے لیے سب کچھ تھے، اسی طرح عمیرہ ان کے لیے اہمیت رکھتی تھی۔

لیکن عمیرہ اب مجبور ہو چکی تھی۔ فطری زندگی پوری شدت اور قوت کے ساتھ اسے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ اسے جانا تھا۔

اس حویلی میں صرف رقیہ کو معلوم تھا کہ اس نے کیا ارادہ کیا ہے۔ رقیہ نے اسے بہت سی باتیں سکھا دی تھیں۔ باہر کی زندگی، مردوں کے رویے، زندگی کی بھاگ دوڑ، پریشانیاں... یہ سب کچھ اسے بتاتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو بیٹا! میں برسوں سے تمہاری خدمت کر رہی ہوں۔ اسی لیے تم سے ایسی ہی محبت ہو گئی جیسی محبت کسی ماں کو اپنی اولاد سے ہو سکتی ہے۔ ایک طرف تو میں بھی یہ چاہتی ہوں کہ تم حویلی سے باہر کی دنیا میں چلی جاؤ... اور دوسری طرف یہ ڈر بھی لگا ہوا ہے کہ نہ جانے تمہارے ساتھ کیا ہو۔ شرجیل

کیسا آدمی نکلے۔“

”رقیہ! میں سمجھتی ہوں کہ شرجیل اچھا آدمی ہے۔“ عمیرہ نے کہا۔ ”وہ دھوکا نہیں دے گا لیکن میں ایک بار اس سے اور بات کر لوں گی۔“

جب عمیرہ نے اپنے خدشات کا اظہار شرجیل سے کیا تو وہ ناراض ہو گیا۔ ”دیکھو عمیرہ! پہلی بات تو یہ ہے کہ میں کسی پلاننگ کے تحت تمہاری حویلی میں نہیں آیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم کون ہو اور کس طرح کی زندگی گزار رہی ہو۔ اس کے علاوہ میرے ساتھ باہر جانے کی بات تم کر رہی ہو۔ میں نے تم سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔“

”لیکن تم نے میری آنکھوں میں خواب تو بھر دیے ہیں نا۔“ عمیرہ نے کہا۔ ”میں بھی تنگ آ چکی ہوں۔ ایک حویلی کی چار دیواری میں کب تک زندگی گزارتی رہوں۔“

”یہ بات دوسری ہے۔ تو پھر میں بھی تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں دھوکا نہیں دوں گا۔“

”تو پھر آج رات میں اس حویلی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ کر تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔“

عمیرہ نے یہ بات کہہ تو دی تھی لیکن مراد کو چھوڑ کر جانے کا خیال ہی اس کے لیے روح فرسا تھا۔ وہ نہیں رہی تو اس کے بابا اس کے بغیر مر جائیں گے۔

ان دونوں کو ایک دوسرے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ عمیرہ نہیں رہی تو پھر وہ کیا کریں گے؟ کس طرح زندگی گزاریں گے؟ نہیں۔ وہ اس طرح اچانک نہیں جا سکتی۔ وہ شرجیل سے کہہ دے گی کہ وہ اس کے ساتھ نہیں جا رہی۔

شرجیل کے پاس سے ہٹ کر وہ مراد کے کمرے کی طرف آ گئی اور اس نے کمرے کے باہر سے مراد کی آوازیں سنیں۔ وہ فون پر بلند آواز میں کسی سے باتیں کر رہا تھا۔

مراد... عمیرہ کا نام لے رہا تھا۔ عمیرہ کے پاؤں دروازے پر آ کر رک گئے۔ مراد کسی سے کہہ رہا تھا۔ ”کیا تم کو نہیں معلوم کہ میں نے عمیرہ کی پرورش کس انداز میں کی ہے؟ ہاں ہاں، مجھے اس کی شادی نہیں کرنی۔ تم اسے میرا پاگل پن سمجھو یا کچھ بھی سمجھ لو۔ میرے بعد... میرے بعد کیا ہوتا ہے۔ میری ساری جائداد کی مالک وہی ہوگی اور کون ہوگا؟ لیکن اس کی شادی نہیں ہوگی۔ اس شرط پر جائداد اسے ملے گی۔ ورنہ نہیں ملے گی۔“

عمیرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اپنے مستقبل کے بارے میں سب کچھ سن لیا تھا۔ اب کسی وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا باپ نہ جانے کیا کیا بولتا رہا لیکن عمیرہ نے کچھ اور نہیں سنا۔ وہ شرجیل کے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ اب اسے اپنے باپ سے کچھ اور نہیں کہنا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج کی رات وہ اس حویلی میں نہیں گزار سکتی۔

☆☆☆

دوسری صبح مراد ناشتے پر عمیرہ کا انتظار کر رہا تھا۔

دونوں باپ بیٹی ناشتا ایک ساتھ ہی کیا کرتے تھے۔ عمیرہ کو اس کے معمولات کا پتا تھا۔ وہ ٹھیک وقت پر ناشتے کے لیے آ جاتی تھی لیکن آج وہ ابھی تک کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔

اس نے آواز دے کر ایک ملازمہ کو بلا کر کہا۔ ”جاؤ... عمیرہ بی بی کو بلا کر لے آؤ۔“

ملازمہ چلی گئی مگر تھوڑی دیر بعد اس نے آ کر خبر سنائی کہ عمیرہ بی بی اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔ مراد نے حویلی کے دوسرے کمروں میں تلاش کرنے کا حکم دیا۔ ایک ملازمہ کو باغ کی طرف دوڑا دیا لیکن عمیرہ کہیں بھی نہیں تھی۔

مراد کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس کے دل کو مٹھی میں بھینچنا شروع کر دیا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ عمیرہ کہاں جا سکتی تھی؟ یقیناً وہ حویلی میں ہی ہوگی۔

ایک ملازمہ نے بتایا کہ الماری میں سے عمیرہ بی بی کے کپڑے بھی غائب ہیں۔ مراد کے پیروں کے نیچے سے زمین نکلی جا رہی تھی۔ وہ کہاں چلی گئی؟ کہاں جا سکتی تھی؟

وہ تو آج تک حویلی کے گیٹ سے باہر بھی نہیں نکلی تھی، پھر اچانک کہاں غائب ہو گئی؟

مراد کی نگاہوں کے سامنے اندھیرا اتر آیا۔ اس کے پورے وجود میں سناٹا سا چھا گیا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ عمیرہ اس طرح حویلی سے غائب بھی ہو سکتی ہے۔

پوری حویلی میں ایک کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ ملازمائیں سہمی ہوئی ایک طرف کھڑی تھیں۔ ان میں صرف رقیہ ایسی تھی جو یہ جانتی تھی کہ عمیرہ کہاں گئی ہے۔ کس کے ساتھ گئی ہے اور کیوں گئی ہے۔

مراد اس وقت بہت بے چینی کے عالم میں اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا، جب ایک ملازمہ بہت ڈرتے ڈرتے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ مراد سے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن شاید اس کی ہمت اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

”کیا بات ہے... کیا کہنا چاہتی ہے؟“ مراد نے پوچھا۔

”سرکار! ایک بات ہے۔ اب پتا نہیں آپ سے کہوں

باندھوں۔"
"ہاں، کیا بات ہے؟"
"وہ جو لڑکی آئی تھی... حویلی کی نگراں بن کر... نیلما بی بی۔ اس کو میں نے گاؤں میں رگھو کے ساتھ دیکھا تھا۔"
"کون رگھو؟"
"بختاور کا بیٹا۔ وہ شہر میں رہتا ہے۔ آج کل یہاں آیا ہوا ہے۔ اس کے آنے کے بعد ہی وہ لڑکی اس حویلی میں آئی۔ پھر میں نے اسے رگھو کے ساتھ دیکھ لیا۔ اب پتا نہیں، عمیرہ بی بی کے معاملے میں اس کا ہاتھ ہے یا نہیں... لیکن میں نے جو دیکھا تھا، وہ آپ کو بتا دیا ہے۔"
"تو نے بہت اچھا کیا... نیلما کہاں ہے اس وقت؟"
"وہ آج نہیں آئی سرکار۔" ملازمہ نے بتایا۔
"کوئی نہ کوئی معاملہ ضرور ہے کیونکہ اس لڑکی نے بتایا تھا کہ وہ اس گاؤں میں بالکل اجنبی ہے۔ یہاں کوئی اسے نہیں جانتا اور اب تو یہ بتا رہی ہے کہ وہ بختاور کے بیٹے کے ساتھ دیکھی گئی ہے۔"
"جی سرکار! ان دونوں کے ساتھ اسی گاؤں کے دو تین لوگ اور بھی تھے۔ وہ بھی شہر سے اچانک یہاں آئے ہیں۔"
"ٹھیک ہے... میں دیکھتا ہوں۔"

☆☆☆

ایوب کے گھر پر اس وقت کھلبلی مچی ہوئی تھی۔

وہ سب وہاں موجود تھے۔ نیلما، رگھو، فیاض، جواد اور بالا۔ عمیرہ اپنی حویلی سے غائب ہو گئی تھی۔ جس کو غائب کرنے کی خود انہوں نے پلاننگ کی تھی، وہ اچانک غائب ہو گئی تھی اور اس طرح نہ صرف ان کا منصوبہ دھرا رہ گیا تھا بلکہ اب خود ان لوگوں کے لیے بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

"دیکھو، ہمیں فوراً یہاں سے بھاگ لینا چاہیے۔" نیلما نے کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ ہم پر خواہ مخواہ کوئی مصیبت آ پڑے۔"
"لیکن کیوں... ہم نے تو کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ پھر ہم کیوں خوف زدہ ہوں؟"
"یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے کچھ نہیں کیا یا ہم کچھ نہیں کر سکے لیکن میرا یہاں آنا... حویلی میں کام کے لیے جانا... پھر تم لوگوں کا ایک ساتھ شہر سے یہاں آ کر جمع ہونا... یہ سب کسی کو بھی شک میں ڈالنے کے لیے بہت زیادہ ہے۔"
"نیلما ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔" رگھو نے کہا۔ "ورنہ وہی مثال ہو جائے گی، کھایا پیا کچھ نہیں... گلاس توڑا بارہ آنے۔"

پھر طے پایا کہ وہ لوگ اسی وقت روانہ ہو جائیں۔

لیکن وہ کہیں نہیں جا سکے۔

پولیس کی نفری نے ایوب کے گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ مراد ان کے ساتھ تھا۔ پولیس گھر کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئی۔ سب کے سب پکڑے گئے۔

"آخر کیوں؟" نیلما نے مراد کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ نے ہمیں کیوں پکڑوایا ہے۔ ہم نے ایسا کون سا قصور کر دیا ہے؟"
"عمیرہ کو کہاں چھپایا ہے تم لوگوں نے؟"
"ہمیں کیا معلوم سرکار کہ عمیرہ بی بی کہاں ہیں؟"
"تم نے تو کہا تھا کہ اس گاؤں میں تمہارا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔" مراد نے پوچھا۔ "پھر یہ لوگ کہاں سے نکل آئے؟"
"سرکار! میری اور رگھو کی ملاقات شہر میں ہوئی تھی۔" نیلما نے بتایا۔ "پھر میں نے جب اسے گاؤں میں دیکھا تو اس سے ملاقات کر لی۔ یہ تو کوئی جرم نہیں ہوا۔"

اور واقعی یہ کوئی جرم نہیں تھا۔ رگھو اگر شہر سے گاؤں آیا ہوا تھا یا اس کے دوسرے ساتھی آئے ہوئے تھے تو اس میں کون سا جرم تھا؟

اگر نیلما اور رگھو پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے یا نیلما نے حویلی میں ملازمت کر لی تھی تو بھی ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ان لوگوں کو ڈرا دھمکا کر چھوڑ دیا گیا تھا کیونکہ ان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔

سوال پھر وہی تھا کہ عمیرہ کہاں چلی گئی تھی؟

پولیس کی اس کارروائی کے بعد اب پورے گاؤں کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ عمیرہ۔ حویلی سے غائب ہو چکی ہے۔

☆☆☆

عمیرہ اس وقت شہر کے ایک خوب صورت ہوٹل کے ایک خوب صورت کمرے میں تھی۔

یہاں آنے کے بعد اس پر حیرت کے دروازے کھل گئے تھے۔ جس طرح کسی ایک سال کے بچے کو اچانک بڑا کر کے اسے شہر کے چوراہے پر لا کر چھوڑ دیا جائے۔

جو کچھ بھی تھا، وہ اس کے لیے انتہائی حیرت انگیز تھا۔

یہ عمارتیں، سڑکیں، ان پر دوڑتی ہوئی گاڑیاں، ہزاروں کی تعداد میں مرد، عورتیں، سجی سجائی دکانیں، ٹیلی ویژن، لفٹ، بجلی سے چلنے والے زینے اور بھی نہ جانے کیا کیا۔ وہ اس طرح یہ سب دیکھ رہی تھی جیسے اس کے سامنے جادو کا شہر آباد کر دیا گیا ہو۔

سب کچھ اس کے لیے نیا تھا۔

وہ ایک نوکھے تجربے سے گزر رہی تھی...... اس نے

خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔ جلووں نے اسے حیران کر دیا تھا۔

اگر یہ زندگی تھی تو پھر وہ جو کچھ گزارتی آئی تھی وہ کیا تھا؟ اس کے باپ نے تو اسے اب تک کسی مرد سے ملنے تک نہیں دیا تھا۔ کسی کو دیکھنے تک نہیں دیا تھا لیکن یہاں اس کے ہر طرف مرد ہی مرد تھے اور ان کے درمیان عورتیں تھیں، لڑکیاں تھیں۔

سب کچھ ایک خوب صورت خواب کی طرح اس کی آنکھوں میں اترتا چلا جا رہا تھا۔

شرجیل اسے ہوٹل کے ایک کمرے میں لے آیا۔

"شرجیل! مجھے تمہارے ساتھ آ کر اچھا تو لگ رہا ہے لیکن مجھے اپنے بابا کو فون کر کے انہیں خیریت بتانی ہے۔ وہ بہت پریشان ہوں گے۔ یہاں فون تو ہے۔ میں یہیں سے فون کر سکتی ہوں۔"
"ایسی غلطی بھی مت کرنا۔" شرجیل جلدی سے بولا۔ "تم نے یہاں سے فون کیا تو ہوٹل کا نمبر ٹریس ہو جائے گا اور تمہارے بابا فوراً پہنچ جائیں گے۔"
"تو پھر... پھر کیا کروں؟"
"گھبراؤ نہیں۔ باہر چل کر کسی پبلک کال آفس سے فون کروا دیتا ہوں۔" شرجیل نے کہا۔
"یہ پبلک کال آفس کیا ہوتا ہے؟"
شرجیل نے اسے پبلک کال آفس کے بارے میں تفصیل سے سمجھایا۔

پبلک کال آفس ہوٹل سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ عمیرہ نے مراد کے موبائل پر فون کیا۔ دوسری طرف مراد ہی تھا۔ عمیرہ کی آواز سنتے ہی وہ تڑپ اٹھا۔ "بیٹی! کہاں ہو تم... کہاں چلی گئی ہو؟"
"بابا! میں نے آپ کو یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ میں بالکل خیریت سے ہوں۔ مجھے کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔"
"لیکن تم ہو کہاں... کہاں سے فون کر رہی ہو؟"
"میں شہر میں ہوں بابا اور بہت آرام سے ہوں۔ میں آپ کو فون کے ذریعے اپنی خیریت بتاتی رہوں گی۔"
"بے وقوف مت ہو...! وہ دنیا تمہارے لیے بالکل نئی ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ شہر میں کیسے کیسے بھیڑیے گھومتے رہتے ہیں۔ میں نے اب تک کسی پھول، کسی چراغ کی طرح تمہاری حفاظت کی ہے۔ تم وہاں تباہ ہو جاؤ گی۔ تم مجھے اپنا پتا بتاؤ بیٹی! میں آ کر تمہیں لے جاؤں گا۔ میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔"
"بابا! ایک بات تو بتائیں۔ آپ نے میرے ساتھ

www.pkdigest.com

سردار جی

کسی چوک میں کچھ آدمی ایک سکھ کو بُری طرح پیٹ رہے تھے جبکہ سکھ مسلسل ہنسے جا رہا تھا۔ ایک اور آدمی ادھر سے گزرا تو اس نے سکھ سے کہا: "سردار جی! آپ پاگل ہو گئے ہیں یہ لوگ آپ کو مار رہے ہیں اور آپ ہنس رہے ہیں؟" سکھ نے جواب دیا۔ "پاگل میں نہیں یہ سارے ہو گئے ہیں کیونکہ جس آدمی کو انہوں نے مارنا تھا وہ میں نہیں ہوں میرا ہم شکل بھائی ہے۔ میں نے ان سب کو بے وقوف بنایا ہوا ہے۔ جب یہ تھک جائیں گے تو میں انہیں اصل بات بتاؤں گا اور ان کی اماں مر جائے گی۔"

ایسا سلوک کیوں کیا؟ اس پوری دنیا سے مجھے کیوں الگ کر کے رکھا؟ یہ خوب صورت رنگ برنگی دنیا میرے لیے کیوں نہیں تھی؟ بتائیں بابا!"
"بیٹی! یہ رنگ برنگی دنیا بہت زہریلی ہے۔ تمہیں ابھی اس کا اندازہ نہیں ہے۔ قدم قدم پر دھوکے ہیں...! میں نے تمہیں عافیت میں رکھنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن افسوس کہ تم نے اس کی قدر نہیں کی۔ تم یہ بتاؤ کہ تم کس کے ساتھ ہو؟ کون تمہیں لے گیا ہے؟"
"کوئی نہیں بابا۔ میں اکیلی ہوں۔ میں حویلی سے نکلی تو میری جبلت نے میری راہنمائی کی اور میں بہ حفاظت شہر تک آ گئی۔ یہاں ایک محفوظ جگہ پر ہوں۔ آپ میری طرف سے پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کو فون کرتی رہوں گی۔ خدا حافظ!"

عمیرہ نے فون بند کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

شرجیل نے تسلی دینے والے انداز میں اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "کوئی بات نہیں۔ زندگی اسی کا نام ہے۔ تم نے اپنے بابا کو اپنی خیریت بتا دی۔ ان کے لیے یہی بہت ہو گا۔ آؤ... ہوٹل واپس چلتے ہیں۔ تم آرام کرنا، میں ذرا کام سے جاؤں گا... شام تک واپس آ جاؤں۔"

عمیرہ نے کچھ نہیں کہا۔ وہ اس کے ساتھ چل پڑی۔

☆☆☆

"بس میڈم! یہ سمجھ لیں کہ میں ایک ہیرے کو نکال کر لایا ہوں۔" شرجیل اپنے سامنے بیٹھی ہوئی ایک عورت سے کہہ رہا تھا۔

یہ عورت میڈم کے نام سے جانی جاتی تھی۔ بہت ہی خوب صورت اور باوقار قسم کی عورت تھی۔ اس نے اپنے خوب

صورت مکان کو بری خانہ بنا رکھا تھا۔ ایک سے ایک خوب صورت لڑکی اس کے پاس تھی۔

اس نے ان لڑکیوں کی پرورش ذرا مختلف انداز سے کی تھی۔ یہ لڑکیاں بہت طرح دار تھیں۔ انھیں رقص کرنا آتا تھا۔ وہ ساز بجا سکتی تھیں۔ خوب صورت باتیں کر سکتی تھیں۔ ناز و ادائیں دکھا سکتی تھیں لیکن صرف ایک حد تک... اور اگر کوئی آگے بڑھنے کی کوشش کرتی تو میڈم کے یہاں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی تھی۔

میڈم کی تربیت یافتہ لڑکیاں کمپنی دیا کرتی تھیں۔

اس شہر میں ایسے بہت سے سرمایہ دار تھے جنھیں کسی سے باتیں کرنے کا شوق تھا۔ جو اس بات کے لیے ترستے تھے کہ کوئی خوب صورت اور ذہین لڑکی ان کے ساتھ لانگ ڈرائیو پر جائے۔ کسی کو وہ اپنے ساتھ پارٹی میں لے جا سکیں۔ کوئی غزلوں کی کسی محفل میں ان کے ساتھ بیٹھی ہو یا جب شراب پینے کو دل چاہے تو کوئی ان کے لیے ساقی گری کے فرائض انجام دے۔ میڈم کی تربیت گاہ میں ایسی ہی لڑکیاں تھیں۔

آنے والوں کو بھی یہ معلوم تھا کہ میڈم کی لڑکیاں ایک خاص حد سے آگے نہیں جاتیں۔ یہ لڑکیاں ایسی بھٹکی ہوئی لڑکیاں تھیں جو پورے ملک سے میڈم کے پاس آتی تھیں۔

میڈم ان سے ان کے ماضی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرتی تھی۔ انھوں نے کس انداز کی زندگی گزاری، کہاں گزاری؟ اس سے میڈم کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ لڑکیاں اس کے پاس آ گئی تھیں اور اب یہاں سے ان کی نئی زندگیوں کا آغاز ہوتا تھا۔

"چلو، میں یہ نہیں پوچھوں گی کہ وہ لڑکی کون ہے اور تم اسے کہاں سے نکال کر لائے ہو۔" میڈم نے کہا۔ "لیکن کیا وہ تمہارے بارے میں جانتی ہے؟"

"نہیں میڈم! وہ کچھ نہیں جانتی۔ میں نے اس سے یہ کہہ رکھا ہے کہ میں ایک اخباری رپورٹر اور رائٹر ہوں اور کہانیوں کی تلاش میرا کام ہے۔"

"اب یہ بتاؤ کہ کیا تم اسے کہیں سے زبردستی اٹھا کر لائے ہو؟" میڈم نے پوچھا۔

"نہیں، وہ خود اپنی مرضی سے میرے ساتھ آئی ہے اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ وہ جس طرح پہلے دن تھی، اسی طرح آج بھی ہے۔ یعنی میں اس کے قریب بھی نہیں گیا۔"

"ہاں، یہ بہت ضروری ہے۔" میڈم نے اپنی گردن ہلائی۔ "اب بتاؤ... کیا مانگ رہے ہو؟"

"صرف تین لاکھ۔"

"کیا یہ بہت زیادہ نہیں ہیں؟"

"نہیں میڈم! اس جیسی لڑکی کے لیے یہ کچھ بھی نہیں ہیں۔" شرجیل نے کہا۔ "آپ خود... اسے دیکھ کر فیصلہ کر سکتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ لے آؤ اس کو۔"

شرجیل کو میڈم نے پچاس ہزار ایڈوانس کے طور پر دے دیے۔ شرجیل اس کے لیے پہلے بھی کئی لڑکیاں لا چکا تھا۔

عیرہ اپنے ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی سے باہر سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یہاں زندگی کتنی رواں دواں تھی۔ حویلی میں اس کے کمرے کی کھڑکی سے سوائے ویرانی کے اور کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن یہاں سب کچھ کتنا انوکھا تھا۔

وہ محبت کے جذبے سے آشنا نہیں تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کسی مرد کی محبت کیا ہوتی ہے۔ شرجیل اس کے دل اور ذہن کے بہت قریب آ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے اس طرح اپنا گھر چھوڑ کر غلطی کی ہے یا صحیح قدم اٹھایا ہے۔

ایک طرف اس کے بابا تھے۔ ان کی شان دار حویلی تھی اور دوسری طرف یہ اجنبی ماحول... اجنبی زندگی... اجنبی لوگ۔ اس پورے شہر میں سوائے شرجیل کے وہ کسی اور کو نہیں جانتی تھی۔

شرجیل کا برتاؤ اس کے ساتھ بہت اچھا رہا تھا۔ اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی جو عیرہ کے مزاج کے خلاف ہوتی۔

اس نے اس ایک ہفتے کے اندر شہر میں زندگی کے اتنے رنگ دیکھ لیے تھے جو حویلی کے اٹھارہ انیس برسوں میں بھی دکھائی نہیں دیے تھے... بلکہ وہاں تو صرف ایک رنگ تھا۔ حویلی کی اونچی اونچی چار دیواری کا۔ اس کے علاوہ وہاں اور کچھ بھی نہیں تھا۔

ہلکی سی دستک کے ساتھ شرجیل کمرے میں داخل ہوا۔

"کہاں رہ گئے تھے تم؟" عیرہ نے پوچھا۔

"میں ایک کام سے گیا تھا اور اب تمہیں بھی چلنا ہے۔"

"چلنا ہے... کہاں؟" عیرہ نے حیرت سے پوچھا۔

"دیکھو... ہوٹل میں ہم ایک یا دو دن سے زیادہ نہیں رہ سکتے۔" شرجیل نے کہا۔ "اس لیے میں نے ایک مکان کا

بندوبست کر لیا ہے۔ وہاں تم اطمینان سے رہ سکتی ہو۔"

"کس کا مکان ہے؟"

"میری ایک رشتے دار خاتون کا۔" شرجیل نے کہا۔ "وہ بہت ہی اچھی ہے۔ تم اس سے مل کر خوش ہو جاؤ گی۔"

"شرجیل! ایک بات تو بتاؤ۔ آخر یہ سب کب تک چلے گا؟" عیرہ نے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے، کیا یہ زندگی اسی طرح گزرتی رہے گی؟ کبھی ہوٹل میں کبھی کسی مکان میں... کوئی منزل تو ہوگی ہماری؟"

"کیوں نہیں... میں تمہیں جہاں لے جا رہا ہوں اسی کو اپنی منزل سمجھ لو۔"

"میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں بابا کے پاس واپس چلی جاؤں۔"

"ایسی غلطی بھی مت کرنا۔ تم خود اچھی طرح جانتی ہو کہ وہ کس مزاج کے انسان ہیں۔ وہ تمہارا یہ جرم کبھی معاف نہیں کریں گے۔ تمہیں گولی مار دیں گے۔"

"بابا ایسا نہیں کر سکتے۔" عیرہ یقین بھرے لہجے میں بولی۔ "خیر، تم مجھے کہاں لے جانا چاہ رہے ہو، چلو۔ ایک اور منزل بھی دیکھ لیتی ہوں۔"

"اپنا سامان سمیٹ لو۔ ہم یہ ہوٹل اسی وقت چھوڑ رہے ہیں۔"

عیرہ اپنے ساتھ سوٹ کیس میں صرف اپنے کپڑے لے کر آئی تھی۔ حالانکہ اس کے پاس لاکھوں کے زیورات تھے لیکن اس نے ان زیورات کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔

ہوٹل کی لابی سے گزرتے ہوئے عیرہ نے ایک لڑکی کو دیکھا جو خود بھی اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس لڑکی کو نظر انداز کرتی ہوئی شرجیل کے ساتھ ہوٹل سے باہر آ گئی۔

اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے اس لڑکی کو پہچان لیا تھا۔ وہ نیلما تھی جو اس کی حویلی کی نگراں بن کر آئی تھی۔

جس طرح اس نے نیلما کو پہچانا تھا، اسی طرح نیلما نے بھی اسے پہچان لیا تھا۔ وہ لابی سے اٹھ کر ان دونوں کے پیچھے لپکی لیکن اتنی دیر میں وہ دونوں ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہو چکے تھے۔

مراد نے عیرہ کا فون آنے کے بعد ان لوگوں کو وہاں سے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ یہ لوگ شہر واپس آ کر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔

ٹیکسی کے نگاہوں سے اوجھل ہو جانے کے بعد اس نے... موبائل پر رگھو کا نمبر ملایا۔ "رگھو! فوراً ہوٹل ڈی لکس پہنچ جاؤ... بہت ضروری بات ہے۔"

"کیا کام ہے؟"

"تم آؤ تو سہی۔ تمہارا دل خوش ہو جائے گا۔ میں اندر لابی میں بیٹھی ہوں۔"

"اوکے! میں پندرہ بیس منٹ میں آ رہا ہوں۔"

نیلما لابی میں جا کر بیٹھ گئی۔ اس نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ حیرت انگیز تھا۔ جس لڑکی کو اغوا کرنے کی انھوں نے پلاننگ کی تھی، وہ لڑکی اس ہوٹل میں مقیم تھی۔

صرف اس اطلاع پر لڑکی کا باپ منہ مانگی رقم دے سکتا تھا۔ رگھو وعدے کے مطابق بیس منٹ میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ "ہاں، بتاؤ کیا بات ہے؟" اس نے نیلما کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"رگھو! وہ لڑکی مجھے اس ہوٹل میں دکھائی دی تھی۔"

"کون...؟"

"وہی مراد صاحب کی بیٹی... حویلی والی۔"

"کیا؟" رگھو بھی یہ سن کر مضطرب ہو گیا۔ "تم سچ کہہ رہی ہو؟"

"بالکل سچ... اور میری آنکھیں دھوکا نہیں کھاتیں۔ تم یہ اچھی طرح جانتے ہو۔" نیلما نے کہا۔ "اور یہ بھی سن لو کہ وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک بندہ بھی تھا اور وہ دونوں شاید اس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔"

"اوہ... پھر تو بہت آسانی سے پتا چل جائے گا۔" رگھو نے کہا۔ "اس ہوٹل کا کاؤنٹر منیجر میرا دوست ہے۔ وہ بتا دے گا۔"

"تو جاؤ، جلدی سے معلوم کر کے آؤ۔"

رگھو نے جب کاؤنٹر والے سے معلوم کیا تو اس نے کہا۔ "یار! وہ جو بندہ ہے، وہ ہر دوسرے تیسرے مہینے کسی نہ کسی لڑکی کو پھانس کر یہاں لاتا ہے۔ دو تین دن یہاں رکھتا ہے پھر اسے کہیں اور لے جاتا ہے۔ شرجیل نام ہے اس کا۔"

"اس کا کوئی پتا تو ہوگا؟"

"ہاں ہاں، پتا بھی جانتا ہوں لیکن خیریت ہے نا؟"

"تم مجھے اس کا پتا بتا دو۔ تمہاری مہربانی ہوگی۔"

"اس میں مہربانی کیسی۔ تم تو دوستوں کے کام آنے والے لوگ ہیں۔" کاؤنٹر والے نے ایک سلپ پر شرجیل کا پتا لکھ کر رگھو کی طرف بڑھا دیا۔

☆☆☆

میڈم کو وہ لڑکی بہت اچھی لگی۔

www.pkdigest.com

اس نے شرجیل کو بقایا رقم ادا کر دی۔ وہ رقم لے کر عمیرہ سے ملے بغیر وہاں سے نکل گیا اور اب عمیرہ میڈم کے سامنے سر جھکائے بیٹھی تھی۔

''بیٹی! تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔'' میڈم نے کہا۔ ''تم اپنی مرضی کی زندگی گزاروگی۔''

''آپ بہت اچھی ہیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ شرجیل مجھے آپ کے پاس کیوں لایا ہے؟''

''بیٹی! سچ سچ بتا دوں؟''

''ہاں بتا دیں۔ مجھے کچھ بے چینی سی ہو رہی ہے۔''

''وہ تمہیں میرے ہاتھ فروخت کر گیا ہے۔''

''فروخت کر گیا ہے... میں سمجھی نہیں؟''

''بیچ دیا ہے اس نے۔'' میڈم نے بتایا۔ ''مجھ سے پورے تین لاکھ روپے لیے ہیں اس نے۔''

عمیرہ کے پورے جسم پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اب صرف اندھیرا تھا... گھور اندھیرا۔ اس اندھیرے کو چیرتی ہوئی اس کے باپ کی آواز اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی... جو یہ کہہ رہا تھا۔ ''بیٹی! تم مردوں کو نہیں جانتیں۔ یہ بھیڑیے ہوتے ہیں۔ میں نے اس لیے پوری دنیا کے کتا ہوں سے تمہیں بچا کر رکھا ہے تاکہ ...... کوئی تم پر بری نگاہ نہ ڈال سکے اور اب تم بک گئی ہو۔ تمہیں بیچ دیا گیا ہے۔''

اس کا لرزہ بڑھتا گیا... بڑھتا گیا پھر وہ بے ہوش ہو کر ایک طرف لڑھک گئی۔

☆☆☆

سب دوستوں نے شرجیل کو گھیر لیا تھا۔

وہ اس وقت اپنے فلیٹ ہی میں تھا۔ میڈم سے لیے ہوئے روپے اس نے الماری میں چھپا کر رکھ دیے تھے۔ اس نے اپنے لیے چائے بنائی اور ابھی چائے پینے ہی جا رہا تھا کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔

اس نے دروازہ کھولا تو وہ سب لہراتے ہوئے اندر آ گئے۔

ان میں سے دو کے ہاتھوں میں ٹی ٹی تھی۔ ان میں ایک لڑکی بھی تھی نیلما... اس کے علاوہ رگھو، فیاض، بالا اور جواد بھی تھے۔

شرجیل بری طرح بوکھلا گیا۔ ''کون ہو تم لوگ؟ کیا چاہتے ہو؟''

''زیادہ سوال جواب کرنے کی ضرورت نہیں ہے... سمجھے؟'' بالے نے اس کے سر پر پستول رکھ دیا۔ ''جو ہم پوچھیں، وہ بتاتے جاؤ ورنہ...''

اس دوران نیلما نے دروازہ بند کر دیا۔ شرجیل کو ان کے تیور خطرناک دکھائی دے رہے تھے۔

''کیا پوچھنا ہے تم لوگوں کو؟''

''وہ لڑکی کہاں ہے؟'' رگھو نے پوچھا۔

''کون سی لڑکی؟''

''وہی جس کو تم حویلی سے اڑا لائے ہو۔''

''نہیں، میں کسی لڑکی کو نہیں جانتا۔ میرے پاس کوئی لڑکی نہیں ہے۔''

''یہ آسانی سے نہیں مانے گا۔ اس کی تھوڑی بہت مرمت کرنی پڑے گی۔''

''ٹھہرو، میں بتاتا ہوں۔'' شرجیل جلدی سے بولا۔

''جلدی بتاؤ لیکن جھوٹ نہیں بولنا۔''

''ہاں، میں اس لڑکی کو حویلی سے نکال کر تو لایا تھا لیکن وہ بھاگ گئی۔'' اس نے بتایا۔

''کب بھاگ گئی؟'' فیاض نے غصے سے پوچھا۔

''آج ہی۔'' اس نے بتایا۔ ''میں نے اسے ہوٹل میں رکھا تھا پھر میں نے سوچا کہ ہوٹل سے بہتر ہے کہ اسے اس فلیٹ میں لے آؤں۔ میں اسے لے کر آ رہا تھا کہ ایک سگنل پر ٹیکسی رک گئی اور وہ دروازے سے کود کر بھاگ گئی۔ میں خود اس کی طرف سے پریشان ہوں۔''

''کیا خیال ہے؟'' بالے نے رگھو کی طرف دیکھا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔'' رگھو نے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔''

''یقین کرو... میں جھوٹ نہیں بول رہا۔''

بالے نے آگے بڑھ کر شرجیل کے چہرے پر ایک گھونسا رسید کر دیا۔ اس وقت شرجیل پر نہ جانے کیا جنون سوار ہوا کہ وہ بے ساختہ بالے سے لپٹ گیا۔ اس نے بالے سے ٹی ٹی چھیننے کی کوشش کی۔ اسی افراتفری میں بالے کی ٹی ٹی چل گئی اور شرجیل ایک زوردار چیخ کے ساتھ ایک طرف الٹ گیا۔ گولی اس کے سینے میں اتر گئی تھی۔

سکتہ... ان سب پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔

وہ سب پھٹی پھٹی نگاہوں سے دم توڑتے ہوئے شرجیل کو دیکھ رہے تھے جس کے خون سے وہ چھوٹا سا کمرا بھر گیا تھا۔

''بے وقوف! اب سوچ کیا رہے ہو؟ نکلو یہاں سے۔'' نیلما کی آواز انہیں ہوش میں لائی۔

یا تو دھماکے کی آواز سنی نہیں گئی تھی یا پھر اس پر اس لیے

دھیان نہیں دیا گیا تھا کہ اس قسم کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ بہرحال، کچھ بھی ہو۔ ان سب کو وہاں سے نکلنے کا موقع مل گیا۔ کسی نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔

☆☆☆

عمیرہ ہوش میں آنے کے باوجود شاید پوری طرح ہوش میں نہیں آئی تھی۔

اس کی نگاہیں چھت کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ بڑبڑا رہی تھی۔ ''بابا جانی! آپ ٹھیک کہتے تھے۔ مجھے مردوں کی دنیا میں نہیں جانا چاہیے۔ مرد بھیڑیے ہوتے ہیں بابا جانی! اس لیے آپ نے اچھا کیا تھا جو مجھے کسی مرد کی صورت نہیں دیکھنے دی تھی۔ پھر ایک شیطان ہمارے پاس آ گیا بابا جانی اور میں اس کے بہکاوے میں آ گئی۔''

میڈم اس کے پاس ہی بیٹھی اس کی باتیں سن رہی تھی۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو بیٹی... کیا تمہارے بابا نے تمہیں مرد کی صورت نہیں دیکھنے دی تھی؟''

''جی میڈم!'' عمیرہ دھیرے سے بولی۔ ''پیدائش سے لے کر اب تک میں نے کسی مرد کی صورت نہیں دیکھی۔ میری حویلی میں کوئی بچہ بھی نہیں آ سکتا تھا۔ یا تو بابا آتے تھے یا پھر میں ہوتی تھی۔ حویلی میں کام کرنے والی صرف عورتیں تھیں۔ میں نے مرد کی شکل میں یا تو اپنے بابا کو دیکھا تھا یا پھر یہ شرجیل مل گیا تھا مجھے جس نے مجھے آپ کے ہاتھوں بیچ دیا۔ مردوں کی دنیا میں میری بولی لگا دی گئی... صرف تین لاکھ! میڈم اتنے روپے کی تو میری مسہری ہوگی۔''

''کیا تمہارے بابا بہت دولت مند آدمی ہیں؟''

''ہاں، بہت دولت مند۔ کروڑوں روپے ہیں ان کے پاس۔ زمینیں ہیں، ملز ہیں، کئی فرم ہیں اور نہ جانے کیا کیا ہے... لیکن میں نے اپنی حماقت سے سب گنوا دیا۔''

''اوہ! افسوس ہوا سن کر۔ اب تم کیا کہتی ہو؟''

''آپ جو کہیں... اب تو میں آپ کے رحم و کرم پر ہوں۔ میری حیثیت ہی کیا ہے۔''

''نہیں، ایسا نہ کہو۔ تم جب چاہو یہاں سے جا سکتی ہو۔'' میڈم نے کہا۔ ''میں ایک دوسرے مزاج کی عورت ہوں۔ کسی پر ظلم کرنا نہیں چاہتی۔ تم چاہو تو میں فون کر کے تمہارے بابا کو بلا لوں؟ تم ان کے ساتھ چلی جانا۔''

''میں کیا منہ لے کر جاؤں گی ان کے پاس۔ میڈم! ایک بات بتائیں... آخر میں اتنی کمزور کیوں ثابت ہوئی؟''

''یہ تو ہونا ہی تھا کیونکہ مردوں سے دور رکھ کر تمہارے بابا نے تمہیں بچی بنا کر رکھ دیا۔ تم میں اعتماد پیدا نہیں ہو سکا۔ تم غیر فطری زندگی گزارتی رہیں۔ اس لیے تم شرجیل کی باتوں میں آ گئیں۔ ظاہر ہے، تمہارے پاس انسان کو پرکھنے کا ہنر کہاں سے آئے گا۔ یہ درست ہے بیٹی کہ زندگی کے اس تالاب میں مگرمچھ بھرے ہوئے ہیں لیکن زندہ رہنے کا ہنر یہ نہیں ہے کہ کنارے کھڑے ہو کر مگرمچھوں کو دیکھا جائے... بلکہ زندگی وہ ہے کہ تالاب میں اتر کر ان کا مقابلہ کیا جائے اور تمہارے بابا نے تمہارے ساتھ یہ کام نہیں کیا۔ تمہیں کنارے پر رکھا۔ بہرحال، اب تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم یہاں آرام سے رہو اور جب جانا چاہو چلی جانا۔ میں تمہارے جانے کا بندوبست کر دوں گی۔''

''آپ بہت اچھی ہیں میڈم۔''

''شاید اس لیے کہ مجھے مگرمچھوں سے لڑنے کا سلیقہ آ گیا ہے۔'' میڈم نے کہا۔ ''بہرحال، اب تم کیا چاہتی ہو؟ تمہارے ذہن میں کیا ہے؟''

عمیرہ نے آنکھیں بند کر کے سوچنا شروع کر دیا۔ وہ کیا چاہتی تھی؟ اسے کیا کرنا چاہیے تھا؟ بابا کے پاس چلی جائے... اس حویلی میں جہاں اس نے زندگی کے اتنے برس گزار دیے تھے یا میڈم کے پاس رہے... یا تالاب میں اتر کر مگرمچھوں کا مقابلہ کرے... ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ دنیا کا ہر مرد ایک جیسا ہو۔ کچھ نہ کچھ تو اچھے لوگ بھی ہوتے ہوں گے۔

پھر اس نے آنکھیں کھول کر میڈم کی طرف دیکھا۔

''میڈم! ایک بات بتائیے... کیا مرد اچھے بھی ہوتے ہیں؟''

میڈم کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

''کیوں نہیں... یہ دنیا اچھے برے لوگوں سے بھری ہوئی ہے لیکن انہیں پہچاننے والی نگاہ چاہیے جو ظاہر ہے تمہارے پاس نہیں ہے۔''

''میڈم! میں اس معاشرے میں رہ کر زندہ رہنا چاہتی ہوں۔'' عمیرہ نے کہا۔ ''پوری خود اعتمادی کے ساتھ۔''

''تو پھر اس کے لیے تمہیں اپنی زندگی کو نئے انداز سے ترتیب دینا ہوگا۔ اگر تم حویلی واپس چلی گئیں تو ایک بار پھر بچی بن جاؤ گی۔''

''تو آپ ہی مشورہ دیں، میں کیا کروں؟''

''میری طرف سے تم آزاد ہو۔'' میڈم نے کہا۔ ''حالانکہ میں نے کبھی ایسا نہیں کیا لیکن نہ جانے کیوں تمہارے سامنے بے بس ہو کر رہ گئی ہوں۔ دل چاہتا ہے کہ تمہارا ساتھ دوں... جہاں تک ممکن ہو۔''

''آپ کا شکریہ میڈم۔''

www.pkdigest.com

"میں نے تمہارے لیے یہ سوچا ہے کہ میں تمہیں ایک الگ فلیٹ دلوا دوں اور ایک جگہ تمہاری ملازمت کا بندوبست کردوں... کسی دفتر میں۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے میڈم... میں تو کچھ بھی نہیں جانتی۔"

"ان سے یہ کہہ دیا جائے گا کہ تم کچھ بھی نہیں جانتیں۔" میڈم نے کہا۔ "وہ تمہاری تربیت کریں گے اور یہ میں اس لیے کردوں گی کہ تم اپنی اس زندگی کے خول سے باہر نکل آؤ جس میں اب تک تمہیں... رکھا گیا ہے۔ تم میں خود اعتمادی پیدا ہو جائے۔ تم اپنے طور پر زندگی گزارنے کا سلیقہ سیکھ لو۔ طوفانوں سے لڑنا سیکھو۔ خود سوچو بیٹی کہ تمہارے بابا کب تک تمہارا ساتھ دیں گے؟ ایک نہ ایک دن انہیں جدا ہونا ہے۔ فرض کرو، تم حویلی میں رہتی ہو اور ایک دن اچانک تمہارے بابا دنیا سے چلے جاتے ہیں پھر تم کیا کروگی؟ تمہیں تو کچھ بھی نہیں معلوم۔ تم تو خودکشی کرلوگی کیونکہ سماج میں رہ کر زندہ رہنے کا طریقہ نہیں سکھایا گیا۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم تربیت حاصل کرو۔ بولڈ بن جاؤ ورنہ شرجیل جیسے لوگ تمہاری زندگی میں آتے رہیں گے اور تم ان کو اپنا سہارا جان کر ان سے لپٹتی رہوگی۔"

"آپ نے مجھے جینے کی راہ دکھا دی ہے میڈم۔" عمیرہ نے کہا۔ "میں وہی کروں گی جو آپ کہہ رہی ہیں۔"

"ٹھیک ہے تو پھر تم اپنے بابا کو فون کرکے انہیں یہ اطمینان دلا دو کہ تم بالکل محفوظ ہو۔ اس کے بعد اپنی زندگی شروع کردو... ایک نئی زندگی۔ تمہاری یہ میڈم تمہاری نئی زندگی میں تمہارا پوری طرح ساتھ دے گی۔"

☆☆☆

مراد نے اپنی وہ حویلی اپنے منیجر کی نگرانی میں دے دی اور خود شہر آگیا۔

شہر میں بھی اس کا شان دار مکان تھا۔ وہ جب شہر میں ہوتا تو اسی مکان میں قیام کرتا لیکن صرف دن بھر کے لیے۔ شام ہوتے ہی وہ حویلی واپس چلا جاتا۔ اپنی عمیرہ کے پاس لیکن عمیرہ اب کہاں تھی۔ وہ کہاں چلی گئی تھی؟

اس کا فون آیا تھا کہ وہ شہر میں ہے اور بہت آرام سے زندگی گزار رہی ہے۔ اس کے ساتھ کوئی پریشانی نہیں ہے۔ وہ بالکل ٹھیک ہے... وغیرہ وغیرہ۔

اور پہلے کی طرح اس بار بھی یہ کال ٹریس نہیں ہوسکی تھی کیونکہ یہ کال کسی پی سی او سے کی گئی تھی۔ جانے عمیرہ میں اتنی چالاکی کہاں سے آگئی تھی؟ کوئی تو ہوگا جو اس کو ایسی باتیں بتا رہا تھا لیکن وہ کون ہوسکتا تھا؟ وہ کس کے پاس تھی؟ کس کے ساتھ تھی؟

اس طرح کے کئی سوالات تھے لیکن مراد کے پاس کسی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ عمیرہ کے جانے کے بعد ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ اب تک اس نے عمیرہ کی گمشدگی کی رپورٹ درج نہیں کروائی تھی۔ یہ بات اس کی شان کے خلاف تھی۔

اس نے منیجر کو گھر پر ہی بلوا لیا۔ وہ فی الحال دفتر جانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے آکر رپورٹ دی تھی کہ سارا کام ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔

منیجر کا نام آفتاب تھا۔ وہ ایک چالاک اور ہوشیار آدمی تھا۔ مراد اس پر بھروسا کرسکتا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے منیجر سے کہا۔ "آفتاب! اگر میں تم سے ایک ذاتی کام لینا چاہوں تو اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ تم اس کا ڈھنڈورا نہیں پیٹو گے؟"

"یہ کس طرح ہوسکتا ہے جناب! آپ حکم دیں۔"

"کسی کو تلاش کرنا ہے۔"

"کس کو سر؟"

"ایک لڑکی ہے۔ اسی شہر میں ہے۔ کہاں ہے، یہ میں نہیں جانتا لیکن میرے پاس اس کے فون آتے رہتے ہیں۔"

"فون نمبر ٹریس ہوسکتا ہے سر!"

"مصیبت تو یہ ہے کہ... فون پبلک کال آفس سے آتے ہیں۔" مراد نے بتایا۔ "اس لیے ٹریس کرنا مشکل ہے۔"

"اس کا آخری فون کب آیا تھا سر؟" آفتاب نے پوچھا۔

"کل۔" مراد نے اداسی سے جواب دیا۔ "میں نے وہ نمبر نوٹ کرلیا ہے۔"

"پھر تو اس جگہ کا پتا چل سکتا ہے جہاں سے یہ کال کی گئی ہے۔" آفتاب نے کہا۔ "آپ مجھے نمبر دے دیں۔ میں شام تک آپ کو رپورٹ دے دوں گا۔"

مراد نے اسے نمبر دے دیا اور ساتھ ہی دوبارہ تاکید کی کہ وہ کسی بھی حال میں اس کا ذکر کسی سے نہیں کرے گا۔

منیجر آفتاب نے اپنے وعدے کے مطابق شام تک رپورٹ دے دی۔ "سر! پبلک کال آفس کا تو پتا چل گیا ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ یہ کال کس نے کی تھی۔ کال آفس والے کا یہ کہنا ہے کہ دن بھر میں پچاسوں لوگ آتے رہتے ہیں۔ وہ کس کس کو یاد رکھ سکتا ہے۔"

"کم از کم یہ تو پتا چلے کہ وہ پبلک کال آفس ہے

کہاں؟"

"وہ رازی سوسائٹی میں ہے سر! شہر کا اچھا پوش علاقہ ہے۔"

"ہوں۔" مراد نے ہنکارا بھرا۔ "اب میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس کی کال دوبارہ آئے گی یا نہیں۔ بہرحال، تم جاؤ۔ اس معاملے کو میں خود دیکھوں گا۔"

یہ اتفاق ہی تھا کہ آفتاب کے جاتے ہی اس کے موبائل پر پھر عمیرہ کا فون آگیا۔ یہ نمبر اسی پبلک کال آفس کا تھا۔ "بابا جانی!" عمیرہ کہہ رہی تھی۔ "آپ تو میری وجہ سے بہت پریشان ہوں گے؟"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے؟"

"نہیں بابا! بلکہ آپ کو اس بات پر خوش ہونا چاہیے کہ آپ کی بیٹی نے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھ لیا ہے۔ مجھے زندگی برتنے کا سلیقہ آتا جارہا ہے۔"

"بیٹی! تم واپس آجاؤ۔ آخر کس چیز کی کمی ہے تمہارے پاس... سب کچھ تو ہے۔"

"قوتِ ارادی کی کمی تھی بابا! خوداعتمادی کی کمی تھی جنہیں اب میں حاصل کرتی جارہی ہوں۔ اور جب میں آپ سے ملوں گی تو آپ مجھے دیکھ کر حیران ہوجائیں گے۔"

"[illegible] آؤ گی میرے پاس... [illegible] آؤ گی؟" مراد چیخ اٹھا۔

"بہت جلد بابا! بہت جلد۔"

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہوگیا۔ مراد نے فوراً آفتاب کو فون کیا۔ "آفتاب! ابھی ابھی اس کی کال آئی تھی اسی نمبر سے۔ جاؤ... جاکر چیک کرو... جلدی۔ پتا لگاؤ وہ کال آفس کے آس پاس ہی رہتی ہوگی۔"

"او کے سر! میں ابھی جارہا ہوں۔"

☆☆☆

اخبارات میں شرجیل کے قتل کی خبر شائع ہوگئی تھی۔

ایک طرف اس کی ایک چھوٹی سی تصویر بھی تھی۔ اس وقت وہ سب رگھو کے چھوٹے سے فلیٹ میں جمع تھے۔ ان کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔

سب کے سب بری طرح بوکھلائے ہوئے تھے۔ خاص طور پر بالا جس کے ہاتھ سے یہ خون ہوا تھا۔ "یار! ہم سب محنت مزدوری کرنے والے سیدھے سادے لوگ تھے۔" جواد نے کہا۔ "چھوٹی موٹی وارداتوں کی بات الگ ہے۔ ہم نے کبھی کوئی بڑا جرم نہیں کیا تھا... پھر اس رگھو نے ہمیں بہکایا اور ہم سب خوامخواہ اس چکر میں پھنس گئے۔"

"یار! میں نے تو سب کے لیے بھلائی کا سوچا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ کہانی الٹی ہوتی چلی جائے گی۔"

"اس کم بخت کو بھی نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ حملہ کر بیٹھا۔ ورنہ ہم اسے چھوڑ کر واپس آجاتے۔"

"میرے ہاتھ سے ایک خون ہوگیا ہے۔" بالے نے کہا۔ "مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے... کیونکہ میں نے سنا ہے کہ خون ہر حال میں سامنے آجاتا ہے۔"

"سوال یہ ہے کہ ہم لوگوں کو کیا سوجھی تھی کہ شرجیل کے گھر چڑھ دوڑے؟" نیلما نے کہا۔ "اس کا تو قصہ ختم ہوگیا تھا۔ ہم نے خوامخواہ اپنی شامت کو آواز دے دی۔"

"مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔" بالے نے اپنی بات دہرائی۔

"میرا خیال ہے کہ یہ بندہ ہم سب کو لے ڈوبے گا۔" جواد نے کہا پھر اس نے بالے کی طرف دیکھا۔ "بے وقوف آدمی! کیوں بار بار ایک بات کو دہرائے جارہے ہو۔ جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ ہمیں کوئی نہیں پہچانتا۔ کسی نے ہم پر دھیان نہیں دیا تھا۔ ہم بڑی آسانی سے نکل کر آگئے تھے۔"

بالا کچھ کہنے کے بجائے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ اس وقت اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔

فیاض نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اعلان کیا۔ "یارو! اس کو تو بہت تیز بخار ہو رہا ہے۔"

"ہاں، بہت تیز بخار ہے مجھے۔" بالے نے سرگوشی کی۔ "میں گھر جارہا ہوں۔ مجھے بڑی وحشت ہو رہی ہے۔"

وہ لوگ اسے روکتے رہے لیکن وہ فلیٹ سے باہر نکل گیا۔

"میں پھر کہہ رہا ہوں کہ یہ آدمی ہم سب کو لے ڈوبے گا۔" جواد نے کہا۔ "اس کی گھبراہٹ ہم سب کو پھنسوا دے گی۔"

"باتیں تو بہت بڑی بڑی کرتا تھا۔" رگھو غصے سے بولا۔ "مجھے کیا معلوم تھا کہ اندر سے ایسا بزدل نکلے گا... ورنہ میں کبھی اسے اپنے ساتھ نہیں ملاتا۔"

"مجھے تو ڈر ہے کہ یہ اپنے پاگل پن میں کہیں پولیس کے پاس نہ پہنچ جائے۔" فیاض نے کہا۔

"تو پھر اس کے لیے کیا کیا جائے؟"

"اب اس کے لیے ایک ہی علاج ہے۔" جواد معنی خیز انداز سے بولا۔ "اور یہ کام بہت ضروری ہوگیا ہے۔ ورنہ ہم

www.pkdigest.com

سب پھانسی کے تختے پر چڑھ جائیں گے۔"

☆☆☆

وہ ایک خوب صورت اور جدید طرز کا دفتر تھا جہاں میڈم عمیرہ کو لے کر آئی تھی۔

اس دفتر کا منیجر میڈم کی جان پہچان کا آدمی تھا اور میڈم اس پر بہت مہربان بھی تھی۔ اس نے عمیرہ کو فوری طور پر ملازمت دے دی۔

"منیجر صاحب! میں کچھ بھی نہیں جانتی ہوں۔" عمیرہ نے اس سے کہا۔ "اس دفتر میں جو کچھ بھی ہے، وہ میرے لیے بالکل اجنبی ہے۔"

"میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔ کس طرح اجنبی ہے؟"

"یہ دفتر کے کام، فائلیں... اور یہ جسے آپ کمپیوٹر کہتے ہیں۔ یہ کاروبار کے الٹ پھیر۔ میں ان میں سے کچھ بھی نہیں جانتی۔"

"میڈم! شاید یہ لڑکی کسی جنگل سے اٹھ کر یہاں آگئی ہے۔" منیجر نے میڈم سے کہا۔

"ہاں، ایسا ہی سمجھ لو۔" میڈم نے کہا۔ "لیکن اب تمہیں اس کی پوری تربیت کرنی ہے۔"

"میں اس کو فیصل کے حوالے کر دیتا ہوں میڈم! وہ انتہائی ذمے دار اور مخلص نوجوان ہے۔ وہ اس لڑکی کو سارے کام سمجھا دے گا۔"

"عمیرہ! تم یہاں آ کر پریشان تو نہیں ہو رہی ہو؟"

"نہیں میڈم!" عمیرہ نے میڈم کا ہاتھ تھام لیا۔ "بلکہ میں زندگی کو ایک نئے انداز سے دکھانے پر آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔"

میڈم مسکرا کر رہ گئیں۔

میڈم نے سب کچھ بہت تیزی سے کیا تھا۔ اسی صبح اس نے عمیرہ کو اخبار دکھاتے ہوئے بتایا تھا۔ "بیٹی! جو شخص تمہیں مجبور کر کے اس حویلی سے نکال لایا تھا، اس کا مرڈر ہو گیا ہے۔"

"کیا؟" عمیرہ حیران رہ گئی۔

"یہ دنیا ہے اور ہمارے اردگرد جو واقعات بھی ہوتے ہیں وہ مکافاتِ عمل ہی ہوتے ہیں۔ اس نے تم جیسی لڑکی کو دھوکا دیا تھا۔ قدرت نے اسے سزا دے دی۔"

پھر اسی دن میڈم نے عمیرہ کے لیے ایک علیحدہ فلیٹ کا انتظام کرتے ہوئے کہا۔ "عمیرہ! اب تمہیں یہیں رہنا ہے۔ ویسے تو میں تمہیں اپنے ساتھ بھی رکھ سکتی تھی لیکن میرے ساتھ تمہیں اپنے طور پر زندگی برتنے کا سلیقہ نہیں آتا۔ خود اعتمادی پیدا نہیں ہوتی۔ اسی لیے تم الگ رہو۔ اپنے آپ پر بھروسا کرنا سیکھو اور میں تم سے دور نہیں ہوں جب کوئی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے لینا۔"

"میڈم! آپ مجھ پر اتنی مہربان کیوں ہیں؟"

"اس لیے کہ تمہارا ساتھ دیتے ہوئے مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں تخلیق کے مرحلے سے گزر رہی ہوں۔"

"اگر ایسا ہے تو مجھے اجازت دیں کہ میں آپ کو ماں کہہ سکوں۔"

میڈم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "بہت شوق سے بیٹی! دوسری لڑکیوں کے لیے تو میں میڈم ہو سکتی ہوں لیکن تمہارے لیے ماں ہی ہوں۔"

اسی دوپہر کو وہ عمیرہ کو اس دفتر میں لے آئی تھی جہاں عمیرہ کے لیے فوری طور پر ملازمت کا بندوبست ہو گیا تھا۔

منیجر نے عمیرہ کو جس نوجوان کے سپرد کیا تھا، وہ ایک سیدھا سادہ نوجوان تھا۔ اس کا نام فیصل تھا۔ عمیرہ سے باتیں کرتے ہوئے کچھ شرمایا شرمایا سا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ نوجوان اسے شرجیل سے کچھ مختلف دکھائی دیا۔

"عمیرہ صاحبہ! آپ کیا کیا جاننا چاہتی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"سب کچھ۔ اس لیے کہ میں کچھ بھی نہیں جانتی۔" عمیرہ نے کہا۔ "تمہارا یہ پورا ماحول اور یہاں رکھی ہوئی ساری چیزیں میرے لیے بالکل اجنبی ہیں۔ میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ یہ سمجھو کہ تم مجھے الف ب سے شروع کرو گے۔"

"چلیں، کوئی بات نہیں۔" فیصل نے ایک گہری سانس لی۔ "میں کوشش کروں گا کہ آپ کو بہت کچھ بتا سکوں۔"

عمیرہ کی زندگی میں یہ تیسرا مرد تھا۔

پہلا مراد تھا... اس کا باپ۔ پھر شرجیل اور اب یہ فیصل۔ تین مختلف لوگ۔ تین مختلف کردار۔ تین مختلف فطرتیں۔ اگر مراد کے نزدیک شرجیل جیسے لوگ تھے تو پھر تو یہ دنیا واقعی بہت خراب تھی... اور اگر فیصل جیسے لوگ ہوتے تو شاید صورتِ حال کچھ اور ہوتی۔

☆☆☆

چار دن گزر گئے۔

شرجیل کے بعد ایک اور آدمی مارا جا چکا تھا اور وہ بالا تھا۔ دوسری موت... دوسرا خون۔ یہ خون جواد نے کیا تھا۔ خود جواد کا بھی قتل ہو گیا تھا۔ کسی نے چاقو سے اس کی گردن کاٹ دی تھی۔ اس کی لاش فٹ پاتھ سے پائی گئی تھی۔ اس کے بارے میں نہیں پتا چل سکا تھا کہ اسے مارنے والا کون ہے۔

وہ ایک بار پھر رگھو کے فلیٹ میں جمع تھے۔

اب صرف فیاض، رگھو اور نیلما رہ گئے تھے۔ یہ تینوں بہت ہی خوف زدہ دکھائی دیتے تھے۔ "رگھو! ایسا لگتا ہے جیسے اس معصوم لڑکی کی بددعائیں ہمارا پیچھا کرنے لگی ہیں۔" نیلما نے کہا۔ "ہم سب شاید ایک ایک کر کے اسی طرح مار دیے جائیں گے یا خوف سے پاگل ہو جائیں گے۔"

"کیسی بددعا؟ ہم نے تو اس کے خلاف کچھ بھی نہیں کیا بلکہ کچھ کر ہی نہیں سکے۔"

"ہم نے اس کے لیے پلاننگ تو کی تھی نا۔" نیلما نے کہا۔ "شاید خدا کو یہ پلاننگ ہی ناگوار گزری ہے۔ اس نے ہماری نیتوں پر ہمیں سزا دینی شروع کر دی ہے۔"

"خدا کے لیے نیلما... پریشان کرنے والی باتیں نہ کرو۔" فیاض نے کہا۔

"تو اور کیا کہوں؟ جو کچھ بھی ہو رہا ہے؟ وہ تو ہم دیکھ ہی رہے ہیں۔"

"لگتا ہے بالے کی طرح تم بھی اپنے ہوش میں نہیں ہو۔"

"نہیں، میں پوری طرح ہوش میں ہوں۔ خدا کی پناہ۔ خود سوچو، پہلے شرجیل مارا گیا پھر بالا۔ اس کے بعد جواد کی لاش پائی گئی۔ آخر کیوں؟ یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑی ہے نا۔"

"پھر تم ہی بتاؤ ہم کیا کریں؟"

"نہیں، ایک خیال ہے میرے ذہن میں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تم لوگ اسے بے وقوفی سمجھو لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ ہمیں اس لڑکی کو تلاش کر کے اس کے باپ سے سوا دینا چاہیے۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"کم از کم اتنا تو ہوگا کہ ہم اپنے احساس سے چھٹکارا پا لیں گے۔" نیلما نے کہا۔

"خدا جانے اس لڑکی کو کیا ہو گیا ہے۔" رگھو جھلا کر بولا۔ "میں یہ کہتا ہوں کہ اب تک جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ اور تم راکھ کریدنے پر تلی ہوئی ہو۔ خدا کے واسطے ہوش میں آؤ نیلما۔ ورنہ ہم بھی مارے جائیں گے۔"

"دیکھو نیلما!" فیاض نے اسے سمجھایا۔ "ابھی تک ہم پر کوئی بات نہیں آئی ہے۔ ہم ایک طرف کھڑے ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ گول کر جاؤ۔ بھول جاؤ ساری کہانی کو۔"

"اس کا باپ بہت اثر و رسوخ والا انسان ہے۔" رگھو نے کہا۔ "وہ کہیں نہ کہیں سے اپنی بیٹی کو ڈھونڈ ہی لے گا۔ اس لیے ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ہم تینوں کو کچھ عرصے کے لیے ایک دوسرے سے بھی الگ رہنا چاہیے۔" فیاض نے مشورہ دیا۔ "ایک دوسرے سے ملنا بھی نہیں چاہیے۔"

☆☆☆

عمیرہ کو وہ لڑکا فیصل بہت اچھا لگ رہا تھا۔

اس میں شرافت تھی جس کا تجربہ اسے شرجیل کے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے جا رہے تھے۔

فیصل نے اسے زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ عمیرہ کے لیے اس کی حیثیت ایک دوست کی بھی تھی... استاد کی بھی اور محبوب کی بھی۔

پہلی بار عمیرہ اس لذت سے آشنا ہو رہی تھی جسے محبت کہا جاتا ہے۔ شرجیل کو دیکھ کر اور اسے پا کر بھی اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئی تھیں لیکن ان کی نوعیت مختلف تھی۔

اس میں نئے پن کی حیرانی کا عنصر زیادہ تھا۔ جس طرح کسی بچے کو کوئی دلچسپ تماشا دکھایا جائے اور وہ آنکھیں پھاڑے ہوئے اس تماشے کو دیکھتا رہے۔ لیکن فیصل کے ساتھ اس احساس کی نوعیت مختلف تھی۔ اس احساس میں کسی قسم کی حیرت نہیں تھی بلکہ ایک طمانیت کا سرور تھا۔

مرد اور عورت ایک دوسرے کے بغیر کتنے ادھورے ہوتے ہیں، اس بات کا علم اسے ہو رہا تھا۔ اس نے حویلی سے باہر آ کر زندگی کے کئی رنگ دیکھ لیے تھے۔ یہ رنگ خوب صورت بھی تھے اور بھیانک بھی۔

میڈم نے اس کے لیے ایک علیحدہ فلیٹ کا بندوبست کر دیا تھا جہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی اور اس فلیٹ میں وہ پورے اعتماد کے ساتھ اپنے دن گزار رہی تھی۔

اس کے فلیٹ میں بھی بے شمار مرد تھے۔ لیکن اب اس کے لیے مردوں کو دیکھنا یا ان سے باتیں کرنا کوئی نئی بات نہیں رہی تھی۔ یہ تو زندگی کی روٹین کا حصہ تھا۔

میڈم اس کی خبر لیتی رہتی تھیں۔ اس کی سمجھ میں اب تک نہیں آیا تھا کہ میڈم اس پر اتنی مہربان کیوں ہیں۔ شاید اس لیے کہ عمیرہ بہت معصوم تھی اور خدا نے میڈم کے دل میں اس کی محبت پیدا کر دی تھی یا کوئی اور بات تھی۔

دفتر کا منیجر بھی اس پر بہت مہربان تھا۔

وہ اس کی غلطیوں کو نظر انداز کر دیا کرتا۔ ایک دن اس نے عمیرہ سے کہا۔ "عمیرہ! میں نے تمہارے لیے بہت اچھی رپورٹ بنا کر بڑے باس کو دے دی ہے اور وہ فوری طور پر تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

www.pkdigest.com

"وہ کیوں؟"

"ان کی ایک فیکٹری ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ اس کا سارا انتظام تمہارے حوالے کردیں۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟ میں اتنی بڑی ذمے داری کیسے اٹھا سکتی ہوں؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا۔" منیجر نے کہا۔ "بہر حال، ان سے ملنا تو ہوگا۔"

"کہاں ہیں بڑے باس؟"

"وہ آج صبح سے اپنے کمرے میں آکر بیٹھ گئے ہیں۔" منیجر نے بتایا۔ "تم بغیر جھجک کے چلی جاؤ۔"

"کیا آپ ساتھ نہیں چلیں گے؟"

"نہیں، تم ہی کو جانا ہوگا۔"

عمیرہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے پر دستک دی اور اندر چلی گئی۔ وہ سامنے کھڑا تھا... اس فرم کا مالک۔ بگ باس... مراد... اس کا باپ... جس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور جس نے اپنے دونوں بازو پھیلا رکھے تھے۔

عمیرہ کسی چھوٹی سی بچی کی طرح روتی ہوئی ان بازوؤں میں سمٹ آئی۔ دونوں باپ بیٹی بہت دیر تک روتے رہے۔ "میری بچی! تم مجھے کیوں چھوڑ گئی تھیں؟"

"بابا! شاید میری برائی یا بھلائی کا کوئی لمحہ تھا۔" عمیرہ نے جواب دیا۔

"مجھے منیجر نے بتادیا تھا کہ تم کون ہو۔" مراد نے کہا۔ "جو عورت تمہیں یہاں لے کر آئی تھی، اس نے منیجر کو تمہارے بارے میں بتادیا تھا کہ تم میری بیٹی ہو۔"

"میڈم نے میرا بہت ساتھ دیا ہے بابا۔" عمیرہ نے بتایا۔ "وہ اگر نہیں ملتیں تو بھیڑیوں کے اس جنگل میں نہ جانے میرا کیا حال ہوجاتا۔"

"بیٹی! میں غلط بھی تھا اور صحیح بھی..." مراد نے کہا۔ "صحیح اس لیے تھا کہ یہ معاشرہ واقعی بھیڑیوں کا ہے۔ یہاں قدم قدم پر شرجیل جیسے لوگ ملتے ہیں اور غلط اس لیے تھا کہ مجھے تمہیں معاشرے سے کاٹ کر نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ اس طرح تمہاری ذہنی نشوونما رک گئی۔ اس کا میں نے کوئی خیال نہیں کیا۔ بس اپنی محبت کے جوش میں تمہیں حویلی میں قید کر کے رکھ دیا۔"

"اب آپ کیسا محسوس کررہے ہیں بابا؟"

"اب مجھے تم پر فخر ہے میری بچی کہ تم نے اپنے لیے جینے کی راہ تلاش کرلی ہے۔ اب تم میں وہ خود اعتمادی دیکھ رہا ہوں جو تمہیں بھیڑیوں کے درمیان بھی محفوظ اور سلامت رکھے گی۔"

"شکریہ بابا! میں واقعی بہت بدل گئی ہوں اور اس کے لیے پھر میڈم کا شکریہ ادا کروں گی۔ انہوں نے قدم قدم پر مجھے حالات سے لڑنا سکھایا ہے۔"

"میں خود تمہارے ساتھ چل کر اس عورت کا شکریہ ادا کروں گا۔"

"ضرور بابا، آپ کو ضرور چلنا چاہیے۔"

☆☆☆

دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔

میڈم اور مراد۔ وقت بہت تیزی سے اپنے آپ کو دہرا رہا تھا۔ صفحات بدل رہا تھا۔ میڈم کے چہرے پر سکون تھا جبکہ مراد کا چہرہ دھواں ہورہا تھا۔ اسے میڈم کو دیکھ کر سکتہ سا ہوگیا تھا۔ عمیرہ دونوں کے سامنے کھڑی حیرت سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ "کیا ہوا بابا؟" اس نے مراد سے پوچھا۔ "کیا آپ میڈم کو جانتے ہیں؟"

"بیٹی! تم ذرا باہر جاؤ۔" مراد نے عمیرہ سے کہا۔ "مجھے تمہاری میڈم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

عمیرہ حیرت سے دیکھتی ہوئی باہر چلی گئی۔

"علینہ! تم... تم اور اس حال میں۔" مراد نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہاں، میں اس حال میں ہوں مراد!" علینہ نے جواب دیا۔ "اور یہ سب کس کی وجہ سے ہوا ہے؟ تمہاری وجہ سے۔ تمہارے مزاج میں جو بے پناہ شک کا پہلو ہے، یہ سب اسی کی کارستانی ہے۔ تم نے معلوم تو کیا ہوتا کہ تمہارا دوست میرے پاس کیوں آیا تھا۔ تم نے اسے میرے قریب دیکھ کر یہ سمجھ لیا کہ میرے اور اس کے درمیان ناجائز تعلقات ہیں۔ تم نے صفائی سننے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی اور مجھے طلاق دے دی۔ کیا قصور تھا میرا؟"

"علینہ!" مراد نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "میں نے جو کچھ دیکھا تو..."

"کبھی کبھی آنکھیں بھی دھوکا کھا جاتی ہیں۔ ایسے موقعوں پر دل کی آنکھوں سے دیکھنا چاہیے لیکن تمہارے پاس دل کی آنکھیں کہاں ہیں۔ سنو مراد! تمہارا دوست مجھ سے ملنے آیا تھا اور تم یہ اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ شوگر کا مریض تھا۔ نہ جانے کس طرح اس کا شوگر لیول اچانک ڈاؤن ہوگیا۔ وہ بے ہوش ہوکر گر گیا تھا۔ اس وقت میں اسے سہارا دینے کے لیے اس کے قریب ہوئی تھی اور تم نے نہ جانے کیا سمجھ لیا۔"

"تم... تم بتا تو دیتیں۔"

"کیسے بتاتی... تم تو کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہیں تھے۔ تمہارے سر پر تو بھوت سوار ہوگیا تھا۔" علینہ نے کہا۔ "اور جانتے ہو ایسا کیوں ہوا؟"

مراد خاموش رہا۔

"میں بتاتی ہوں کہ ایسا کیوں ہوا کیونکہ تم ایک ایسے آدمی ہو جس نے اپنے ایک استاد کی بے بس لڑکی پر مجرمانہ حملہ کیا تھا اور اس وقت اس لڑکی نے یہ کہا تھا کہ اس دنیا میں کسی مرد پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ بس اس دن کے بعد سے تم نفسیاتی مریض بن گئے۔ تم نے یہ سوچا کہ جب تم خود اپنے آپ پر بھروسا نہیں کرسکتے تو پھر دوسرے مردوں پر کیسے بھروسا ہوسکتا ہے... اور اسی شک کی روشنی میں تم نے مجھے اور اپنے دوست کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا کہ مرد نے ایک بار پھر دھوکا دیا ہے اور اپنی بچی کی زندگی بھی برباد کر کے رکھ دی۔ اس بے چاری کو پوری دنیا سے کاٹ کر رکھ دیا۔ صرف اس لیے کہ تمہیں اپنے آپ پر بھی بھروسا نہیں تھا اور تم سب کو اپنی عینک لگا کر دیکھتے تھے۔"

"شاید... شاید مجھے یہ سب نہیں کرنا چاہیے تھا۔" مراد بڑبڑایا۔ "لیکن تم... تم نے یہ سب کیا شروع کردیا ہے؟"

"زندہ رہنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا نا۔" علینہ نے کہا۔ "دیکھیے یہ ایک بھی کہانی ہے لیکن تنہا جان لو کہ میں غلط نہیں کررہی۔ لڑکیاں میرے پاس آتی ہیں لیکن میں انہیں حوصلے کا سبق سکھاتی ہوں۔ ان کی تربیت کرتی ہوں کہ وہ مگرمچھوں کے درمیان رہ کر زندگی گزارنے کا ہنر سیکھ سکیں۔ عمیرہ جب میرے پاس آئی اور مجھے اس نے اپنے بارے میں بتایا تو مجھے پتا چل گیا کہ وہ تمہاری بیٹی ہے اور میں نے اس پر خصوصی توجہ دینی شروع کردی... کیونکہ..."

"کیونکہ وہ تمہاری بیٹی ہے علینہ!" مراد نے کہا۔

"ہاں، وہ میری بیٹی ہے۔ میری اپنی اولاد۔ میں نے اسے اپنی کوکھ سے جنم دیا ہے... لیکن تم اسے یہ مت بتانا۔ ورنہ اسے بہت صدمہ ہوگا۔ بہت دکھ ہوگا اسے۔"

اس وقت دروازے کے باہر کھڑی ہوئی عمیرہ کانپ کر رہ گئی۔ اس نے یہ سب کچھ سن لیا تھا۔ اسے شک ہوگیا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں لیکن اسے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ یہ میڈم اس کی ماں نکلیں گی۔ اب اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ میڈم اس پر اتنی مہربان کیوں تھیں۔

اندر کمرے میں علینہ، مراد سے کہہ رہی تھی۔ "اب میری بیٹی نے دنیا دیکھ لی ہے۔ اسے انسانوں کو پرکھنے کا سلیقہ آگیا ہے۔ اب وہ آسانی سے دھوکا نہیں کھا سکتی۔ اس لیے میں یہ چاہتی ہوں کہ تم اس کی نئی زندگی میں اس کا ساتھ دو۔"

"تم بتاؤ، میں کیا کروں اس کے لیے؟"

"میں نے جان بوجھ کر اسے تمہارے دفتر میں ملازمت دلوائی تھی۔" علینہ نے بتایا۔ "اس کے ساتھ فیصل نام کا ایک نوجوان کام کرتا ہے۔ وہ بہت اچھا ہے۔ تم عمیرہ کی شادی اس سے کردینا کیونکہ یہی زندگی ہوتی ہے۔ یہ پہیا اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ تم زندگی بھر اسے حویلی میں قید تو نہیں رکھ سکتے تھے نا۔"

"علینہ... کیا... کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ کوئی ایسا راستہ نکل آئے کہ ہم سب ایک ساتھ رہ سکیں؟"

"نہیں مراد صاحب! اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ اب صرف یہی ہوسکتا ہے کہ ہم دونوں اپنی بیٹی کے لیے ایک اچھی اور خوب صورت زندگی کی دعائیں کریں۔ آپ عمیرہ کو لے جائیں یہاں سے اور ایک بار پھر یہ کہہ رہی ہوں کہ اسے میرے بارے میں کچھ مت بتائیے گا ورنہ شاید عورت ذات پر سے بھی اس کا بھروسا ختم ہوجائے... جائیں۔"

علینہ نے اپنا چہرہ دوسری طرف کرلیا۔ مراد سر جھکائے کمرے سے باہر آگیا۔

☆☆☆

کئی برسوں کے بعد وہ حویلی پھر آباد ہوگئی تھی۔

اس بار اس حویلی کی مالک خود عمیرہ تھی، جس کے ساتھ اس کا شوہر فیصل آیا ہوا تھا۔ میڈم نے خودکشی کرلی تھی جبکہ مراد ہارٹ اٹیک سے مر گیا تھا۔

شادی کے بعد بھی بہت دنوں تک عمیرہ شہر میں رہی پھر جب اس کے یہاں ایک بیٹی کی ولادت ہوگئی تو وہ اس بچی کو لے کر حویلی آگئی۔

اس نے اپنے شوہر سے کہا۔ "ہم نے یہ حویلی دوبارہ آباد تو کرلی ہے لیکن میری بچی کی پرورش اس انداز سے نہیں ہوگی جس انداز سے میری پرورش ہوئی تھی کیونکہ میں اپنی بیٹی کو مردوں کے معاشرے میں رہتے ہوئے بھی اپنی حفاظت کرنے کا سلیقہ سکھانا چاہتی ہوں جس طرح میں نے سیکھا ہے۔"

حویلی پھر سے آباد ہے۔ اب وہاں صرف ملازمائیں نہیں بلکہ بہت سے ملازم بھی کام کرتے ہیں اور مالیوں اور خانساماؤں کے درمیان تین چار برس کی حمیرا بال لیے دوڑتی پھرتی ہے۔

گزرا ہوا کل ایک کہانی بن کر رہ گیا ہے۔

احمد اقبال

اور مکین

دوسرا رنگ

انسانی ذات ایک حیرت کدہ ہے ...... اس کی ذات گویا معبدوں میں سفر کرتی ہے جہاں قدم قدم پر اُداس...... تنہائی اور کرب ہی کرب کا پھیلاؤ ہے ...... چند ایسے ہی کرداروں کی منظر کشی ...... جو ایک ہی شے کے پیچھے بھاگ رہے تھے ...... متضاد رویوں کے باوجود ان کے جنون میں مماثلت تھی ...... ایسے کردار جن کی کہانی راستوں سے شروع ہوکے ...... راستوں میں ہی ختم ہوگئی ...... نہ کوئی نخلستان ...... نہ گلزار اور نہ ہی کوئی پڑاؤ ...... کوئی پار اُتر کر بھی پار نہ اترا ...... اور کوئی راہ میں گمنام ہوا ......

بے مکین مکینوں کی حکایتِ غم جو پیاسے سراب کے پیچھے بھاگ رہے تھے

جب صائمہ نے بڑی مسرت سے اعلان کیا کہ ڈبلن میں ہونے والی کسی بین الاقوامی قسم کی میڈیکل کانفرنس میں شرکت کے لیے اس کے نام کا انتخاب کرلیا گیا ہے تو حسد سے میرا بُرا حال ہوگیا۔ دس سال سے میں میدانِ صحافت میں گھوڑے دوڑا رہا تھا بلکہ خود گھوڑے کی طرح دوڑ رہا تھا لیکن آج تک بیرونِ ملک تو کیا چنڈ دادن خان یا ٹنڈو الٰہ یار جیسی جگہ سے بھی مجھے کسی کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ نہیں ملا تھا۔

میں نے کہا۔ ''سفارش سے پاکستان میں سب ہوجاتا ہے۔ پنڈی کے ڈسٹرکٹ اسپتال میں دو میٹرک پاس بھائی ڈاکٹر تھے... ان میں سے ایک تو میڈیکل سپرنٹنڈنٹ تھا۔''

صائمہ نے خفگی سے کہا۔ ''پی ایم اے نے میرا انتخاب لیاقت کو دیکھ کر کیا ہے۔''

میں نے غصے سے میز پر مُکّا مارا۔ ''کون ہے آخر یہ لیاقت... کوئی بہت بڑا بدمعاش ہے جسے دیکھ کر انتخاب کرنے والوں کی پتلون گیلی اینڈ ڈھیلی ہوگئی... اب کیا وہ تمہارے ساتھ ڈبلن بھی جائے گا؟ کانفرنس کے بہانے...''

صائمہ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''ایسے لاؤڈ اسپیکر کی طرح مت چلاؤ۔ ہم ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہیں... دس دن تو لگ ہی جائیں گے مجھے... کانفرنس میں۔''

''صرف دس دن...''

اس نے کن انکھیوں سے مجھے دیکھا۔ ''اب وہاں سے لندن ایسے ہی ہے جیسے اپنا لاہور سے اسلام آباد... اور لندن سے پیرس نہ جانا بھی ایسا ہے جیسے اسلام آباد سے کوئی مری جائے بغیر لوٹ آئے۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے... یورپین یونین میں شامل تمام ممالک کی سرحدیں ملتی ہیں... نہ ویزا کا مسئلہ نہ کرنسی کا... سفر کی سہولت ہے...''

صائمہ نے مایوسی سے کہا۔ ''گویا تمہیں کوئی صدمہ نہیں ہوگا... اگر میں دو چار مہینے باہر رہوں... یا واپس ہی نہ آؤں...''

اب مجھے احساس ہوا کہ ایک اچھے اور سچے عاشق کے کردار کی مناسبت سے میرے ڈائیلاگ اور میرے جذبات خرابی پیدا کر رہے ہیں... میں نے اداس صورت بنا کے ٹھنڈی آہ بھری اور اپنی آواز میں رقت پیدا کی۔ ''میں بتاؤں کہ جدائی کے خیال سے میرے دل پر کیا بیت رہی ہے...''

''ہاں... دل میں لڈو پھوٹ رہے ہوں گے کہ دس دن تو جان چھوٹی... نہ کوئی دیکھنے والا نہ پوچھنے والا...''

حقیقت کچھ ایسی ہی تھی۔ میں اپنے یارانِ باکمال و جاں نثار کے ساتھ دن عید اور رات شب برات منانے کی آزادی ملنے پر اتنا خوش تھا کہ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میز پر چڑھ کے ڈانس کروں اور گاؤں... آئے موسم رنگیلے سہانے... اور پھر چلّا چلّا کے کہوں کہ حضرات آزادی بڑی نعمت ہے۔

لیکن صائمہ کے جانے کے بعد اچانک مجھے احساس ہونے لگا کہ ماحول میں ایک انجانی اُداسی اتر آئی ہے... پھولوں کے رنگ پھیکے پڑ گئے ہیں... چاندنی ماند پڑ گئی ہے اور میرا دل غمگین گانوں کی طرف مائل ہے... تو جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے... میرے چاروں یار جو تاش کے کھیل میں مجھے کنگال کرنے کے ماہر تھے، میری اداسی سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے جیتی ہوئی رقم مجھے واپس کردی۔ یہ ایک تاریخی واقعہ تھا۔ بعد میں جب انہیں میری اداسی کا اصل سبب معلوم ہوا تو... خیر...

صائمہ اپنی چھوٹی سی ڈبیا جیسی کار میرے لیے چھوڑ گئی تھی جس کی چھت میرے لیے اتنی نیچی تھی کہ میں سرنگوں بیٹھنے پر مجبور ہوتا تھا ورنہ ہر گڑھے یا اسپیڈ بریکر پر میرے سر میں ایک گومڑا ابھر آتا تھا۔ صائمہ نے میری اس تجویز کا ہمیشہ بُرا مانا تھا کہ وہ چھت میں ایک گول سوراخ کرالے جس میں سے میرا سر باہر نکلا ہوا نظر آئے۔ صائمہ کا خیال تھا کہ گاڑی کی چھت پر کٹا ہوا سر دیکھ کے نہ جانے کتنے لوگ وحشت سے بے ہوش ہوجائیں گے۔

میں نے اپنی جنگِ عظیم اول کی یادگار موٹر سائیکل کو جس کے بارے میں عام خیال یہ تھا کہ وہ پیٹرول کے بجائے قوتِ ارادی سے چلتی ہے... چھوڑ کے صائمہ کی گاڑی میں سفر کیا تو مجھ پر کچھ رقت طاری ہونے لگی کیونکہ کار میں اسی کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ رات کو میں نے ڈراؤنے خواب دیکھے۔ صائمہ ایک گورے کی بانہوں میں رقص کر رہی ہے... کسی بار میں جہاں سب ہی مدہوش اور بدمست ہیں۔ جام پہ جام لنڈھا رہی ہے... جیسے ولایت جانے والے میم اور بغل لوٹتے ہیں، ایسے ہی وہ کسی فرنگی کی بانہوں میں بانہیں ڈالے جہاز سے اُتر رہی ہے۔

میں گھبرا کے اٹھ بیٹھا۔ یہ احساس مجھے بعد میں ہوا کہ میرے جاگنے کی وجہ کچھ اور تھی۔ میں نے ایک آواز سنی تھی... جیسے کوئی چیز گری ہو... کوئی چائے کا مگ یا پانی کا گلاس... اندھیرے میں نظر کچھ نہیں آرہا تھا لیکن میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ دوسرے کمرے میں کوئی ہے۔ سوال یہ تھا کہ

www.pkdigest.com

دروازے کا قفل کھول کے کوئی اندر کیسے آیا؟ اور کیوں آیا؟ کوئی چور، ڈاکو اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا تھا... البتہ مجھے حق گوئی و بے باکی آئین جواں مرداں... پر اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کے سفر پر روانہ کرنے کے خواہش مند بہت تھے۔ ایک خاتون کا سیاسی مستقبل میرے اس انکشاف نے ختم کر دیا تھا کہ ان کے پاس خیر سے ایک نہیں بیک وقت دو شوہر ہیں... ایک یہاں اور ایک لندن میں، جہاں وہ جاتی رہتی تھیں... عموماً علاج کے لیے... مگر ان کے لندن سے ہمارے قتل کے لیے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے..... خالو اسے جہنم رسید کرنے کے لیے چشم براہ رہتے تھے... رشوت کے ٹکٹ سے حج کرنے والے ایک بزرگوار بھی مجھے قتل کر کے ثوابِ دارین حاصل کرتے کیونکہ میرے باثبوت انکشاف نے ان پر ایک ٹی وی چینل سے درس کے دروازے بند کر دیے تھے۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اندھیرے میں پھر کھٹکا ہوا جو مجھے دھماکے جیسا لگا۔ میں نے فوراً تکیے کے نیچے سے اپنا ریوالور نکالا... اگرچہ اس کا لائسنس بھی ہے اور میں اسے خالی نہیں رکھتا لیکن اسے چلانے کی ضرورت پڑی تو میں مدد کے لیے کسے بلاؤں گا... یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اس کی نمائش میں اکثر کرتا تھا اور یہ اعلان بھی بار بار کیا تھا کہ فلاں کو میں نے گولی نہ ماری تو میرا بھی نام بزدل نہیں... تاکہ دشمن ڈرتے رہیں۔ لائٹ جلا کے میں نے بیچ والے دروازے کا رخ کیا اور دہاڑ کے کہا۔ "کون ہے؟" اور اس کے ساتھ ہی دوسرے کمرے کی لائٹ کا سوئچ بھی دبا دیا۔

"م... میں... چور... چور نہیں ہوں۔" میں نے اپنے سامنے ہاتھ اٹھائے اس بدحواس نوجوان کو دیکھا جو واقعی تھرتھر کانپ رہا تھا۔ "اور... اور میں پاگل بھی... پاگل بھی نہیں ہوں۔"

اس کی عمر شاید پچیس چھبیس سال ہوگی لیکن اس کی صحت افسوسناک حد تک خراب تھی۔ وہ صورت سے بیمار اور فاقہ زدہ لگتا تھا۔ اس کے بال بے ترتیبی سے ماتھے پر آ رہے تھے۔ اس کے کپڑے بھی میلے تھے۔ دھاری دار سفید شرٹ پتلون سے آدھی باہر تھی... گرے پتلون کے گھٹنوں پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ وہ اپنی شکل اور حالت سے ہی اتنا مظلوم اور قابلِ رحم لگتا تھا کہ اسے ریوالور کی زد پر رکھنا لاحاصل تھا۔ میں ویسے ہی اسے ایک چھانپڑ مارتا تو وہ گر جاتا۔

"پھر کون ہو تم؟"

"میں... بابر ہوں... شہنشاہ بابر نہیں... بابر بلال۔"

اس نے خود ہی کہا تھا کہ نہ میں چور ہوں نہ پاگل... اب میں نے غور کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ صورت سے بھی ایسا ہی لگتا ہے اور باتوں سے بھی۔

میں نے کہا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو... اندر کیسے آئے؟"

اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ "اس دروازے سے... مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے... میں نے کچھ بھی نہیں کھایا۔ رات بھر بھاگتے اور چھپتے رہے... ورنہ وہ ہمیں پکڑ لیتے۔"

میں نے کہا۔ "تم جیل سے بھاگے ہو؟"

اس نے فوراً تردید کی۔ "نہیں نہیں... میں مجرم نہیں ہوں... میں نے کچھ نہیں کیا... نہ چوری کی... نہ کسی کو قتل کیا... لوگ اسے پاگل خانہ کہتے ہیں... مگر وہ نفسیاتی اسپتال ہے... میں ذرا بھی پاگل نہیں ہوں... آپ یقین کریں مجھ پر... میں ایک شریف اور معزز خاندان سے ہوں... بلال خان مرحوم میرے والد... اسمبلی کے رکن تھے۔"

"کون بلال خان؟" میں نے ذہن پر زور دیا۔ "چودھری بلال خان؟ وہ جو بہت بڑے زمیندار تھے... تم ان کے بیٹے ہو؟"

اس نے خوش ہو کے سر ہلایا۔ "میں... جھوٹ نہیں بولتا... آپ بے شک معلوم کر لیں... لیکن پہلے مجھے کھانے کے لیے کچھ دیں ورنہ میں مر جاؤں گا۔ کیا میں بیٹھ جاؤں؟"

"بیٹھو۔" میں نے ریوالور جیب میں ڈال کے صوفے کی طرف اشارہ کیا اور کچن کی طرف چلا گیا۔ کافی کے لیے گرم پانی چولھے پر رکھتے ہوئے اور پھر فریج میں سے ڈبل روٹی مکھن نکالتے ہوئے میری نظر ایک لمحے کے لیے بھی بابر پر سے نہیں ہٹی لیکن وہ اپنے ہاتھ دونوں گھٹنوں میں دبائے صوفے کے کنارے پر ٹکا ہوا تھا اور زمین کو گھور رہا تھا۔ دیوانگی اس کے انداز و اطوار سے جھلکتی تھی۔

کافی کا مگ لے کر میں اس کے سامنے بیٹھ گیا اور اسے مکھن لگائے بغیر ڈبل روٹی کے بڑے بڑے ٹکڑے سالم نگلتے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس کی بھوک کم ہوئی تو اس نے شرمندہ نظروں سے مجھے دیکھا اور سلائس پر چھری سے مکھن لگا کے کھانے لگا۔ درمیان میں اس نے کافی کے گھونٹ بھی لیے اور اچانک بولا۔ "بزدل صاحب... خدا کی قسم میں پاگل نہیں ہوں... نفسیاتی مریض میں ضرور بن گیا تھا... اپنے والد کی موت کے بعد..."

میں نے کہا۔ "تم میرا نام بھی جانتے ہو؟"

"ہاں... اس نے کہا تھا کہ آپ میری مدد کریں گے... آپ اچھے آدمی ہیں۔ چوروں، ڈاکوؤں کی مدد بھی کرتے ہیں... میں نے تو ایسا کوئی کام نہیں کیا۔"

"یہ تم سے کس نے کہا تھا کہ میں تمہاری مدد کروں گا؟"

"شیدے نے... شیدا پستول... میں تو وہاں سے نکل نہیں سکتا تھا، اسی نے میری مدد کی... ہم ایک ساتھ بھاگے۔ آپ جانتے ہیں نا شیدے پستول کو... وہ ڈاکو تھا... عمر قید کاٹی اس نے... پھر ہیروئن کا نشہ کرنے لگا... میں ایسا کچھ نہیں کرتا... والد کی موت کے بعد میرا نروس بریک ڈاؤن ضرور ہو گیا تھا... صدمے سے نہیں... مجھے احساسِ جرم نے پاگل کر دیا تھا... سب کہتے تھے کہ تم نے انہیں مار ڈالا... تم قاتل ہو۔"

"سب کون؟"

"میرا بڑا بھائی... اکبر اور اس کی بیوی... میری بھابی رانی... میں نے اپنے باپ کو قتل نہیں کیا تھا... لیکن یہ ٹھیک ہے کہ ان کی موت کا ذمے دار میں ہوں۔ میری ان سے لڑائی ہوئی تھی... اکثر ہوتی تھی... اس رات بھی وہ بہت چیخے چلائے تھے کیونکہ میں نے کہا تھا، وہ غاصب ہیں... انہوں نے غریبوں کا حق مارا ہے... خدا انہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ وہ سخت مشتعل تھے... صبح انہیں ہارٹ اٹیک ہوا... باتھ روم میں... ہم نے دروازہ توڑ کر انہیں نکالا۔"

"یہ تو ایک حادثہ تھا... دل کے مریض وہ پہلے سے ہوں گے... پھر تم ایسا کیوں سمجھتے ہو کہ تم نے قتل کیا تھا؟" میں نے اسے تسلی دی۔

"میرا بھائی چیخ چیخ کر کہہ رہا... تم اپنے باپ کے قاتل ہو... اور اس کی بیوی رانی ہر ایک کو بتاتی رہی... میں خود کو مجرم سمجھنے لگا... میری نیند، بھوک سب اڑ گئی... میں رات رات بھر جاگتا رہتا تھا... اپنے آپ سے باتیں کرتا تھا... بھائی کہنے لگی کہ اس کا دماغ چل گیا ہے... اسے پاگل خانے بھیج دو... ورنہ یہ ہمیں بھی مار ڈالے گا... اور میرا بھائی... جورو کا غلام... اس نے مجھے پاگل خانے میں داخل کرا دیا۔"

میں نے کہا۔ "ایسے تو کسی کو بھی پاگل قرار نہیں دیا جا سکتا... جب تک ڈاکٹروں کی یہ رائے نہ ہو۔"

اس نے میری بات کاٹ دی۔ "میں سب سمجھتا ہوں... میں پاگل نہیں ہوں... مجھے پاگل بنایا گیا ایک سازش کے تحت... اور میرے بھائی کو یہ مشورہ دیا اس خبیث ڈاکٹر زیدی نے... وہ ایک جعلی ڈاکٹر ہے۔"

مجھے اب اس کی کہانی میں دلچسپی بھی محسوس ہو رہی تھی اور اس سے ہمدردی بھی۔ "مگر اس سازش کا کوئی مقصد بھی تو ہوگا؟"

وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ "مقصد تھا... میں سب جانتا ہوں... مجھے جائداد سے بے دخل کرنا... باپ کی ساری جائداد پر اکبر قابض ہونا چاہتا تھا۔ اس کا یہی طریقہ تھا۔ پہلے اس نے باپ کو میرے خلاف بھڑکایا... بڑی چالاکی سے... اس نے میرے خلاف ایسی باتیں مشہور کر دیں... یہ ٹھیک ہے کہ میں بڑے بھائی کے مقابلے میں نالائق اور نکما تھا... میرا باپ چاہتا تھا کہ ایک بیٹا وکیل بنے... خاندانی معاملات... زمینوں کے جھگڑے... دشمنی کے مقدمات... ان سب کے لیے باہر سے وکیل نہ کرنا پڑے... اکبر وکیل بن گیا... ماں چاہتی تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں... بعد میں باپ نے بھی ڈاکٹر بننے پر زور دیا... میرا داخلہ بھی ہو گیا تھا میڈیکل کالج میں... لیکن میں کیا کروں... مجھے پہلے ہی سال میں محبت ہو گئی... ایک نرس ہے... اور میں نے شادی کر لی... حالانکہ ہماری ایسی عمر نہیں تھی... وہ تھی اٹھارہ سال کی... میں اکیس سال کا... میری تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا... میری ماں بہت روئی دھوئی... باپ نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا... بے شک میں نے بڑی بے وقوفی کی... شادی ڈاکٹر بننے کے بعد ہی ہو سکتی تھی لیکن... میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتا تھا... میرے بھائی نے اس موقع سے بڑا فائدہ اٹھایا... اس نے عجیب و غریب باتیں مشہور کر دیں... مثلاً یہ کہ ہم پکڑے گئے تھے... ایک اسٹور روم میں... یہ جھوٹ ہے... اور یہ کہ... وہ پہلے حاملہ ہو گئی تھی... سراسر بکواس... میری بیوی کی گھر میں بڑی بے عزتی ہوتی تھی... وہ بچ بھی جاتی تھی کیونکہ اس کا باپ پرائمری اسکول ٹیچر تھا۔ تین سال تک میں اپنے گھر میں ایسے رہا جیسے یتیم خانے میں ہوں۔ مجھے ذاتی ضرورت کے لیے باپ کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑتا تھا۔ وہ پیسے دینے سے پہلے مجھے ذلیل کرتا تھا... سو روپے دیتا تھا، سو باتیں سنا کے... میری روز لڑائی ہوتی تھی... یہ ٹھیک ہے کہ میں بے وقوف تھا... اپنے بھائی کی طرح چالاک اور موقع شناس نہیں تھا... میں اپنے باپ کے منہ پہ ہر بات کہہ دیتا تھا... وہ بات سچ ہوتی تھی اور سچ کڑوا ہوتا ہے۔"

پیٹ بھر جانے کے بعد وہ زیادہ ناراضی اور جھنجلاہٹ کا اظہار کر رہا تھا اور اس کی آواز بھی اونچی ہو گئی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اب وہ خوف زدہ نہیں تھا۔ میری ہمدردانہ دلچسپی سے اس کا حوصلہ بڑھ جاتا تھا اور وہ زیادہ پُرامید ہو گیا تھا کہ یہاں آ کے اس نے غلطی نہیں کی اور میں اس کی مدد کر سکتا ہوں۔

میں نے کہا۔ "سچ یقیناً کڑوا ہوتا ہے... لیکن بعض اوقات وہ سچ نہیں ہوتا جسے ہم سچ مان لیتے ہیں۔"

www.pkdigest.com

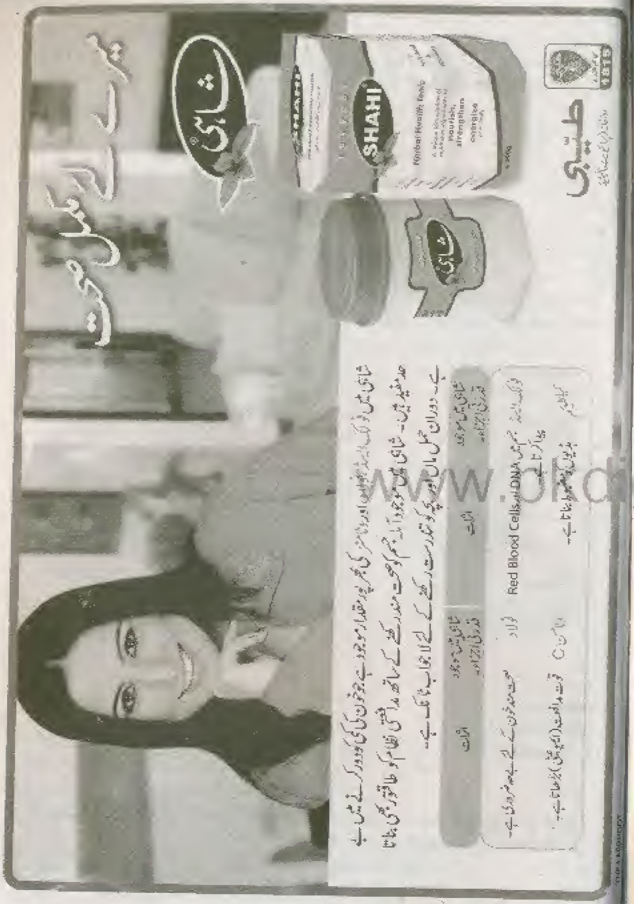

وہ ایک دم بیٹھ گیا۔ ”نہیں... ایسی کوئی بات نہیں... میرے باپ نے... اللہ اس کی مغفرت کرنا چاہے تو کرسکتا ہے... لیکن زندگی میں اس نے بڑی ناانصافی کی... بہت ظلم کیے... اس نے اپنے سیاسی اثر رسوخ اور طاقت سے آس پاس کے سب غریب کاشت کاروں کی زمین ہتھیالی... زبردستی قبضہ کرلیا اور انہیں بے دخل کردیا... ان کے گھر نہیں رہے... جس نے مزاحمت کی اسے مروادیا... جیلوں میں ڈلوا دیا... ان کے گھر کی عورتیں اس کے کارکنوں کی بربریت کا شکار ہوتیں... میرا بڑا بھائی اپنے باپ کی طرح تھا لیکن مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا تھا... میں نے اعلان کردیا تھا کہ جب میں مالک بنوں گا تو اپنے حصے کی زمین اصل مالکوں کو واپس کردوں گا... باپ مجھے عاق کردیتا لیکن میرے وکیل بھائی نے اسے سمجھایا کہ قانون میں اس کی گنجائش ہی نہیں... ہاں، یہ ہوسکتا ہے کہ زندگی میں وہ اپنی ساری زمین جائداد کسی کو بھی دے دے... میرا باپ ایسا ہی کرتا اور اکبر کو مالک بنا دیتا لیکن میری ماں ہمیشہ آڑے آئی... اس نے یہ حق تلفی نہیں ہونے دی۔ اس کے انتقال کے بعد میں لاوارث ہوگیا۔“

”بابر... مجھ سے تم کس قسم کی مدد چاہتے ہو؟“

وہ بگڑ گیا۔ ”سب کچھ تو بتادیا میں نے... مجھے میرا حق چاہیے... میں پاگل نہیں ہوں... پھر مجھے اس جعلی ڈاکٹر کے کہنے پر پاگل خانے میں کیوں بند کرادیا گیا ہے؟ کیا میں اپنی باتوں سے آپ کو پاگل لگتا ہوں؟ اور آپ اس پاگل خانے سے بھی معلوم کرلیں... میں نے وہاں کبھی ایسی کوئی حرکت کی...؟ یا کسی کو مارا پیٹا، کسی دیوانگی کا مظاہرہ کیا... چیخنا چلانا... اپنے کپڑے پھاڑنا... انہوں نے میری بیوی کو بھی مار کے گھر سے نکال دیا... وہ مجھے سب بتاتی تھی... وہ اپنی ماں کے گھر چلی گئی اور کہاں جاتی... اسے بھی مجھ سے ملنے سے روک دیا گیا... یہ سب کیا ہے؟ میں کسی سے کچھ نہیں کہتا... بس مجھے اپنی بیوی کے ساتھ زندگی گزارنے کا حق چاہیے... اور وہ سب جو قانونی طور پر میرا ہے۔ میرے پاس تو وکیل کرنے کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں۔“

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔ بظاہر وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ اس کے بیان میں کہیں تضاد نہیں تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کا لہجہ اور رویہ نارمل نہیں تھا۔ کبھی وہ چلانے لگتا تھا تو کبھی رونے کے قریب ہوجاتا تھا۔ اس کے انداز گفتگو میں روانی نہیں تھی... لیکن یہ سب ذہنی دباؤ کا نتیجہ تھا۔ یہ کہا جاسکتا تھا کہ وہ ذہنی عدم توازن کا شکار تھا لیکن اس کو پاگل ہرگز نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔

پتا نہیں کیوں میں نے اس کی مدد کا فیصلہ کرلیا۔ شاید اس لیے کہ میں مصروفیت چاہتا تھا۔ صائمہ کی غیر حاضری کے خلا... کو پُر کرنے کے لیے یا محض ہمدردی کے باعث... معلوم نہیں یہ شیدا پستول کون تھا جس نے بابر کو اپنے ساتھ اس پاگل خانے سے فرار ہونے میں مدد فراہم کی اور پھر میرے پاس بھیج دیا۔ اگر وہ ڈاکو تھا اور اس نے عمر قید کاٹی تھی تو یہ بات تقریباً دس بارہ سال پرانی تھی جب میں ڈاکوؤں کا قانونی مشیر اور نمائندہ مشہور نہیں ہوا تھا۔

یہ کچھ...... سال پہلے کی بات تھی جب ایک عمارت میں محصور ہوجانے والے ڈاکوؤں نے میری موجودگی میں پولیس کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ عمارت میں یرغمال لوگوں کی جان بچانے کے لیے پولیس نے ان کی بات مان لی۔ دراصل ڈاکوؤں کو ڈر تھا کہ جیسے ہی وہ ہتھیار ڈالنے کے بعد باہر نکلے، انہیں پولیس مقابلے میں ہلاک کردیا جائے گا۔ ایک صحافی کے سامنے گرفتار ہونے کے بعد ان کے ساتھ قانون کے مطابق سلوک ہونا یقینی تھا۔ کچھ عرصے بعد ایسا ہی واقعہ پھر پیش آیا۔ ڈاکوؤں کو سزا ضرور ہوئی لیکن وہ زندہ رہے۔ جیل کے باہر ان کے ساتھی میرے مرید ہوگئے۔ مجھے ڈاکوؤں کے مختلف گروہوں کی طرف سے تحفے تحائف موصول ہونے لگے۔ جو ڈاکو رہا ہوئے، انہوں نے اپنا پیشہ نہیں چھوڑا لیکن وہ ہر واردات کے بعد میرا حصہ بھی نکالنے لگے... پھر اغوا برائے تاوان کی وارداتوں میں میری معرفت سودے ہونے لگے۔ میں بڑی مشکل میں پھنس گیا... نہ میں انکار کرسکتا تھا اور اقرار کی صورت میں مجھے بھی مجرموں کا ساتھی کہا جاتا تھا۔ ایک صحافی کی حیثیت سے میری گڈول بہت اچھی تھی اور چند نامور صحافی میرے حامی تھے چنانچہ ایک ثالث کی حیثیت سے میری نیک نامی برقرار رہی اور میں زندہ بھی رہا۔

میرا خیال ہے کہ جیل میں کسی عقیدت مند ڈاکو نے شیدے پستول نامی اس ڈاکو سے میرا ذکر کیا ہوگا۔ جب شیدا پستول فرار ہوا تو اس نے بابر کو بھی باہر نکال دیا اور اسے میرا پتا دے دیا کہ اس بندے سے رابطہ کرکے دیکھو... وہ نام کا بزدل ہے مگر بزدل نہیں ہے۔

میرا نام بزدل کیوں ہے... یہ سب ہی جانتے ہیں تاہم نئے قارئین کی آگاہی کے لیے عرض کردوں کہ میرا نام تو ماں باپ نے بدیع الزماں رکھا تھا... شاعری کے شوق میں دلنواز کا اضافہ خود میں نے کیا اور دلنواز لالہ موسوی کے نام سے میرا مزاحیہ قطعہ بھی شائع ہوچکا تھا... بدیع الزماں دلنواز

لالہ موسوی کو روزنامہ "حقیقت ساز" کے پبلشر پرنٹر مالک و مدیر جناب لنگ چنگیزی عرف توپ صاحب نے مختصر کر کے بزدل کر دیا... جو نام کے ابتدائی حروف سے بنا تھا اور اتنا مقبول ہوا تھا کہ لوگ میرا اصل نام بھول گئے...... حد تو یہ ہے کہ میری اکلوتی محبوبہ و منگیتر، دوست اور مالکہ بھی مجھے بزدل کہتی تھی۔

خاموشی کے اس مختصر وقفے میں مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب بابر صوفے پر ہی بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ میں نے اسے کندھے سے پکڑ کے لٹایا اور اس کے جوتے اتار کے پاؤں سیدھے کیے مگر وہ نہیں جاگا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جسمانی اور ذہنی طور پر کتنا خستہ حال تھا۔ موسم معمولی سا خنک تھا چنانچہ میں نے اس پر کمبل ڈالا اور پھر خود بھی سو گیا۔ مجھے اس کی طرف سے کسی قسم کا اندیشہ نہیں تھا۔

صبح میں قدرے تاخیر سے اٹھا۔ وہ اس وقت بھی بے خبری کی نیند میں تھا۔ میں نے اسے آواز دی تو وہ گھبرا کے اٹھا۔ اس نے مجھے اور پھر ادھر ادھر دیکھا تو مطمئن ہو گیا۔ میں نے اسے اپنے کپڑے دے کر باتھ روم بھیجا کہ وہ شیو کرے جو بڑھ کر داڑھی کی شکل اختیار کر گئی تھی اور نہا دھو کے صاف ہو جائے... جب نہا دھو کے اور شیو کر کے میرے سامنے آیا تو ایک بالکل بدلا ہوا آدمی تھا۔

ناشتے کے دوران میں نے اس کے سوال پر کہا کہ اس کی مدد کی جا سکتی ہے بشرطیکہ وہ میری مرضی کے مطابق چلے۔

وہ مان گیا۔ "مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"سب سے پہلے تو یہ کہ تم میرے ساتھ وہیں جاؤ گے... اس نفسیاتی اسپتال میں جہاں سے تم فرار ہوئے تھے۔"

وہ بدک گیا۔ "سوال ہی نہیں پیدا ہوتا... وہ مجھے ایسی سزا دیں گے کہ میں زندہ ہی نہ بچوں... میں وہاں سے نہ نکلتا تو ایک دن یہی ہوتا... ان پر کوئی الزام نہ آتا... وہ کہتے کہ... کچھ بھی کہہ دیتے... پاگل نے خودکشی کر لی... انہیں اپنے انعام سے غرض ہے۔"

میں نے کہا۔ "بابر! اب یہ ناممکن ہے... تم میرے ساتھ جاؤ گے اور میری ذمے داری پر... آج ہی نفسیاتی امراض کا ایک ماہر تمہارا معائنہ کرے گا اور وہ باہر سے آئے گا۔ میں کورٹ آرڈر لے کر ماہرین کے ایک بورڈ سے بھی کلیئرنس لے سکتا ہوں... وہ ڈاکٹر... کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا...؟"

"اصغر علی زیدی... میں شرط لگا سکتا ہوں کہ اس کی ڈگری بھی جعلی ہے۔"

"ہو گی... پاکستان میں تو آج کل پی ایچ ڈی ڈاکٹروں کی ڈگریاں جعلی ثابت ہو رہی ہیں... ان میں یونیورسٹی کے پروفیسر اور وزیروں کے نام تک آ رہے ہیں... لیکن میں اپنے طور پر حقائق کی تصدیق کروں گا... میں یہ نہیں کہتا کہ تم نے جھوٹ بولا ہے... زیادہ نہیں... مجھے صرف دو دن چاہئیں... میں تمہارا معائنہ بھی کرا لوں گا اور تمہارے بھائی سے بھی مل لوں گا... دیکھیں، وہ کیا کہتا ہے۔"

وہ چلانے لگا۔ "نہیں... تم اسے نہیں جانتے... وہ بہت چالاک اور مکار ہے... وہ وکیل بھی ہے... وہ تمہیں قائل کر لے گا کہ جو کچھ میں نے کہا ہے سب جھوٹ ہے۔"

"ایزی بابر... ایزی... اتنی آسانی سے کوئی مجھے گمراہ نہیں کر سکتا... میرے پاس اپنی ذاتی عقل ہے اور اس کی کوالٹی بھی بہت اچھی ہے... چالاک اور مکار لوگوں سے یہ دنیا بھری پڑی ہے... ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں... بس محتاط رہنا چاہیے... تم میری مانو اور واپس چلو۔"

"کیا حرج ہے... اگر میں تمہارے ساتھ رہوں؟"

"دیکھو... وہ سب جو تمہارے مخالف ہیں... جن کو تم اپنا دشمن سمجھتے ہو... یہ ڈاکٹر زیدی اور تمہارا بھائی... اور یہ پاگل خانے والے... یہ سب تمہارے خلاف سازش کر کے مشہور کر سکتے ہیں کہ تم کسی کو مار کے بھاگے ہو... یا تم ایک خطرناک قسم کے پاگل ہو... تم جہاں نظر آؤ تمہیں شوٹ کر دیا جائے۔"

اس کے چہرے پر خوف پھیل گیا۔ "مم... میں بالکل ٹھیک ہوں... میں نے آج تک چڑیا کا بچہ بھی نہیں مارا... تم روبی سے پوچھ لو۔"

"یہ روبی کون ہے؟"

"روبینہ... میری بیوی... وہ بتائے گی کہ میں کتنا کمزور دل ہوں..."

"ٹھیک ہے... میں بھی چاہتا ہوں کہ تم اس پاگل خانے سے باعزت طور پر نکلو... مکمل صحت یابی کی سند کے ساتھ۔ ماہرین یہ تصدیق کریں کہ تم بالکل نارمل ہو... اپنے بھائی کی طرح... تمہیں اپنے حصے کی نصف جائداد ملے اور تم اپنے معاملات خود سنبھالو۔ اپنی بیوی کے ساتھ بے خوف زندگی گزارو۔"

وہ کچھ دیر کے لیے جیسے خواب میں کھو گیا تھا۔ "ایسا... ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا سچ مچ یہ ممکن ہے... اگر ہو سکتا ہے تو میں آپ کی بات مانوں گا۔"

میں نے اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ چودھری بلال خان کے بارے میں میری معلومات واجبی تھیں۔ وہ اپنے علاقے کا انتہائی طاقتور شخص تھا، انتہائی کرپٹ... ظالم اور بدنام... بابر نے اس کے بارے میں جو بھی کہا تھا، غلط نہیں تھا لیکن کم و بیش یہ صفات بیشتر سیاسی وڈیروں میں پائی جاتی تھیں اور برائی شمار ہی نہیں ہوتی تھیں۔ گزشتہ الیکشن میں وہ ہار گیا تھا اور حسب روایت اس نے اپنے حریف پر دھاندلی کا الزام عائد کیا تھا۔ اس کا حریف اگر زیادہ سازشی جوڑ توڑ کا ماہر اور بہتر شاطر نہ ہوتا تو بلال خان کو کیسے ہراتا... باقی تمام عیوب اس کی ذات میں بھی بدرجۂ اتم پائے جاتے تھے جو سیاسی میدان میں کامیابی کے لیے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا بلال خان کی موت ہارٹ اٹیک سے ہی ہوئی تھی۔

اکبر خان اب اپنے باپ کی نشست پر جیتنے کے لیے کوشاں تھا اور اس کا مستقبل روشن نظر آتا تھا کیونکہ اسے بابر کے بیان کے مطابق اپنے باپ کی تمام بدکرداری... بے ضمیری اور بے شرمی کی صفات ورثے میں ملی تھیں۔ اس کے برعکس چھوٹا بھائی جو راست گو... رحم دل اور بے وقوفی کی حد تک سادہ لوح تھا، بڑے کی آنکھ میں کانٹا بن کے کھٹک رہا تھا اور وہ اس کے وجود کو حرفِ غلط کی طرح مٹانے پر تل گیا تھا۔

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟

[illegible] قاتل کا [illegible] مجھ پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ میرے ساتھ گم صم بیٹھ کے باہر دیکھنے والے بابر کے دماغ میں کیا کھچڑی پک رہی ہے، اس کا اندازہ میرے لیے ناممکن تھا۔ ہم شیخوپورہ، فیصل آباد والی سڑک پر تھے کہ اس نے کہا۔ "میں کوک پیوں گا۔"

میں نے گاڑی روک لی۔ سڑک کے کنارے ہی ایک چھوٹا سا لکڑی کا کھوکھا تھا جس میں ایک بوڑھا عام ضرورت کی چیزیں لیے بیٹھا تھا۔ بسکٹ، چپس، ٹافیاں، سگریٹ اور بوتلیں... لال رنگ کے ایک باکس میں سے اس نے برف میں لگی ہوئی بوتل نکالی اور مجھے تھما دی۔ عام طور پر ایسے دور افتادہ مقامات پر ملنے والی ڈرنکس نقلی ہوتی ہیں چنانچہ میں نے اپنے لیے کچھ نہیں لیا۔ بوتل بابر کو تھما کے میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

بابر کے انداز و اطوار میں دیوانگی نہ تھی، ایک ایسی ادا ضرور تھی جو حیران کرتی تھی مثلاً وہ بلاوجہ ہنس پڑتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کسی وجہ کے بغیر خوف یا غصے کے جذبات ابلنے لگتے تھے... وہ گم صم ہو جاتا تھا اور بلاوجہ چونکتا تھا۔ اچانک یوں میری طرف سر گھماتا تھا جیسے میں نے کچھ کہا ہو یا وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہو... ذہنی طور پر وہ نارمل بہرحال نہیں تھا۔

اس نے کوک کی بوتل کو ایک سانس میں یوں خالی کیا جیسے پیاس سے اس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے اور وہ تیز دھوپ میں میلوں کا سفر پیدل کر کے آیا ہو۔ حالانکہ موسم خوش گوار تھا اور کار کی کھلی کھڑکی سے آنے والی ہوا میں فرحت تھی۔ وہ کچھ دیر خالی بوتل ہاتھ میں پکڑے بیٹھا رہا... پھر اس نے ہاتھ یوں اٹھایا جیسے بوتل کو باہر پھینکنا چاہتا ہو... لیکن اچانک وہ تیزی سے پلٹا اور اس نے بڑی پھرتی سے بوتل میرے سر پر دے ماری... میں نے بریک لگائے لیکن گاڑی اس سے پہلے ہی بند ہو چکی تھی۔ دیوانہ وار اس نے میرا سر ہاتھوں سے پکڑ کے اسٹیئرنگ پر مارا اور بوتل سے دوسرا وار کیا... معلوم نہیں اس میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی... شاید یہ جنون اور وحشت کا کرشمہ تھا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں سڑک کے کنارے ایک گڑھے میں پڑا ہوا تھا۔ کسی کو بھی وہاں میری موجودگی کا علم ہی نہیں تھا۔ میں خود ہی باہر نکلا۔ مجھے ابھی تک چکر آ رہے تھے اور میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ میں نے سڑک پر پیدل چلنا شروع کیا کیونکہ صائمہ کی کار جو مجھے اتنی ہی عزیز تھی جتنا مجنوں کو لیلیٰ کا کتا... دور دور تک کہیں نہ تھی۔

ایک چائے خانے سے مجھے درد کی دوا بھی مل گئی۔ اس سے خاصا فائدہ ہوا۔ اب مجھے بابر پر سخت طیش آ رہا تھا۔ اس نے نیکی کا بڑا اچھا صلہ دیا تھا کہ مجھے ناک آؤٹ کر کے میری ہی گاڑی لے گیا تھا۔ تاہم بابر کی اس حرکت سے میرے یقین میں کمی نہیں آئی تھی کہ وہ پاگل نہیں ہے۔ اسے ذہنی طور پر اتنا زیادہ احساس جرم میں مبتلا کیا گیا ہے کہ وہ سچ مچ خود کو اپنے باپ کا قاتل سمجھنے لگا ہے اور اس کی شخصیت مسخ ہو کے رہ گئی ہے۔ اب وہ سمجھتا ہے کہ حق مارنے والوں نے حق گوئی کو اس کا قصور بنا دیا ہے، اس کی ازدواجی زندگی کو تباہ کر دیا ہے، اس سے آزادی چھین لی اور اب اسے زندہ رہنے کے حق سے بھی محروم کرنے پر آمادہ ہیں۔ یہ اس کی بغاوت تھی جس نے اسے اسپتال سے فرار پر مجبور کیا۔ گاڑی چھین کے وہ کہاں جائے گا... کیا کرے گا... یہ جاننے کے لیے مجھے سب سے پہلے اسپتال والوں سے رابطہ کر کے حقائق کی تصدیق کرنا تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی بیوی کے پاس ضرور پہنچے گا جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا۔ گاڑی مجھے مل جائے گی۔ اس سلسلے میں پولیس کو زحمت دینا لاحاصل تھا۔

امداد نفسیاتی کلینک میرا دیکھا ہوا تھا تاہم مجھے یہ علم نہیں تھا کہ یہ نام اس کے بانی، منتظم اعلیٰ اور مالک ڈاکٹر امداد

صدیقی کے نام پر ہے۔ اسپتال کی دو منزلہ عمارت نئی آبادی میں ایک کنال پر بنی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے والے حصے میں مختصر سا باغ تھا۔ کار پارکنگ باہر سڑک پر تھی جو اس وقت بھی سنسان تھی۔ دروازے پر مجھے روکنے ٹوکنے والا کوئی دربان نہیں تھا۔ صدر دروازے سے میں ایک ہال میں داخل ہو گیا جو ویران پڑا تھا۔ عین وسط میں آمنے سامنے دو صوفہ سیٹ رکھ دیے گئے تھے۔ درمیانی گلاس ٹاپ ٹیبل پر کم سے کم ایک ہفتہ پرانے پھولوں کا گلدستہ تھا۔ یہاں کم روشنی کے باعث بھی اداسی کا تاثر نمایاں تھا!... خاموشی اور کسی ذی روح کی عدم موجودگی کے باعث یہ جگہ ویسے بھی آسیب زدہ نظر آ رہی تھی۔

میں حیران تھا کہ بات کروں تو کس سے کیونکہ کاؤنٹر کے اوپر ریسپشن کے الفاظ ضرور نظر آ رہے تھے لیکن پیچھے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اچانک وہاں ایک لڑکی نمودار ہوئی جہاں ایک لمحہ پہلے کچھ نہیں تھا۔ معلوم نہیں وہ چھت سے ٹپکی تھی یا فرش سے نکلی تھی۔ وہ پچیس سے تیس سال کے درمیان کی عورت تھی جسے لڑکی ہی کہا جا سکتا تھا۔ اس کا بدن تھوڑا سا فربہی کی جانب مائل تھا۔ آج کل کی ہڈی چمڑی والی لڑکیوں کے مقابلے میں اس کا گداز جسم اس لباس میں یقیناً پرکشش بلکہ ہیجان خیز لگتا تھا جو اس نے زیب تن کر رکھا تھا۔ جدید فیشن کے اس ملبوس میں اس کے بدن کے سارے قوس و خم اور نشیب و فراز اپنی تمام دلفریبی کے ساتھ دعوت نظارہ دیتے تھے جسے میں مسترد کرتا تو کفران نعمت کا مرتکب ہوتا۔

"یس سر!" اس نے بڑی دلکش مسکراہٹ اور شیریں لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔ "میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟"

"آپ؟... کر تو بہت کچھ سکتی ہیں۔" میں قریب جا کے کاؤنٹر پر کہنیاں رکھ کے جھک گیا۔ "لیکن فی الحال صرف ڈاکٹر امداد صدیقی سے ملوا دیجیے۔"

مارٹل کا کاؤنٹر مشکل سے دو فٹ چوڑا تھا اور وہ اس کے بالکل پیچھے یوں تن کے کھڑی ہوئی تھی کہ میں اپنی زرافے جیسی گردن کے باعث براہ راست اس کے کشادہ گریبان سے پھوٹتی خوشبو کو بھی محسوس کر سکتا تھا لیکن وہ ایک انچ پیچھے نہیں ہوئی۔ "کس سلسلے میں؟"

میں نے سوچ کے کہا۔ "کل رات یہاں سے دو مریض فرار ہو گئے۔"

اس کی مسکراہٹ کافور ہو گئی۔ "آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

میں نے مسکرا کے کہا۔ "اخبار والوں کو سب معلوم ہو جاتا ہے۔"

"آپ کون ہیں؟"

"میں بزدل ہوں۔"

وہ ٹھنک کے بولی۔ "مجھے تو بڑے بہادر لگتے ہیں کہ خوامخواہ مجھ سے بے تکلف ہو رہے ہیں... میں نے نام پوچھا تھا۔"

میں نے اپنا کارڈ اس کے سامنے رکھ دیا۔ "لیکن میرا نام ہے نرس۔"

وہ جاتے جاتے پلٹی۔ "نرس؟ مائنڈ یور... میں ڈاکٹر شیریں ہوں۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔ "کاش میں فرہاد ہوتا۔"

اس کے لبوں کی مسکراہٹ اعتراف کرتی تھی کہ اس نے یہ بات سن لی ہے لیکن وہ انجان بن کے سیدھی نکل گئی۔ ایک کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اس نے پھر مجھے پلٹ کے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ وہ پورے پانچ منٹ بعد برآمد ہوئی۔

"جائیے!" اس نے مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

ڈاکٹر امداد صدیقی چھوٹے قد کا گول مول آدمی تھا جس کے سر کی شفاف سطح سے روشنی منعکس ہوتی تھی۔ اس نے کھڑے ہو کے بڑی خوشامدانہ مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کے... برا نہ مانیے گا، اگر میں کہوں کہ آپ شیطان کی طرح مشہور ہیں۔"

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ "بزدل کے ساتھ میں ڈھیٹ بھی ہوں۔"

اس نے دونوں ہاتھ مل کے کہا۔ "پہلے فرمائیے کیا چلے گا... گرم کہ ٹھنڈا...؟"

میں نے کہا۔ "کچھ نہیں... میں جلدی میں ہوں۔"

وہ سیریس ہو گیا۔ "یہ آپ سے کس نے کہا کہ اسپتال سے دو مریض نکل گئے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "خود اس مریض نے جو فرار ہو کے سیدھا میرے پاس آیا تھا... اس کا نام ہے بابر بلال... دوسرے کا نام اس نے شیدا پستول بتایا..."

وہ کچھ سوچتا رہا۔ "بابر آپ کے پاس کیوں گیا؟"

اس کا جواب میں نے بڑے اختصار سے دیا۔ "مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ کیا وہ کوئی خطرناک قسم کا پاگل ہے... جس سے پبلک کو خطرہ ہو؟"

ڈاکٹر صدیقی نے نفی میں سر ہلایا۔ "بالکل نہیں... ایسا ہوتا تو ہم سب سے پہلے پولیس کو بتاتے... لیکن ہم نے صرف گھر والوں کو بتایا ہے۔"

"کون گھر والے؟" میں نے معنی خیز لہجے میں سوال کیا۔

"اس کے بھائی کو... اور اس کی بیوی کو..."

"ڈاکٹر صاحب! کیا یہ درست ہے کہ محض جائداد چھپانے کے لیے اس کے بڑے بھائی اکبر نے اسے یہاں بند کرا دیا تھا... اور اسے پاگل ثابت کرنے میں کسی ڈاکٹر زیدی نے اس کی مدد کی تھی؟"

"یہ بالکل لغو اور غلط بات ہے۔ بابر کو میں پاگل ہی نہیں سمجھتا... وہ شدید ڈپریشن کا شکار تھا... لیکن اب اس کی حالت پہلے سے بہتر ہو رہی تھی... شاید ہم اسے ڈسچارج بھی کر دیتے... دو چار مہینے میں۔"

"ڈاکٹر زیدی کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ وہ ایک جعلی ڈاکٹر ہے... اس کی ڈگری بھی جعلی ہے۔"

ڈاکٹر صدیقی مسکرایا۔ "ایسا تو کہے گا وہ... کیونکہ ڈاکٹر زیدی کی سفارش پر ہی اسے یہاں لایا گیا تھا... اگر وہ میرے بارے میں بھی ایسی ہی بات کہے تو مجھے تعجب نہیں ہوگا۔"

"ایک آخری بات... جس شخص نے فرار میں اس کی مدد کی... نام تو اس کا رشید ہے لیکن وہ خود کو شیدا پستول کہتا ہے۔"

"دیکھیے... آپ کو مجھ سے بہتر علم ہوگا... وہ ایک ڈاکو تھا اور عمر قید کی سزا کاٹ رہا تھا... جیل میں اسے ہیروئن کی لت پڑ گئی اور اس نے رشوت دی یا کوئی چکر چلایا کہ اسے علاج کے لیے یہاں بھیج دیا گیا... اس کی حالت واقعی بگڑی تھی۔ رہی مدد کی بات تو معاملہ اس کے برعکس ہے بزدل صاحب... بابر نے اس کی مدد کی۔ بابر طبعاً رحم دل ہے... کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ اس کیس میں کیوں دلچسپی لے رہے ہیں؟ محض ایک سنسنی خیز خبر بنانے کے لیے..."

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "اطمینان رکھیے... اخبار میں کچھ نہیں آئے گا... وہ میرے پاس مدد مانگنے آیا تھا۔"

"تمیاز! آپ نے بھگت لیا۔"

"اس کے باوجود... ابھی میں نے قطعی فیصلہ نہیں کیا... کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ اس کی بیوی کا گھر کہاں ہے... سسرال والوں نے تو اسے نکال دیا تھا۔"

وہ کچھ تذبذب کا شکار رہا... پھر اس نے انٹرکام کا بٹن دبا کے مجھ سے کہا۔ "ڈاکٹر شیریں اس کی فائل دیکھ کے بتا دے گی۔"

ڈاکٹر شیریں سے آدھے گھنٹے بعد دوسری ملاقات ذرا بھی تلخ نہیں رہی۔ اس نے مجھے کاؤنٹر کے پیچھے بلا لیا۔ وہاں ایک دروازہ بھی تھا جو پس منظر میں دیوار کے سائز کی پینٹری کا حصہ بنا ہوا تھا اور غور سے دیکھے بغیر الگ نظر ہی نہیں آتا تھا۔

یہ ڈاکٹر شیریں کے مختصر سے کیبن نما کمرے کا راستہ تھا... کیبن میں ایک چھوٹی سی میز تھی اور دو کرسیاں جو آمنے سامنے لگی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں اسٹیل کی الماری تھی۔ دوسرے میں ایک چھوٹی سی ٹیبل جس پر الیکٹرک کیتلی کے علاوہ چائے کافی کا سامان بھی تھا۔

ایک فائل نکال کے اس نے شکایتی انداز میں کہا۔ "آپ نے تو چائے کافی کچھ بھی نہیں لیا۔" وہ ایک کاغذ کے پرزے پر کچھ لکھنے لگی۔

میں نے مسکرا کے اسے دیکھا۔ "میں اس خلائی مخلوق کے ساتھ پیتا تو خاک مزہ آتا... آپ پوچھ کر دیکھیے۔"

وہ ہنس پڑی۔ "مجھے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے... بیٹھیے۔"

میں نے پرچا جیب میں رکھ لیا۔ "بڑی عجیب بات ہے۔"

الیکٹرک کیتلی کا پلگ لگاتے ہوئے اس نے کہا۔ "کیا عجیب بات ہے؟"

"میں نے کسی خوب صورت لڑکی کی ہینڈ رائٹنگ خوب صورت نہیں دیکھی۔"

خوشامد اس کی بھی کمزوری تھی۔ اس نے مسکرا کے مجھے دیکھا۔ "میں نے سنا ہے کہ آپ کالم بھی لکھتے ہیں... شاعر بھی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میرا اگلا کالم آپ پر ہوگا۔ رہی شاعری کی بات... تو آپ پر میں ایک غزل کہہ سکتا ہوں... اگر آپ سامنے ہوں۔"

اس نے کافی کا مگ میرے سامنے رکھ دیا۔ "وہ پھر بھی کہیں... مجھے یہ بتائیے... بابر سے آپ کو کیا دلچسپی ہے؟"

"خاتون! میں بزدل ہی نہیں رحم دل بھی ہوں... پتا نہیں کیوں میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کی مدد کروں۔"

"دل کی بات ضرور سن لینی چاہیے۔ اس سلسلے میں جو مدد مجھ سے ہو سکی، میں ضرور کروں گی... بابر برا آدمی نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "اور میں؟"

وہ مسکرائی۔ "آپ بھی اچھے آدمی ہیں۔"

میں ہرگز ڈاکٹر شیریں سے عشق لڑانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا حالانکہ اس کی طرف سے مجھے گرین سگنل مل گیا تھا۔ میں نے صرف اس بات کو یقینی بنایا تھا کہ ضرورت پڑنے پر مجھے ڈاکٹر شیریں سے ہر قسم کی معلومات حاصل ہو جاتیں۔ ایک فلرٹ انداز میں اسے خدا حافظ کہنے کے بعد میں نے باہر آ کے ٹیکسی پکڑی... ٹیکسی والا شاید کسی مریض یا اس کے لواحقین کو لایا تھا اور اس امید میں اونگھ رہا تھا کہ اسے واپسی کی

www.pkdigest.com

روحانی معالج
صدر کراچی
ایس - آر - رائے
ہر کام بذریعہ کلام الٰہی کیا جاتا ہے ہر مقصد میں کامیابی چند یوم میں حاصل کریں مثلاً
من پسند جگہ شادی
گھریلو پریشانی
کاروبار میں بندش
رشتوں میں بندش
انعامی چانس
سوتن سے نجات
شوہر کو راہ راست پر لانا
بیرون ملک سفر
ہر کام بذریعہ نقش و کلام کیا جاتا ہے
ہم دعویٰ نہیں کام کرتے ہیں
خود بیٹھ کر کام حل کروائیں اور پرسکون زندگی بسر کریں
اپنا لکی نمبر اور برج ستارہ، پتھر، مبارک دن
معلوم کریں صرف ایک فون کال پر
رابطہ 24 گھنٹے
021-35476149 , 021-32783885
0322-3231669 , 0333-3136430

www.pkdigest.com

سواری مل جائے۔

روبی کا میکا اس کے سسرال سے زیادہ دور نہیں تھا۔ فرق صرف حیثیت کا تھا۔ بابر کا آبائی گھر کسی اسمبلی کے ممبر کی کوٹھی ہوگی جو اس کے شایان شان ہوگی... عام لوگوں کا... جنہیں عوام کہا جاتا ہے... منتخب کردہ کوئی نمائندہ کسی عام گھر میں کیسے رہ سکتا ہے... روبی خود ایک پرائمری ٹیچر کی بیٹی تھی جو اس ملک کے غریب ترین طبقے سے تعلق رکھتا ہے... تمام عمر صرف علم کی دولت بانٹتا رہتا ہے جو کبھی کم نہیں ہوتی... صرف اس کی زندگی کے مسائل بڑھتے ہیں۔

چار پانچ مرلے کے گھر کو قدامت اسی طرح ختم کر رہی تھی جیسے علاج نہ ہونے پر انسان کو بیماری ختم کر تی ہے۔ اس کا پلستر اکھڑ رہا تھا اور اس پر رنگ نہ کرانے سے بدنمائی غالب آرہی تھی... میں نے گھنٹی بجائی... پھر دستک دی تو ایک تھکی ہوئی بوڑھی آواز نے پوچھا۔ ''کون ہے؟'' پھر دروازہ کھل گیا۔

سفید بالوں والی ایک نحیف و نزار بڑی بی نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''کیا بات ہے جی... کس سے ملنا ہے؟''

ان کے جارحانہ لہجے کے باوجود میں نے ادب سے پوچھا۔ ''میں بابر کا ایک دوست ہوں۔''

''بابر یہاں نہیں رہتا۔'' انہوں نے بے رخی سے کہا۔

''مجھے معلوم ہے... ان کی بیوی تو یہاں رہتی ہے... آپ اس کی ماں ہیں؟''

''ہاں ہوں... روبی ابھی ڈیوٹی سے نہیں لوٹی... کیا کام ہے تمہیں اس سے...؟'' بڑی بی نے شک بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''وہ آنے والی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو میں اندر بیٹھ کے اس کا انتظار کرلوں۔''

''لو بھیا... آج تک میں نے تمہاری صورت نہیں دیکھی... اندر کیسے بلالوں؟ بے شک صورت سے تم چور اچکے نہیں لگتے... لیکن زمانہ ایسا ہے۔'' وہ بات کرتے کرتے سوچ میں پڑ گئیں۔ ''اچھا... آجاؤ... اللہ مالک ہے... یہاں سے کیا جو لے جاؤ گے۔''

پیچھے ہٹ کر انہوں نے مجھے گزرنے کا راستہ دیا اور پھر ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ''اندر بیٹھ جاؤ... وہ بھی ایک بڑھیا کی دیکھ بھال کرتی ہے... وہ پیسے والے لوگ ہیں... بہو بھی بیٹے کے ساتھ ہی نکل جاتی ہے... کسی اسکول کی پرنسپل ہے... پرنسپل کیا مالک ہے... شام تک روبی کو اس کی بیمار ساس کی دیکھ بھال کے دس ہزار ملتے ہیں۔''

مختصر سی بیٹھک میں دو پرانی کرسیاں تھیں جن پر صاف کشن رکھے ہوئے تھے۔ قدیم صوفے کی پالش برسوں پہلے خراب ہو چکی تھی اور فوم کے کشن دب گئے تھے۔ پردے بھی پرانے لیکن صاف تھے۔ بار بار دھلنے سے ان کا رنگ نکل گیا تھا۔ دیوار پر فریم میں اللہ اور محمد کے دو طغرے تھے۔ مکے مدینے کی تصویریں تھیں اور ایک تصویر سب سے الگ تھی جس میں ایک شخص نے قدیم وضع کی شیروانی کے ساتھ جناح کیپ لگا رکھی تھی۔ شاید اپنے رعب میں اضافے کے لیے اس نے بڑی بڑی مونچھیں بھی پال رکھی تھیں۔ کچھ لوگ آج بھی مونچھ کو مردانگی کی شان سمجھتے ہیں۔

''یہ میرے میاں ہیں... روبی کے ابا۔'' بڑی بی نے میری دلچسپی کو نوٹ کرلیا۔ ''کئی برس ہوگئے ان کے انتقال کو... تم بابر کو کیسے جانتے ہو... اور اس کے دوست ہو تو کیا تمہیں پتا نہیں کہ وہ پاگل خانے میں ہے؟''

میں نے کہا۔ ''خالہ... بس آپ سے کیا جھوٹ بولوں... کل رات سے پہلے میں شہنشاہ بابر کے سوا کسی بابر کو نہیں جانتا تھا۔ نہ مجھے معلوم تھا کہ وہ پاگل خانے میں ہے... وہ کل رات وہاں سے فرار ہوا تو میرے پاس آگیا... میں ایک اخبار کا نمائندہ ہوں... کسی نے اسے کہا تھا کہ میں اس کی مدد کرسکتا ہوں۔''

اسی وقت کسی نے باہر کے دروازے پر دستک دی تو بڑی بی اٹھیں۔ ''میرا خیال ہے روبی آگئی۔''

روبی واقعی ایک کم عمر لڑکی تھی۔ نرس کے سفید لباس میں وہ اور بھی معصوم لگ رہی تھی۔ روبی دبلی پتلی اور ایشوریا رائے جیسے نرم و نازک نقوش والی حسین لڑکی تھی۔ اس کی صورت پر متانت تھی اور آنکھوں میں تشویش اور حزن و ملال کے ساتھ عزم و ہمت کی چمک۔

اس کی سوالیہ حیران نگاہوں کے جواب میں میرے لیے ضروری ہوگیا کہ میں اپنا تعارف پھر کراؤں۔ وہ ماں کے ساتھ بیٹھ گئی تو میں نے بابر سے اپنی ملاقات کی ساری تفصیل بیان کی اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات بھی بتائے۔ ماں بیٹی کی صورتوں پر تشویش اور پریشانی کے سائے مزید گہرے ہوگئے۔

''تم نے اس کے لیے اتنا کیا... اور اس کمینے پاگل نے...''

روبی نے دکھی لہجے میں احتجاج کیا۔ ''ماں... اسے گالیاں تو مت دو۔''

''تم اب بھی اس کی مدد کرنا چاہتے ہو؟'' بڑی بی نے

اپنی بات جاری رکھی۔ ”تم نے پولیس میں رپورٹ تک نہیں لکھوائی۔“

”میرا خیال تھا کہ وہ سیدھا یہاں آئے گا... کار تو مجھے مل ہی جائے گی... مجھے بابر کے بارے میں کچھ معلوم کرنا تھا۔“

بڑی بی نے ایک آہ بھری۔ ”اس کے بارے میں کیا ہے بتانے کو... میری بیٹی کی تو قسمت پھوٹ گئی... روبی! جا تو چائے بنا کے لا۔“

روبی غصے میں اٹھی۔ ”ماں! تمہیں جو کہنا ہے میرے سامنے کہنا... مجھے پتا ہے تم بھی اس کے خلاف ہو۔“

میں نے ہاتھ کے اشارے سے روبی کو منع کیا۔ ”چائے کی ابھی ضرورت نہیں۔“ لیکن وہ باہر نکل گئی۔

”دیکھو بیٹا! پرانے لوگ ایسے ہی نہیں کہتے تھے کہ موری کی اینٹ چوبارے نہیں چڑھ سکتی... چڑھے گی تو اس کو کبھی نہ کبھی ایسے ہی نکال کے پھینک دیا جائے گا... جیسے انہوں نے روبی کو نکال پھینکا۔“

روبی نے اندر سے کہا۔ ”ماں! میں سب سن رہی ہوں۔“

یہ کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ گھر کے کچن کی دیوار آٹھ دس فٹ دور تھی۔ کھلے دروازے سے بڑی بی کی قدرے اونچی آواز اسی طرح روبی کے کانوں تک پہنچ رہی ہوگی جیسے کچن میں برتنوں کے اٹھانے اور رکھنے کی ہر آواز مجھ تک آرہی تھی۔

”بلال خان کا اور ہمارا کیا جوڑ... وہ خاندانی جاگیردار... دولت ان کے گھر کی باندی... ہم جیسے نہ جانے کتنے ان کی حویلی میں چاکری کرتے تھے... اسے طاقت کا غرور تھا... روبی کا باپ مرتے دم تک اپنے علم پر غرور کرتا رہا... کیا اس سے بلال خان اور ہم برابر ہوگئے؟ اس کی حویلی کو دیکھو اور ہمارے اس کھنڈر کو دیکھو... اس نے روبی کو میٹرک تک تعلیم دلائی... خاندان والوں کی مخالفت کے باوجود... خاندان بھی ہم جیسا... کوئی کلرک، کوئی چپراسی، مزدور... روبی کو ڈاکٹر بننے کا شوق تھا... بچپن میں ہر لڑکی کو ہوتا ہے... ہمارے ایسے حالات کہاں تھے کہ ڈاکٹری پڑھانے کا خرچہ اٹھاتے... روبی نرس بن گئی۔ تم دیکھ رہے ہو نا وہ آج بھی کتنی خوب صورت ہے... اس پر سب کی نظر تھی... اچھے رشتے بھی آئے تھے لیکن نصیب کے لکھے کو بھلا کون مٹا سکتا ہے... نہ ہم نے روبی کو اس لیے اسپتال میں نوکری کرنے کی اجازت دی تھی... نہ بابر کو اس کے ماں باپ نے شادی کرنے کے لیے میڈیکل کالج بھیجا تھا... بس جو انہونی تھی ہو گئی... یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے بیٹا۔“

روبی چائے کی ٹرے کے ساتھ اندر آئی۔ ”کون سی غلطی کی تھی ہم نے؟“

”غلطی نہیں کی تھی تو پھر یہ سب کیوں ہوا تیرے ساتھ... اور کتنا ذلیل کیا تھا تیرے باپ کو بلال خان نے... کیا نہیں کہا تھا اس نے... کون سا الزام تھا جو تجھ پر اور ہم پر نہیں لگایا تھا؟“

”اس کی بات مت کرو... وہ خود ذلیل آدمی تھا... بابر نے کس طرح میرا ساتھ دیا... میری حفاظت کی... وہ آج بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرتا ہے۔“

”کیا فائدہ۔“ روبی کی ماں چلائی۔ ”تیرا شوہر پاگل خانے میں بند ہے... ساری عمر وہیں رہے گا اور وہیں مر جائے گا... اس کے بھاگنے سے کیا ہوتا ہے... پولیس اسے پھر پکڑ کے وہیں پہنچا دے گی۔“

روبی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ”تم تو ایسا مت کہو ماں... آخر میں بیٹی ہوں تمہاری... تم جاؤ اندر... جاکر اسٹار پلس دیکھو۔“

میں نے بھی کہا۔ ”دیکھیے... مجھے روبی سے کچھ پوچھنا تھا۔“

روبی کی ماں بادلِ ناخواستہ اٹھی۔ وہ کچھ زیادہ بولنے پر شرمندہ بھی اور کچھ یوں نکالے جانے پر... روبی نے دوپٹے سے اپنے آنسو صاف کیے اور میرے لیے چائے بنانے لگی۔ نرس کا بے رنگ لباس اتار کے اس نے سرخ اور سیاہ رنگوں کے امتزاج والا لباس پہن لیا تھا جس نے اس کے حسن کو نیا نکھار دے دیا تھا۔

”دیکھیے... بابر کی اس حرکت کے باوجود... جو اس نے آپ کے ساتھ کی...“ روبی نے چائے کا کپ میرے سامنے رکھ دیا۔ ”میں آپ کو یقین دلا سکتی ہوں کہ وہ پاگل نہیں ہے... اسے پاگل بنا دیا گیا ہے۔ میں بیوی ہوں اس کی... میں جانتی ہوں... وہ دل کا برا نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”روبی! معاملہ دل کا نہیں... دماغ کا ہے۔ بابر بھی اپنے بھائی کو اور بھابی کو الزام دیتا ہے... یہاں تک کہ ڈاکٹر زیدی کو بھی... حالانکہ میں ابھی وہیں گیا تھا... امدادِ نفسیاتی اسپتال... وہاں ڈاکٹر صدیقی نے بھی کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔“

روبی نے ایک گہری سانس لی۔ ”انہیں کیا معلوم اندر کی بات کا... یہ سب ایک دن میں تو نہیں ہوگیا... یہ سلسلہ تو شاید بچپن سے چل رہا تھا... اس وقت سے جب میری شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ دونوں بھائیوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا... اکبر اپنے باپ... جیسا تھا... شاطر، عیار

اور منافق... سازشی اور بے ضمیر... انتہائی موقع شناس اور کینہ پرور... ذاتی مفاد ہو تو کیسی مروت کہاں کا لحاظ... نہ اصول نہ ایمان... بلال خان کے بارے میں آپ ضرور جانتے ہوں گے... آپ اخبار میں ہو... نہیں جانتے تو لوگوں سے پوچھ کر دیکھو کہ اس نے یہ ساری کامیابی کیسے حاصل کی؟“

”وہ مجھے معلوم ہے روبی... یہاں جو اقتدار میں ہے۔ دولت اور طاقت کا مالک ہے... بلال خان نے بھی... کامیابی کے ایک ہی راستے پر چل کے اور ایک ہی فارمولے پر عمل کر کے یہ مقام حاصل کیا ہے۔“

”اکبر بلال اسی کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے... اس کے برعکس میرا شوہر واقعی بے وقوف ہے... انتہائی سادہ لوح... اصول پرستی اور خیر کی بات کرنے والا... حساس اور دردمند دل رکھنے والا... اکبر خان نے اسے خوب ایکسپلائٹ کیا... وہ باپ کی ہاں میں ہاں ملاتا تھا... وہ باپ کا چہیتا بن گیا... بابر ہر معاملے میں اس سے الجھتا رہا... یہ غلط ہے... وہ خلافِ اصول ہے... یہ ظلم ہے... وہ ناانصافی ہے... باپ سخت چڑتا تھا... ماں کی حمایت نہ ہوتی تو بابر باپ کے ہوتے ہوئے یتیم ہو جاتا... سب کچھ اکبر خان کو مل جاتا... اکبر خان نے اس صورتِ حال سے پورا فائدہ اٹھایا... اس نے باپ بیٹے کے اختلافات کو ہوا دی... ایک طرف بابر کو اکسایا کہ تم بالکل ٹھیک کہتے ہو... دوسری طرف باپ کے کان بھرے... لیکن ایسی ہوشیاری سے کہ اس کا اپنا شیطانی کردار سامنے نہ آئے۔ وہ جھوٹ بولنے سے بھی گریز نہیں کرتا تھا... بابر اور اس کے باپ میں دن رات جھگڑا رہتا تھا... ہر وقت کی چیخ پکار اور محاذ آرائی ختم کرنے کے لیے ماں نے یہ کیا کہ اسے گھر سے دور میڈیکل کالج میں داخلہ دلوا دیا۔ بابر کے نمبر بہت کم تھے... پڑھنے سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی... جس شخص کا ذہن ہر وقت انتشار کا شکار ہو... جسے گھر میں سکون نہ ہو... سب بے وقوف اور پاگل سمجھتے ہوں... وہ کیا پڑھے گا... لیکن بلال خان کا اثر رسوخ کام آیا اور بابر کو کسی کوٹے پر داخلہ مل گیا... اس کی بدبختی کہ وہاں میں تھی۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے تو یہ سراسر اس کی خوش بختی نظر آتی ہے۔“

روبی کے چہرے پر رنگ سا آگیا۔ ”دوسرے تو ایسا نہیں سمجھتے... بابر انتہائی جذباتی ہے... میں نے اسے بہت سمجھایا، بہت روکا... لیکن اسے ڈر تھا کہ کوئی اور مجھے اس سے چھین لے گا... کوئی ڈاکٹر یا کسی بڑے گھر کا لڑکا... اور اس میں کوئی شک نہیں کہ... بہت سے تھے جو ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے... وہ کیا شعر ہے... اچھی صورت بھی کیا بری شے ہے... جس نے ڈالی بری نظر ڈالی... وہاں سینئرز اور ڈاکٹرز کس طرح نرسوں کا جذباتی استحصال کرتے تھے... مجھے معلوم ہے۔ بے چاری غریب نرس خود اپنے خوابوں کے جال میں پھنس کر اپنا سب کچھ گنوا بیٹھتی تھی۔ بابر کے اصرار کے سامنے میں بھی ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئی... اب آپ سے کیا چھپاؤں... ڈر مجھے بھی تھا کہ کوئی بابر کو مجھ سے نہ چھین لے... سب جانتے تھے کہ وہ کون ہے... کس کا بیٹا ہے... لیکن یہ شادی ہی بابر کا سب سے سنگین جرم بن گئی۔ میرے ساتھ جو ہوا سو ہوا... بابر کو اس جرم کی پاداش میں پاگل خانے جانا پڑا۔“

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے گھڑی دیکھی۔ ”میرا خیال تھا کہ وہ سیدھا تمہارے پاس آئے گا... آخر گاڑی لے کر وہ گیا کہاں؟“

”میں کیا بتاؤں... مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے... کہیں وہ ان کے ہتھے چڑھ گیا تو مارا جائے گا... بلال خان کا وارث اکبر خان ہے... سب اسی کے حکم کے غلام ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”آخر بابر ایسا کیوں سمجھتا ہے کہ اس نے ہی اپنے باپ کو قتل کیا؟“

”اسے یہی سمجھایا گیا ہے... اس کے دماغ میں یہ بات بٹھا دی گئی ہے تم تو جانتے ہو کہ ایسا ہوتا ہے... کچھ لوگ دوسروں کے ذہن پر حاوی ہو جاتے ہیں... اسے یوں کنٹرول کرنے لگتے ہیں جیسے کوئی پتلی والا ڈور ہلاتا ہے تو ہر پتلی اس کی مرضی کے مطابق چلتی ہے۔“

”کیا بابر کا ذہن اتنا کمزور ہے؟“

”تھا نہیں... کر دیا گیا ہے... جیسے ایک بچے کو چلنے ہی نہ دیا جائے تو وہ شاید کھڑا بھی نہ ہو پائے اور دوسرے کو دوڑنے بھاگنے دیا جائے... اکبر نے بار بار مسلسل کہا کہ وہ اپنے باپ کا قاتل ہے... قتل صرف پستول یا خنجر سے نہیں ہوتا... الفاظ کے زخم بھی جان لیوا ہوتے ہیں... تم نے باپ سے جو کچھ کہا وہ خنجر کے گھاؤ سے کم نہیں تھا... سب جھوٹ... ان کے والد کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا... وہ دل کے مریض تھے... مگر بابر نے مان لیا کہ غصہ اور صدمہ ان کے ہارٹ اٹیک کا سبب تھے۔“

”تم نے اس کی کوئی مدد نہیں کی؟“

”میں کیا کرتی... بچپن سے چل رہا تھا یہ سلسلہ... اکبر کو برتر اور بابر کو کم تر ثابت کیا جا رہا تھا... تم نالائق ہو... پڑھنے لکھنے کے قابل نہیں... میٹرک اس نے دو بار امتحان دے کر

پاس کیا... وہ بھی تھرڈ ڈویژن میں... پھر انٹر میں بھی کہانی دہرائی گئی... رہی سہی کسر اس وقت پوری ہوگئی جب ڈاکٹری کے پہلے ہی سال میں اس نے پڑھائی چھوڑ کے مجھ سے شادی کرلی۔ اس پر ایک طوفان کھڑا ہوگیا۔ باپ کو وہ ہمیشہ سے اپنا دشمن نمبرون خیال کرتا تھا... یہ نہیں سمجھتا تھا کہ دشمن نمبر ون اس کا بڑا بھائی ہے جو باپ کی نظر میں اسے گرا رہا ہے... یہ بابر کی سادہ لوحی کیا... سراسر بے وقوفی تھی... بھائی کی چالاکی اور دوغلا پن اسے نظر ہی نہیں آتا تھا۔ بھائی اس کے سامنے آتا تھا تو بابر کا سب سے اچھا دوست، ہمدرد اور خیر خواہ بن جاتا تھا۔ شادی کے جرم میں باپ کی طرف سے جو ردِعمل آیا، وہ سب سے سخت تھا... اس کے بس میں ہوتا تو وہ بابر کو عاق کر دیتا... اسے اپنی اولاد تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا مگر یہ قانونی طور پر ممکن نہیں تھا... پھر ماں اپنے چھوٹے اور مظلوم بیٹے کی حمایت کرتی تھی... ایسا ہوتا ہے... ذہنی طور پر معذور بچے کو ماں کی زیادہ شفقت ملتی ہے۔''

میں نے اسے روک کے پوچھا۔ ''اس کی ماں کا شادی پر کیا ردِعمل تھا... اس نے تمہیں بہو کے طور پر قبول کر لیا تھا؟''

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ ''میرا خیال ہے... یہ اس کی مجبوری تھی... بیٹے کی محبت میں اسے یہ کڑوا گھونٹ نگلنا پڑا... ہر ماں کی طرح اس کی بھی خواہش ہوگی کہ وہ بیٹے کے لیے سارے زمانے میں گھوم پھر کے اپنی پسند کی بہو لائے... چندے آفتاب، چندے ماہتاب...''

''ایسی تو تم بھی ہو۔''

وہ شرمائی۔ ''تم اپنی نظر سے دیکھ رہے ہو... میری ساس نے کبھی ایسا نہیں سمجھا... نہ کہا... اس کے علاوہ بابر کی ماں کی نظر شاید اپنے خاندان کی کسی لڑکی پر ہو... یا وہ اپنے ہم رتبہ لوگ چاہتی ہو... وہ خود بڑے گھر کی لڑکی تھی... حقیقت تو یہ ہے کہ بلال خان کی اوقات کچھ نہیں تھی... اپنی بیوی کے مقابلے میں خاندانی طور پر اس کی وہی حیثیت تھی جو میری بابر کے مقابلے میں... بلال خان کنگال تھا... اس کا باپ ایک جاگیردار ملک خدا بخش کا منشی تھا... خدا بخش کی کوئی اولاد نہیں تھی... اولاد کے لیے اس نے یکے بعد دیگرے کئی شادیاں کر ڈالیں... پہلی نے طلاق لے لی... دوسری مر گئی... تیسری ماں باپ کے گھر جا بیٹھی اور لوٹ کے نہیں آئی... چوتھی مرتے دم تک اس کے ساتھ تھی... اصل قصوروار وہ خود تھا... وہ چار کیا چالیس شادیاں کر لیتا تب بھی بے اولاد ہی رہتا... یہ دوسری بیوی نے ثابت کیا... اس نے دوسرے شوہر سے سات بچے

پیدا کر کے دکھا دیے... خیر، پھر بھائی نے اسے ایک بیٹی دے دی جسے خدا بخش نے قانونی طور پر بھی اپنا لیا... اس ڈر سے کہ بعد میں اس کی زمین جائداد پر فساد نہ ہو... اس نے اپنی زندگی میں ہی سب کچھ بیٹی کے نام کر دیا تھا... خدا بخش کا منشی بہت بھروسے کا آدمی تھا لیکن جب خدا بخش کا انتقال ہوا تو وہ خود بھی بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے بلال خان کو مدد کے لیے بلا لیا... بلال خان اس وقت بی اے کر چکا تھا اور نوکری تلاش کر رہا تھا... وہ بہت ذہین اور ہینڈسم آدمی تھا... اس نے بڑی خوبی سے خدا بخش کی زمینوں کا انتظام سنبھالا اور اس کی بیٹی کا اعتماد حاصل کر لیا... یہی اعتماد بالآخر محبت میں ڈھل گیا... روکنے ٹوکنے والا کوئی تھا نہیں... شادی ہوگئی اور زمینوں کا انتظام سنبھالنے والا ایک منشی کا بیٹا ساری زمینوں کا مالک بن گیا... وہ ہر لحاظ سے ایک اچھا شوہر ثابت ہوا... اس نے ایسے چکر چلائے کہ آس پاس کی ساری زمینیں اس کے قبضے میں آگئیں... تعلقات کو اتنا بڑھایا کہ بالآخر سیاست کے میدان میں کود پڑا اور اسمبلی کا رکن بن گیا اس میں خوفِ خدا ہوتا تو وہ کمزور، بے سہارا غریب کسانوں کی زمین پر قبضہ نہ کرتا... ان پر ظلم نہ کرتا... اس کی ایک نجی جیل بھی جس میں وہ مخالفوں کو زنجیروں سے باندھ کر رکھتا تھا... ان کی نظروں کے سامنے ان کی بہو بیٹیوں کو بلال خان کے کارندے بے آبرو کرتے تھے... ظاہر ہے، یہ سب میں نے نہیں دیکھا... مجھے خود بابر نے بتایا۔''

''اس کی بیوی بلال خان کو روکتی نہیں تھی؟''

''وہ کون سی میری طرح کسی ٹیچر کی یا کسی ملا کی بیٹی تھی... اس کا باپ خدا بخش خود ایک وڈیرا تھا... یکے بعد دیگرے شادیاں کرتا رہا۔ مجرم خود تھا، سزا بیویوں کو دیتا رہا۔ بلال خان کی بیوی... اس کا نام سارہ تھا... اس قسم کے رویوں کی عادی تھی... بابر اس لیے محفوظ رہا کہ وہ ماں کا لاڈلا تھا۔ سارہ نے کبھی شوہر کو اس کے ساتھ زیادتی کرنے نہیں دی ورنہ بابر مارا جاتا... باپ اسے کوڑی کوڑی کو محتاج کر دیتا... ساری جائداد اکبر خان لے جاتا... شادی کے معاملے میں ماں کو بھی بابر سے شکایت ہوئی... بلکہ دکھ ہوا... شاید اسے بیٹے سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ اس طرح ماں کو بھی نظر انداز کر دے گا... میاں بیوی میں بیٹوں کی وجہ سے ہمیشہ اختلاف رہتا تھا... یوں سمجھو کہ گھر دو حصوں میں بٹ گیا تھا... بڑا بیٹا اور باپ ایک طرف... چھوٹا بیٹا اور ماں دوسری طرف... ماں اس صورتِ حال سے پہلے ہی دل برداشتہ

تھی۔ سکون آور گولیاں کھاتی رہتی تھی... بابر نے شادی کی تو وہ ڈپریشن کا شکار ہوگئی۔''

اندر فون کی گھنٹی بجی تو روبی کی توجہ ادھر ہوگئی۔ وہ اپنے شوہر کی طرف سے پریشان تھی۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے بھی اس کی بے چینی کا اظہار ہوتا تھا۔ میری صورت میں اسے ایک ہمدرد اور مددگار نظر آیا تھا... شاید میں وہ پہلا شخص تھا جو اس کے شوہر کی مدد کسی غرض کے بغیر کر رہا تھا اور اسے نہ مجرم سمجھتا تھا اور نہ پاگل... مجھے سب بتا کے روبی کو سکون مل رہا تھا اور یہ امید مل رہی تھی کہ میں بابر کو حالات کے اس بھنور سے نکالنے میں اس کی مدد کروں گا۔

اندر سے روبی کی ماں نے چلّانا شروع کیا۔ ''روبی... فون ہے تیرا...''

روبی ایک دم اٹھی۔ ''کیا بابر کا فون ہے؟''

''نہیں... اسی حرافہ رانی کا ہے۔''

میں نے روبی کی اپنی بھابی سے ہونے والی یکطرفہ گفتگو سنی تو اس نتیجے پر پہنچا کہ بابر اپنی بیوی کے پاس آنے کے بجائے پہلے سسرال پہنچا ہے۔ روبی چند منٹ بعد سخت بدحواسی واپس لوٹی۔ ''معاف کیجیے... مجھے جانا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اگر بابر وہاں پہنچا ہے تو میری کار میں چلی چلو...''

''یہ تو رانی نے نہیں بتایا... بابر ابھی کسی سے ملا نہیں... ان کا ایک بنگالی ملازم ہے... وہ کہتا ہے کہ میں نے بابر کو دیکھا تھا لیکن وہ بھاگ گیا... کھیتوں کی طرف... ادھر ان کے باغات بھی ہیں... مجھے جانا ہوگا... آپ ساتھ چلیں گے؟''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''دیکھو... یہاں کا معاملہ کچھ اور تھا... یہاں مجھے آنا پڑا... میں بابر کو واپس اسپتال لے جانے کے لیے نکلا تھا... شاید میں ڈاکٹر امداد صدیقی سے مل کے واپس چلا جاتا... میرا اخلاقی یا قانونی فرض پورا ہو جاتا... یہاں میں اس امید میں آیا تھا کہ... مجھے اپنی گاڑی مل جائے گی۔''

وہ کچھ مایوس نظر آنے لگی... ''میں نے بھی آپ سے بڑی امیدیں وابستہ کر لی تھیں... یہاں نہ کوئی ہمدرد ہے نہ مددگار... سب ہمارے دشمن ہیں۔''

بات کرتے کرتے وہ رونے لگی۔ میں نے کہا۔ ''اچھا میں چلتا ہوں... لیکن اس گھر میں شاید مجھے بھی خوش آمدید نہ کہا جائے... تمہیں ایک چھوٹا سا جھوٹ بولنا ہوگا۔''

اس نے بھیگی پلکیں اٹھائیں۔ ''وہ کیا؟''

''تم مجھے... اپنے والد کا شاگرد بتا سکتی ہو... کہہ سکتی ہو

کہ میں نے ہمیشہ ان کا خیال رکھا... اور بعد میں بھی فیملی کی خیر و عافیت پوچھنے آتا رہا۔ یوں ہی... ہر جگہ اخبار والوں کی مداخلت سے ایسے لوگ بہت چڑتے ہیں... بلال خان اور اکبر خان جیسے...''

''میں کہہ دوں گی کہ انہوں نے ہمیشہ بڑے بھائی کی طرح میرے سر پر ہاتھ رکھا ہے۔'' اس کا چہرہ چمکنے لگا۔ ''اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا... بابر کو اس کا حق مل جائے تو ہم یہاں سے چلے جائیں گے... میں پیسے کو اہمیت نہ دیتی لیکن بابر کے علاج کے لیے پیسا چاہیے... میرے پاس پیسا ہوگا تو میں اسے اچھے سے اچھے ماہرِ نفسیات کے پاس لے جا سکتی ہوں۔ وہ اس ماحول سے نکلے گا تو بالکل ٹھیک ہو جائے گا... ہم ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہیں گے۔''

میں نے مسکرا کے کہا۔ ''لڑکی... باقی باتیں بعد میں... اب چلو۔''

وہ ٹیکسی ڈرائیور جسے میں نے امداد کلینک کے باہر اونگھتا ہوا پایا تھا... ابھی تک باہر اپنی ٹیکسی میں بیٹھا اونگھ رہا تھا... وہ ایک امید پرست شخص تھا۔ اس امید میں تھا کہ میں واپس بھی جاؤں گا۔ روبی کو پیچھے بٹھا کے میں آگے بیٹھ گیا تو اس نے گاڑی گھمائی۔ ''واپس پاگل خانے؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں... بلال خان کی حویلی دیکھی ہے؟''

''نہیں دیکھی تو آج دیکھ لیں گے سر!''

روبی نے اس کی راہنمائی کی۔ حویلی شہر کے مضافات کی آخری حد سے بھی آگے تھی۔ شہر میں ان کی نہ جانے کتنی کوٹھیاں ہوں گی... یہ کوٹھی بالکل نوتعمیر شدہ لگتی تھی۔ اس کے آس پاس پھل دار درختوں کے گھنے باغ تھے جنہوں نے کوٹھی کو ایسے چھپا رکھا تھا کہ سڑک پر سے گزرنے والی ٹریفک نظر ہی نہیں آتی تھی۔ میرے پوچھنے پر روبی نے بتایا کہ یہ سب کینو اور مالٹے کے باغات ہیں جو سیکڑوں ایکڑ پر پھیلے ہوئے ہیں اور ہر سال ان کا ٹھیکا چالیس پچاس لاکھ سے کم نہیں ہوتا۔ باغات کی حد بندی خاردار تاروں سے کی گئی تھی۔ دس دس فٹ کے فاصلے پر سیمنٹ کے کھمبے نصب تھے... چھ فٹ کی بلندی پر یہ کھمبے ایک خاص زاویے پر باہر کی طرف دو فٹ موڑ دیے گئے تھے۔ خاردار تاروں کو چھ چھ انچ کے فاصلے پر بڑی صفائی سے کپ لگا کے ٹائٹ کیا گیا تھا... چنانچہ یہ تقریباً ناممکن تھا کہ کوئی بڑا جانور یا انسان اندر داخل ہو سکے اور فصلوں یا درختوں کو نقصان پہنچا سکے۔

اندر جانے والا راستہ چھ فٹ چوڑا اینٹوں کا فرش تھا۔ جہاں سے یہ راستہ شروع ہوتا تھا، وہاں تین فٹ اونچی

سیمنٹ کی محراب تھی۔ محراب کی گولائی میں اکبر خان فروٹ فارمز کے بڑے بڑے سیاہ حروف نظر آرہے تھے۔ میں نے پہلی نظر میں دیکھ لیا کہ سیمنٹ کے تازہ پلستر کو کاٹ کر لکھے جانے والے اصل حروف کچھ اور تھے۔ ابتدائی حروف پر دوبارہ پلستر کیا گیا تھا اور "بلال" کی جگہ "اکبر" لکھوایا گیا تھا۔ نئے حروف کا فرق سیاہ رنگ کی چمک کے فرق سے بھی واضح تھا۔ اس سے زیادہ واضح اکبر خان کی نیت کا فرق تھا۔ بلال خان کے اس فروٹ فارم کا وہ اکیلا مالک نہیں تھا لیکن اس نے نام صرف اپنا لکھوایا تھا۔

اس محراب یا قوس کے پچھلے حصے کی وسعت بھی بیس فٹ ہی ہوگی جہاں یہ زمین کو چھوتی تھی، وہاں سے اندر کی طرف چھ فٹ اونچی پختہ دیوار تھی۔ دیوار کے فولادی سلاخوں والے گیٹ اس وقت کھلے ہوئے تھے۔ ذرا ہٹ کے پولیس کی ایک موبائل وین کھڑی ہوئی تھی۔ وردی والا ایک سب انسپکٹر بغیر وردی والے چوکیدار کے ساتھ گپ لگا رہا تھا۔

ٹیکسی کو دیکھتے ہی انہیں اپنا فرض یاد آگیا۔ بندوق والا دبلا پتلا اور مونچھوں والا چوکیدار پہلے لپکا۔ میں نے ٹیکسی کو روک لیا۔ سب انسپکٹر نے بارعب انداز میں قریب آکے سوال کیا۔ "کہاں جانا ہے؟"

میں نے معصومیت سے کہا۔ "اندر۔"

سب انسپکٹر کا موڈ خراب ہو گیا۔ "اوئے اندر دے پتر... یہ کوئی پارک ہے کہ جس کا جی چاہے اندر چلا جائے... کیا کام ہے اندر؟ کس کے پاس جانا ہے... اور مسخری کی تو میرے ساتھ تو میں سچ مچ اندر کر دوں گا۔"

روبی نے شیشہ نیچے کیا تو چوکیدار کا ہاتھ خود بہ خود سلام کے لیے اٹھ گیا۔ "معاف کرنا بی بی جی! میں نے دیکھا نہیں تھا آپ کو۔"

روبی نے رکھائی سے کہا۔ "اپنی آنکھیں کھلی رکھا کرو... چلو ڈرائیور۔"

چوکیدار نے سب انسپکٹر سے کہا۔ "یہ بھی گھر کی مالکن ہیں جی۔"

چوکیدار کے لہجے میں حیرانی کم تھی کہ اتنے بڑے گھر کی بہو ایسی خستہ حال ٹیکسی میں سفر کیوں کر رہی ہے... طنز اور تمسخر کا انداز زیادہ نمایاں تھا۔ اس نے بعد میں تھانے دار صاحب کو اس مالکن کے بارے میں ضرور بتایا ہوگا کہ وہ ایک سابق پرائمری ٹیچر کی بیٹی اور ایک پاگل کی بیوی ہے اسی لیے اسے کسی چمکتی دمکتی شان دار ہنڈا سوک یا کرولا نہیں ملی ورنہ بلال خان کی بہو کے لیے گاڑیوں کی کیا کمی؟"

اینٹوں سے بنے ہوئے راستے کا اختتام شاہانہ انداز کی کوٹھی کے پورچ میں ہوا... وہاں پہلے سے چار گاڑیاں موجود تھیں... ایک نئی سفید رنگ کی پراڈو سب سے آگے تھی... اس کے پیچھے سیاہ رنگ کی لشکارے مارتی ہنڈا سوک تھی۔ باقی دو گاڑیوں میں سے ایک پولیس کی جیپ تھی اور دوسری تھانے کی موبائل وین... کوٹھی کے گرد پھیلے ہوئے باغ میں مجھے کم سے کم چار پولیس والے نظر آئے جو رائفلوں کے سہارے کاہلی اور بیزاری سے کھڑے تھے۔

ٹیکسی ڈرائیور نے کچھ نروس ہو کے پوچھا۔ "سر! کیا میں جاؤں؟"

روبی نے اقرار میں سر ہلا دیا تھا لیکن میں نے کہا۔ "ابھی ٹھہرو۔"

ایک اور سب انسپکٹر نے چھڑی لہرا کے اسے اشارہ کیا۔ "ادھر پیچھے کھڑا ہو جا... دیوار کے ساتھ..."

پراڈو کے... سفید وردی والے ڈرائیور نے سر ہلایا۔ "جلدی کر... بڑے صاحب نے آنا ہے... ان کی گاڑی کھڑی ہوتی ہے یہاں۔"

روبی نے بڑے اعتماد کے ساتھ چند سیڑھیاں چڑھ کے وہ لکڑی کا بھاری بھرکم دروازہ کھولا جس پر چنیوٹی نقش و نگار تھے۔ اس کے چاروں طرف بھی چار فٹ چوڑا ایسا ہی لکڑی کا خوب صورت کام تھا۔ اپنے سامنے مجھے ایک طویل راہداری نظر آئی۔ اس کی بلند و بالا چھت کو فائبر گلاس نے گولائی میں ڈھک رکھا تھا۔ دن میں راہداری کو سورج کا اجالا قدرتی روشنی فراہم کرتا تھا لیکن مجھے اس وقت بھی یہاں مدھم روشنی والے چھ فانوس جلتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

اندر مکمل خاموشی میں کسی اسٹیریو سسٹم کی گونج سنائی دے رہی تھی... پھر اچانک اس کی آواز کا گلا گھونٹ دیا گیا تو سناٹا بھی گہرا ہو گیا۔ ایک عورت راہداری کے آخری حصے میں بنے ہوئے وسیع گول لاؤنج میں نمودار ہوئی اور عین وسط میں ٹھہر گئی۔

روبی نے نروس لہجے میں کہا۔ "بھابی! یہ کیا معاملہ ہے... اتنی پولیس کس لیے ہے یہاں؟"

کسی ماڈل جیسے لباس اور میک اپ میں نظر آنے والی وہ عورت بلاشبہ حسین تھی اور اسے قدرت کے عطا کردہ حسن کو اتنے ہی کمال سے سنبھال کر رکھنے اور استعمال کرنے کا ہنر بھی آتا تھا۔ جیسے کسی ماہر شکاری کو اپنا اسلحہ رکھنے اور برتنے کے فن میں مہارت حاصل ہوتی ہے... اس کا جسم بے حد متناسب اور پرکشش تھا... نہ کہیں سے ایک انچ زیادہ نہ کہیں سے ایک انچ

کم... اس کے لباس کی تراش خراش بھی کسی باکمال ڈیزائنر نے کی تھی۔

اس نے ایک ادائے ناز سے چہرے پر آجانے والے ریشمی بالوں کو جھٹک کر پیچھے کیا۔ "یہ تم مجھ سے پوچھ رہی ہو؟ کمال ہے... تمہیں تو سب سے پہلے معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارا وہ پاگل شوہر پاگل خانے سے نکل بھاگا ہے۔"

روبی اپنے شوہر کے بارے میں زیادہ متفکر تھی۔ اس نے اپنی بھابی کے تلخ الفاظ کو نظر انداز کر دیا۔ "وہ تو مجھے معلوم ہے... میرا خیال تھا کہ وہ ادھر آئے گا۔"

پھر رانی نے مجھے اچٹتی نظر سے دیکھا۔ "اس سے اندازہ ہو جانا چاہیے تمہیں کہ اسے تم سے کتنی محبت ہے۔"

"طعنے مت دو... میں بہت پریشان ہوں بھابی۔"

"تم سے زیادہ ہم پریشان ہیں۔ آخر وہ یہاں کیوں آیا... اور آیا تھا تو اپنی منحوس شکل دکھا کے روپوش کیوں ہو گیا؟"

"روپوش ہو گیا... کہاں؟"

"جنگل کی طرف بھاگ گیا۔ پولیس اسی کو تلاش کر رہی ہے۔ اس پر خون سوار ہے۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو بھابی... وہ تو کسی معصوم بچے سے زیادہ بے ضرر ہے... آج تک اس نے ایک چڑیا کا بچہ نہیں مارا۔"

"یہ ایک محبت کا ڈراما کرنے والی بیوی کے ڈائیلاگ ہیں۔" رانی نے طنز سے کہا۔ "ورنہ وہ ریوالور لے کر یہاں نہ آتا۔"

روبی نے چیخ ماری۔ "ریوالور...؟ یہ جھوٹ ہے۔ اس کے پاس ریوالور کہاں سے آیا؟"

"پوچھ لو بنگالی سے... وہ تو جھوٹ نہیں بولتا... تمہیں اس پر بڑا اعتماد ہے... بنگالی نے ہی دیکھا تھا اسے۔"

اب میں نے اپنی موجودگی کا احساس دلانا ضروری سمجھا۔ "دیکھیے... اس بات کی گواہی میں بھی دے سکتا ہوں کہ اس کے پاس ریوالور نہیں تھا۔"

"آپ کی تعریف گواہ صاحب...؟"

میں نے کہا۔ "میں بزدل ہوں۔"

رانی نے برا سا منہ بنایا۔ "جی نہیں... کافی بہادر ہیں آپ جو روبی کے ساتھ یہاں تک چلے آئے۔"

میں نے کہا۔ "بابر میرے ساتھ تھا۔ وہ کل رات آیا تھا اور آج صبح میں اسے واپس نفسیاتی اسپتال لے کر جا رہا تھا... تو موقع پا کے وہ میری گاڑی لے گیا... میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ مسلح نہیں تھا۔"

وہ مجھے غور سے دیکھتی رہی۔ "آپ اس کے دوست ہیں یا روبی کے؟"

اب روبی نے کہا۔ "یہ ابا کے سب سے عزیز شاگرد تھے... ابا ان پر بہت اعتماد کرتے تھے... یہ میرے لیے بڑے بھائی کی جگہ ہیں۔"

"تم نے پہلے کبھی ان کا ذکر نہیں کیا... بابر جانتا ہوگا انہیں ورنہ رات ان کے فلیٹ پر کیوں گزارتا... اب آپ اپنی گاڑی کے چکر میں آئے ہیں... یا پھر چھوٹی بہن کی مدد کرنے؟"

اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ میں اپنا تفصیلی تعارف کرا دوں۔ اس کے بعد رانی کے جارحانہ رویے میں نمایاں تبدیلی آئی۔ اس نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور خود میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے ایک ملازم کو چائے لانے کے لیے بھی کہا۔ "میرے شوہر آنے ہی والے ہوں گے... وہ بہت غصے میں تھے کہ پاگل خانے والوں نے اسے نکلنے کیسے دیا۔"

میں نے کہا۔ "آپ ادارہ نفسیاتی اسپتال کو بار بار پاگل خانہ کہنے پر کیوں مصر ہیں؟"

وہ مسکرائی۔ "کیا نام سے فرق پڑتا ہے؟ آج کل اچھا فیشن چلا ہے... معذور، لنگڑے لولے، اندھے بہرے بچوں کو اسپیشل چلڈرن کہا جاتا ہے... کیا اس سے حقیقت بدلتی ہے؟"

روبی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ "بھابی! ذرا بنگالی کو بلاؤ۔"

"اس بنگالی کا کوئی نام تو ہوگا۔" میں نے کہا۔

رانی نے نازک انگلیوں سے بالوں کو پھر رخ روشن سے ہٹایا۔ "ہاں... نام ہے عبدالصبور خان... دس بارہ سال کا تھا جب یہاں آیا تھا... اس وقت سے سب بنگالی ہی کہتے ہیں... اکبر کے والد نے بتایا تھا کہ انیس سو اکہتر میں اس کے ماں باپ مشرقی پاکستان چلے گئے تھے... یہ نہ جانے کیسے یہاں رہ گیا... میری ساس جب بیاہ کے آئیں تو یہ ساتھ ہی آیا تھا... جہیز کا آئٹم سمجھ لیں۔"

"بھابی... پولیس کو کس نے بلایا؟"

"اکبر نے اور کس نے... اب تم پوچھو گی کہ اس کی کیا ضرورت تھی...؟ ہم کیا کرتے... تمہیں بلاتے یا خود اس کے پیچھے جاتے... جان کا خطرہ مول لے کر... تمہارا شوہر ہے اور تمہیں محبت بھی ہے اس سے۔" اس کے لہجے میں تمسخر آ گیا۔

"تمہیں نہیں ہے تو کیا یہ بھی میرا قصور ہے..."

رانی کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے بدلا۔ "میرا مطلب

www.pkdigest.com

تھا کہ تم نہیں مانو گی اسے پاگل... لیکن وہ پاگل ہے... ڈاکٹر کہتے ہیں..."

"کون ڈاکٹر؟ وہ تمہارا ڈاکٹر زیدی..."

رانی نے چمک کے کہا۔ "میرا؟... میرے اور تمہارے آنے سے پہلے بھی وہ فیملی ڈاکٹر تھا... تمہارے سسر کے زمانے میں بھی... اور وہ ڈاکٹر امداد صدیقی... جو ایک نفسیاتی امراض کا ماہر ہے... پورا اسپتال چلا رہا ہے... اس نے کیا بابر کو سالا سمجھ کے مہمان بنا رکھا ہے؟"

روبی نے تلخی سے کہا۔ "اسے پیسا مل رہا ہے... اور مجھے معلوم ہے پیسا کس کا ہے...؟"

رانی نے چلا کے کہا۔ "بابر کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہے... اسے وہاں الیکٹرک شاک بھی دیے گئے تو فائدہ نہیں ہوا... اب وہ وہاں سے بھاگا ہے تو آخر کیوں... کچھ تو ہوگا اس کے دماغ میں... فرار ہونے میں اس کی مدد کرنے والا کون تھا؟ ایک پرانا پاپی... پہلے ڈاکو تھا اب ہیرو بنی ہے... شیدا پستول... پستول اس کے ہاتھ میں بھی ہے... کس نے دیا ہے اس کے ہاتھ میں یہ پستول... اور کیوں؟ کسے قتل کرنا چاہتا ہے تمہارا شوہر... پھر تم پوچھتی ہو کہ پولیس کو کیوں بلایا ہے... جاؤ تم پکڑلاؤ اسے..."

میری پوزیشن بڑی خراب اور عجیب ہوگئی تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ دو بھائیوں کا بیر ان کی بیویوں میں بھی سرایت کر گیا ہے۔ ابھی تک مجھے رانی کے پچھلی بیک گراؤنڈ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ شاید وہ خاندانی بہو تھی جس کا حسب نسب روبی کے مقابلے میں برتر تھا۔ مزید یہ کہ اسے قبولیت کی سند حاصل تھی۔ وہ اسی حویلی میں تھی جس میں سے روبی کو بے دخل کیا جا چکا تھا۔ رانی کی حمایت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ روبی کی حمایت کرنے میں میرے لیے یہ خطرہ تھا کہ وہ اپنی توپوں کا رخ میری طرف کر دے گی۔

بنگالی کے آنے سے عارضی طور پر جنگ بندی کا ایک وقفہ آگیا۔ بنگالی دیکھنے میں بھی بنگالی ہی لگتا تھا۔ دبلا پتلا... پستہ قد اور سیاہ رو... دیگر ملازموں کی طرح اس نے بھی سلیٹی رنگ کی یونیفارم پہن رکھی تھی۔ وہ چائے کی ٹرالی کو دھکیلتا ہوا درمیان تک لایا پھر وہ واپس جانے کے لیے پلٹا ہی تھا کہ رانی نے اسے روک لیا۔ "بنگالی! ایک منٹ... آج تم نے بابر صاحب کو دیکھا تھا؟"

بنگالی نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

"کہاں دیکھا تھا؟ پستول بھی تھا ان کے ہاتھ میں؟"

بنگالی نے دوبارہ سر ہلایا۔ "جی... ادھر پیچھے جہاں سرونٹ کوارٹر ہے... باڑھ کے پاس۔"

میں نے کہا۔ "تمہاری ان سے کوئی بات نہیں ہوئی؟"

بنگالی نے مختصر جواب دیا۔ "نہیں سر!"

"کیا مطلب... انہوں نے صرف تمہیں اپنا چہرہ دکھایا... پھر پستول دکھایا اور چلے گئے؟"

"یس سر!"

چھ سات سال کی ایک صحت مند اور خوب صورت بچی کھلونا پستول کے ساتھ دوڑتی ہوئی اندر آئی۔ "ٹھاہ... ٹھاہ... ممی... میں نے پاپا کو مار دیا... اب تمہاری باری ہے... ٹھاہ..."

"مریم! یہ کیا بدتمیزی ہے... یہ گن کہاں سے آئی تمہارے پاس؟" رانی نے برہمی سے کہا۔ "تمہاری میڈم کہاں ہیں؟"

پینتیس چالیس سال کی ایک عورت اس سوال سے پہلے ہی اندر آچکی تھی۔ وہ متناسب جسم اور سانولے رنگ کی سنجیدہ عورت تھی جس کی صورت پر غربی نے گزرتے ہوئے وقت کی ساری کہانی لکھ دی تھی... اس نے عینک لگا رکھی تھی اور اس کے بال قبل از وقت سفید ہونے لگے تھے۔

"آئی ایم سوری بیگم صاحب... بے بی آج اسکول نہیں جاسکی... میں کہتی ہوں ہوم ورک پورا کرلو تو سنتی نہیں۔"

مریم نے کہا۔ "میں تمہیں بھی مار دوں گی میڈم... ٹھاہ... انکل زیدی کے سوا سب کو مار دوں گی۔ انہوں نے مجھے یہ گن لا کے دی ہے... وہ بہت اچھے ہیں... جھوٹے وعدہ نہیں کرتے... پاپا جھوٹ بولتے ہیں... آپ بھی جھوٹ بولتی ہو... روبی آنٹی جھوٹ نہیں بولتیں۔"

رانی چائے چھوڑ کے غصے میں اٹھی اور اس نے کسی کی موجودگی کا خیال کیے بغیر مریم کو پکڑ کے اس کے گال پر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ "بہت بکواس کرنے لگی ہو تم... لے جاؤ اسے اور بند کردو اس کے کمرے میں۔" اس نے مریم کو میڈم کی طرف دھکیل دیا۔ میڈم اسے نہ سنبھالتی تو شاید مریم گر جاتی۔ وہ مریم کی گورنس تھی... محض ایک ملازمہ... لیکن صاف نظر آتا تھا کہ وہ رانی کی بچی کو رانی سے زیادہ چاہتی ہے... وہ چلا چلا کے روتی ہوئی مریم کو باہر لے گئی۔

رانی کی اس سے بھی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے چائے حلق میں انڈیل کر جیسے خود سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ مریم کا یہاں رہنا بھی ٹھیک نہیں... میں میڈم سے کہوں گی کہ آج وہ اسے اپنے گھر لے جائے۔" وہ کسی ناگن کی طرح بل کھا کے اٹھی اور تیز تیز قدموں سے چلتی باہر نکل گئی۔

روبی نے فریادی لہجے میں کہا۔ "تم نے دیکھا... بابر

کیا چھ سال کی اس معصوم بچی کو نقصان پہنچا سکتا ہے؟ وہ خطرناک پاگل ہو تب بھی... شیطان تو نہیں ہے... درندہ تو نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں ذرا باہر جاکے پولیس سے پوچھوں... بابر کے بارے میں... اور اپنی گاڑی کے بارے میں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں... آخر وہ گیا کہاں... ابھی تک پولیس اسے تلاش نہیں کر سکی، یہاں ٹھہرنے کا بھی کیا فائدہ... مجھ سے کوئی سیدھے منہ بات کرنے والا نہیں... ادھر ماں اکیلی ہے... بابر کا کیا پتا وہ رات کو ادھر آجائے... میری طرف۔"

میں نے اس کی کسی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ پریشانی میں وہ خود کلامی کر رہی تھی۔ جب میں نے حویلی کے چاروں طرف پھیلے ہوئے فروٹ فارم کو دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس جنگل میں بابر کے لیے چھپے رہنا اور کسی کی نظر میں نہ آنا کوئی مشکل کام نہیں۔ مقامی پولیس کی نفری دس بارہ افراد پر مشتمل تھی۔ وہ سب مختلف سمتوں میں سرگرداں تھے۔ یہ اکبر خان اور اس کے مرحوم باپ سابق رکن اسمبلی کا اثر رسوخ تھا کہ تھانے والے اپنے سارے کام چھوڑ کے بابر کو تلاش کرنے یہاں آگئے تھے۔ اب رات ہونے لگی تھی۔ جو کام دن کے اجالے میں نہیں ہوا تھا، وہ رات کی تاریکی میں کیسے ہوتا؟ چنانچہ پولیس اب تلاش ختم کر کے واپس جانے کے موڈ میں نظر آتی تھی۔

ایک اندیشہ میرے ذہن میں بھی کلبلا رہا تھا کہ کہیں یہ گھیراؤ بھی ایک سازش تو نہیں جس کا مقصد پولیس مقابلے میں بابر کو ہلاک کرنا ہو... ثابت کرنے والے اسے ایک خطرناک پاگل پہلے ہی ثابت کر چکے تھے... بنگالی کی گواہی نے یہ ثبوت بھی فراہم کر دیا تھا کہ بابر مسلح ہے اور اس سے یہ منطقی نتیجہ نکالا جاسکتا تھا کہ وہ کسی کو جان سے مارنے کے لیے ہی اسپتال سے فرار ہوا ہے... اس کے دشمنوں کی فہرست میں سب سے اوپر اکبر خان کا نام تھا اور اکبر خان کا سازشی ذہن یہ انتظام کر سکتا تھا کہ پولیس جیسے ہی بابر کو دیکھے، اسے گولی مار دے... اس پر جارحانہ انداز میں پولیس پر حملے کا الزام بعد میں عائد کیا جاسکتا تھا۔

میں نے دل ہی دل میں اس وقت کو کوسا جب میرے دل میں بابر کے لیے ہمدردی کے جذبات جاگے اور میں نے اس کی کہانی سن کے خود اس کی مدد کا فیصلہ کیا۔ سب سے اچھا ہوتا کہ جب وہ میرے فلیٹ میں سو رہا تھا تو میں اسپتال والوں کو یا پولیس کو فون کر دیتا اور وہ بابر کو واپس لے جاتے...

خیر، اب بھی صائمہ کی کار مل جاتی تو میں واپس جا سکتا تھا... ورنہ میرے لیے رات کو ٹھہرنے کا بھی مسئلہ ہوتا... نہ مجھے اکبر خان کی حویلی میں جگہ ملتی اور نہ روبی کے گھر میں... تو مجھے کسی ہوٹل سے رجوع کرنا پڑتا۔

حویلی کے اندر کم سے کم تین گاڑیاں اس وقت بھی موجود تھیں اور دو شوفر بھی بیکار کھڑے تھے لیکن ان میں سے کوئی میری مدد کے لیے آگے نہیں آیا۔ ایک کونے میں دیوار کے ساتھ وہی مفلوک الحال ٹیکسی ڈرائیور مجھے واپس لے جانے کے انتظار میں اکیلا بیٹھا تھا۔ اس نے میرے پوچھنے پر بڑے دکھ سے بتایا کہ کسی نے چائے تو کیا اسے ایک گلاس پانی تک کو نہیں پوچھا۔ پانی بھی اس نے نلکے سے منہ لگا کے پیا۔ "بڑے گھر والوں کے دل چھوٹے ہوتے ہیں جناب!"

میں نے اس سے اتفاق بھی کیا اور معذرت بھی کی۔ تمام دن وہ میرے ساتھ اس امید میں رہا تھا کہ اسے اچھی کمائی ہوگی۔ اب میں نے اسے پرس میں سے ایک ہزار روپے نکال کے دیے تو اس کا چہرہ روشن ہوگیا۔ "شاید آج میں واپس نہ جاسکوں... مجھے تھانے میں ڈراپ کر کے تم چھٹی کرو۔"

تھانہ صرف حوالات میں بند چند قیدیوں سے آباد تھا۔ ڈیوٹی افسر کے کمرے میں محرر کسی قیدی کے معاملات طے کر رہا تھا۔ سودا کرنے والوں نے بھی میری دخل اندازی کو پسند نہیں کیا۔ "تھانہ انچارج صاحب کیا ہر وقت موجود رہتے ہیں ادھر... اور کوئی کام نہیں ہے ان کو۔"

"وہ نکلے ہوں گے گشت پر... تم یہی کہو گے کہ... بڑی واردات ہوگئی ہے علاقے میں... وہ تفتیش کے لیے گئے ہیں۔" میں کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا۔

محرر میری جسارت پر دم بخود رہ گیا۔ "اوئے... کون ہو تم؟"

میں نے کہا۔ "خدائی فوجدار... میں ابھی وہیں سے آرہا ہوں جہاں تمہارے تھانے کی ساری نفری جھک مار رہی ہے۔ مجھے انچارج صاحب نہیں ملے... خدانخواستہ انہیں اس خطرناک پاگل نے تو نہیں پکڑ لیا... بلال خان کے بیٹے نے؟"

محرر کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ "جناب نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔"

میں نے اپنا کارڈ اس کے سامنے رکھ دیا۔ "میں ایک چینل کے لیے بھی رپورٹنگ کرنے آیا تھا... لیکن یہاں کسی نے میری گاڑی چھین لی۔"

محرر نے ان دونوں کو رخصت ہونے کا اشارہ کیا جو کسی

منافع بخش کیس میں معاملات طے کرنے کے قریب تھے۔ وہ مجھ پر ایک قہر آلود نگاہ ڈال کے اٹھے اور باہر کھڑے ہو گئے... میرے لیے چائے طلب کرنے کے بعد اس نے روزنامچہ نکالا... "تو جناب رپورٹ میں کیا لکھنا ہے؟ گاڑی کون سی تھی... کس نے چھینی اور کہاں...؟"

میں نے کہا۔ "مجھے امید ہے گاڑی ایسے ہی مل جائے گی... گرے کلر کی مہران کار ہے... نمبر زیرو ون ٹو تھری۔"

محرر کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو گئیں۔ "کیا نمبر بولا جناب نے... مہران... گرے یعنی سلیٹی..."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی صائمہ کی گاڑی گیٹ سے اندر آئی اور تھانے کے احاطے میں رک گئی۔ اسے ڈرائیو کر کے لانے والا عمر رسیدہ اور بیمار صورت انسپکٹر دروازے کو دھڑ سے مار کے اترا اور اپنے کمرے میں گھس گیا۔ غصے اور صدمے سے میرا برا حال ہو گیا۔ مالِ مفت دلِ بے رحم... چند گھنٹوں میں اس نے اپنے اناڑی پن سے اس گاڑی کا ستیاناس کر دیا تھا جس پر خراش تک نہ تھی۔ اس کی سامنے والی ایک لائٹ ٹوٹ چکی تھی اور بمپر بھی ٹیڑھا ہو کے لٹک رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ محرر اپنے افسرِ اعلیٰ کو میرے بارے میں کچھ بتاتا، میں خود انچارج صاحب کے کمرے میں پہنچ گیا۔ "تھانے دار صاحب! یہ آپ کی گاڑی ہے جس میں ابھی جناب کی سواری آئی ہے؟"

وہ میرے لہجے سے چراغ پا ہو گیا۔ "اور کیا تمہارے باپ کی گاڑی ہے؟"

میں نے کہا۔ "میرے باپ کے پاس تو گدھا گاڑی بھی نہیں تھی۔ یہ میری گاڑی ہے جسے تم اپنے باپ کی گاڑی سمجھ کے لیے پھر رہے تھے۔"

"اوئے! ہوش میں رہ کر بات کر۔"

"تم ہوش میں تھے؟ کیا حال کر دیا ہے تم نے گاڑی کا... یہ ڈاکٹر صائمہ کی گاڑی ہے اور وہ... بیوی ہے میری..." میں نے اپنا کارڈ اس کے سامنے رکھ دیا۔

تھانے دار کے غبارے کی ساری ہوا نکل گئی۔ "آپ بھی کمال کرتے ہو جی... بندے کو تعارف پہلے کرانا چاہیے... یہ گاڑی تو ادھر لاوارث کھڑی تھی... اپنے اکبر خان کے فروٹ فارم کے پاس... میں ادھر سے سیدھا یہاں آیا ہوں۔"

"میں بھی وہیں سے سیدھا یہاں آیا ہوں... میں نے آپ کو وہاں نہیں دیکھا... آپ کیا گاڑی میں بیوی بچوں کے ساتھ پکنک منا رہے تھے؟"

اس نے بالکل برا نہیں مانا۔ "او جی! پکنک خاک منائی ہے ہم نے... اس پاگل نے وخت ڈال دیا ہے... ابھی تک تو ملا نہیں۔ وہ پاگل خانے سے اسی گاڑی میں فرار ہو کے یہاں آیا ہے۔"

"یہ آپ سے کس نے کہا؟ اسے تو میں لے کر آیا تھا... کل رات وہ میرے ساتھ تھا۔ مجھے تو اس میں خطرناک پاگلوں والی کوئی بات نہیں لگی۔"

تھانے دار نے میری ساری بات یوں سنی جیسے یہ کوئی میرے اپنے ذہن کی ایجاد کردہ کہانی ہے۔ "آپ سب سے مل چکے ہو... لیکن کسی نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ آج وہ جس بھائی کی جان کا دشمن ہو رہا ہے، وہی اس کا علاج بھی کرا رہا تھا... اس نے بابر کو جیل جانے سے بچا لیا تھا... یہ اندر کی بات ہے جناب... بلال خان کوئی عام آدمی نہیں تھا... عزت دار سیاسی شخصیت تھا... اگر اکبر خان اپنے ہی بھائی کے خلاف رپورٹ لکھواتا کہ اس نے باپ کو قتل کیا ہے..."

"بلال خان کی موت ہارٹ فیل کا نتیجہ تھی۔"

"ہاں... سرکاری طور پر... اکبر خان نے خاندان کی عزت پر حرف نہیں آنے دیا... پوسٹ مارٹم ہوتا تو معلوم ہو جاتا کہ اس کے اپنے بیٹے نے اسے ڈبو کے مارا تھا... ہاں جی... وہ ساری اسٹوری آپ جیسے اخبار والوں کے لیے تھی کہ بلال خان پر باتھ روم میں دل کا دورہ پڑا... اور دروازہ اندر سے بند تھا اس لیے بہت دیر بعد ایک ملازم روشن دان کے راستے اندر اترا اور اس نے بلال خان کو دیکھا تو وہ مر چکا تھا... حقیقت یہ تھی کہ بابر نے اس بڈھے بیمار آدمی کا سر کئی بار ٹب کے کنارے پر مارا اور جب وہ بے ہوش ہو گیا تو اسے پانی میں دبا کے رکھا... پوسٹ مارٹم رپورٹ میں تو سر کے سب زخم لکھے جاتے... چوٹ کا ذکر ہوتا... اکبر خان نے معاملہ دبا دیا تھا... وہ بابر کو پھانسی کے تختے تک لے جانا چاہتا تو لے جا سکتا تھا... لیکن اس نے چھوٹے بھائی کا خیال کیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ بے وقوف ہے... پاگل ہے... آج وہ اسی بھائی کی جان لینا چاہتا ہے... پھر آپ کے ساتھ اس نے جو کیا... اس کے بعد بھی آپ کو کسی کا یقین نہیں... بس وہ بچا ہے اور اس کی وہ فاحشہ بیوی... بابر کو تباہ کرنے والی وہی ہے... بڑے خواب دیکھے تھے اس نے کہ ایک خاندانی رئیس زادہ پھنس گیا تو زندگی عیش سے گزرے گی... کبھی اس کے بارے میں بھی معلوم کرنا... نرس سے زیادہ وہ کیا تھی... ہمیشہ نائٹ ڈیوٹی کیوں لیتی تھی... اس کے یار بیمار بن کے اسپتال میں داخل ہو جاتے تھے... پرائیویٹ روم میں... بابر کو اس نے

ڈاکٹر نہیں بننے دیا... میں اس کی زبان سے سچ اگلوا سکتا ہوں آج بھی آپ کے سامنے... اس نے بابر کو باپ کے قتل پر اکسایا ہوگا تاکہ آدھی نہیں پوری جائداد مل جائے۔"

جب میں وہاں سے اٹھا تو میرا دماغ گھوم رہا تھا... ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ... مرزا غالب میرے کان میں بار بار کہہ رہے تھے اور میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ بکواس تھانے دار کر رہا تھا یا بابر خان... اس کی معصوم نظر آنے والی بیوی مظلوم تھی یا سارے فساد کا سبب... ابھی تک تو میری ملاقات اکبر خان سے بھی نہیں ہوئی تھی... مجھے خیال آیا کہ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے ابھی اپنی گاڑی میں واپس لوٹ جاؤں لیکن نہ جانے کیوں ایک اندر کی آواز تھی جو مجھے روک رہی تھی... ایک رات اور سہی... میرے دل میں ایک خلش سی تھی کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے... ادھر کے سچ اور ادھر کے سچ میں کوئی فرق ہے... اگر بابر مارا نہ گیا تو پکڑا جائے گا... اکبر خان کا سچ بھی سامنے آ جائے گا تو تصویر واضح ہو جائے گی۔

سب سے پہلے ضروری تھا کہ میں پولیس کے ہاتھوں زیادتی کا شکار ہونے والی نازک اندام اور خوب صورت گاڑی کا علاج کراؤں ورنہ صائمہ کو ہارٹ اٹیک ہو جائے گا کہ اس نے اپنی جان سے پیاری چاند سی بنو جیسی گاڑی تمہارے حوالے کی تھی، چند [illegible] اس کا یہ حال کر دیا تو میرا کیا کرو گے... تمام خواتین کی طرح صائمہ ایسی صورتِ حال میں کیا مکالمے بولے گی... اس کا مجھے خوب اندازہ بلکہ تجربہ تھا۔

ایک ٹوٹے پھوٹے پرانے ماڈل کے مکینک نے جسے خود بھی مرمت اور ڈینٹ پینٹ کی سخت ضرورت تھی، آدھے گھنٹے میں گاڑی کی لائٹ بدل دی اور بمپر سیٹ کر کے اسے اصل جیسی حالت میں کر دیا تو میں اس کی مہارت کا قائل ہو گیا... اب صائمہ اپنی پوسٹ مارٹم والی نظر سے دیکھتی، تب بھی شک نہیں کر سکتی تھی کہ ایک تھانے دار نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا۔

اب شام ہو چلی تھی۔ میرے دل میں واپس جانے یا نہ جانے کی کشمکش ہنوز جاری تھی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ بابر بلال کا کیا بنا... اس کے پکڑے جانے کی بہ نسبت مارے جانے کے امکانات بہرحال بہت زیادہ تھے۔ سامنے سے گزرتے ہوئے میری نظر امدادِ نفسیاتی اسپتال پر گئی تو میرا پاؤں بریک پر جم گیا۔ غلطی میری ہی تھی۔ میرے بالکل پیچھے آنے والی گدھا گاڑی کا انجن یعنی گدھا کار کے عقبی حصے میں گھس گیا۔ جب میں نے پلٹ کے دیکھا تو گدھے کا سر شیشے سے اندر آنے کے بعد مجھ سے صرف ایک فٹ کے فاصلے پر تھا اور ہم دونوں ایک دوسرے کو غصے سے دیکھ رہے تھے۔

گدھا گاڑی والے کی تقریر کا اس جلسہ عام کے شرکا پر زیادہ اثر ہوا جو اس پرلطف تماشے کا مزہ لینے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ ایک تو یہ جناور... دوسرے گدھا... بغیر بریک والا... اس لمبوترے پیچھے کیوں نہیں دیکھا... میری کسی نے نہیں سنی کہ میری دونوں آنکھیں پیدائشی طور پر آگے فٹ ہیں... مجھے گدھے کے علاج کے لیے پانچ سو دینے ہی پڑے... پیچھے ایک نیا شیشہ لگوانے کا نیا مسئلہ بھی مجھے ہی حل کرنا تھا۔

ڈپریشن کے اس موڈ میں جب صائمہ کا غضب ناک چہرہ میرے تصور میں تھا تو میں نے ڈاکٹر شیریں کا مسکراتا ہوا دلدار چہرہ اپنے سامنے دیکھا۔ "آپ گاڑی ادھر کھڑی کر دیں... اور اندر آ جائیں..." اس نے کہا تو میں نے تعمیل کی۔

"میں آپ ہی سے ملنے آیا تھا۔" میں نے کہا۔

"میں نے اندر کھڑکی سے دیکھا... سوچا آپ کو گدھوں کے نرغے سے نکال لاؤں... گاڑی کی فکر نہ کریں... دوسرا شیشہ لگ جائے گا... زیادہ مہنگا نہیں ہوتا، میں اسپتال کے ڈرائیور کو بھیج دوں گی۔" وہ بولتے ہوئے میرے ساتھ چلتی رہی۔

آدھے گھنٹے بعد میری یعنی صائمہ کی گاڑی پھر بحالی کے لیے ارسال کر دی گئی تھی۔ میری جیب سے مزید دو ہزار نکل چکے تھے اور مجموعی نقصان کا ٹوٹل تین ہزار کی حد کو چھو رہا تھا۔ غصے، خوف، پریشانی اور پشیمانی جیسے منفی جذبات کے باعث میرا نصف خون الگ جل چکا تھا اور یہ سب پنگا لینے کی پرانی بیماری کا نتیجہ تھا۔

ڈاکٹر شیریں نے کافی بنا کے میرے سامنے رکھی اور پھر خود بھی میرے سامنے بیٹھ گئی۔ "میں بس جانے ہی والی تھی... رات کو میری جگہ لینے والی ایک پرانی نرس ہے... وہ ابھی تک آئی نہیں۔"

میں نے کہا۔ "آپ کا مفرور مریض ہاتھ آیا کہ نہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "بڑی حیرانی کی بات ہے... وہ محاورے کے مطابق ایسے غائب ہو گیا ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ... وہ مارا جائے گا۔"

"اچھا ہے... وہ نہ مارا گیا تو اس کے ہاتھوں کوئی مارا جائے گا... جس نے اپنے باپ کو نہ بخشا ہو... وہ بھائی کو چھوڑے گا؟"

شیریں نے حیران نظروں سے مجھے دیکھا۔ "یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ بابر نے باپ کو مارا تھا... اس کی طبعی

www.pkdigest.com

موت ہارٹ فیل ہونے سے ہوئی تھی۔“

”ابھی ابھی تھانے دار نے جو کچھ مجھے بتایا ہے، وہ اندر کی بات ہے... جو آپ کے علم میں بھی نہیں ہوگی۔“

شیریں نے تھانے دار کے انکشافات کو مسترد کر دیا۔ ”بکواس کرتا ہے وہ... آپ ڈاکٹر زیدی سے پوچھیں جو ان کا فیملی ڈاکٹر ہے۔ بلال خان کا معالج وہی تھا... دل کا روگ نیا نہیں تھا... برسوں سے تھا اور بڑھتا جا رہا تھا کیونکہ بلال خان دوا ضرور کھاتا تھا لیکن اس کے ساتھ زہر بھی کھاتا تھا... میرا مطلب ہے نمک... اور دیسی گھی... تکے کباب... جب اس پر آخری دل کا دورہ پڑا تو زیدی ہی وہاں تھا... بابر تو تھا ہی نہیں... یہ ٹھیک ہے کہ باپ سے اس کا زبردست جھگڑا ہوا تھا اور دونوں نے لحاظ کیے بغیر ایک دوسرے پر بہت چیخ پکار کی تھی... لیکن اس کے بعد بابر غصے میں گھر سے واک آؤٹ کر گیا تھا... یہ کہہ کر کہ اب جو اس گھر میں قدم رکھے اس پر لعنت۔“

میں پھر الجھن میں پڑ گیا۔ ”اس رات وہ کہاں تھا؟“

”تم نے مریم کو دیکھا ہے؟ اس کی ایک گورنس ہے... سات سال پہلے اسے خود رانی نے رکھا تھا جب مریم ایک سال کی بھی نہیں تھی... وہ یہاں کام کرتی تھی... اکیلی عورت تھی... شوہر نے چھوڑ دیا تھا کیونکہ اولاد نہیں تھی... غنیمت ہے کہ ماں باپ اس کے رہنے کا ٹھکانا چھوڑ گئے تھے... یہاں وہ رات کے وقت آتی تھی پھر دن میں بھی رہنے لگی کیونکہ ڈاکٹر امداد صاحب کے پاس کام کرنے والی ڈاکٹر کام چھوڑ کے چلی گئی تھی... موقع ملا تو میں بھی چلی جاؤں گی۔“

”ڈاکٹر صاحب کے پیسے بچے۔“

”نہیں... ڈاکٹر امداد نے شاہدہ کو... یہ اس گورنس کا نام ہے... اسے اتنی ہی تنخواہ کی آفر دی جو ڈاکٹر لیتی تھی... شاہدہ کو کیا فرق پڑتا تھا، یہاں رہے یا اپنے گھر میں... لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ شاہدہ پیدائشی نرس ہے... میرا مطلب ہے اس میں وہ تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں جو ایک آئیڈیل نرس کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں... وہ مریضوں کی اچھی دیکھ بھال کرتی تھی... گھبراتی یا جھنجلاتی نہیں تھی اور مریض اس سے اسی طرح خوش رہتے تھے جیسے بگڑے ہوئے بچے ایک شفیق ماں سے... ڈاکٹر زیدی نے اس کی سفارش کی تو رانی نے اسے دگنی تنخواہ پر بلا لیا... شاہدہ کو وہاں زیادہ آرام بھی ملا... پیسا بھی اور عزت بھی... پھر اس کے وجود میں پوشیدہ ممتا کے جذبے کی تسکین کا ساماں بھی ہو گیا... اس نے مریم کو اپنی بچی کی طرح پالا۔“

”یہ میں نے دیکھا تھا... نہ وہ ماں کو پسند کرتی ہے اور نہ باپ کو... رانی نے اسے میرے سامنے مارا۔“

”وہ چاہتی کب تھی کہ مریم پیدا ہو... اس کے جسم کی خوب صورتی جو متاثر ہوتی... جس رات بلال خان کا انتقال ہوا... بابر خود بھی شاہدہ کے گھر میں تھا... شاہدہ سب جانتی تھی، اس نے بابر کو سکون آور گولیاں کھلا کے سلا دیا تھا۔ اس نے یہ بات فون پر خان کو بھی بتا دی تھی کہ بابر کے لیے پریشان نہ ہو... شاہدہ کی حیثیت اس گھر کے ایک فرد جیسی ہے، خود خان اس کی عزت کرتا تھا اور بابر کی ماں کے زمانے میں تو گھر کے وہ معاملات بھی شاہدہ کے ہاتھ میں تھے... جو اب رانی سنبھالتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تم اس گھر کے معاملات کی اتنی معلومات کیسے رکھتی ہو؟“

وہ کچھ دیر میرے پیچھے دیوار کو دیکھتی رہی۔ ”اس کی ایک وجہ ہے... آج میں جو کچھ بھی ہوں... شاہدہ کی وجہ سے ہوں... اسی نے مجھے پالا پوسا اور دیکھ لو، ڈاکٹر بنا دیا... وہ میری اصل ماں نہیں ہے... مجھے تو معلوم ہی نہیں کہ اصل ماں کون تھی... تم نے بنگالی کو بھی دیکھا ہوگا... وہ عبدالصبور خان تھا... اس کی اور میری کہانی میں یہی فرق ہے... اسے شاہدہ جیسی کوئی ماں نہ ملی... میرے والدین کسی ایکسیڈنٹ میں مارے گئے تھے... وہاں سے نیپال کے راستے فرار ہونے والی کوئی فیملی مجھے اپنے ساتھ لے آئی... ان کے ساتھ ٹریجڈی یہ ہوئی کہ بیوی بچھڑ گئی... بیٹی اغوا ہو گئی... اکیلا آدمی مجھے کیسے پالتا... وہ مجھے شاہدہ کے سپرد کر کے نہ جانے کہاں گیا... چار سال تک شاہدہ کی سارہ کے ساتھ بڑی اچھی دوستی رہی... میرا بھی آنا جانا رہا... سارہ مجھے بہت پسند کرتی تھی اور وہ خودکشی نہ کرتی تو رانی کی نہیں، میری شادی اکبر خان سے ہوتی۔“

میں کچھ دیر بے یقینی میں مبتلا رہا۔ ”خودکشی... بابر کی ماں نے خودکشی کی تھی؟“

”ہاں، اب تو تین سال ہو گئے... وہ بڑی اچھی عورت تھی لیکن پہلے شوہر نے اور پھر بیٹوں نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا... اس سے سارہ کا دل ٹوٹ گیا... اس کے دل میں زندہ رہنے کی خواہش ہی نہ رہی... ایک رات وہ خاموشی سے نکلی اور دریا میں اتر گئی... صبح اس کی لاش ملی۔“

”آخر ایسی کیا بات ہوئی تھی... میرا مطلب ہے کہ خودکشی کی فوری وجہ بھی تو کوئی ہوگی؟“

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”میں نے کہا نا... سب

سے پہلے تو خود اس کے شوہر نامدار... شوقین مزاج اور مزاج کے وڈیرے... ایسے لوگوں کے شوق کیا ہوتے ہیں... تم بھی جانتے ہو گے... گھر کی عورتیں خواہ عادی ہوں... لیکن خود کو مرد کے غلط رویے کا عادی بنانا بھی تو بے بسی ہوتی ہے... اور اچھی مشرقی عورت کی طرح بیوی بن کر رہنے کی مجبوری آہستہ آہستہ اعصاب پر اثر انداز ہوتی ہے... اس کے بعد کچھ امید ہوتی ہے بیٹوں سے کہ وہ بڑے ہوں گے تو اسے اہمیت دیں گے... سب سے پہلے اپنی مرضی سے شادی کرنے والا تھا اکبر خان۔“

”گویا بابر بلال نے پہلی غلطی نہیں کی تھی... وہ بڑے بھائی کے نقش قدم پر گیا تھا؟“

وہ ہنسی۔ ”فرق صرف معیار کا تھا... رانی ایک کامیاب ماڈل تھی... اس کی ڈیمانڈ تھی... چاہنے والے بہت تھے۔“

میں مزید حیران ہوا۔ ”یعنی وہ کوئی خاندانی لڑکی نہیں تھی؟“

”جس قسم کی لڑکی کو بلال خان کی فیملی اپنے معیار پر خاندانی سمجھتی ہے، وہ بہرحال نہیں تھی۔“

”پھر انہوں نے رانی کو قبول کیسے کر لیا؟“

شیریں ہنسی۔ ”پہلے رانی نے خود کو قبول کرا لیا، بلال کی نظر میں... پھر بلال نے اپنی بہو کو قبول کر لیا... ماں باپ بڑے مجبور ہوتے ہیں... اولاد بڑی آسانی سے انہیں بلیک میل کر سکتی ہے... خود نہیں ہوتی... اکبر بلال رئیس باپ کا بیٹا تھا... شوقین کھلاڑی اور ماہر شکاری بھی... بالآخر خود بھی پھنس گیا رانی کے جال میں... آج تک اس جال سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے لیکن ناکام ہے... اونچی شان والے بلال خان نے بھی ناک اونچی رکھنے کے لیے ایک کہانی بنائی اور اپنی بہو کو ایک بڑے خاندان کا نسب دے دیا جو امریکا میں مقیم ہیں... میں ڈاکٹر ہونے کے باوجود خاندانی نہیں ہوں... روبی کا تو ذکر ہی کیا۔“

”ان کی ماں کی خودکشی کی یہ وجہ تھی؟“

”یہ دوسری وجہ تھی... پہلی تھی شوہر کا رویہ... وہ زیادہ تعلیم یافتہ تو نہیں تھی لیکن اسے پڑھنے کا شوق تھا... میری ماں بتاتی ہے... شاہدہ کو میں ماں ہی کہتی ہوں... کہ اس کی لائبریری میں ہزاروں کتابیں ہیں... وہ لکھتی بھی تھی لیکن اپنے نام سے شائع کچھ نہیں کرا سکتی تھی... عشق محبت کے جھوٹے قصے... ناول، افسانے... سارہ بلال کے نام سے شائع ہوں... ناممکن... اس کے بعد بڑا بیٹا باپ کے نقش قدم پر چل نکلا... سارہ کی اور رانی کی ایک دن نہیں بنی... بنتی بھی کیسے...

ساری دولت سارہ کے حصے میں آئی جسے نہ شوہر کی حمایت حاصل تھی اور نہ بیٹے کی... تابوت میں آخری کیل ٹھونکی چھوٹے لاڈلے بیٹے نے... نہ اس نے ماں کی خواہش کے مطابق پڑھا، نہ اس کی محبت کے بدلے اسے محبت دی... اس بیٹے کی حمایت کے جرم میں ماں نے بڑا عذاب سہا... شوہر کی طرف سے الگ اور بڑے بیٹے کی طرف سے الگ... آخر میں اسے کیا ملا... نہ بیٹا ڈاکٹر بنا جس پر وہ غرور کر سکتی... نہ اس نے شادی کے معاملے میں ماں کو پوچھا... وہ ناقص العقل... احمق اور بالآخر پاگل کہلایا... سارہ کی شکست مکمل ہو گئی۔“

میں نے پوچھا۔ ”تم یقین سے کہہ سکتی ہو... کہ اس نے خودکشی کی تھی؟“

”ہاں... پوسٹ مارٹم رپورٹ میں یہی لکھا گیا تھا... بلاشبہ رات بھر لاش پانی میں تیرتی رہی اور اِدھر اُدھر کے پتھروں سے ٹکرائی... اس کے سر اور جسم کے کچھ حصوں پر چوٹوں کے نشانات بھی تھے۔“

”خودکشی بعض اوقات قتل کا باعزت نام ہوتا ہے۔“

”نہیں... کسی کو مار کے پانی میں پھینکنا اور ڈوب کے مرنا... دونوں میں فرق ہوتا ہے... اس کے پھیپھڑوں اور سانس کی نالی میں ریت تھی۔“

ایک ڈاڑھی والے وردی پوش نے اندر آ کے اعلان کیا۔ ”ڈاکٹر صاحب! گاڑی آ گئی ہے۔“

شیریں ایک دم کھڑی ہو گئی۔ ”لیجیے... آپ کی گاڑی کا شیشہ لگ گیا... اب میں چلتی ہوں... مجھے پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے... عام طور پر اس وقت تک میں گھر پہنچ جاتی ہوں۔“

”آپ انہی کے ساتھ رہتی ہیں نا... شاہدہ کے ساتھ؟“

وہ ہنسی۔ ”جی نہیں... میرا اپنا گھر ہے... شادی کے بعد ہر لڑکی کا گھر اس کے شوہر کا گھر ہوتا ہے۔“

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”گویا آپ بھی دستیاب نہیں... میں تو آپ کو اپنے ساتھ کھانے پر لے جانے کا موڈ بنا چکا تھا۔“

”کھانا آپ ہمارے ساتھ کھا سکتے ہیں... میری ساس بہت اچھی ہیں... کھانا اچھا بناتی ہیں... میرے شوہر بھی آپ سے مل کے بہت خوش ہوں گے۔“

”کیا وہ بھی ڈاکٹر ہیں؟“ میں ان کے ساتھ باہر تک آیا۔

”نہیں، وہ بزنس مین ہیں۔“ شیریں نے کہا اور پھر اچانک چیخ ماری۔ ”یہ ہے آپ کی گاڑی... زیرو دن نو تھری...“

www.pkdigest.com

”آپ کو کوئی شک ہے؟“

”یہ تو صائمہ کی گاڑی ہے... ڈاکٹر صائمہ کی...“

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ”آپ جانتی ہیں اسے؟“

”ہاں، وہ میری کلاس فیلو تھی... سال بھر پہلے ملی تھی... اس گاڑی کا نمبر ایسا تھا کہ مجھے یاد رہ گیا۔“

”یہ نمبر میں نے لکھوا کے دیا تھا۔“

”اچھا... شادی کر لی اس نے بھی... اور آپ نے بتایا بھی نہیں... کسی روز اسے بھی ساتھ لائیے نا...“ وہ ایک لمبی چوڑی سفید گاڑی میں بیٹھ گئی جو اس کے شوہر نے اسے لانے کے لیے بھیجی تھی اور اسے سفید وردی والا ایک باموچھ شوفر چلا رہا تھا۔

گاڑی جانے سے پہلے میں نے ڈاکٹر شیریں سے شاہدہ کے گھر کا پتا لے لیا۔ ”ڈاکٹر صاحبہ... آپ سے ایک مؤدبانہ گزارش ہے... اگر کبھی صائمہ سے ملاقات ہو تو خدا کے لیے اسے یہ سب مت بتایئے گا... جو میں نے اس کی گاڑی کے ساتھ کیا... وہ تو قتل کر دے گی مجھے۔“

وہ ہنسی۔ ”آپ بھی اتنا ڈرتے ہیں اپنی بیوی سے؟“

گاڑی کے روانہ ہونے کے بعد میں نے ”بھی“ پر غور کیا۔ غالباً تمام شریف شوہروں پر لازم ہے کہ وہ اپنی بیویوں سے ڈریں... ازدواجی زندگی میں کامیابی کا فارمولا نمبر ون... یا کم سے کم اپنا ظاہر ضرور کریں... ورنہ وہی ہوتا ہے جو سارہ کے ساتھ ہوا... تمام عمر خوش و خرم رہنے کی اداکاری کے بعد بیویاں ڈوب کے مر جاتی ہیں... شرم سے... صدمے سے جو تمام عمر کے رائگاں جانے سے ہوتا ہے... یا... دماغ کی خرابی سے... بس... خودکشی کرنے والے نارمل لوگ نہیں ہوتے... وہ ذہنی مریض ہوتے ہیں... نفسیاتی بیماری کا شکار ہوتے ہیں... کیا یہ ایک موروثی مسئلہ تھا کہ ماں کے بعد بیٹا ڈپریشن میں مبتلا ہوا؟

رات کے وقت مجھے روبی کے گھر پہنچنے میں کچھ دشواری ہوئی۔ بالآخر میں نے گاڑی کو اس گھر کے سامنے روک لیا جو اندھیرے میں اور بھی آسیب زدہ نظر آ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اندر ایک سے زیادہ افراد گفتگو میں مصروف ہوں۔ دو عورتوں کے ساتھ میں نے کسی مرد کی آواز بھی سنی۔ میرے دستک دیتے ہی خاموشی چھا گئی۔

روبی نے تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ ”آپ... کہیے...“

مجھے اس کی رکھائی نے حیران کیا۔ ”کیا گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں؟“

”مہمان... نہیں... اماں سو رہی ہیں۔“

”میں نے باتوں کی آواز سنی تھی۔“

”وہ... میں ٹی وی دیکھ رہی تھی۔“ وہ اسی طرح دروازے میں کھڑی رہی۔

”کیا تمہارے شوہر کا کچھ پتا چلا؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں... پتا نہیں وہ کہاں غائب ہو گیا ہے... مجھے سخت تشویش ہے۔“

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ”روبی! کیا تم مجھے اندر آنے کو نہیں کہو گی... کچھ بات کرنی تھی۔“

”آئی ایم سوری... اس وقت میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں سونے جا رہی تھی... آپ صبح آ جایئے۔“

ظاہر ہے اس دوٹوک جواب کے بعد میرے پاس اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں واپس اپنی کار میں جا بیٹھوں۔ روبی کے رویے نے میرے دل میں بے عزتی اور جھنجلاہٹ کا احساس پیدا کیا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ رکھائی سے کام لے کر مجھے ٹالنا چاہتی تھی۔ وہ تشویش کی بات کر رہی تھی جبکہ مجھے وہ ذرا بھی متفکر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

شیریں کے دیے ہوئے پتے سے شاہدہ کا گھر تلاش کرنا میرے لیے مزید دشوار کام ثابت ہوا۔ اس کا گھر روبی کے گھر سے نسبتاً بہت بہتر تھا۔ دس مرلے پر بنا ہوا یہ گھر متوسط طبقے کی آبادی میں تھا اور کشادگی کے باعث پر واقع ہونے سے زیادہ بڑا بھی لگ رہا تھا۔

کال بیل پر شاہدہ خود ہی دروازہ کھولنے آئی۔ اس کے پیچھے رانی کی بیٹی مریم کو دیکھ کر مجھے کوئی حیرانی نہیں ہوئی۔ رانی نے میرے سامنے ہی شاہدہ سے کہا تھا کہ اسے اپنے گھر لے جاؤ... یوں لگتا تھا جیسے وہ مریم کو اپنے گھر میں محفوظ نہیں سمجھتی اور اسے خطرہ ہے کہ بڑے بھائی کے خون کا پیاسا بابر بلال اپنی بھتیجی کو بھی ہلاک نہ کر دے یا اغوا کر کے نہ لے جائے... ایک خطرناک پاگل کا کیا بھروسا...!

شاہدہ نے مجھے ویلکم کہا۔ ”شیریں نے مجھے بتا دیا تھا کہ آپ مجھ سے ملنے آؤ گے۔“

مریم نے پیچھے سے سر نکال کے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ”ہیلو انکل لیو...!“

شاہدہ نے اسے ڈانٹا۔ ”مریم! ایسے نہیں کہتے... صرف انکل کہو۔“

”مما نے کہا تھا کہ انکل لیو ڈرپوک بھی ہیں... کیا آپ کاکروچ سے ڈرتے ہیں انکل... میں نہیں ڈرتی... میں اسے ٹانگ سے پکڑ کے الٹا کر دیتی ہوں... پھر وہ سائیکل چلاتا رہتا ہے۔“

”آپ تو بہت بہادر ہو۔“ میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔

شاہدہ نے اسے پھر ڈانٹا۔ ”تم جاؤ... کارٹون دیکھو... مجھے انکل سے بات کرنے دو۔“

وہ مجھے ایک نفاست سے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ اس کی اپنی آمدنی معقول تھی۔ اوپر والا حصہ اس نے کرائے پر دے رکھا تھا اور یقیناً شیریں بھی اس کے لیے کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہو گی۔ شیریں کی کار سے اندازہ ہوتا تھا کہ نوکری وہ محض وقت گزاری کے لیے کرتی ہے۔

”میں کھانا بنا رہی تھی۔ پندرہ بیس منٹ انتظار کرنا پڑے گا آپ کو... آپ کے لیے بھی کری رکھ دیتی ہوں۔“

میں نے کچن میں بیٹھنے کو ترجیح دی۔ میں نے سارا دن کچھ بھی نہیں کھایا تھا اور بھوک سے میرا برا حال تھا۔ تکلف سے کام لینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ دوران گفتگو شاہدہ نے بڑی سادگی اور اپنائیت سے یہ بھی کہہ دیا کہ مجھے کسی ہوٹل میں جانے کی کیا ضرورت ہے... شیریں والے بیڈروم میں اب کوئی نہیں ہے۔ اس کی باتوں سے اور رویے سے اجنبیت کا احساس بالکل ختم ہو گیا تھا اور میں اتنا ایزی محسوس کرنے لگا تھا جیسے میں اپنے گھر میں ہوں۔ شاہدہ کی فطرت اور مزاج کی یہی خوبی تھی جس سے وہ اداو نفسیاتی کلینک کے مریضوں کو کنٹرول کر لیتی تھی جس نے اس نے بابر کی ماں کا دل جیت لیا تھا... اس گھر کا اعتماد حاصل کر لیا تھا... اچھا یہ تھی کہ وہ رانی کی بھی ضرورت بن گئی تھی۔

ہم کھانے کے دوران بھی باتیں کرتے رہے۔ کھانا کھاتے ہی مریم کو نیند آنے لگی اور وہ کارٹون دیکھتے دیکھتے سو گئی۔ میں نے شاہدہ کو وہ سب بتایا جو مجھے معلوم ہوا تھا یا میرا اندازہ تھا۔ صاف نظر آتا تھا کہ سارہ کی موت کا اسے صدمہ تھا۔ جب میں نے اپنے شکوک کا اظہار کیا تو وہ برداشت نہ کر سکی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”دیکھو بیٹا! آج تک میں نے اپنے لب نہیں کھولے... اس لیے نہیں کہ میں ڈرتی تھی... بلال خان اور اس کے بیٹوں کے مقابلے میں میری اوقات ہی کیا ہے، وہ بہت طاقتور لوگ ہیں... میرے جیسے نہ جانے کتنے ان کی جوتیاں اٹھاتے ہیں... وہ میرے جیسے لوگوں کو حشرات الارض کی طرح اپنے جوتوں سے مسل ڈالیں... میری خاموشی کی اصل وجہ کچھ اور تھی... میں نے اس گھر کا نمک کھایا ہے... میں اس گھر کی عزت کا تماشا کیسے بنا سکتی تھی... سارے راز میرے سینے میں دفن ہیں... میں نے سب دیکھا اور سنا لیکن کسی کے سامنے کچھ نہیں کہا... مگر اب میری قوت برداشت جواب دے چکی ہے... ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے... تم مجھے اچھے آدمی لگتے ہو... اسی لیے تو بابر کی بات نے تمہارے دل پر اثر کیا اور تم نکل آئے اس کی مدد کرنے... کسی لالچ کے بغیر... ابھی شیریں بھی تمہاری تعریف کر رہی تھی... تم اس کی سہیلی کے شوہر ہو... وہ بتا رہی تھی کہ صائمہ کے بھی ماں باپ نہیں تھے۔“

میں نے کہا۔ ”جھوٹ میں بھی آپ سے نہیں بولوں گا... میری شادی صائمہ سے ہی ہو گی... لیکن ابھی ہوئی نہیں... وہ آج کل لندن میں ہے۔“

شاہدہ نے سر ہلایا۔ ”تم صحافی بھی ہو... مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا اگر تم سب چھاپ دو... میرے حوالے سے... اب کون ہے جس کا میں لحاظ کروں... سارہ بڑی نیک دل عورت تھی... وہ ہرگز بلال خان جیسے بندے کے لائق نہیں تھی... وہ بہت ذہین تھی اور بہت حساس... اگر بلال خان پابندی نہ لگاتا تو وہ ایک مشہور رائٹر ہوتی مگر وہ کہتا تھا کہ یہ عشق محبت کی جھوٹی کہانیاں وہ عورتیں لکھتی ہیں جو آوارہ ہوتی ہیں... پہلے تجربات کرتی ہیں... پھر بے شرمی سے زمانے کو بتاتی ہیں... باقی ڈھکوسلا ہوتا ہے تخلیقی اور تصوراتی ادب کا... تم کیا میری ناک کٹواؤ گی ایسے معاشقوں پر مبنی ناول لکھ کے۔“

”کوئی اتنا جاہل بھی ہو سکتا ہے؟“

”جاہل نہیں... وہ چالاک آدمی تھا... بیوی پر قدغن لگانے کے لیے اس نے یہ بہانہ تراشا تھا... سارہ صرف لکھتی رہی اور لکھ لکھ کے مسودے جمع کرتی گئی... یہ کام بھی وہ چھپ چھپ کے کرتی تھی... مرنے سے پہلے اس نے سارے مسودے میرے حوالے کر دیے تھے... اسے ڈر تھا کہ کسی روز بلال خان نے دیکھ لیا تو انہیں آگ لگا دے گا... دونوں بیٹے اسے دکھ دینے میں باپ سے کم نہیں تھے... بڑا بدزبان بھی تھا... چھوٹا ماں پر گیا تھا لیکن شروع سے اسے صرف نفرت ملی۔“

میں نے کہا۔ ”اس کی کوئی وجہ تو ہو گی؟“

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”وجہ... وجہ تھی شک... سارہ نے خود مجھے بتایا اور میں نے محسوس بھی کیا... دیکھا بھی اور سنا بھی... بلال خان اسے اپنی اولاد نہیں سمجھتا تھا... حالانکہ اس گھر میں یہ ناممکن تھا کہ سارہ اکیلی کہیں جا سکتی... یا گھر میں کوئی اس سے اکیلے میں مل سکتا... گھر میں بہت لوگ آتے تھے... خاندان کے... بلال خان کے دوست... جاننے والے... لیکن بلال خان کی موجودگی میں... شک کا زہر اس

www.pkdigest.com

کے دماغ میں تھا... وہ کہتا تھا کہ عورت کی ذات مکر و فریب کا مجسمہ ہے... وہ مرد کی آنکھوں میں دھول جھونک کے کچھ بھی کر سکتی ہے... سارہ یہ سب سہتی تھی، برداشت کرتی تھی... سکون آور گولیاں کھاتی تھی... پھر بھی جاگتی رہتی تھی... جب رانی گھر میں آئی تو سب الٹا ہو گیا... شرافت کے سارے معیار بدل گئے... بلال خان نے خود کو سیاسی امور کے لیے وقف کر رکھا تھا... مالی اور انتظامی امور میں اکبر خان کو مکمل اختیارات حاصل تھے... اس کے پاس جنرل پاور آف اٹارنی تھا... رانی نے اس کو پوری طرح بس میں کیا... اکبر خان پر عشق کی دیوانگی کا غلبہ تھا... اس کی مت ماری گئی تھی... رانی نے شادی سے پہلے قانونی تحفظ مانگا کیونکہ وہ بہرحال ایک کیریئر ویمن تھی... اس نے کہا کہ تمہارے لیے میں ایک کامیاب کیریئر اور اپنے روشن مستقبل کے ساتھ اپنی آزادی بھی قربان کر رہی ہوں... اس کے بدلے میں تم مجھے کیا دے رہے ہو... صرف محبت بھرے ڈائیلاگ کافی نہیں... نتیجہ یہ کہ اکبر نے اسے برابر کی حیثیت دے دی... صورتِ حال ایسی بن گئی کہ اکبر اسے چھوڑتا تو اپنی نصف جائداد اور اثاثوں سے محروم ہو جاتا... رانی چالاک عورت تھی... یہ جانتی تھی کہ بلال خان اور اکبر خان جیسے لوگ اس سے پیچھا چھڑانا چاہیں تو سب کچھ کر سکتے ہیں... وہ ایسے غائب ہو جائے گی جیسے کبھی تھی ہی نہیں... رانی نے اس کا بھی قانونی بندوبست کر رکھا تھا... باپ بیٹا بری طرح پھنس گئے... سال بھر بعد مریم پیدا ہوئی تو مجھے بلا لیا گیا... میں نے دیکھا کہ اکبر خان پوری طرح رانی کے بس میں ہے... بلال خان کی بیٹے کے آگے نہیں چلتی... لیکن سب سے برا حال سارہ کا تھا... ساس وہ کیا تھی جسے نہ شوہر کی حمایت حاصل تھی اور نہ بیٹے کی... رانی نے اسے دل کھول کے ذلیل کیا... اس نے جھوٹ اور مکاری کے سارے حربے آزمائے... اپنے شوہر کے کان بھرے اور بیٹے کے ہاتھوں ماں کو بہت ذلیل کرایا... ایک دن تو انتہا ہو گئی، سارہ نے روتے روتے مجھے بتایا کہ شراب کے نشے میں اکبر نے اسے گالیاں دیں اور اگر وہ بھاگ کر کمرے سے نہ نکل جاتی تو شاید وہ اسے مارتا۔''

میں دیکھ رہا تھا کہ یہ سب بتاتے ہوئے شاہدہ کتنی دکھی ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ سارہ کو خودکشی پر اکبر خان نے اور رانی نے مجبور کیا؟''

''خودکشی؟... یہ قتل تھا... میں نے سارہ سے پوچھا کہ آخر اکبر کو اس کی کس بات نے اتنا مشتعل کیا تھا؟ اس نے وہی کہا جو حقیقت تھی... جو میری آنکھیں بھی دیکھ سکتی تھیں... رانی اس خبیث ڈاکٹر زیدی کے چکر میں پھنس گئی تھی... تم نے دیکھا ہے اسے؟''

''ابھی تک صرف اس کا نام سنا ہے۔''

''اس کی شخصیت بڑی پُرکشش ہے... اکبر کے مقابلے میں وہ واقعی ہیرو ہے... اس کی عمر چالیس سے اوپر ہے لیکن وہ دراز قد اور وجیہ ہے... بہترین لباس پہنتا ہے اور اس کے پاس زبان کا جادو ہے... وہ کسی کو بھی مسحور کر سکتا ہے... لیکن یہ جادو وہ صرف خوب صورت عورتوں پر آزماتا ہے... بلال خان کا پورا گھر ہی اس کا گرویدہ ہے... سب سمجھتے ہیں کہ اس سے زیادہ قابل ڈاکٹر کوئی نہیں... اس نے سب کا اعتماد حاصل کر رکھا ہے... ایسا کہنا اچھا تو نہیں لگتا... لیکن خود سارہ اس کے چکر میں آگئی تھی... وہ محبت کی بھوکی تھی... عزت اور اہمیت چاہتی تھی... زیدی نے اسے ایکسپلائٹ کیا اور پھر بلیک میل... جب اس نے رانی کی طرف پیش قدمی کی تو یہ بات سارہ سے چھپی نہ رہ سکی... اس نے مجھ سے کہا اور ہم دونوں نے دن رات ان پر نظر رکھی... ہمیں ثبوت مل گیا... ماں نے بیٹے کو بھی بتانے کی کوشش کی تھی کہ اپنی بیوی کو سنبھال... بیٹا الٹا ماں پر چڑھ دوڑا کہ بہو کو بدنام کرتی ہو... شرم آنی چاہیے تمہیں... بات بلال خان تک پہنچ گئی اور اس نے بھی اپنی بیوی کو گالیاں دیں... اور سارہ کہ ساس بہو کی دشمنی میں تو اس حد تک گر گئی ہے... سارہ کا دماغ الٹ گیا... اس کے پاس ایک ریوالور تھا... بلال خان کہیں باہر سے لایا تھا... اٹلی سے شاید... زنانہ ماڈل کے ریوالور کے دستے پر بڑا خوب صورت کام تھا... وہ ریوالور لے کر پہنچ گئی ڈاکٹر زیدی کے کلینک میں... آگے دو کہانیاں ہیں... ایک یہ کہ سارہ نے اسے گالیاں دیں کہ بے غیرت... تجھے کوئی لحاظ نہیں... میں تجھ سے دس سال بڑی ہوں... رانی تجھ سے بیس سال چھوٹی ہے... مجھے چھوڑ کے اب تو اس کے پیچھے لگ گیا ہے... ساس کے بعد تو بہو کی عزت سے کھیلے... یہ میں نہیں ہونے دوں گی... اس نے زیدی کو شوٹ کرنے کے لیے فائر کیا مگر زیدی نے اس پر جست لگا کے اسے پکڑ لیا... گولی اس کے کلینک کی چھت میں پیوست ہو گئی... زیدی نے بلال خان کو رپورٹ دی کہ سارہ بی بی ریوالور لے کر اس کے کلینک آئی تھیں... انہوں نے مجھ سے بھاری مقدار میں نشے کی گولیاں طلب کی تھیں... میں جانتا ہوں کہ وہ کتنی خطرناک ہوتی ہیں اور سارہ بی بی کی ذہنی کیفیت کو دیکھتے ہوئے میں نے کہا کہ وہ گھر جائیں...

ضرورت ہوگی تو میں گھر آ کے انہیں خود گولی دوں گا... اس پر انہوں نے رونا شروع کر دیا کہ میں اب زندہ نہیں رہنا چاہتی... پہلے شوہر کا ظلم برداشت کرتی رہی... پھر بیٹا بھی میرا سہارا نہ بنا اور اب اس فاحشہ رانی کو لا کے میرے سینے پر مونگ دلنے بٹھا دیا ہے... وہ الگ مجھے ذلیل کرتی ہے... میں کہاں تک برداشت کروں... اچانک انہوں نے ریوالور نکالا اور خود کو شوٹ کرنے کی کوشش کی... میں نے جست لگا کے انہیں قابو کر لیا اور ان سے ریوالور چھین لیا... گولی چھت میں پیوست ہو گئی ورنہ ان کی کنپٹی میں اتر جاتی۔''

''آپ نے یہ سب... کس سے سنا؟''

''خود سارہ سے... پھر جو ڈاکٹر زیدی نے بتایا وہ سارہ کے شوہر سے... ایک دلچسپ بات بتاؤں... اس وقت ڈاکٹر زیدی نے کہا تھا کہ اس نے ریوالور چھین کر اپنی دراز میں مقفل کر دیا تھا... آج اکبر کا وہ بنگالی ملازم کہتا ہے کہ اس نے بابر کے ہاتھ میں وہی ریوالور دیکھا تھا... وہ سارہ بی بی کا ریوالور پہچانتا ہے۔''

''وہ بابر کے پاس کیسے آیا؟''

''یہی تو میں پوچھتی ہوں... بنگالی بکواس کرتا ہے... جھوٹ بول رہا ہے کسی کے کہنے پر... یا اکبر بلال کے کہنے پر... یا ڈاکٹر زیدی کے کہنے پر... صرف بابر کو خطرناک پاگل ثابت کرنے کے لیے جو اپنے [illegible] کو قتل کرنا چاہتا ہے... میں کیا بولوں... میری کوئی حیثیت ہے اس گھر میں؟ وہ جوتے مار کے نکال دیں گے مجھے۔''

''اس واقعے کے کتنے عرصے بعد سارہ نے خودکشی کی؟''

''میرا خیال ہے... ایک ہفتے بعد... حالانکہ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ اتنی دور دریا تک کیوں گئی... بنگالی کہتا ہے کہ اسے مالکن نے حکم دیا تھا اور وہ ان کو دریا کے کنارے چھوڑ کے آگیا تھا... سارہ کی عمر کی عورت کیا رات کے وقت ٹھٹھرتی ہوئی پانی میں اترے گی؟ اس نے پل پر سے چھلانگ کیوں نہیں ماردی؟''

''تمہیں شک ہے کہ سارہ کو بھی قتل کیا گیا تھا؟''

''شک نہیں... یقین... مگر بلال خان کے گھر کے معاملات مختلف انداز میں طے ہوتے ہیں... ڈاکٹر زیدی نے لکھا کہ وہ ڈپریشن کی مریض تھی اور ایک بار پہلے میرے کلینک میں بھی خودکشی کی ناکام کوشش کر چکی تھی... سارہ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی یہی کہتی ہے... پھر میرے کہنے کی کیا اہمیت ہے اور تمہارے کہنے سے کیا ہوگا؟''

''بابر کو نفسیاتی اسپتال بھجوانے کا مشورہ بھی اسی ڈاکٹر زیدی نے دیا تھا؟''

''ظاہر ہے، اس نے کہا کہ بابر بلال میں ماں کی طرف سے ڈپریشن کا مرض آیا ہے... موروثی طور پر وہ پاگل ہے...'' وہ تلخی سے بولی۔

''یہ تین سال پہلے کی بات ہے؟''

''ہاں... اکبر خان کو اب یقین آگیا ہے کہ اس کی ماں غلط نہیں کہتی تھی... اسے رانی اور ڈاکٹر زیدی کے مراسم کا ثبوت مل گیا ہے... اب وہ ڈاکٹر زیدی کا بھی دشمن ہے... رانی اس سے طلاق مانگتی ہے لیکن اکبر خان جانتا ہے کہ اس کو رانی سے چھٹکارے کی کیا قیمت دینی پڑے گی... ادھر وہ خبیث ڈاکٹر... رانی سمجھتی ہے کہ وہ اس پر مرتا ہے... مگر وہ اس کی دولت کا مالک بننے کے خواب دیکھ رہا ہے... اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تو دیکھنا، ایک دن رانی بھی ایسے ہی ماری جائے گی... اور ڈاکٹر زیدی کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا... مسیحا اگر خود قاتل بن جائے تو اسے کسی کا ڈر نہیں ہوتا... وہ سائنٹفک طریقے سے قتل کرتا ہے... اور عدالت میں اسے قتل ثابت کرنا ہی ناممکن ہو جاتا ہے... اکبر بلال اکثر بیوی کی ٹھکائی لگاتا ہے... کہتا ہے اسے قتل کر دے گا... لیکن وہ دولت مند ہے... غیرت مند نہیں... اسے تو اپنے بھائی کے حصے کی دولت کی زیادہ فکر ہے۔''

جب شاہدہ کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تو وہ سونے چلی گئی۔ میرا تھکن سے حال خراب تھا لیکن میرے دماغ کی بتی جل رہی تھی... میں سوچ رہا تھا کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے... رات ایک بجے اچانک میرا فون بولنے لگا۔

میرے ہیلو کہنے پر دوسری طرف سے صائمہ نے کہا۔ ''تم شاہدہ کے گھر میں ہو؟''

میں بھونچکا رہ گیا۔ ''تم کیا سات سمندر پار سے سب دیکھ رہی ہو؟ کیا خلائی سیارے کے کسی کیمرے کا رخ میری نقل و حرکت پر ہے؟''

''میرے پاس شیریں کا فون آیا تھا... مجھے بڑی خوشی ہوئی جب اس نے تمہاری تعریف کی۔''

''اگر وہ شادی شدہ نہ ہوتی تو مجھے معلوم ہے کہ تمہارے جذبات بالکل مختلف ہوتے... یہ آدھی رات کو یاد کرنے کا مطلب؟''

''آدھی رات ادھر تمہارے کالے لوگوں کے ملک میں ہوگی... یہاں تو ابھی آٹھ بجے ہیں اور تمہیں جلانے کے لیے بتا رہی ہوں کہ اس وقت میں بلنگھم پیلس میں ملکۂ برطانیہ

www.pkdigest.com

کے ساتھ ہوں۔"

میں نے کہا۔ "اس سے کہو کہ بہت عمر ہوگئی... بس اب اللہ اللہ کرے اور اسے آفر دو کہ تخت پر بیٹھنے کے لیے میں تیار ہوں... کیا پتا وہ مان جائے... کیا تم نشے میں دھت ہو... تمہاری آواز سے ایسا لگ رہا ہے اور باتوں سے بھی..."

"برطانوی شاہی معالج اور برٹش میڈیکل ایسوسی ایشن نے مندوبین کے اعزاز میں ڈنر دیا ہے... رقص، موسیقی، شراب اور اللہ معاف کرے... لحم خنزیر یہاں سب ہے..."

"یہ وقت تم اپنے کمرے میں رہ کے یادِ الٰہی میں گزار سکتی تھیں۔"

"اب تک تین عالی نسب ہینڈسم گورے مجھے رقص کی دعوت دے چکے ہیں... ایک تو لگتا ہے کہ فریفتہ ہو چکا ہے... اگر آج ہی اس نے پروپوز کر دیا تو آئی ایم سوری... شاید میں واپس نہ آؤں۔"

میں نے کہا۔ "چلو میں جل کے کوئلہ ہو گیا... آگے بولو..."

"حقیقت یہ ہے سویٹ ہارٹ کہ تمہارے بغیر مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ دل بار بار یہی چاہتا ہے کہ کاش تم بھی ساتھ ہوتے۔"

"مجھ پر رقت طاری ہو رہی ہے... اور مجھے نیند بھی آرہی ہے... میں رات بھر روتا رہوں یا سوتا رہوں؟"

"تم دونوں کام کر سکتے ہو... خواب میں مجھے یاد کرو اور روتے رہو۔" اس نے کہا۔ "میری ساری ہمدردیاں اس غریب لڑکی روبی اور اس کے مظلوم شوہر بابر کے ساتھ ہیں... مجھے امید ہے کہ تم انہیں ان کا حق ضرور دلاؤ گے... اور میرا خیال ہے کہ وہ خبیث ڈاکٹر زیدی..."

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی میں نے فون بند کیا اور سو گیا۔ خوب صورت لڑکیاں خواہ وہ ڈاکٹر ہوں، جب دخل در معقولات کرتی ہیں تو ثابت کرتی ہیں کہ وہ ناقص العقل ہیں... اگر اسی طرح میں صائمہ سے کہوں کہ میرے خیال میں فلاں مریض کو ہارٹ پرابلم نہیں، اس کے دماغ میں پھوڑا ہے چنانچہ اسے کان کے درد کی دوا دے دو... پھر؟... وہ ڈاکٹری کرے صحافت... شاعری اور جاسوسی میں کر رہا ہوں۔"

صبح آنکھ کھلتے ہی جو ہوشربا خبر مجھے ملی... یا دی گئی... یہ تھی کہ بابر نے بالآخر اپنے بڑے بھائی اکبر کو شوٹ کر دیا ہے... شاہد وہ بڑی افراتفری میں تھی... اس نے مجھے دکھ کے ساتھ یہ بریکنگ نیوز دی۔ "ابھی ابھی میرے پاس رانی کا فون آیا تھا... بہت رو رہی تھی... میں ادھر ہی جا رہی ہوں... مریم کو بھی ساتھ لے جا رہی ہوں... بے چاری یتیم ہو گئی۔"

میں آنکھیں کھولے دم بخود اسے دیکھتا رہا۔ "یہ افسوسناک واقعہ کب پیش آیا... کتنی دیر پہلے...؟"

"ابھی کچھ پتا نہیں۔" اس نے گھڑی کی طرف دیکھا جس میں صبح کے دس بج رہے تھے۔ "اکبر روز صبح جاگنگ کے لیے جاتا ہے... اسی فروٹ فارم میں راستے بنے ہوئے ہیں۔"

"جب اسے معلوم تھا کہ اس کا بھائی وہیں چھپا ہوا ہے... اور اسے قتل کرنا چاہتا ہے تو آج وہ نہ جاتا... کہیں اور چلا جاتا۔"

"بس ہونے والی بات ہو کے رہتی ہے... اس کا معمول ہے، ساڑھے چھ بجے نکل جاتا ہے... ایک گھنٹے بعد لوٹتا ہے... رانی اس کے بعد اٹھتی ہے... ساڑھے آٹھ نو بجے وہ ناشتا کرتے ہیں... آج اکبر نو بجے تک نہیں آیا تو بنگالی کو معلوم کرنے بھیجا گیا... اس نے دیکھا تو لاش وہاں الٹی پڑی تھی... اور وہ ریوالور بھی وہیں پڑا ہوا تھا... بابر کی ماں کا... کچھ پتا نہیں کہ اسے کس نے گولی ماری اور کب... پولیس کو طلب کیا گیا ہے... پوسٹ مارٹم ہوگا تو پتا چلے گا کہ اسے مرے ہوئے کتنی دیر ہوئی تھی۔"

میں نے کہا۔ "چلو... بابر کا مقصد تو پورا ہوا... اب میں بھی کیا کر سکتا ہوں... وہ آج نہیں تو کل پکڑا جائے گا۔"

"تم جاتے وقت یہ تالا باہر سے لگا جانا... میں نے تمہارے لیے ناشتا بنا کے میز پر لگا دیا ہے۔"

"آپ کی میزبانی کا بہت شکریہ... میں سوچ رہا ہوں کہ واپس چلا جاؤں... موڈ بنا تو رانی اور روبی سے تعزیت کرنے کے لیے ادھر چکر لگا دوں گا۔"

اکبر کے مارے جانے کی خبر نے میری جھنجلاہٹ میں اضافہ کر دیا تھا... میرا وقت ضائع ہوا تھا اور میرا بے وقوف بننے اور بنائے جانے کا احساس پہلے سے زیادہ شدید ہو گیا تھا... غسل کر کے ناشتا کرنے تک میرے خیالات میں کچھ ٹھہراؤ آیا تو میں نے اپنے دماغ کا کمپیوٹر آن کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ پہلے ہی آن ہو گیا تھا اور امکانات کے ایسے پہلو روشن ہو کے سامنے آرہے تھے کہ میرا واپسی کا پروگرام ڈانواں ڈول ہونے لگا۔

ایک گھنٹے بعد میرا ارادہ بدل گیا۔ اخلاقی طور پر میرا پہلا فرض یہ بنتا تھا کہ میں بیوہ ہو جانے والی رانی سے پہلے

تعزیت کروں حالانکہ اصل حقائق سامنے آجانے کے بعد میں یہ کہنے میں حق بجانب تھا کہ اللہ نے اس کی مشکل کو آسان کیا... جیتے جی اکبر اسے ہرگز طلاق نہ دیتا اور وہ خلع حاصل کرنا چاہتی تو اسے اپنے تمام شرعی حقوق سے دست برداری قبول کرنی پڑتی۔ رانی اور اکبر شادی کی ایسی ہتھکڑی سے جکڑے ہوئے تھے کہ دنیا کے سامنے میاں بیوی بن کے رہنے بنا چارہ نہ تھا... قانونی مجبوری اپنی جگہ تھی لیکن اخلاقی طور پر اس رشتے میں صرف بے غیرتی تھی... عدت کے چار ماہ دس دن تیاری میں گزر جائیں گے... پھر رانی کو ڈاکٹر زیدی سے دوسری شادی رچانے سے روکنے والا کون ہوگا... وہ ہر طرح سے آزاد ہوگی۔

بلال خان کی حویلی میں قیامت برپا تھی۔ ایک طرف رانی کے سوگ کا ڈراما جاری تھا اور وہ بڑی کامیابی سے زار و قطار رونے کا مظاہرہ بھی کر رہی تھی... جب کوئی نیا غمگسار آتا تھا، وہ ظاہر کرتی تھی کہ اسے اپنے شوہر سے کتنی محبت تھی اور اس کی جدائی کے بعد زندگی اسے کتنی مشکل نظر آتی ہے۔ اسے بیوہ کرنے والے کی قاتل نفرت بیوی بھی وہاں موجود تھی اور اس کا رونا بالکل مختلف اسباب کی بنا پر تھا۔

پولیس کے اعلیٰ افسران سمیت علاقے کی ساری نفری کے علاوہ تعزیت کرنے والوں کی کثیر تعداد بلال خان کی حویلی میں جمع تھی... اندر باہر گاڑیاں بکھری تھیں اور سب کی پریشانی ایک ہی تھی کہ وہ تعزیت اور ہمدردی کریں تو کس سے کریں... مقتول ایک بھائی تھا تو قاتل دوسرا اور وہ بھی مفرور تھا... ان کے ماں باپ پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو چکے تھے اور گھر میں صرف دو عورتیں رہ گئی تھیں جن کے بارے میں شک کسی کو نہیں تھا کہ اب یہ ساری جاگیر، جائداد اور دولت انہی کو ملے گی۔

مجھے قانونی معاملات میں دخل اندازی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بہت سے افسرانِ بالا مجھے جانتے تھے۔ کچھ سیاست دانوں نے بھی میری اس مستعدی پر دبے دبے الفاظ میں حیرانی کا اظہار کیا کہ میں خبر بننے سے پہلے ہی خبر لینے پہنچ گیا... صحافی ہو تو ایسا... میں انہیں کیا بتاتا کہ یہاں مجھے خبر لینے کا کوئی خیال نہیں، پنگا لینے کا شوق لایا تھا... تاہم میری اوپر والوں سے راہ و رسم نے مقامی پولیس کے عملے کو خاصا مرعوب کیا اور میرے ساتھ ان کا رویہ پہلے سے زیادہ نیاز مندانہ ہو گیا۔

معاملات اب پولیس کے ہاتھ میں تھے مگر میرے دل میں ایک کرید سی تھی۔ زیادہ تر حقائق کا علم مجھے تین خواتین سے ہوا تھا... کچھ روبی سے... اس سے زیادہ ڈاکٹر تیمر یں سے اور سب سے زیادہ اس کی پالنے والی ماں شاہدہ سے... میں نے حویلی میں ڈاکٹر زیدی کو بھی دیکھا تو وہ مجھے ویسا ہی نظر آیا جیسا بتایا گیا تھا۔ خوبرو، اسمارٹ اور بے حد پُراعتماد... وہ سوٹ پہنے سگریٹ ہاتھ یا منہ میں دبائے بڑے سکون سے اندر باہر آجا رہا تھا اور بالکل گھر کے مالک کی طرح تمام معاملات کی نگرانی کرتا نظر آتا تھا۔ اس نے مجھ سے بھی بڑی شائستگی سے بات کی۔

یہ محض اتفاق تھا کہ شاہدہ نے بھی مجھے صرف رانی کے متعلق بتایا تھا، اس کے بیک گراؤنڈ کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ آخر وہ کہاں سے آئی تھی؟ کس کی بیٹی تھی اور اب اس کی فیملی کے دیگر افراد کہاں تھے؟ ظاہر ہے زر، زن، زمین کے اس خونی ڈرامے میں ان کا کردار کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ محض اپنے تجسس کو رفع کرنے کے لیے میں واپس جانے سے پہلے روبی کے گھر چلا گیا۔ دکھ سکھ کے ہر موقع پر سدھیانے والوں کی شرکت زیادہ ضروری سمجھی جاتی ہے لیکن داماد کی موت پر نہ ساس سسر آئے تھے، نہ سالے سالی... اخلاقی طور پر تو روبی کے ساتھ اس کی ماں کو بھی پہنچنا چاہیے تھا لیکن مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ طبیعت کی خرابی کے تحت گھر پر ہی تھی۔

روبی کے گھر کے دروازے پر تالا... کو دیکھ کر مجھے اتنی حیرانی نہیں ہوئی جتنی اندر سے آنے والی آوازیں سن کر... میں سوچ رہا تھا کہ اس وقت وہ کہاں جا سکتی ہے؟ کسی ڈاکٹر کے پاس یا بلال خان کی حویلی؟ کیا پتا اسے بعد میں احساس ہوا ہو کہ مصیبت والا گھر اس کی بیٹی کا سسرال بھی ہے... میں نے ابھی گاڑی کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ یہ آوازیں سن کر میں رکنے پر مجبور ہو گیا... ان میں ایک آواز واضح طور پر روبی کی ماں کی تھی... غلطی مجھ سے یہ ہوئی کہ میں نے فوراً ہی دستک دے دی۔

قریب سے گزرنے والے ایک شخص نے میری توجہ تالے کی طرف دلائی۔ "بھائی صاحب! گھر میں کوئی نہیں ہے۔"

اندر سے آنے والی آوازیں بھی ایک دم بند ہو گئی تھیں چنانچہ میں نے تالے کو دیکھا اور پھر شرمندگی کے ساتھ راہ گیر کا شکریہ ادا کیا جو وہیں رک گیا تھا اور مجھے شک کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ وہ پڑوس میں ہی رہتا تھا اور غالباً ماں بیٹی کی حفاظت کا خود ساختہ ٹھیکے دار بھی تھا۔

جہاں سیر وہاں سوا سیر... میں نے سوچا... اتنا وقت بلاوجہ ضائع کر لیا تو تھوڑا اور سہی۔ میرے دماغ کا کمپیوٹر

www.pkdigest.com

تجزیہ سے کام کر رہا تھا۔ بے ترتیب خیالات، شبہات، خدشات اور امکانات کے کباڑ خانے میں سے واقعات کو ایک ترتیب میں لانے کی کوشش کامیاب بھی ہو سکتی تھی... بشرطیکہ چند نکات واضح ہو جائیں جو ابھی تک بے یقینی کے اندھیرے میں تھے۔

یہاں رکنے کے لیے مجھے کسی بہانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے روبی کے ہمسائے سے تصدیق کی۔ ”یہ ماسٹر صاحب کا گھر ہے نا؟ جہاں اب ان کی بیٹی اور بیوہ رہتی ہیں... اور کوئی تو نہیں ہے...؟“

”نہیں جی... بس دو عورتیں ہیں گھر میں... آپ کون ہو... دراصل ہمیں آتے جاتے لوگوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میں بزدل ہوں۔“

وہ پہلے چونکا پھر اس کا چہرہ ایسا ہو گیا جیسے اس نے غلطی سے برفی کے دھوکے میں صابن کھا لیا ہو۔ وہ مجھے گھورتا رہا اور میں گاڑی میں بیٹھ کے نکل لیا... کچھ وقت میں نے شاہدہ کے گھر میں سو کے گزارا جس کی دوسری مجھے چابی ڈاکٹر شیریں نے فراہم کر دی تھی۔ اکبر بلال کی تدفین عصر کے بعد رکھی گئی تھی... شک و شبہے کی کوئی بات نہیں تھی چنانچہ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں دیر نہیں لگی تھی۔ ایف آئی آر علاقے کے تھانے دار نے حویلی میں بیٹھ کے لکھی تھی۔ یہ رپورٹ بھی ڈاکٹر زیدی کی طرف سے لکھوائی گئی کیونکہ مرحوم کی بیوہ کی حالت خراب تھی اور کسی مولوی نے فتویٰ بھی جاری کر دیا تھا کہ دورانِ عدت وہ کسی نامحرم کے سامنے نہیں آسکتی... ایف آئی آر میں بابر بلال کو قاتل نامزد کیا گیا تھا... آلۂ قتل وہی تھا... اس کی ماں کا ریوالور... لیکن قاتل ہنوز مفرور تھا۔

جنازے میں سیکڑوں افراد نے شرکت کی۔ ان میں کچھ سیاسی شخصیات بھی تھیں چنانچہ دو ٹی وی چینل والے بھی قبرستان تک مستعد نظر آئے۔ میں رانی یا روبی سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن میں نامحرم تھا اور حویلی کے اندر میرے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں ڈاکٹر زیدی سے بھی بات کر سکتا تھا لیکن وہ نمازِ جنازہ کے بعد مجھے نظر ہی نہیں آیا۔ وہ قبرستان میں بھی نہیں تھا۔ بنگالی نے مجھے بتایا کہ انہیں ایک ایمرجنسی میں جانا پڑا... ڈاکٹروں کا معاملہ ہر جگہ ایسا ہی ہے۔

شام کو مجھے شیریں نے چائے پر بلا لیا۔ بلال خان کی حویلی میں بھی کھانے کا انتظام شامیانے لگا کے کیا گیا تھا جہاں بریانی قورمے کی دیگوں پر دیگیں خالی ہو رہی تھیں۔ تام

نہاد غمگساروں کا ایک جمِ غفیر تھا جو اس دعوتِ عام میں اس جوش و جذبے کے ساتھ شریک تھا جیسے وہ اکبر کی شادی کے بعد اس کی دعوتِ ولیمہ میں بھی شریک رہے ہوں گے... غالباً وہ سوئم اور چہلم کی تاریخ کا تعین بھی کر چکے تھے۔

شیریں کا گھرانا روایتی انداز میں مہمان نواز تھا۔ ان کے نزدیک میں شیریں کی سہیلی کا شوہر تھا تو اس گھر میں بھی میری حیثیت داماد جیسی تھی۔ اس کا شوہر افسوسناک حد تک کاروباری ذہن کا مالک اور بدذوق تھا جو اخبار میں صرف بازار کے بھاؤ پڑھتا تھا... نہ خبریں، نہ کالم اور نہ مزاحیہ قطعات... پھر اسے کسی بزدل یا بہادر کے نام سے کیا... شیریں کا خیال تھا کہ مجھے رات وہیں رک جانا چاہیے لیکن پھر شاہدہ کا فون آگیا کہ وہ واپس آگئی ہے تو میں نے شیریں سے اجازت لے لی۔

میں نے جاتے ہی صاف کہہ دیا کہ میت والے گھر میں، میں نے آج تک کھانا نہیں کھایا اور یہاں تو مغرب کے وقت دعوتِ عام تھی۔ شیریں کے گھر میں نے چائے پی تھی اور اب مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ وہ نیک دل عورت صرف میرے لیے کھانا بنانے چلی گئی۔ اس وقت مجھے مریم سے باتیں کرنے کا موقع ملا۔

اس نے شاہدہ کے جاتے ہی رازداری سے کہا۔

”انکل! کیا آپ کو معلوم ہے... چاچا نے پاپا کو مار دیا تھا... دو گولیاں چلائیں۔“

میں نے کہا۔ ”آپ کو افسوس نہیں ہے؟“

”افسوس۔“ اس نے جواب دینے سے پہلے غور کیا۔ ”میں کسی اور کو پاپا بنا لوں گی۔“

”آپ کو اچھا کون لگتا ہے؟“

”انکل زیدی کو میرے پاپا ہونا چاہیے... ممی بھی کہتی ہیں۔“

”او کے... کیا ممی کو افسوس ہے کہ پاپا مر گئے؟“

”ہوگا... میں نے پوچھا نہیں۔“

”وہ سارا دن روتی رہی ہوں گی؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ اپنے کمرے میں تھیں... اکیلی... انکل زیدی نے کہا کہ ان کی طبیعت خراب ہے... لیکن جب میں نے جا کے دیکھا تو وہ ٹی وی دیکھ رہی تھیں... آواز بند کر کے... رو تو نہیں رہی تھیں۔“

میں نے کہا۔ ”کیا وہ کارٹون دیکھ رہی تھیں؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اسٹار پلس... ساس بھی کبھی بہو تھی۔“

”اور آنٹی روبی... کیا ان کی ماما آئی تھیں؟“

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”وہ چپ تھیں... سب ان کو برا جو کہہ رہے تھے۔“

شاہدہ نے میرے اخذ کردہ نتائج سے اتفاق کیا۔ پولیس اپنے معمول کے طریقۂ کار پر تفتیش کر رہی تھی۔ ابھی تک وہ بابر کو نہیں پکڑ پائے تھے جسے سب نے اتفاقِ رائے سے قاتل قرار دے دیا تھا لیکن جو معلومات مجھے باہر سے اور اس کے بعد ذاتی تعلق کی بنا پر روبی، ڈاکٹر شیریں اور پھر سب سے اہم چشم دید گواہ شاہدہ سے حاصل ہوئی تھیں، ان کی بنا پر قاتل صرف ایک ہی شخص ہو سکتا تھا... ڈاکٹر زیدی... میں نے اب اس سے براہِ راست بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

شاہدہ نے مجھے بتایا کہ وہ اپنا کلینک رات دس بجے تک کھلا رکھتا تھا لیکن عام طور پر آخری مریض کے رخصت ہونے تک ساڑھے دس گیارہ بھی بج جاتے تھے۔ ابھی دس بجے تھے اور کوئی رکاوٹ حائل نہ ہوتی تو پندرہ منٹ میں صائمہ کی کار مجھے وہاں پہنچا سکتی تھی۔

اس کا کلینک خاصا بڑا تھا۔ ایک ہال میں مریضوں کے بیٹھنے کے لیے صوفے لگائے گئے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے علاج سے صرف اونچی آمدنی والے ہی مستفید ہوتے تھے۔ اس کی مشورہ فیس بھی چھ سو روپے تھی جو باہر بیٹھا ہوا اس کا پرسنل اسسٹنٹ وصول کر لیتا تھا۔ یہ فیس میں نے بھی ادا کی۔ ایک مریض اندر تھا اور دوسرا باہر منتظر تھا چنانچہ صرف پندرہ منٹ بعد مجھے اندر جانے کا اشارہ مل گیا۔

ڈاکٹر زیدی مجھے دیکھ کے چونکا یا اچھلا نہیں لیکن اس کی صورت پر ناگواری کے اور حیرت کے شدید تاثرات ظاہر ہوئے۔ ”آپ... آپ کو کیا ہو گیا صحافی صاحب؟“

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ”ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا لیکن بہت کچھ ہو سکتا ہے ڈاکٹر زیدی... مثلاً شور شرابا... خون خرابا... اس کا انحصار آپ کے رویے پر ہے... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم پڑھے لکھے شریف اور مہذب لوگوں کی طرح سے بات کریں اور اپنی اپنی راہ لیں۔ اپنی راہ کا مجھے علم ہے... آپ کس راہ پر جاتے ہیں... یہ فیصلہ وقت کرے گا۔“

”آپ میرا وقت ضائع کرنے آئے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ آپ کو ضائع کرنے کے لیے مزید وقت بھی نہ ملے... آپ خود ضائع ہو جائیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے درمیان کوئی سمجھوتا ہو جائے... مگر اس بقائے باہمی کا۔“

ڈاکٹر زیدی کے چہرے پر ایک پُرامید اور معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”او کے... کلینک بند کرنے کا وقت ہو گیا ہے... ہم گھر چلتے ہیں۔“

میں نے تجویز پیش کی۔ ”آپ اپنے اسسٹنٹ کو رخصت کر دیں تو بات یہاں بھی ہو سکتی ہے۔“

ڈاکٹر زیدی نے اپنے اسسٹنٹ کو رخصت کر کے باہر کا دروازہ بھی بند کر دیا اور ہال کی لائٹس آف کر دیں۔ جب وہ واپس آیا تو میں نے اپنا ریوالور نکال کے سامنے رکھ لیا تھا۔ اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں، میں نے معذرت کے ساتھ کہا۔ ”میں بزدل ہوں... یہ اپنی حفاظت کے لیے ساتھ رکھتا ہوں۔“

وہ میرے سامنے بیٹھ گیا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ تم دو دن سے جاسوسی کرتے پھر رہے ہو۔“

میں نے کہا۔ ”تمہیں اور بہت کچھ معلوم ہے۔ جو ابھی پولیس کو معلوم نہیں لیکن ہمارے ملک کی پولیس سب معلوم کر لیتی ہے... آج سے کئی سال پہلے تم نے ایک پلان بنایا تھا... بلال خان کی جگہ لینے کا۔“

”اس کی جگہ میں کیسے لے سکتا تھا؟“

”تم نے اس کی بیوی پر ڈورے ڈالے... ہمدرد بن کے... کچھ اعتماد تمہیں اپنی ذات پر تھا... خواتین تمہاری شخصیت میں ایک کشش محسوس کرتی ہیں... سابقہ تجربات سے تمہیں اندازہ ہوگا کہ تم ایک لیڈی کلر ہو... سارہ بھی آسانی سے تمہارے جال میں پھنس گئی لیکن وہ اپنے شوہر کو مار کے تم سے شادی کرنے پر راضی نہیں ہوئی... اپنے بچوں کی وجہ سے۔“

”آپ بکواس فرماتے ہیں بزدل صاحب...“

”جب اس کی پہلی ماڈل بہو آئی تو تم نے اپنا پلان بدل دیا۔ تم نے بہو کی طرف رخ کیا... وہ تھی بھی ہر پھول پر منڈلانے والی تتلی... تم نے اسے اپنا پلان سمجھایا کہ کس طرح بلال خان کی پوری جاگیر پر قبضہ کیا جا سکتا ہے... اور وہ مان گئی... مگر اس کی ساس کو سخت طیش آیا... تمہاری بے غیرتی پر... وہ شوہر، بیٹے اور بہو کے رویے سے پہلے ہی دکھی تھی... وہ نیند کی اور سکون کی گولیاں کھانے لگی... جو تم اسے فراہم کرتے رہے... وہ باقاعدہ نفسیاتی مریض بن گئی۔ اب جب تم نے نظریں پھیریں تو ایک دن وہ ریوالور لے کر تمہیں قتل کرنے پہنچ گئی۔“

”یہ جھوٹ ہے... اس نے میرے کلینک میں خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی... میں نے اس سے ریوالور

www.pkdigest.com

چھین لیا۔"

"او کے... فرض کرو ایسا ہی ہوا... اس ریوالور سے فائر ہونے والی ایک گولی چھت میں پیوست ہوگئی۔" میں نے اوپر دیکھا۔ "یہ غالباً اسی گولی کا سوراخ ہوگا... پھر تم نے اس سے ریوالور چھین لیا۔"

"نہیں... ورنہ وہ نہ جانے کیا کرتی۔"

"اس ریوالور کا تم نے کیا کیا؟... سارہ کو واپس کردیا؟"

"اسے میں نے اپنی میز کی دراز میں ڈال دیا تھا... اور تالا لگا دیا تھا۔"

میں نے کہا۔ "پھر وہ ریوالور بابر کے پاس کیسے پہنچا؟ اس نے اپنے بھائی کو اسی ریوالور سے قتل کیا ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم... بہت عرصے تک وہ ریوالور میز کی دراز میں ہی پڑا رہا... پھر پتا نہیں کب وہاں سے غائب ہوگیا۔"

میں نے کہا۔ "کیا اس واقعے کی رپورٹ تم نے بلال خان کو دی تھی؟ ضرور دی ہوگی... صرف ایک ہفتے بعد تم نے سارہ کو بات کرنے کے لیے بلایا... اس کا بنگالی ملازم سارہ کو دریا تک لایا اور اسے وہاں چھوڑ کے چلا گیا... وہ سارہ کا رازدار تھا... اور تم سے بھی انعام وصول کرتا ہوگا... سارہ سے تمہیں کیا بات کرنی تھی؟"

"بات سارہ کرنا چاہتی تھی... وہ چاہتی تھی... میں اس کے شوہر بلال خان سے اس کی جان چھڑا دوں... وہ دل کا مریض تھا اور میں اس کا معالج... وہ سمجھتی تھی کہ میرے لیے یہ کام آسان ہے... کوئی مجھ پر شک نہیں کرے گا مگر میں نے صاف انکار کردیا... ایک ڈاکٹر کا کام جان بچانا ہے... اور وہ اپنے مریض کے اعتماد کو دھوکا نہیں دے سکتا۔"

"تمہارے انکار سے دل برداشتہ ہوکر اس نے خودکشی کرلی؟ وہ دریا میں اتر گئی... یا تم نے اسے مار کے دریا میں پھینک دیا؟"

"یہ سب تمہارے مفروضات ہیں۔ اس نے خودکشی کی تھی... وہ ایک پاگل عورت تھی۔"

"وہ ایک ذہین عورت تھی... ذہین اور حساس... وہ رائٹر تھی... اسے پاگل کیا بلال خان کے جاہلانہ سلوک نے... اور پھر تمہاری بے غیرتی اور ہوس پرستی نے... موروثی طور پر اس کا بیٹا بابر بلال بھی نفسیاتی مریض بنا اور پاگل ہوا تو اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں... اسے پاگل پن کی سند دینے والے بھی تم ہی تھے... تم نے ہی اسے امداد نفسیاتی کلینک بھیجنے کی سفارش کی تھی۔"

اس نے ایک سگریٹ جلایا۔ "کیا تم نے ڈاکٹر امداد سے بات کی؟ تم سمجھتے ہو کہ وہ بھی اس سازش میں شریک ہے؟"

"شیدا پستول پہلے ایک ڈاکو تھا... اب ایک ہیرونچی ہے... اسے تم ہیروئن کے انجکشن فراہم کرتے تھے... اس نے بابر کو فرار ہونے میں مدد دی۔"

"کیا شیدا پستول ایسا کہتا ہے؟" وہ پُرتمسخر انداز میں مسکرایا۔

"سارہ کا پوسٹ مارٹم بھی تم نے اپنی نگرانی میں کرایا تھا جس سے اس کا قتل صرف خودکشی ثابت ہو... بعد میں کیا ہوا؟ بلال خان کا قتل تم نے کیسے کیا؟"

"اس کا ہارٹ فیل ہوا تھا... وہ دل کا پرانا مریض تھا۔"

"اور تم اسے غلط گولیاں دیتے رہے یا جس روز وہ باتھ روم کے ٹب میں گر کر ہلاک ہوا... تم نے اسے کوئی ایسی گولی دے دی تھی جس نے اس کا کام تمام کیا... اس کا پوسٹ مارٹم تو ضروری سمجھا ہی نہیں گیا تھا۔"

"الزام لگانا بہت آسان ہوتا ہے بزدل صاحب!"

"بابر کو سوائے تمہارے شریکِ جرم بنگالی کے کسی نے نہیں دیکھا۔ جو ریوالور تمہاری دراز میں مقفل پڑا تھا... وہ بھی بابر کے ہاتھ میں صرف بنگالی کو نظر آیا... بابر اسے اپنا چہرہ اور ریوالور دکھا کے ایسا غائب ہوا کہ پھر کسی کو نظر نہیں آیا... پھر اکبر کا قتل اسی ریوالور سے ہوا... اس کے بعد سے بابر کا کچھ پتا نہیں کہ اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا... علاقے کی ساری پولیس اسے ایک فروٹ فارم میں تلاش کرکے پکڑ نہیں سکی... کیا تم نے اسے بھی ٹھکانے لگا دیا ہے ڈاکٹر زیدی...؟"

"اپنی بکواس بند کرو... تم کچھ ثابت نہیں کرسکتے۔"

میں نے کہا۔ "چار مہینے دس دن عدت کے گزارنے کے بعد رانی تم سے شادی کرلے گی... بابر کو پولیس اس سے پہلے ہی جہاں وہ نظر آیا، گولی مار دے گی اور پکڑا گیا تو وہ جائے گا سیدھا تختۂ دار کی طرف... تمہارا راستہ بالکل صاف ہے ڈاکٹر زیدی... تم ٹھیک کہتے ہو... میں کچھ ثابت نہیں کرسکتا... لیکن یہ کیس پولیس کے پاس جائے گا تو تمہارے خلاف کچھ ایسے چشم دید گواہ نکل آئیں گے جن کے منہ بند کرنا تمہارے لیے مشکل ہوگا... ایک ہے بابر کی بیوی روبی... دوسری ہے ڈاکٹر شیریں... چوتھی مریم کی گورنس شاہدہ... کیا میں تیسری بھول گیا؟ نہیں ڈاکٹر زیدی... تیسری ہوگی خود رانی... تم اگر یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری محبت میں وہ تمہارے ساتھ پھانسی کے تختے تک جاسکتی ہے تو یہ تمہاری احمقانہ بھول ہے... تم جانتے ہو کہ میرے ہاتھ بھی لمبے ہیں... پولیس میں

میرے اچھے خاصے مراسم ہیں... تمہارے خلاف ایف آئی آر میں لکھواؤں گا... باقی کام خود پولیس کرلے گی۔"

میں نے اپنا ریوالور اٹھایا اور کلینک سے نکل آیا... ڈاکٹر زیدی کے رویے نے مجھے تھوڑا سا مایوس کیا تھا۔ خلافِ توقع نہ وہ گھبرایا تھا، نہ مشتعل ہوا تھا اور نہ اس نے اپنی سازشی فطرت کے مطابق مجھ سے سودا کرنے کی کوشش کی تھی۔ تاہم میرے ذہن میں اپنا لائحہ عمل واضح تھا۔ ڈاکٹر زیدی کے بچنے کی صرف ایک صورت تھی کہ وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کے یہاں سے فرار ہوجائے۔

آدھی رات کے بعد ابھی میں سویا ہی تھا کہ شاہدہ نے جھنجوڑ کے مجھے جگا دیا۔ وہ سخت وحشت زدہ تھی۔ خوف کے ہسٹیریا میں اس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ اس کی ایک وجہ آنسو بھی تھے جو از خود اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ "اللہ میری توبہ... پتا نہیں کیا ہو رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "شاہدہ... آرام سے بتاؤ کیا ہوا ہے؟"

"آرام سے کیا بتاؤں... بنگالی... بنگالی کا فون آیا تھا... کسی نے رانی کو قتل کردیا ہے... بے چاری بچی... ایک دن پہلے باپ مارا گیا... اب ماں..."

میں اچھل کر بستر سے اترا۔ "رانی کو مار دیا ہے... کس نے؟"

"وہی خبیث ہوگا... ڈاکٹر زیدی اور کون... تم نے اس کے منہ پر سب کہہ دیا... رانی کو مرنا ہی تھا... اس کے بعد میری باری ہوگی... پھر شیریں کی۔"

میں نے کہا۔ "گھبراؤ نہیں... کچھ نہیں ہوگا... کیا تم وہاں جا رہی ہو؟"

"وہاں میں کیسے جاؤں اس بچی کو لے کر... وہ ماں کی لاش دیکھے گی خون میں لت پت... وہ بنگالی تو پاگل ہوگیا ہے... کہتا ہے، رانی کی لاش اندر پڑی ہے... اور چوکیدار کہتا ہے وہ کچھ دیر پہلے باہر گئی تھیں... اپنی گاڑی میں۔"

یہ بات سنتے ہی میں باہر دوڑا۔ یک لخت مجھ پر چودہ طبق روشن ہوگئے تھے۔ رانی کا قاتل ڈاکٹر زیدی نہیں ہوسکتا تھا۔ خصوصاً ان حالات میں کہ میں نے اس کے سامنے اپنے شکوک کا اور ارادوں کا اظہار بھی کردیا تھا... پھر رانی اس کے لیے سونے کے انڈے دینے والی مرغی تھی، اسے وہ کیسے مار سکتا تھا... وہ خوب صورت تھی اور کم سے کم آدھی دولت جائداد کی مالک تھی!

گاڑی کو میں نے روبی کے گھر کے سامنے روکا تو رات کا ڈیڑھ بجا تھا لیکن اندر روشنی نظر آرہی تھی۔ میں نے دستک دی تو کوئی دروازے تک آیا... اندر سے روبی نے پوچھا۔ "کون ہے؟"

میں نے کہا۔ "بزدل... میں مریم کو تمہارے پاس چھوڑنے آیا ہوں... شاہدہ میرے ساتھ بلال خان کی حویلی جا رہی ہے... کسی نے رانی کو قتل کردیا ہے۔"

وہ میرے جال میں آگئی۔ اس نے کنڈی کھولی ہی تھی کہ میں دھکا دے کر اندر داخل ہوگیا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔ میری توقع کے عین مطابق روبی میرے سامنے تھی لیکن لباس اس نے وہی پہن رکھا تھا جو میں نے رانی کے جسم پر دیکھا تھا... اس کے پیچھے بابر بت بنا کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہی نہیں، چہرے پر اور اطوار میں بھی دیوانگی کے آثار صاف دیکھے جاسکتے تھے۔ سب سے پیچھے روبی کی ماں تھی جو خوف سے بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔

بابر نے ایک دم مجھ پر حملہ کیا لیکن میں نے گولی نہیں چلائی۔ میں نے اس کے سر پر ریوالور مارا... وہ چکرا کے گرا اور بے ہوش ہوگیا۔ روبی نے ایک چیخ ماری اور اس کے پاس گھٹنوں کے بل جھک گئی۔

میں نے کہا۔ "کھیل ختم ہوگیا روبی!" میں نے اسے کھینچ کے کمرے میں دھکا دیا۔ وہ بیڈ پر گری تو اس کی ماں بھی اندر آگئی۔

میں نے کہا۔ "دیکھو روبی... مجھے تم سے ہمدردی ہے... ہوسکتا ہے کہ تم مجھے سچ سچ بتا دو تو میں کسی سے کچھ نہ کہوں... پولیس کو بھی کچھ نہ بتاؤں... ورنہ تم جانتی ہو کہ پولیس نا کردہ جرائم کا اعتراف بھی کرا لیتی ہے... آدھے گھنٹے میں وہ تم سے سب اگلوا لیں گے... میں بزدل ہی نہیں رحم دل بھی ہوں۔"

وہ پھر میری باتوں میں آگئی۔ "رانی کو میں نے ہی مارا ہے... اس کے کپڑے پہن کے میں ہی اس کی گاڑی میں وہاں سے نکلی تھی... چوکیدار نے مجھے رانی سمجھا۔ وہ گاڑی میں نے گھر کے قریب ہی چھوڑ دی تھی... شام کو جب مہمان رخصت ہوئے تو میں غائب ہوگئی تھی... میں ایک الماری میں گھس کے انتظار کرتی رہی، سب یہی سمجھے ہوں گے کہ میں بھی چلی گئی... آدھی رات کے بعد جب رانی سو گئی تو میں نے کچن کی چھری سے اس کا گلا کاٹ دیا۔"

میں سنتا رہا۔ "بابر کو تم نے شروع سے اپنے گھر میں ہی چھپا رکھا تھا؟"

"ہاں... یہ محفوظ ترین جگہ تھی... پولیس یہاں آئی اور تلاشی لے کر چلی گئی... بابر پڑوس کے گھر میں تھا... پولیس کے جاتے ہی یہ یہاں آگیا... پولیس اسے فروٹ فارم پر اور

www.pkdigest.com

سارے شہر میں تلاش کرتی پھر رہی ہے۔"

"اس کے بڑے بھائی کو بھی تم نے مارا؟"

"ہاں... وہ ریوالور تو بابر نے بہت پہلے ڈاکٹر زیدی کے کلینک سے غائب کر دیا تھا... ماں کا ریوالور اسے بہت عزیز تھا۔"

"یہ ساری اسکیم تمہاری تھی... سب کو راستے سے ہٹا کے ساری دولت جائداد پر قبضہ کرنے کی؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "بابر میرے ساتھ تھا... اس کی ماں نے خودکشی کی تھی... وہ نفسیاتی مریض ہو گئی تھی... اکبر خان نے حالات سے فائدہ اٹھایا اور بھائی کو دیوانہ مشہور کر دیا... یہ کہا کہ بابر میں ماں کی طرف سے موروثی بیماری آئی ہے... اگر میں عقل سے کام نہ لیتی تو بابر مارا جاتا... میری کیا اوقات تھی... میں نے خود ڈاکٹر زیدی سے کہا کہ وہ اسے پاگل خانے میں ڈال دیں... وہاں ڈاکٹر شیریں نے میری مدد کی... جب بابر کا باپ بھی مر گیا تو میں نے بابر کو اپنی اسکیم سمجھائی کہ ہم کیا کر سکتے ہیں... بابر پاگل ہے تو پاگل ہی سہی... اگر وہ پاگل خانے سے فرار ہو جائے تو اکبر خان کو بھی مار سکتا ہے اور اس کی بیوی کو بھی... اول تو الزام اس پر نہیں آئے گا کیونکہ سب کچھ میں کروں گی... لیکن اگر وہ پکڑا بھی گیا تو اسے سزائے موت نہیں ہو سکتی... کوئی اچھا وکیل اسے دماغی خرابی کے عذر پر بچا لے گا۔ ایک بہت بڑے وکیل نے تو مجھے یقین دلا دیا تھا کہ بابر کو جیل کی سزا بھی نہیں ہوگی... اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے گا... وہاں اس کا علاج ہوگا اور سال دو سال میں ڈاکٹر اس کے نارمل ہونے کی رپورٹ دے دیں گے... پیسے سے سب ہو جاتا ہے... بابر باہر آ جائے گا۔"

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔ "یہ سب کیوں کیا تم نے روبی... ہر صورت میں بابر کو آدھا تو مل ہی جاتا... اور یہ آدھا بھی کم تو نہیں ہے؟"

"تم اسے لالچ کہہ سکتے ہو... لیکن میں نے اس ذلت کا انتقام بھی لیا ہے جو خاندانی غربت کی سزا تھی... پہلے میرے باپ نے تمام عمر یہ ذلت اٹھائی اور علم کی دولت کے غرور سے خود کو دھوکا دیتا رہا... کیا ہے علم کی دولت... ایک پرائمری اسکول ٹیچر کی معاشرے میں کیا اوقات ہے؟ اور اس کے مقابلے میں بلال خان جیسے رئیس... جو جائز ناجائز میں فرق ہی نہیں کرتے... حق و ناحق کو سمجھتے ہی نہیں... عدل اور ناانصافی کے مطلب کو جانتے بوجھتے نظر انداز کرتے ہیں... اس گھر میں جو عزت دار کہلاتا تھا... مجھے صرف بے عزتی ملی... طعنے ملے کہ باپ کے گھر میں کبھی سوکھی روٹی کے سوا کچھ ملا تھا... یہاں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کے ولایتی مکھن... ڈبل روٹی اور مارملیڈ کھاتی ہو... جو کپڑے آج پہن رہی ہو... کبھی خواب میں بھی دیکھے تھے... سن سن کر میرا کلیجا پک گیا تھا۔ اس ذلت کا حصہ میرے باپ کی روح کو بھی اسی طرح پہنچایا جاتا تھا جیسے ایصالِ ثواب کے لیے ضروری ہو... میری ماں کو ذلت دی جاتی تھی۔ میں بابر کی محبت کو کب تک کافی سمجھتی... اس کی اور اپنی حق تلفی کیسے دیکھتی رہتی... وہ تو ہم سے جینے کا حق ہی چھین رہے تھے... اگر وہ ہمیں تھوڑی سی عزت... تھوڑی سی محبت شفقت اور اپنائیت دے دیتے تو انہیں کیا کمی پڑتی؟ ہم آدمی کو بھی بہت سمجھتے لیکن وہ تو ہمیں دو گز زمین کے سوا کچھ دینا ہی نہیں چاہتے تھے... پھر ہم کیا کرتے؟ خاموشی سے مر جاتے؟ میرا شوہر پاگل قرار دیا جا چکا تھا... اسے کسی بھی بہانے مارا جا سکتا تھا... پھر میری باری آتی... میں نے پہل کر دی تو کون سا غلط کام کیا... کیا آپ کسی سانپ کو موقع دیتے ہیں کہ وہ پھن اٹھا کے آپ کو ڈس لے... نہیں... آپ پہلے اسے مار دیتے ہیں۔"

اس کی آواز واپسی پر بھی میرے کانوں میں گونج رہی تھی اور میرے لیے طے کرنا مشکل تھا کہ جو کچھ اس نے کیا وہ صحیح تھا یا نہیں... یہ میں ضرور طے کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے بھی روبی کو دھوکا دیا تھا... میں نے اس سے سچ اگلوانے کے لیے جھوٹا وعدہ کیا تھا۔ مجھے سارے حقائق پولیس کے سامنے رکھنے تھے۔ اس کے بعد قانون کو اپنا کام کرنا تھا۔ ڈاکٹر زیدی نے قتل کی ایف آئی آر لکھوا دی تھی۔ روبی اور اس کا شوہر گرفتار ہو چکے تھے۔ مکان رہ گیا تھا... مکین نہیں رہے تھے۔

بلال خان کے فروٹ فارم... حویلی... جائداد اور دولت کی واحد وارث ایک سات سالہ بچی مریم رہ گئی تھی جس کی پرورش کی ذمے دار... اس کی گورنس شاہدہ تھی۔ اس نے ایک لاوارث بچی شیریں کو ڈاکٹر بنا دیا تھا۔ شاید وہ مریم کو بھی ڈاکٹر بنا دے۔ بشرطیکہ وقت نے اسے اتنی مہلت دی۔ ورنہ یہ کام شیریں ہی کرے گی۔ برسوں بعد جب مریم اس ساری دولت یا جائداد کی مالک ہوگی تو کیا یہ کہانی نئے ناموں کے ساتھ پھر شروع ہوگی؟ کون جانے... بے نام کہانی تو کوئی نہیں ہوتی۔

میرے فون کی گھنٹی بجی تو میں نے نمبر دیکھا۔ یہ صائمہ تھی۔ میں نے گھنٹی بجنے دی کیونکہ اسے بتانے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں تھا۔

www.pkdigest.com